گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

2014

معراج رسول

نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے ناولوں کی بھرپور اقساط

پروفیسر سیما سراج سے پُرفکر ملاقات



اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

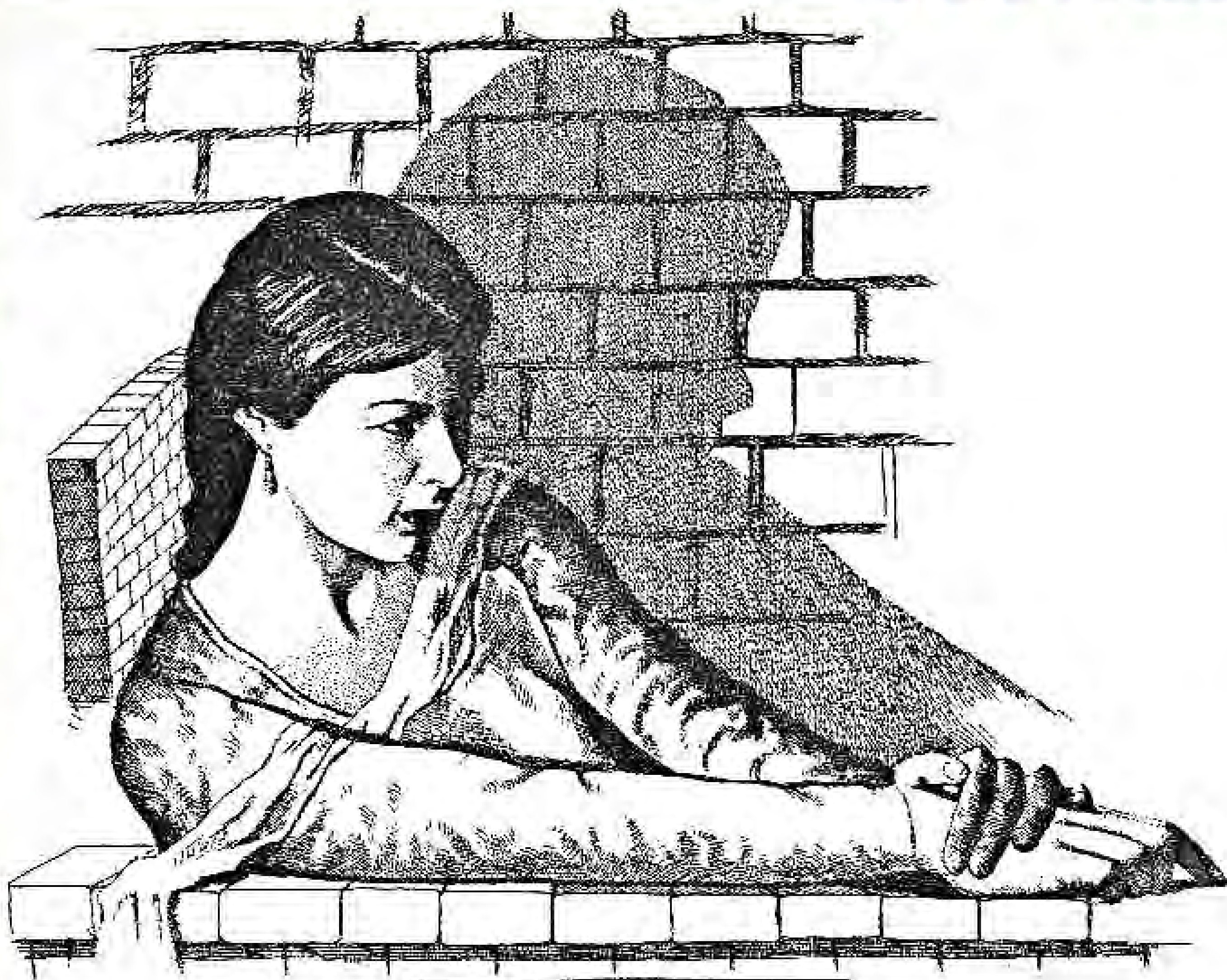
مکمل ناول

منی ناول

افسانے

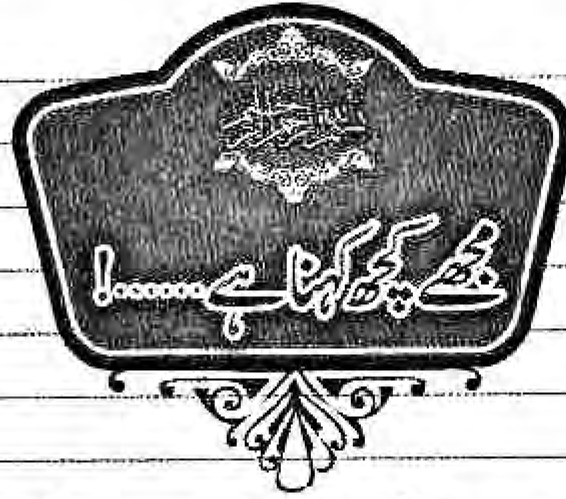
خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: عفرا .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا
جلد 42 • شمارہ 08 • نومبر 2014 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں قربانی کا مفہوم واقعہ کربلا سے ہی متعین ہوتا ہے کیونکہ حضرت امام حسینؓ نے جو کچھ کیا وہ اسلام کو بچانے کے لیے کیا۔ کربلا میں حقیقی فتح امام حسینؓ کی ہوئی جن کا نصب العین آج بھی انتہائی روشن اور تابناک ہے جتنا کہ اس وقت تھا۔ کربلا میں اگر جوانوں، بوڑھوں اور بچوں نے تلوار کے ذریعے جہاد کیا تو اہل بیت رسول ﷺ کی مقدس خواتین نے اہلِ کوفہ وشام تک حق وصداقت پرمبنی اپنی آواز پہنچائی۔

حضرت زینب کبریٰؓ کے خطبات جوانہوں نے کوفہ وشام کے بازاروں اور حاکم کوفہ اور حاکم شام کے دربار میں دیے ان میں جرأت وشجاعت کے اظہار کے ساتھ حق گوئی بھی نظر آتی ہے۔

یہ اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت ہے، ان مقامات پر آپ نے سانحہ کربلا کے واقعات اور کارناموں سے آگاہی بخشی ورنہ عین ممکن تھا کہ واقعہ کربلا کے تھوڑے عرصے بعد ہی لوگوں کو یہ عظیم قربانیاں یاد ہی نہ رہتیں...... واقعہ کربلا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کربلا کا واقعہ ایک دردانگیز حادثہ ہی نہیں بلکہ فرض شناسی اور اخلاقی تعلیمات کا گراں بہا نمونہ ہے۔ واقعہ کربلا کے بعد تاریخ اسلام میں آج تک جو کچھ پیش آیا اس میں سانحہ کربلا کی جزوی مشابہت موجود رہی ہے۔ یعنی حق وباطل کے درمیان تصادم شروع سے ہوتا چلا آرہا ہے اور ایسے مواقع پر اسلام کے سچے سپاہیوں نے حضرت امام حسینؓ سے ہی جرأت وہمت کا سبق سیکھا، اگر یہ سانحہ رونما نہ ہوتا اور حضرت امام حسینؓ کا کردار پیش نظر نہ ہوتا تو اس امت کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ مسلمان ظلم کے سامنے جھک جاتے اور باطل کی بیعت اور شر کے ساتھ مصالحت کرلینے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے۔

اس طرح امام حسینؓ نے انسانیت کو حسن وعمل کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جس پر ہم رہتی دنیا تک فخر کرسکتے ہیں...... اور انسان کی عظمت بھی یہی ہے کہ ہم اعلیٰ انسانی اقدار کی خاطر جئیں اور اعلیٰ اقدار کی خاطر مریں...... مومن کی یہی شان اور اس کا یہی کردار ہے اور شہدائے کربلا کی شہادت میں یہی فلسفہ اور یہی راز مضمر ہے۔

مدیرہ

انجم انصار



علم... معرفتِ الٰہی

حضرت عمر فاروق ؓ فرماتے ہیں۔ "اے لوگو! علم کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ...... اللہ تعالیٰ کے پاس ایک ردائے محبت ہے جو شخص علم کی طلب رکھتا ہے اللہ تعالیٰ وہ چادر اسے اوڑھا دیتا ہے...... چنانچہ وہ شخص اگر کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنی رضا جوئی کرا لیتا ہے...... بار بار ارتکاب گناہ پر بھی اللہ اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے...... محض اس لیے تاکہ اس سے وہ چادر نہ چھینی پڑے جو اسے عطا کی گئی ہے۔"

حضرت ابوبکر صدیق ؓ فرماتے ہیں۔ "علم کو جب کوئی شریف النفس انسان حاصل کرتا ہے تو وہ علم اس میں تواضع پیدا کرتا ہے...... اور جب کوئی ادنیٰ یا کم ظرف اسے حاصل کرتا ہے تو وہ متکبر ہو جاتا ہے...... اور علم کو جب کوئی اپنی حد سے زیادہ حاصل کرے تو وہ علم اس میں مکاری پیدا کر دیتا ہے اور جو علم کو اپنی حد سے کم حاصل کرتا ہے تو اس میں حماقت پیدا ہوتی ہے...... انسان کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ اتنا علم حاصل کرے کہ وہ اپنے اللہ سے ڈرتا رہے۔"

درحقیقت علم ہمیں یقین عطا کرتا ہے اور یہ یقین ہم میں خوف پیدا کرتا ہے اور جب خوف عطا ہو جاتا ہے تو ہمیں اخلاص عطا ہوتا ہے اور پھر مزید درجات بڑھتے، بڑھتے مشاہدہ عطا ہوتا ہے۔ جو آخری درجہ ہے۔

روحانیت اور علم لدنی کے حصول کے لیے کسی حکمتِ عملی کی ضرورت نہیں سوائے اس کے کہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کی تقلید کر لی جائے۔ آپ کی حیات درحقیقت عملی قرآن ہے۔ اگر ہم زندگی کے تمام شعبوں میں آپ ﷺ کی زندگی کی تقلید و پیروی کرنا شروع کر دیں تو روحانیت خود بخود حاصل ہو جائے گی۔

اللہ ربّ العزت کی اس وسیع و عریض کائنات میں انسان کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں کہ وہ ان پر غور و فکر کرے اور کائنات کے خالق و مالک یعنی اپنے بہت پیارے رب کو سمجھے اس کی معرفت حاصل کرے۔

مسلمان اس وقت تک عالم پر چھائے رہے جب تک علم ان کا سرمایۂ حیات رہا...... جو قوم علمی روش سے روگردانی کرے گی وہ وقت کی رو میں کچلی جائے گی۔

افسوس...... کہ آج مسلمان علمی روش بھلا بیٹھے...... آج کا مسلمان اپنے اسلاف کے عظیم علمی کارناموں سے بھی آگاہ نہیں...... جہاں آسمانِ علم پر بے حد روشن ستارے چمک رہے ہیں...... ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہمیں جدید عصری علوم کے پس منظر میں مطالعہ قرآن کی خاص طور پر ضرورت ہے...... اور ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ آج کے لوگوں کے ڈگمگائے ہوئے ایمان کو قرآنی آیات کی سائنسی تفسیر و تفہیم کی صورت میں دلائل کے ساتھ مضبوط کیا جائے۔ اپنے اسلاف کی اتباع میں علمی و تحقیقی روش اپنا کر پھر سے غلبۂ دین کی بحالی میں اپنا کردار ادا کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے...... اور علم و فکر کے در ہم پر وا کر دے...... آمین۔

☆☆☆

حرفِ آخر

یہ مضمون لکھنے کے بعد شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ بہت کچھ بیان کیا جا سکتا تھا مگر طوالت کا خوف...... بہرحال حقیقت یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو سکا...... بس ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں التجا ہے کہ اس مضمون میں کہیں کوئی غلطی...... کوئی کمی ہو تو وہ مجھے معاف فرما دے...... آمین۔

اس مضمون کی تیاری میں، میں نے جن اعلیٰ ہستیوں کی کتب سے استفادہ کیا ہے ان جلیل القدر ہستیوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں...... اللہ ان کے درجات بلند فرمائے...... ان پر اپنی خاص رحمتوں کا نزول فرماتا رہے...... ان کے فیوض و برکات علمیہ و دینیہ کو قیامت تک قائم و دائم رکھے...... آمین۔

یا اللہ اس ادارے کے تمام اراکین کو تمام تعاون کرنے والوں کو...... اور اس تحریر کے مطالعہ کرنے والوں کو بھی اس کے تمام علمی اور عملی منفعت عطا فرمائے...... اور اس کو ہمارے لیے سرمایہ نجات اور توشۂ آخرت بنا دے...... آمین۔

حضرت شیخ ابو طالب مکیؒ
حضرت امام محمد غزالیؒ
حضرت علامہ مفتی جعفر حسین صاحب
ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی
جناب مفتی محمود اشرف عثمانی
مولانا حافظ محمد اسحاق دہلویؒ
مولانا خورشید عالم صاحب
جناب علی محمد علی دخیل (ترجمہ سید صفدر حسین نجفی)
جناب منصور احمد بٹ
جناب ڈاکٹر طاہر القادری صاحب
جناب سرفراز اے شاہ صاحب
جناب علی ریحان سید صاحب

ختم شد

اعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں

قسط 3



"کیا ہوا خدا بخش...... خیریت ہے ناں سب۔ عظام اور رواحہ؟" انہوں نے دل پر ہاتھ رکھا... تو خدا بخش نے یک دم ہی آگے بڑھ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں تھپتھپایا۔

"حوصلہ رکھیں صاحب، بچے ٹھیک ہیں الحمدللہ۔"

"تو خدا بخش ایسا کیا ہوگیا! تم نے تو مجھے دہلا دیا۔ میں نے سوچا شاید بچے......" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ "عظام کی خاندانی دشمنی بھی تو ہے۔"

"وہ دراصل کچھ لوگ آئے ہیں صاحب۔"

"کون لوگ خدا بخش؟" وہ پھر گھبرا گئے۔

"پتا نہیں صاحب پہلے کبھی اس طرح کے لوگ آپ سے ملنے نہیں آئے۔ عجیب حلیے ہیں ان کے اور عجیب باتیں کر رہے تھے۔ کسی شخص کے متعلق پوچھ بھی رہے تھے۔ میں نے انہیں بٹھا دیا ہے صاحب اور آپ کو بلانے آگیا۔"

"اوہ میرے خدا...... کہیں وہ عظام کو تو نہیں پوچھ رہے تھے؟" ان کی پریشانی بڑھی۔ "اس کے دشمن نہ ہوں اگر اسے کچھ ہوگیا تو پرایا بچہ ہے۔" گھبرا کر انہوں نے پھر خدا بخش کی طرف دیکھا۔

"کہاں بٹھایا ہے انہیں...... بچے گھر پر تھے، کہیں وہ کسی کو نقصان نہ پہنچا دیں؟"

"میں نے انہیں لان میں بٹھایا ہے صاحب، یہی کہا تھا صاحب گھر پر نہیں واک کے لیے سامنے پارک میں گئے ہیں بچوں کا تو ذکر تک نہیں کیا اور اندرونی دروازہ باہر سے لاک کر کے آیا ہوں۔ اندر مالی لان میں کام کر رہا ہے۔ ابھی آیا تھا صاحب۔"

"تم ٹال دیتے انہیں خدا بخش۔" وہ اندر سے بے حد پریشان ہوگئے تھے۔

"ٹالا تھا صاحب لیکن وہ انتظار کرنے کو کہنے لگے۔ میں نے سوچا بچوں کے جاگنے سے پہلے ہی انہیں فارغ کر دیں۔ مجھے بھی شک گزرا تھا کہ کہیں عظام بیٹے کے پیچھے نہ آئے ہوں اگرچہ انہوں نے کوئی اور نام لیے تھے۔ ذہن سے نکل گیا ہے اب تو بس میں نے کہہ دیا صاحب پارک میں ہیں۔ وہاں ہی جا کر مل لو لیکن وہ ایک جو کلوٹا سا تھا ان میں اس نے کہا بلا لاؤ جا کر۔ ہم کیا پارک میں تیرے صاحب کو ڈھونڈتے پھریں گے۔" خدا بخش ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بتا رہا تھا اور وہ سوچ رہے تھے پتا نہیں کون لوگ ہیں۔ ان کے تمام احباب سے تو خدا بخش اچھی طرح واقف تھا اور پھر ان کا حلقۂ احباب کوئی وسیع بھی نہ تھا۔ چند گنے چنے ہی لوگ تھے پھر کہیں وہ عظام کے دشمن ہی نہ ہوں۔ انہوں نے خدا بخش کی طرف دیکھا۔

"کیا وہ شکل صورت سے بدمعاش قسم کے لوگ لگتے ہیں؟"

"نہ صاحب وہ تو...... وہ تو اپنے حلیے اور بات چیت سے گانے بجانے والے قبیلے سے لگ رہے تھے۔ تین بندے ہیں صاحب لیکن وہ جو کلوٹا سا ہے وہ کچھ بدمعاش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لگتا نہیں۔"

وہ الجھے ہوئے سے تیز، تیز چلنے لگے اور گیٹ کے پاس پہنچتے ہی بے تابی سے گیٹ کھول کر اندر آئے۔ مالی گیٹ کے پاس ہی زمین پر بیٹھا تھا۔ وہ ہر اتوار کو آتا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر سلام کیا تو وہ اشارے سے جواب دیتے تیزی سے لان کی طرف بڑھے۔ دو افراد لان چیئرز پر بیٹھے تھے جبکہ تیسرا شخص کھڑا ادھر ادھر متجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اپنے حلیوں اور وضع قطع سے

ایسے ہی لگ رہے تھے جیسے خدا بخش نے بتایا تھا۔ وہ دونوں انہیں دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام، تشریف رکھیں۔" اپنے اضطراب کو چھپاتے ہوئے انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں تو بیٹھ گئے تھے لیکن تیسرا شخص اسی طرح کھڑا تھا۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور دائیں رخسار پر زخم کا ہلکا سا نشان تھا، وہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے بار، بار اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بظاہر بے نیاز سا کھڑا تھا لیکن اس کی تیز نظریں انہی کے چہرے پر تھیں۔

"کہیے کیسے آنا ہوا؟" انہوں نے بھی اسے نظر انداز کر کے سامنے بیٹھے ہوئے افراد کو مخاطب کیا۔

"صاحب ہم حیاتی دادا سے ملنے آئے ہیں۔ بڑا ضروری کام آپڑا ہے صاحب۔" ایک نے جواب دیا۔

"لیکن میں تو کسی حیاتی دادا کو نہیں جانتا۔" وہ حیران ہوئے تھے۔

"صاحب یہ گھر آپ کا ہے ناں؟" اب کے زخم کے نشان والے شخص نے پوچھا تو انہوں نے اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہاں آپ کے علاوہ اور کون، کون رہتا ہے؟"

"کیا میں اس تحقیق کا مقصد پوچھ سکتا ہوں؟"

"مقصد بھی بتا دیں گے صاحب لیکن......" اس شخص کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن آنکھوں سے بھرپور خباثت جھلکی۔ ذرا سے وقفے کے بعد اس نے بات مکمل کی۔

"بتانے میں کچھ حرج ہے کیا؟"

"میرے اور میرے بیٹے کے علاوہ یہ خدا بخش۔ بس ہم تین افراد اس گھر کے مستقل مکین ہیں باقی کچھ جز وقتی ملازم مثلاً صفائی والی خاتون اور یہ مالی وغیرہ۔" انہوں نے تحمل سے جواب دیا۔

"دراصل!" اس شخص نے انگوٹھے اور انگلی سے اپنی مونچھ کو بل دیا۔ "ان کے مطابق......" اس نے بیٹھے ہوئے افراد کی طرف اشارہ کیا۔ "رات کو آپ کے گیٹ کے باہر انہوں نے حیاتی دادا کو دیکھا تھا۔ اگر وہ اس گھر کا مکین نہیں ہے تو یقیناً آپ سے ملنے آیا ہوگا۔"

"نہیں، اس نام کا کوئی شخص میرا ملاقاتی نہیں ہے۔ نہ ہی رات کوئی مجھ سے ملنے آیا۔"

"لیکن گزری رات وہ شخص میرا مطلب ہے حیاتی دادا یہاں گیٹ کے باہر کھڑا تھا غالباً بیل دینے لگا تھا۔"

"اگر کوئی شخص میرے گھر کے گیٹ کے باہر کھڑا تھا تو کیا ضروری ہے میں اسے جانتا ہوں یا وہ میرا کوئی واقف کار ہی ہو؟ کوئی اجنبی بھی کسی وجہ سے گیٹ کے باہر کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"بات سنیں صاحب۔" بیٹھے ہوئے اشخاص میں سے ایک نے ان کی طرف دیکھا۔ "ہم شاہجہان بیگم کے سازندے ہیں۔ رات اِدھر دو گھر چھوڑ ملک صاحب کے گھر میں ان کے بیٹے کی شادی کی خوشی میں گانے بجانے کی محفل تھی تو ہم شاہجہان بیگم کے ہاں سے آئے تھے لڑکیوں کو لے کر اِدھر سے گزرتے ہوئے ہم نے حیاتی دادا کو دیکھا۔ صاحب وہ اِدھر آپ کے بنگلے کے گیٹ کے باہر کھڑے اُدھر سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمیں لگا تھا جیسے وہ اِدھر اسی بنگلے میں رہتے ہیں اور...... صاحب برسوں بعد دیکھا تھا لیکن لمحوں میں

پہچان لیا، میں تو جی بندے کو ایک بار دیکھ لوں تو ساری زندگی اس کی شکل نہیں بھولتی اور حیاتی دادا تو برسوں بڑے صاحب کے ساتھ شاہجان بیگم کے ڈیرے پر آتا رہا تھا۔"

وہ بیزاری سے اس کی بات سن تو رہے تھے لیکن ان کا دھیان ملک صاحب کی طرف تھا جو انہیں ہمیشہ ہی بڑے وضع دار اور پرانی اقدار کی قدر کرنے والے اور مذہب سے گہرا لگاؤ رکھنے والے لگتے تھے لیکن بیٹے کی شادی پر بے جا اصراف کے علاوہ ناچ گانے کی محفل بھی سجائے بیٹھے تھے۔

"تو صاحب ہمارا کوئی غلط مقصد نہیں ہے۔ شاہجہان بیگم کو کوئی کام آپڑا ہے حیاتی دادا سے تو صبح واپسی پر ذکر کیا تو انہوں نے اِدھر دوڑا دیا۔" اب پھر کھڑے ہوئے شخص نے بات آگے بڑھائی تھی۔

"لیکن میں آپ کو بتا چکا ہوں میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔"

"ٹھیک ہے صاحب، ہم چلتے ہیں اور معافی چاہتے ہیں کہ آپ کو پریشان کیا لیکن اگر کبھی حیاتی دادا سے ملاقات ہو تو ہمارا پیغام ضرور دے دیجیے گا کہ شاہجہان بیگم یاد کرتی ہیں انہیں۔ کبھی فرصت نکال کر ملاقات کرلیں۔"

انہوں نے بے حد جزبز سا ہو کر اس کی طرف دیکھا یعنی وہ اب بھی شک کر رہا تھا کہ وہ اس شخص کو جانتے ہیں۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں حضرات کہ دور و نزدیک میرے احباب میں اس نام کا کوئی بندہ نہیں ہے۔ میں پہلی بار یہ نام سن رہا ہوں۔"

"جی صاحب بس احتیاطاً کہا ہے۔" دونوں سازندے کھڑے ہوگئے اور قدرے جھک کر سلام کرتے ہوئے رخصت ہوئے جبکہ تیسرے شخص نے سلام کرنے کی زحمت نہیں کی تھی اور اِدھر اُدھر متجسس نظروں سے دیکھتا ہوا گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد خدا بخش نے گیٹ بند کیا۔

"صبح، صبح آگئے پریشان کرنے کو۔" خدا بخش بڑبڑاتا ہوا ان کے پاس آیا اور پوچھا۔ "ناشتا لینے جاؤں صاحب؟"

"نہیں، پہلے ایک کپ چائے بنا دو۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "پھر دیکھنا بچے اگر اٹھ گئے ہوں تو ناشتا لے آنا۔"

"جی صاحب، چائے تو دم کردی تھی، ابھی لایا۔" خدا بخش نے سر ہلایا۔

وہ الجھے، الجھے سے خدا بخش کے ساتھ چلتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اندرونی دروازے تک آئے۔ خدا بخش نے لاک کھولا۔

"سنو خدا بخش، بچوں سے ان کا ذکر نہ کرنا خواہ مخواہ پریشان ہوں گے کہ کون لوگ تھے۔"

"ارے صاحب غلطی سے آگئے تھے گانے بجانے والوں کا بھلا یہاں کیا کام۔"

انہوں نے سر ہلا دیا لیکن دل میں کہیں ایک وہم سا تھا کہ یہ لوگ عظام کی ٹوہ لینے ہی آئے ہیں اور یہ ان کا فرض بنتا تھا کہ جب تک عظام کا قیام ان کے گھر پر ہے وہ اس کی حفاظت کا خیال رکھیں اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی سیکورٹی ایجنسی سے گارڈ منگوالیں۔ دل ہی دل میں فیصلہ کرکے وہ لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے اس نے نظر اٹھائی اور اس کے ٹائی کی ناٹ باندھتے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے۔ آئینے میں سے جھانکتا چہرہ اس کا تو نہ تھا۔

"یہ میں ہوں تو پھر وہ کون ہے جو آئینے میں سے جھانکتا ہے؟" اس نے سر تا پا اپنا جائزہ لیا۔ مارکس اینڈ اسپنسرز کی شرٹ mont black اور gucci سے خریدی گئی ٹائی اور پھر اس کی نظر اپنے پاؤں پر پڑی یہ شوز...... اس نے غیر ارادی طور پر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کردی...... ٹائی اب اس کے گلے میں جھول رہی تھی لیکن وہ جو آئینے سے جھانکتا تھا اس کا لباس تو...... اس نے پھر ڈرتے، ڈرتے آئینے کی طرف دیکھا۔ آئینے میں اب وہی تھا۔ گلے میں جھولتی ٹائی۔

"اور...... ہاں یہ میں ہی تو ہوں لیکن چند لمحے پہلے جو آئینے سے جھانکتا تھا وہ کون تھا؟" اس نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "وہ...... وہ بھی تو میں ہی تھا۔ ثمر حیات...... صوفی محمد نصیر بزاز کا بیٹا۔" اور وہ پرانا ثمر حیات جو صوفی محمد نصیر کا بیٹا تھا پتا نہیں کیوں آج کل موقع بے موقع اِدھر اُدھر کونوں کھدروں سے جھانکنے لگتا تھا۔ "خیر......" اس نے سر کو ہولے سے جھٹکا اور کھڑے ہو کر اطمینان سے ٹائی باندھی۔ کرسی کی پشت پر لٹکا کوٹ اٹھا کر پہنتے ہوئے اس کی نظر پھر آئینے پر پڑی تھی۔ وہ پھر آئینے میں سے جھانک رہا تھا۔ وہی صوفی محمد نصیر بزاز کا بیٹا لیکن یہ چہرہ کتنا اجنبی لگ رہا تھا اسے۔ وہ کوٹ پہننا بھول کر اسے دیکھنے لگا اور پھر اس چہرے کے پیچھے سے ایک اور چہرہ جھانکنے لگا۔

"فرحی!" اس کے لبوں سے نکلا اور کوٹ کی دوسری آستین پہننے کے لیے اٹھا ہاتھ نیچے گر گیا۔ "تم یہاں آئینے میں کہاں سے آکر چھپ کر بیٹھ گئی ہو؟" اس نے چاہا کہ آئینے سے فرحی کو نکال کر باہر لے آئے لیکن جب اس نے آئینے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو آئینہ خالی تھا اور شفاف آئینے سے اس کا اپنا عکس جھانکتا تھا۔ دائیں کندھے پر جھولتا کوٹ...... خمار آلود آنکھیں جن میں سرخ ڈورے تیرتے تھے۔ تھکا تھکا سا چہرہ۔

رات کے خمار سے سر بھاری تھا اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ پینے کا عادی نہیں تھا لیکن کبھی، کبھی کسی محفل میں وہ مجبور ہو جاتا تھا لیکن بہت کم ایسا ہوتا تھا۔ رات بھی بگ باکے اشارے پر اس نے ولسن کے اصرار پر وائن کا ایک پیگ پیا تھا۔

"ہماری دوستی کے نام ایک اور جام۔" ولسن نے اپنا جام اس کے جام سے ٹکرایا تھا اور اس نے خاموشی سے وہ جام بھی حلق سے نیچے اتار لیا تھا لیکن وہ چہرہ جو آئینے سے جھانکتا تھا کس کا تھا۔ اس نے ذہن پر زور دیا اور یونہی کوٹ کی ایک آستین پہنے پھر بیڈ پر آکر بیٹھ گیا اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی کو دبایا۔ دماغ خالی، خالی سا تھا اور اس میں خیالات پرندوں کی طرح اڑتے اڑتے آتے اور غائب ہو جاتے تھے۔

"لیکن وہاں فرحی بھی تو تھی۔ آئینے سے جھانکتی ہوئی اور ناراضی سے تکتی۔" دماغ کی زمین پر پھر کسی سوچ کا پتھر گرا تھا۔

"ہاں وہ فرحی ہی تو تھی پر ناراضی سے کیوں تکتی تھی۔ ہاں......!" اسے یاد آیا۔ "فرحی......!" اس کے لبوں سے سسکی کی طرح نکلا۔ "تمہارا بیٹا...... مجھے معاف کردو، مجھ سے کوتاہی ہوئی لیکن یوں ناراض ہو کر آئینے میں تو چھپ کر نہ بیٹھو۔ لیکن نہیں...... وہ فرحی بھلا آئینے میں کیوں چھپ کر بیٹھے گی۔" اس کی ذہنی رو پھر بھٹکی۔

"ضرور کسی نے اسے آئینے میں قید کر دیا ہے۔ پر میں اسے آزاد کروالوں گا۔" وہ اٹھا، کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکا اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ سر اتنا بھاری تھا جیسے کسی نے منوں بوجھ رکھ دیا ہو تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"کیا ہے؟" وہ دھاڑا اور مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

"صاحب ناشتا لگا دوں؟" باہر سے آواز آئی۔

"نہیں کرنا ابھی۔" اس نے سر کو ہولے سے جھٹکا شاید رات اس نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔ اس نے پھر سر جھٹک کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھا۔ شفاف آئینے میں لمحے بھر کے لیے اُس کا چہرہ نظر آیا تھا اور پھر اس کا اپنا عکس جھانکنے لگا۔

"کون ہے یہ اور بار بار کیوں میرے عکس پر غالب آجاتا ہے اور یہ آئینے میں کیسے آگیا؟" اس نے ذہن پر زور دیا اور ایک بار پھر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن ذہن غنودہ تھا۔

☆☆☆

"ثمر!" اس نے ڈولتے سر کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "ثمر بیٹا اٹھو ناں۔" ممتا کی شفقت و محبت سے لبریز ہاتھ اس کی پیشانی پر ٹکے تھے۔ "کالج نہیں جانا کیا؟"

"کالج......!" وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔ "جانا تو ہے بلکہ بہت ضروری جانا ہے۔" اس کی نگاہ سامنے کارنس پر سجی الارم والی گھڑی پر پڑی تھی۔ اس نے شکایتی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"اتنی دیر ہوگئی، آپ نے جگایا کیوں نہیں؟"

"میں سمجھی شاید آج تمہیں کالج نہیں جانا...... کہہ رہے تھے ناں کل کہ اب گھر میں ہی بیٹھ کر پڑھوں گا پھر تمہارے ابا نے کہا کہ تم سے پوچھ لوں کیا خبر ابھی جانا ہو۔"

"ہاں اماں، آج جانا ہے بہت ضروری جانا ہے صرف آج پھر ایگزام تک گھر......" وہ تقریباً بھاگتا ہوا واش روم میں گیا تھا اور پھر اس نے تیار ہونے میں صرف چند منٹ ہی لگائے۔ اماں ناشتے کے لیے بلاتی ہی رہ گئیں لیکن وہ فائل ہاتھ میں اٹھائے۔ "دیر ہوگئی اماں۔" کہتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی کر رہا تھا بلکہ اسی ماہ کے آخر میں اس کے پیپرز شروع ہو رہے تھے۔ رول نمبر اور ڈیٹ شیٹ آچکی تھی۔ کلاسز میں حاضری کم ہوگئی تھی ان کے گروپ نے بھی طے کیا تھا کہ اب وہ گھر بیٹھ کر ہی پڑھیں گے لیکن آج سب کو کالج آنا تھا۔ وہ آج کے دن کو یادگار بنانا چاہتے تھے کیونکہ ان کے گروپ فیلو بالی بٹ نے ایگزام کے فوراً بعد انگلینڈ اپنے ماموں کے پاس چلے جانا تھا۔ جن کی بیٹی سے پچھلے سال اس کا نکاح ہوا تھا۔ جنید کو بھی اس کے بڑے بھائی نے امریکا بلا لیا تھا۔ سو آج سب دوستوں کا لمبا چوڑا پروگرام تھا لیکن پہلے انہیں کالج جانا تھا۔ سر زبیر نے بھی انہیں بلا رکھا تھا۔ ایک ٹاپک پر انہیں لیکچر دینا تھا اور پھر وہ سب اکٹھے کالج سے نکلتے بقول ان کے آج کا دن بالی بٹ اور جنید کے ساتھ جنہوں نے پھر گوروں کے دیس میں چلے جانا تھا۔ جب وہ اسٹاپ پر پہنچا تو اس کی سانس بے حد پھول رہی تھی۔ سڑک کے کنارے ایک بوڑھے درخت کے وسیع و عریض تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے سڑک پر نظر دوڑائی جو دور، دور

تک سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا وہ یقیناً پوائنٹ مس کر چکا تھا۔ پڑھنا اس کا اور اماں کا مشترکہ شوق تھا اور شوق کے اس بیج کو اماں نے ہی پانی دے، دے کر سینچا تھا۔ ابا تو چاہتے تھے کہ وہ میٹرک کر لے یا زیادہ سے زیادہ بارہ جماعتیں پڑھ لے اور پھر دکان پر ان کے ساتھ بیٹھے۔ ان کی اچھرا میں ایک چھوٹی سی دکان تھی اور کرشن نگر میں ان کا اپنا پانچ مرلے کا گھر تھا لیکن اماں اسے پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنانا چاہتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ وہ خود دس جماعت پاس تھیں اور ان کے میکے میں سب ہی پڑھے لکھے تھے۔ اس کے ماموں، خالائیں، ان کے بچے سب کالج، یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے تھے اور کچھ اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ ایسے میں ان کی خواہش کچھ بے جا بھی نہ تھی۔ وہ پڑھائی میں اچھا تھا اور ہمیشہ اپنے اسکول، کالج میں ٹاپ کرتا تھا اور اماں بہت خوش تھیں۔

"تو آج کا دن نکال کر پیچھے سترہ دن ہیں تیاری کے لیے۔" اس نے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے، لگائے حساب لگایا اور اس کی نظر سڑک پر دور سے آتی بس پر پڑی تو وہ تیز، تیز چلتا ہوا سڑک کے کنارے پر آکر کھڑا ہوگیا لیکن بس رکے بغیر ہی فراٹے بھرتی ہوئی گزر گئی کہ اس کے پائدان تک لوگ کھڑے تھے بلکہ بس کے گیٹ کے ڈنڈے پکڑے لٹک رہے تھے اس کے بعد یکے بعد دیگرے دو ویگنیں رکے بغیر گزر گئی تھیں جب تیسری وین بھی رکے بغیر گزر گئی تو اس نے جاتی ہوئی وین کو غصے سے مکا دکھایا حالانکہ یہ وین اس کے روٹ کی نہیں تھی لیکن اس نے سوچا تھا کہ وہ آگے کسی اسٹاپ پر اتر کر وہاں سے جی سی کی طرف جانے والی کوئی بس یا وین پکڑ لے گا نہیں تو...... تصور میں ہی بالی کا گورا چٹا پھولا ہوا چہرہ آگیا۔ وہ جب ناراض ہوتا تھا تو یونہی گال پھلا لیتا تھا۔ اس کے لبوں پر مدھم مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سڑک کے کنارے سے ہٹ کر پھر درخت کی طرف جانے لگا تب ہی بلیک کلر کی ہنڈا سڑک پر نمودار ہوئی وہ یونہی مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ گاڑی رک گئی تھی اور اس کا شیشہ سرکا اور فرح نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے آواز دی۔

"ارے فرح تم!" وہ تیزی سے گاڑی کے قریب آیا۔

"پوائنٹ کا انتظار کر رہے ہو؟"

"نہیں، وہ تو میں مس کر چکا۔"

"کالج جا رہے ہو کیا؟" فرح نے پھر پوچھا تو وہ جو گاڑی کے پیچھے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا چونک کر بولا۔

"ہاں...... ہاں۔"

"تو میں بھی کالج جا رہی ہوں، آجاؤ۔"

"اوہ تھینک یو، فرح تھینک یو۔" وہ کھل اٹھا تھا۔

ڈرائیور نے ہاتھ بڑھا کر بائیں طرف کا فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر فرح کو دیکھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا تو فرح نے اس کے شکریہ ادا کرنے پر برا سا منہ بنایا اور بڑبڑائی۔

"میں بھی کالج ہی جا رہی تھی۔" اس کی بڑبڑاہٹ پر مسکراہٹ لبوں میں دبائے وہ سامنے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگا۔ فرح سے اس کی بہت اچھی دوستی تھی بلکہ دوستی سے بڑھ کر کوئی اور جذبہ بھی تھا جو اُن

دونوں کے درمیان تھا لیکن ابھی تک اس جذبے کو زبان نہیں ملی تھی۔ فرح کو لڑکی ہونے کے ناتے کچھ کہنے میں حیا آتی تھی اور اسے اپنی مالی حیثیت کچھ کہنے نہ دیتی تھی فرح اور اس میں بہت طبقاتی فرق تھا سو جب بھی فرح کا خیال آیا بھی تو اس نے جھٹلا دیا۔ ''نہیں یہ ناممکن ہے اور ناممکن کے متعلق کیا سوچنا۔ فرح ایک اچھی دوست ہے بس۔'' اور اس سے آگے وہ اپنی سوچوں پر بند باندھ دیتا تھا۔ راستے بھر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ڈرائیور کی موجودگی میں دونوں نے ہی ایک دوسرے سے مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ گیٹ کے قریب پارکنگ میں جب دونوں اترے تو فرح نے ڈرائیور کو منع کر دیا کہ وہ اسے لینے نہ آئے کیونکہ واپسی پر اسے سائرہ کے ساتھ اس کے گھر جانا ہے اور اُدھر سے وہ خود ہی کسی کے ساتھ آجائے گی۔ ڈرائیور کو بتا کر وہ تیز، تیز چلتی ہوئی اس کے ہم قدم چلنے لگی تھی جو اسے ڈرائیور سے بات کرتے دیکھ کر اس کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔

''مجھے تم پر بہت غصہ آرہا ہے ثمر۔''

''کیوں بھئی؟'' اس نے چلتے، چلتے رخ موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

''کیسے اجنبیوں کی طرح شکریہ ادا کر رہے تھے۔''

''تو کیا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اس کی رفتار مدھم ہوئی اور وہ شرارت سے اسے دیکھنے لگا۔

''نہیں۔'' وہ سنجیدہ تھی۔ ''ہمارے درمیان کم از کم اتنی دوستی اور تعلق تو ضرور ہے کہ شکریے کی کوئی ضرورت نہیں یا شاید میں ایسا سمجھتی ہوں کہ ہم اچھے دوست ہیں جبکہ تم ایسا نہیں سمجھتے۔''

''یہ تمہارا خیال ہے ورنہ ہم یقیناً اچھے دوست ہیں اور میں تو ذرا اخلاق کا مظاہرہ کر رہا تھا تمہارے ڈرائیور کے سامنے۔ تمہیں پسند نہیں آیا تو میرا شکریہ واپس کر دو۔''

''تم بھی ناں ثمر!'' وہ مسکرا دی اور اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے۔ وہ لمحے بھر کو مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا وہ بہت خوب صورت نہیں تھی لیکن خوش شکل تھی اور جب مسکراتی تو اس کی آنکھوں میں جیسے تارے سے دمکنے لگتے تھے۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''آں...... کچھ نہیں۔'' اس نے چونک کر فرح کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور خود کو تنبیہ کی۔

''ثمر حیات اس لڑکی کا اور تمہارا کوئی میل نہیں، یہ دوستی یہاں کالج تک ہے بس۔'' اور اس کا دل جیسے ایک لمحے کو ڈوب سا گیا۔ وہ کالج میگزین راوی کا ایڈیٹر تھا اور فرح جو سائیکالوجی آنرز کی طالبہ تھی اسے اپنا ایک آرٹیکل دینے آئی تھی اور یہ فرح سے اس کی پہلی ملاقات تھی اور پھر ان دو سالوں میں ان کے درمیان دوستی کا ایک خوب صورت رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ فرحی اس کی خوب صورت شاعری کی دلدادہ تھی اور وہ اس کی ذہانت سے متاثر تھا۔ دونوں کا مشترکہ شوق ادب کا مطالعہ تھا اور کتب کا تبادلہ ہی انہیں ایک دوسرے سے قریب لایا تھا۔ اس نے اکثر سنڈے مال اور اردو بازار میں پرانی کتابوں کو کھنگال کر بے شمار ادبی کتب اکھٹی کر رکھی تھیں جبکہ فرح... ہر نئی آنے والی کتاب فوراً خرید لیتی تھی۔ وہ ایسا کر سکتی تھی جبکہ اپنے محدود جیب خرچ میں وہ نئی کتب کم ہی خریدتا تھا۔ وہ مہینے میں ایک دو بار ضرور مال کے فٹ پاتھوں سے چند اچھی ادبی کتب لینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ چلتے، چلتے وہ دونوں کالج کے لان تک آگئے تھے۔

''ثمر سنو۔'' فرح نے اسے بلایا تو وہ چونک کر رک گیا۔ ''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کیا......؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''چلو اُدھر چل کر بیٹھتے ہیں اور اطمینان سے بات کرتے ہیں۔'' اس نے لان کی طرف اشارہ کیا۔

''سب ٹھیک تو ہے ناں فرحی؟'' وہ پریشان ہوا تھا۔ فرح نے سر ہلایا اور لان کی طرف بڑھ گئی۔

''ہاں، اب بولو کیا بات ہے؟'' وہ دونوں اب لان کے ایک کونے میں کھڑے تھے۔

''بیٹھ جاؤ ناں ثمر۔'' فرح نے بینچ کی طرف اشارہ کیا۔ ثمر نے ایک نظر لان پر ڈالی۔ کچھ لڑکے، لڑکیوں کے گروپ جن کی غالباً اس وقت کلاس نہیں تھی لان میں گھاس پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''خیریت ہے ناں فرحی؟'' اس نے پھر پوچھا تھا۔ فرح نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''مجھے یقین نہیں تھا کہ آج تم کالج آؤ گے پھر بھی میں نے دعا کی تھی کہ تم آجاؤ۔''

''ہاں تو...... میرا پروگرام تو نہیں تھا آنے کا لیکن لگتا ہے تمہاری دعا مجھے کھینچ کر لے آئی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا دعائیں یوں اتنی جلدی بھی قبول ہو جاتی ہیں؟'' وہ آنکھوں میں معصوم سی حیرت بھرے اسے دیکھ رہی تھی بلاشبہ اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ اس نے نظریں چرائیں۔

''اگر ایسا ہے تو میں نے کچھ اور بھی دعائیں کی ہیں کیا میری سب دعائیں قبول ہو جائیں گی ثمر؟''

''پتا نہیں فرحی، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کون سی دعا درِ قبولیت تک پہنچتی ہے اور کون سی رد کر دی جاتی ویسے میں تو بالی بٹ کے لیے آیا تھا وہ ایگزام کے فوراً بعد انگلینڈ جا رہا ہے اور بعد میں جنید کا بھی پروگرام ہے امریکا جانے کا تو آج ہم سب دوست ان کے ساتھ ایک یادگار دن گزاریں گے اور یہ دن ہماری یادوں میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔''

''اور تم؟'' فرح بے چین سی ہوئی تھی۔ ''تمہارا کیا پروگرام ہے بی ایس سی کے بعد...... کیا تم بھی کہیں کسی اور جگہ جا رہے ہو؟''

''نہیں...... میں یہاں سے اسی کالج سے ہی ماسٹر کروں گا فزکس میں...... میرا ارادہ ایجوکیشن میں جانے کا ہے۔''

''یعنی استاد بنو گے؟'' وہ مسکرائی۔

''ہاں حالانکہ میرے ماموں اور اماں کا خیال ہے کہ مجھے ایم بی اے کرنا چاہیے، میں نے ماموں کے مشورے پر ہی فزکس کے ساتھ ڈبل میتھس رکھا تھا۔''

''وہ تمہارا بیسٹ فرینڈ جواد تو ایم بی اے میں ہی ایڈمشن لے گا تو میرا خیال تھا شاید تم بھی۔''

''نہیں، شروع سے ہی میرا ایم پڑھانا تھا۔''

''تو تم یہاں جی سی سے ہی ماسٹر کرو گے؟'' فرح نے جیسے یقین دہانی چاہی تھی۔

''شیور۔''

فرح خوش نظر آنے لگی تھی۔

''ہاں، اب بتاؤ تمہیں کیا بات کرنا تھی؟'' اس نے فرح کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”پھر کبھی سہی ابھی جاؤ۔ تمہارے دوست تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم سے پھر ملاقات تو ہوتی رہے گی اگر تم جی سی میں ہی رہے۔“ وہ جیسے پھر متذبذب ہوئی تھی۔

”اگر کیا مطلب ہے...... مجھے یہاں ہی رہنا ہے، یہ میری خواہش ہے کہ میں یہاں سے ہی ماسٹر کروں۔“

”تو ٹھیک ہے پھر بات ہوگی۔“ وہ جیسے مطمئن سی ہو کر لڑکیوں کے اس گروپ کی طرف چل دی تھی جو ابھی ابھی لان میں داخل ہوا تھا۔

”وہ کیا بات کرنا چاہتی تھی۔“ اس روز ثمر نے کئی بار سوچا تھا لیکن پھر اس کے ذہن سے نکل گیا کہ فرح اس روز اس سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی لیکن پھر گزرتے دنوں کے ساتھ خود بخود ہی اظہار کو لفظ مل گئے تھے اور یہی بات فرح اس روز اس سے کرنا چاہتی تھی اور نہیں کر سکی تھی۔ وہ حیران سا فرح کو تکتا رہ گیا تھا۔ فرح نے کتنی عجیب بات کی تھی کہ وہ اس کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہے۔

”یہ کیسے ممکن ہے فرحی؟“

”کیوں ممکن نہیں، کیا میں بدصورت ہوں، کیا میں تمہیں پسند نہیں؟“

”یہ بات نہیں ہے فرحی۔“ وہ سٹپٹایا تھا۔ ”ہمارے راستے الگ، الگ ہیں فرحی، یہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ کہاں تم ایک بڑے آدمی کی بیٹی اور کہاں میں ایک معمولی دکان دار کا بیٹا۔ کیا تمہارے ڈیڈ صوفی محمد نصیر کپڑے والے کے بیٹے کو اپنی لاڈوں پلی بیٹی کا رشتہ دے دیں گے؟“

”اس بات کا جواب میں بعد میں دوں گی ثمر، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ہوں؟“ اس روز وہ سر ریاض کے آفس میں بیٹھے میگزین کا میٹریل دیکھ رہے تھے۔ فرح اب اردو حصے کی ایڈیٹر تھی اور وہ انگریزی حصے کا۔ سر ریاض ان کے انچارج تھے۔

”تم کس قابل ہو فرحی کاش میں تمہیں بتا سکتا لیکن میں اپنے جذبوں کا اظہار کر کے تمہارے راستے کھوٹے نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہارے انمول جذبوں کی قدر کرتا ہوں فرحی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے لیے کسی سرمائے سے کم نہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے میرے دل میں محفوظ ہو گیا ہے ایک قیمتی اثاثے کی صورت لیکن فرحی اپنے آپ کو یہاں ہی روک لو اس سے آگے مت آنا۔“

”لیکن میں جاننا چاہتی ہوں ثمر، کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اتنی ہی محبت جتنی میں کرتی ہوں؟“

”کیا یہ ضروری ہے فرحی کہ میں اپنے ان جذبوں کو جنہیں میں نے کسی خزانے کی طرح چھپا کر رکھا ہے ظاہر کر دوں جبکہ ہماری منزل ایک نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن میں یہ یقین چاہتی ہوں کہ میرے جذبے رائگاں نہیں ہیں۔ ان کی پامالی کا دکھ مجھے مار ڈالے گا ثمر۔“ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی، ضدی تھی اور ہمیشہ اپنی منواتی تھی۔

”فرحی!“ اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور جیسے ہار سا گیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے کہ آگ ایک طرف لگے اور دوسری طرف اس کی تپش نہ پہنچے۔ تم اس محبت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں فرحی جو میرے دل میں تمہارے لیے ہے لیکن میں ڈرتا ہوں فرحی اپنے لیے نہیں تمہارے لیے۔“ اور فرح کو تو لگا تھا جیسے اس نے ثمر حیات سے محبت کا اقرار نہیں پایا پوری کائنات کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہو۔ اس کے جذبے بے وقعت نہیں

تھے، رائگاں نہیں گئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جگنو دمک رہے تھے۔ تارے بھرے ہوئے تھے اور وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کاش وہ خود کو سب کچھ کہنے سے روک سکتا اور اپنے جذبے دل میں چھپائے ایک روز اس سے جدا ہو جاتا۔

”تم تو شعر کہتے ہو ثمر، جانتے ہو ناں یہ بڑا بے اختیار سا جذبہ ہے۔“ اسے سر جھکائے بیٹھے دیکھ کر فرح نے آہستگی سے کہا۔ ”اور یہ جبر سے، کوشش سے، زور زبردستی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک روز خود بخود دل کی زمین پر اُگ آتا ہے کہ آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ مجھے بھی پتا نہیں چلا تھا کہ میرے دل میں تمہاری محبت کا بیج پھوٹ پڑا ہے۔ وہ تو اس روز جب تمہاری فیرویل پارٹی تھی جو تمہارے ڈیپارٹمنٹ کے تھرڈ ائیر کے طلبا نے تمہیں دی تھی اور میں عامرہ تقی کی مہمان بن کر اس پارٹی میں شریک تھی۔ بٹ نے گانا سنایا تھا۔

یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس ہم نہ ہوں گے

اور تم نے نظم پڑھی تھی۔

یہ پات، پات صورتیں
یہ باغ، باغ انجمن
کہاں ملے گی پھر کہاں
بکھیر دے گی وقت کی گھٹاؤنی ہوا انہیں
کدھر، کدھر کہاں، کہاں
اُمڈ پڑیں گی زندگی کی دلگداز راہ میں
جدائیوں کی خندقیں

اور عامرہ تقی سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی کہ امتحان کے بعد اس کی شادی تھی اور شادی کے بعد اسے دبئی چلے جانا تھا۔ تمہارے ڈیپارٹمنٹ کی دو تین لڑکیاں اور بھی بی ایس سی کے بعد پڑھائی چھوڑ رہی تھیں۔ میں جو اس وقت تمہاری طرف دیکھ رہی تھی اور تم عامرہ تقی کی طرف دیکھتے ہوئے پڑھ رہے تھے۔

ہر ایک میز پر گداز بازوؤں کے دائرے
ہر اک نگاہ لیکچرر کی سمت دوڑتی ہوئی
یہ باغ، باغ انجمن، یہ پات، پات صورتیں

تم عامرہ تقی کو دیکھ رہے تھے جو سر جھکائے رو رہی تھی اور میں تمہیں دیکھ رہی تھی، اسی وقت تم نے مجھے دیکھا تھا اور مجھے لگا تھا جیسے تم...... اور کیا تمہارے بھی یہ کالج میں آخری دن ہیں اور تم بھی ایگزام کے بعد کالج نہیں آؤ گے اور میرا دل نیچے ہی کہیں پاتال میں گرتا جا رہا تھا۔ تو کیا پھر میں تمہیں کبھی دیکھ نہ سکوں گی اور اس روز مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ میں تم سے...... ہاں ثمر حیات تم سے......“ وہ جھجک کر چپ کر گئی تھی اور اسے لگا تھا جیسے اس کے اندر رنگ ہی رنگ بکھر گئے ہوں، انوکھے رنگ۔

”فرح اس سے محبت کرتی تھی...... ہاں اس ثمر حیات سے۔ صوفی محمد نصیر بزاز کے بیٹے سے۔“

”اور اس رات میں نے بہت دعائیں کیں کہ صبح تم کالج آ جاؤ اور میں تمہیں بتاؤں کہ......“

''کھٹ......کھٹ۔'' دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ وہ جیسے کسی خواب سے جاگا تھا۔ اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ کمرا......؟ اس کی نظروں میں اجنبیت تھی۔ وہ تو فرح کے ساتھ تھا ابھی...... دستک ایک توقف کے بعد پھر ہوئی۔

''کیا ہے؟'' کمرے کو اجنبی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ڈی ون سے گاڑی آ گئی ہے باس۔''

''ڈی ون؟'' اس نے دُہرایا۔ جیسے یہ لفظ اس کے لیے اجنبی ہو۔

''ڈی ون۔'' زیرلب کہتے ہوئے۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور جیسے ذہن کے بند دروازے کھلتے چلے گئے اور وہ حال میں لوٹ آیا۔

''اوہ......'' اس نے تیزی کے ساتھ بیڈ پر پڑا کوٹ اٹھایا۔ اب اس نے باہر سے آنے والی آواز پہچان لی تھی۔

''ٹھیک ہے ممتاز خان میں آ رہا ہوں۔''

دروازہ کھول کر اس نے باہر کھڑے ممتاز خان کی طرف دیکھا اور مڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھا اور ٹائی کی ناٹ درست کی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے قدرے سوجے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے انہیں دبایا اور کوٹ پہنا۔ سر اب بھی بھاری اور بوجھل ہو رہا تھا۔ جھک کر تکیے کے پاس پڑا اپنا سیل فون اٹھایا۔ ساتھ ہی فون بج اٹھا۔ اسکرین پر بگ با کا نام روشن تھا۔

''لیس بگ با۔'' وہ فوراً الرٹ ہو گیا۔

''تم تیار رہو، ڈی ون سے گاڑی تمہیں لینے چلی گئی ہے۔''

''مجھے کہاں جانا ہے بگ با؟''

''ثمر تم ٹھیک ہو؟'' بگ با نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا تو وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا۔

''حیاتی۔'' بگ با کا لہجہ آہستہ لیکن یقین لیے ہوئے تھا۔ ''تم مجھے ٹھیک نہیں لگتے۔''

''نہیں بگ با...... ویسے تو ٹھیک ہوں لیکن سر کچھ بوجھل اور بھاری ہو رہا ہے۔''

''ہوں...... جب تم ڈرنک نہیں کرتے تو تمہیں رات احتیاط کرنا چاہیے تھی۔ ایک پیگ کی حد تک تو ٹھیک تھا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ تم اس کے پیش کیے ہوئے جام کو رد کر کے اس کی ناراضی مول لو کیونکہ مجھے لگ رہا ہے کہ مستقبل قریب میں ہمارا ان سے بہت واسطہ پڑنے والا ہے۔''

''میں کل بہت اپ سیٹ تھا سر...... میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے اس وقت وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا جہاں میں تھا۔ میرا بیٹا گھر میں میرا منتظر تھا۔ وہ میری قربت کو ترسا ہوا ہوتا ہے بگ با اور میں بھی...... اور کل فرحی کی برسی بھی تھی۔ اس لیے دل و دماغ کی کشمکش سے بچنے کے لیے میں پیتا چلا گیا۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''مجھے اس کا بہت افسوس ہے حیاتی کہ میں نے کل کے دن تمہیں پریشان کیا لیکن مجبوری تھی تمہارا اس میٹنگ میں شامل ہونا بہت ضروری تھا کیونکہ آئندہ بھی ولسن وغیرہ کے ساتھ تمہیں ہی ڈیل کرنا ہے خیر اس وقت ایک گلاس لیموں پانی پی لو ابھی وقت ہے۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد تم گھر سے نکلو گے وہ لوگ وقت کے پابند

ہیں اور آدھے گھنٹے میں تم ان کے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ گے۔''

''لیس بگ با۔''

''رات ساری بات میں نے تمہیں سمجھا دی تھی پھر بھی احتیاطاً دُہرا رہا ہوں۔ تمہیں ان کے ساتھ فی الوقت کوئی ڈیل نہیں کرنی۔ صرف جاننا ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ ولسن نے رات کچھ خاص نہیں بتایا، آج اس کا باس بتائے گا کہ وہ ہم سے کس طرح کا تعاون چاہتا ہے اور ہمیں اس تعاون سے کیا فائدہ ہو گا۔''

''کیا میرے ساتھ کوئی اور بھی جائے گا۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں...... ڈرائیور تمہیں وہاں ڈراپ کر کے آ جائے گا وہاں سے تم سیدھے ڈی ون آؤ گے واپس...... مجھے اگر دبئی نہ جانا ہوتا تو میں خود وہاں جاتا لیکن میرا دبئی جانا بھی ضروری ہے۔ میں تمہیں کل کے روز بھی ڈسٹرب نہ کرتا۔ مجھے احساس تھا کہ کل تمہاری بیوی کی برسی تھی اور تمہارا بیٹا گھر آیا ہوا تھا لیکن میں کسی اور کو ولسن کے پاس نہیں بھیج سکتا یہ نہیں کہ سیمو یا منیرا قابلِ اعتبار نہیں بلکہ وہ تمہاری طرح پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ تم ان کی زبان سمجھتے ہو اس زبان میں بات کر سکتے ہو لیکن سیمو، منیرا نہیں۔ ولسن اردو میں بات کر رہا تھا۔ شاید اس کا باس بھی یہ زبان جانتا ہو لیکن تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کے مقام سے واقف ہو۔''

''کیا یہی مقام ہے...... جس پر وہ آج ہے؟'' اس کے اندر تلخی گھل گئی۔

''جانتے ہو حیاتی ولسن تم سے بہت متاثر ہوا ہے، تمہاری شخصیت اور وجاہت سے۔''

''لیس بگ با۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا جیسے ولسن کا متاثر ہونا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

''اوکے! پھر بات ہوتی ہے میں دبئی جاتے ہی تم سے رابطہ کروں گا اور ہاں اس کے بعد ایک ہفتہ تمہیں بالکل ڈسٹرب نہیں کیا جائے گا۔ تم جی بھر کر اپنے بیٹے کے ساتھ انجوائے کرنا۔''

''تھینک یو بگ با۔'' اس نے فون بند کر کے پاکٹ میں ڈالا اور ایک نظر پھر آئینے پر ڈالی اور اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ کنپٹیوں پر تھوڑے سے سفید بال، کشادہ پیشانی، بڑی، بڑی روشن آنکھیں بلاشبہ وہ آج بھی بہت وجیہہ تھا اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ فرحی کا سراپا تصور میں لہرایا اور کانوں میں فرحی کی آواز گونجی۔

''جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے ثمر تو تب بھی تم ایسے ہی لگو گے اتنے شاندار...... ہے ناں؟'' فرحی کے دل میں جو کچھ آتا تھا وہ کہہ دیتی تھی جبکہ وہ اب بھی کچھ کہتے جھجکتا تھا۔ ''اور یہ نظر باز لڑکیاں تمہیں ایسے ہی گھوریں گی۔''

اس روز وہ کارکیل میں کچھ کھانے پینے گئے تھے اور قریبی میز پر بیٹھی دو لڑکیاں مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور فرح کو غصہ آ رہا تھا۔

''لگتا ہے مجھے تمہیں چھپا کر رکھنا پڑے گا۔''

''تو کیا مکھی بنا کر ڈبیا میں بند کر دو گی؟''

''ہاں...... شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔'' وہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبائے شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

"اور تم خود ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں نا۔" ایک گہری سانس لے کر وہ دروازے کی طرف بڑھا اور پھر کچھ سوچ کر اپنا سیل فون نکال کر نمبر ملانے لگا اور پھر عظام کی آواز سن کر بے اختیار مسکرا اٹھا۔

"کیسے ہو میری جان؟"

"پاپا آپ کیسے ہیں؟" عظام کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"ابھی سو رہے ہو کیا...... چلو ٹھیک ہے آرام کرو۔"

"نہیں پاپا، اب تو جاگ گیا ہوں آپ گھر آگئے ہیں کیا؟"

"نہیں، شام تک آؤں گا تم شام کو آجانا اور......"

"پھر ایک دن بعد آپ پھر چلے جائیں گے؟" عظام اداس ہوا تھا۔

"ارے نہیں میری جان...... پورا ایک ہفتہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

"رئیلی پاپا......!" عظام کسی بچے کی طرح خوش ہوا۔

"رئیلی، اوکے پھر شام کو ملتے ہیں۔"

"انشاءاللہ۔" عظام کی خوشی اس کے لہجے سے ٹپکتی تھی۔

"انشاءاللہ۔" فون آف کر کے اس نے پاکٹ میں رکھا اور... کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دل ہی دل میں بگ باکا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اسے عظام کے ساتھ رہنے کے لیے پورا ایک ہفتہ دے دیا تھا ورنہ رات جب وہ ڈی ٹو سے نکلا تھا تو اس کا دل بہت برا ہو رہا تھا۔ وہ تین چار دن پورے سکون کے ساتھ عظام کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا لیکن یہ جو اچانک بگ با نے بلا لیا تھا اور یقیناً اب وہ پھنس جائے گا۔ اس کا ذہن بکھرا، بکھرا سا تھا اور بار، بار عظام کا مایوس چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ پتا نہیں کب سے وہ اس کا انتظار کر رہا تھا اور اب غیر ارادی طور پر اس نے گاڑی رواحہ کے گھر والے راستے پر ڈال دی تھی۔ اسے اپنی سوچوں پر اختیار نہیں تھا اس کا جی چاہ رہا تھا وہ عظام کے گلے لگ کر روئے خوب زور، زور سے اسے بتائے کہ فرحی...... ہاں فرحی کی برسی تھی ناں اور عظام...... شراب نے اس کے اندر رقت سی پیدا کر دی تھی۔ تصور میں گاڑی اس نے رواحہ کے گھر کے سامنے روکی تھی اور گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا تھا، وہ عظام کو لے کر کہیں چلا جائے دور بہت دور وہ گیٹ کے پاس کھڑا تھا اور اسے بیل بجائی تھی لیکن ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے جیسے اس کے حواس بحال کیے تھے "یہ میں کیا کرنے لگا تھا۔" وہ مڑ کر گاڑی میں آبیٹھا تھا۔

"باس!" ملازم لڑکے نے اسے کمرے سے باہر آتے دیکھا اور قریب آکر پوچھا۔ "ناشتا لگا دوں صاحب؟" وہ شاید کہیں قریب ہی اس کے باہر آنے کے انتظار میں منڈلا رہا تھا۔

"ہاں، صرف چائے اور ایک بوائلڈ انڈا لیکن اس سے پہلے ایک گلاس پانی میں دو لیموں نچوڑ کر دو۔" لڑکا چلا گیا تو وہ وہاں ہی لاؤنج میں بیٹھ کر ولسن اور اس کے ساتھیوں کے متعلق سوچنے لگا۔

☆☆☆

ایمل اور بابر مایوں کا فنکشن اٹینڈ کر کے رات تقریباً ایک بجے گھر پہنچے تو ارتفاع لاؤنج میں بیٹھی تھی اور اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔

"ارے میری بیٹی ابھی تک جاگ رہی ہے۔" بابر بے اختیار اس کی طرف بڑھا اور اس کے سر پر

پیار کیا۔

"بات نہیں کریں مجھ سے آپ۔" ارتفاع نے رخ موڑ لیا۔

"یہ کیا، لگتا ہے میرا بیٹا بہت ناراض ہے۔" بابر نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "میری جان میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"جب مجھے اس طرح واپس بلا لینا تھا تو پہلے اجازت کیوں دی تھی۔ جانتے ہیں میری کتنی ہتک ہوئی ہے۔" وہ روٹھے، روٹھے لہجے میں گلہ کر رہی تھی۔

"پہلے تو میں نے یہی سمجھا تھا کہ خدانخواستہ کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے، اتنا ڈر گئی تھی میں کہ کہیں ماما یا آپ......" اس نے رخ موڑ کر بابر کی طرف دیکھا۔

"سب کے فون گھر آنے تک آتے رہے کہ خیریت ہے ناں سب اور جب یہاں آکر میں نے بتایا کہ میرے بھائی نے مجھے اپنی کزن کے مایوں کے فنکشن میں شامل ہونے کے لیے اس طرح بلایا ہے تو ظفری کا موڈ بہت خراب ہوگیا اور باقی سب بھی ناراض ہو رہے تھے۔ اگر میرا جانا اتنا ضروری تھا تو آپ نے مجھے جانے کی اجازت ہی نہیں دینا تھی۔ میں نے تو پہلے ہی معذرت کر لی تھی اور ظفری نے کہا بھی تھا کہ وہ پھر کسی روز سب کو فارم پر لے چلے گا لیکن پاپا آپ نے۔"

"میں نے کہا ناں گڑیا میرا کوئی قصور نہیں۔ اپنی ماما اور بھیا سے پوچھو جو آج بھی 1950ء میں جی رہے ہیں۔" اس نے ان کے ساتھ کھڑی ماما کی طرف نہیں دیکھا لیکن اسی طرح پھولے، پھولے چہرے کے ساتھ باپ کی طرف دیکھتی رہی۔

"اجازت تو آپ نے دی تھی پاپا اور آپ کو بتانا چاہیے تھا ماما کو کہ میں آپ کی اجازت سے جا رہی ہوں اور میرے دوست کوئی چور اچکے یا بدمعاش نہیں۔"

"جانتا ہوں میری گڑیا کے دوست بہت اچھے ہیں اور یہ بھی کہ میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے لیکن یہ تمہاری ماما......" اس نے ایمل کی طرف دیکھا۔

"یہ سمجھتی ہے کہ تم ایک انتہائی بے وقوف لڑکی ہو۔"

"ایسا نہیں ہے بابر کہ میں اسے بے وقوف سمجھتی ہوں لیکن بچے کتنے بھی بڑے اور سمجھ دار کیوں نہ ہو جائیں انہیں رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور خاص طور پر لڑکیوں کو...... اور یہ اب بچی نہیں ہے کہ جہاں جس طرف جی چاہا منہ اٹھا کر چل دے۔" ایمل سنجیدہ تھی۔

"میں نے پاپا کو سارا پروگرام بتایا تھا اور انہوں نے خود مجھے اجازت دی تھی جانے کی۔"

"اور کیا تمہارا فرض نہیں تھا کہ تم مجھے بھی بتاتیں۔"

"تو کیا صرف اس لیے آپ نے مجھے واپس بلوا لیا کہ میں نے آپ کو نہیں بتایا؟"

"نہیں بلکہ اگر تم مجھے بتا دیتیں تو میں تمہیں ہرگز جانے کی اجازت ہی نہ دیتی۔"

"پاپا کو اندازہ تھا اسی لیے انہوں نے مجھے آپ کو بتانے سے منع کیا تھا۔" ارتفاع نے پہلی بار ماں کی طرف دیکھ کر بات کی تھی۔ ایمل نے شاکی نظروں سے بابر کی طرف دیکھا لیکن وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"پتا نہیں کیوں کبھی، کبھی مجھے لگتا ہے کہ آپ میری اسٹیپ مدر ہیں۔" ارتفاع اب بھی ماں کی طرف ہی

دیکھ رہی تھی۔ بابر نوید نے ایک جتاتی ہوئی سی نظر ایمل پر ڈالی تھی اور اپنے لبوں پر بے اختیار نمودار ہونے والی مسکراہٹ کو ذرا سا سر جھکا کر چھپایا تھا اور پھر رخ موڑ کر بیٹی کی طرف دیکھا جو بے حد شاکی نظروں سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایمل کی آنکھوں میں دکھ اور بے یقینی تھی۔

''حالانکہ اسے سگی ماں ہونے کا دعویٰ ہے۔''

''دعویٰ نہیں، میں ہوں ہی اس کی سگی ماں۔'' ایمل نے ناراضی سے بابر کی طرف دیکھا جس نے ارتفاع کے کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا۔

''یہ تمہاری رئیل مدر ہی ہیں۔'' ارتفاع نے مڑ کر دائیں طرف کھڑے بابر نوید کی طرف دیکھا تو بابر نے اس کے کندھے سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور کھل کر مسکرایا۔

"yes,believe me she is your real mother" (ہاں یقین کرو یہ تمہاری سگی ماں ہی ہیں) لیکن ارتفاع کی آنکھوں میں شک ہلکورے لے رہا تھا۔ بابر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''آئی کانٹ بلیو اِٹ پاپا۔'' ارتفاع کی آنکھوں میں بے یقینی تھی اور کچھ دیر پہلے تک اس کے لہجے میں جو تناؤ تھا اور چہرے پر جو غصے کی سرخی تھی وہ مفقود ہوگئی تھی۔

''ارے نہیں میری جان، یقین کرو ایمل ہی تمہاری سگی ماں ہے اور میری واحد بیوی...... بس یہ ذرا پرانے زمانے میں جیتی ہے۔'' بابر نے ایک مسکراہٹ بیوی کی طرف اچھالی اور ایک بار پھر بیٹی کا کندھا تھپتھپایا۔ ''اوکے ڈیئر، میں بہت تھک گیا ہوں اور اب سونے جارہا ہوں۔''

''گڈ نائٹ پاپا۔''

''گڈ نائٹ سوئٹ ڈریمز۔'' اس نے ارتفاع کے سر پر پیار کیا اور ساکت بیٹھی ایمل پر ایک نظر ڈالتا لاؤنج سے نکل گیا۔ ارتفاع اب ایمل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر گرنے والا شک کا بیج جیسے لمحوں میں جڑ پکڑ کر تناور درخت بن گیا تھا۔

''تو آپ میری اسٹیپ مدر ہیں، اس لیے آپ بچپن سے لے کر اب تک مجھے ہر بات پر ٹوکتی رہی ہیں۔ میری ہر خواہش، ہر ضد پاپا نے پوری کی ہے ورنہ آپ کا بس چلتا تو آپ تو مجھے مار ہی دیتیں۔'' اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی۔ ''تھینک گاڈ کہ پاپا دوسرے مردوں کی طرح آپ کے آنے کے بعد بدلے نہیں اگر وہ بھی بدل جاتے تو میں تو گھٹ گھٹ کر مر جاتی۔'' آنکھوں کی نمی نے پلکوں کی باڑ کو چھوا تو ایمل بے اختیار اس کے قریب آئی اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو ارفی اگر مجھے تمہارا دوستوں کے ساتھ کسی فارم ہاؤس جانا اچھا نہیں لگا اور میں پریشان ہوئی تو یہ فطری بات تھی۔ میں ماں ہوں تمہاری، میری جان یہ وہ دور نہیں ہے جب عورت کو دیکھ کر لوگ راستہ چھوڑ دیتے تھے، ہر عورت کی عزت کرتے تھے...... اور اب عورت......''

''پلیز......!'' ارتفاع نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔ ''مجھے اس وقت آپ کا لیکچر نہیں سننا۔''

''میں تمہاری ماں ہوں اور جو کچھ تم سے کہتی ہوں تمہاری بہتری اور بھلائی کے لیے کہتی ہوں۔'' ایمل کا

ہاتھ ابھی تک اس کے بازو پر تھا۔

''مجھے یقین نہیں کہ آپ میری سگی ماں ہیں۔'' اس نے ایمل کا ہاتھ جھٹک دیا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

''یہ...... یہ کیا کہا ارتفاع نے۔'' ایمل نے پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ''ارفی...... ارفی رکو بیٹی میری بات سنو۔'' وہ اس کے پیچھے لپکی لیکن وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی وہ حیران اور ساکت کھڑی خالی سیڑھیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''کہاں...... بھلا کہاں غلطی ہوئی، کہاں میرے پیار میں...... کمی ہوئی کہ اس نے سمجھا کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں کیا...... صرف اس لیے کہ میں اسے غلط بات پر ٹوکتی ہوں اور بابر اپنے لاڈ پیار کی وجہ سے ہر بات میں اس کی حمایت کرتے ہیں چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔''

☆☆☆

ارتفاع ابھی دو سال کی بھی نہیں ہوئی تھی جب افنان پیدا ہوا تھا اور اس کی توجہ ارتفاع کی طرف سے ہٹ گئی تھی اور ارتفاع چڑچڑی ہوگئی تھی۔

''ارفی بہت چڑچڑی ہوگئی ہے بابر۔'' افنان کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس نے بابر سے کہا تھا۔ ''اسی لیے میں چاہتی تھی کہ ارفی کچھ سمجھ دار ہو جائے تو......''

''تم کیوں فکر کرتی ہو ایمل، میں ہوں ناں اپنی بیٹی کا خود خیال رکھوں گا۔ تم اپنے بیٹے اور بیٹے کے باپ کا خیال رکھو بس اور میری بیٹی کی فکر کرنا چھوڑ دو۔'' اور وہ مطمئن ہوگئی تھی بابر اسے بہت توجہ دیتا تھا، وہ مصروف ہوتی تو اسے فیڈر بنا کر دیتا اور اس کے کپڑے تک تبدیل کرنے کا کام کر دیتا تھا۔ افنان بچپن میں بہت کمزور تھا اور آئے دن بیمار ہو جاتا تھا اس وجہ سے بھی ارتفاع اگنور ہوتی تھی لیکن وہ مطمئن تھی کہ بابر اس کا بہت خیال رکھتا ہے اور وہ بھی بابر کے ساتھ بہت اٹیچڈ تھی لیکن جب افنان سات آٹھ سال کا ہوا تو اچھا خاصا صحت مند ہو گیا تھا اور تب سے وہ ارتفاع پر بھی توجہ دینے لگی تھی لیکن تب بھی وہ اس کے مقابلے میں بابر کی زیادہ سنتی تھی کہ وہ اس کی ہر بے جا ضد بھی مان لیتا تھا۔ وہ منع کرتی تو وہ پروا نہ کرتا۔

''بھئی تم میرے اور میری بیٹی کے درمیان مت آیا کرو۔'' وہ نڈھال سی ہو کر وہاں ہی سیڑھی پر بیٹھ گئی تھی۔

''اور کیا یہ میری غلطی ہے کہ وہ مجھے اپنی سوتیلی ماں سمجھتی ہے...... نہیں دراصل بابر نے ہی اسے میرے قریب نہیں آنے دیا۔'' افنان پانی پینے کے لیے اپنے بیڈ روم سے نکلا تھا۔ اس کا بیڈ روم گراؤنڈ فلور پر تھا جبکہ ارتفاع اور ماما، پاپا کا فرسٹ فلور پر۔ لاؤنج کی لائٹ جل رہی تھی۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر سیڑھیوں پر بیٹھی ماں پر پڑی۔

''ماما۔'' وہ تیزی سے اس کے قریب آیا۔ ایمل نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ سرخ آنکھیں، گیلی پلکیں، بھیگے رخسار۔

''ماما کیا ہوا؟'' اس نے بے چینی سے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ کہتی ہے، میں اس کی ماں نہیں ہوں۔'' اس نے افنان کا ہاتھ پکڑا۔ ''کیا میں اس سے پیار نہیں

کرتی، کیا میں اسے اتنا ہی نہیں چاہتی جتنا تمہیں چاہتی ہوں، کیا کبھی میں نے اس کے ساتھ سوتیلی ماؤں جیسا سلوک کیا ہے، افی تم بتاؤ کب...... کب میں نے اسے سوتیلا سمجھا؟ کیا ایک ماں کا فرض نہیں ہوتا کہ وہ اپنی اولاد کو غلط صحیح کا ادراک دے اور اگر جو میں اسے ٹوکتی ہوں تو غلط ٹوکتی ہوں افی؟“

”نہیں۔“ افنان اس کے پاس ہی سیڑھی پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنا ایک بازو ماں کے گرد حمائل کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ”ریلیکس ماما، وہ تو بے وقوف ہے اور آپ نے خواہ مخواہ اس کی بات کو دل پر لے لیا۔ دراصل بچپن سے ہی پاپا نے اس کی ہر جا بے جا بات مانی ہے تو جب اس کی کوئی بات رد ہوتی ہے تو وہ اگریسیو ہو جاتی ہے۔“

”ہاں ہو جاتی ہے اگریسیو لیکن اس نے ایسا تو کبھی نہیں کہا کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں لیکن آج اس نے ایسا کہا افی، اس نے مجھے ماں ماننے سے انکار کر دیا۔ میری نفی کر دی...... اس نے کہا مجھے یقین نہیں ہے کہ میں اس کی ماں ہوں۔“ آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

”اس کی آنکھوں میں شک نہیں یقین تھا۔ اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔“ آنسو زیادہ تیزی سے اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ افنان نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

”پلیز ماما مت روئیں، دراصل اس کا پروگرام خراب ہوا ہے ناں تو اسی لیے آج وہ زیادہ غصے میں آ گئی ہے اور آتی رہے غصے میں اگر کوئی نقصان ہو جاتا اس کا تو......“

”اللہ نہ کرے!“ ایمل نے بے اختیار کہا۔

”تو پلیز اب آپ ریلیکس ہو جائیں۔“ افنان نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔ ”اور اب بھی وہ کچھ غلط کرے گی تو آپ اسے ٹوکیں گی، منع کریں گی، سمجھائیں گی بھلے وہ غصہ کرے یا آپ کو سوتیلی ماں سمجھے۔“ افنان نے سمجھایا۔

”میں تو اس کی بھلائی چاہتی ہوں افی، ایک ماں کی طرح اور تم جانتے ہو ناں زمانہ بہت خراب ہے اور وہ بہت معصوم ہے۔ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔“ اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔ ”شاید تم سے بھی زیادہ...... بلکہ یقیناً تم سے بھی زیادہ۔“

”اور میں اس سے بالکل بھی جیلس نہیں ہوتا کہ آپ اسے مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ اسے آپ کی محبت کی زیادہ ضرورت ہے یہ اس کا حق ہے کہ آپ اسے زیادہ چاہیں کیونکہ ایک روز اسے اس آنگن سے رخصت ہو جانا ہے جبکہ مجھے ہمیشہ یہاں رہ کر آپ کی محبتیں وصولنا ہیں۔“

”تم میرے بہت سمجھ دار بیٹے ہو افنان لیکن وہ اس طرح کیوں نہیں ہے؟ وہ کیوں میری محبتوں پر اعتبار نہیں کرتی؟ کیوں اسے لگتا ہے کہ میں اس کی سگی ماں نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں پھر پانی بھر گیا تھا اور وہ چھلکنے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔

”آپ اس کی سگی ماں ہی ہیں بس اب نہیں رونا آپ نے۔“ اس نے ماں کا سر اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے، ہولے تھپکنے لگا۔

☆☆☆

اس وقت رات کے دو بجے تھے لیکن ظفری کے فارم ہاؤس میں جیسے رات اب اتری تھی۔ ملتان کے نواح میں آبادی سے الگ تھلگ اس فارم ہاؤس میں زندگی جاگ رہی تھی۔ فضا میں بھنے گوشت کی خوشبو تھی۔ ظفری نے باربی کیو کا انتظام کر رکھا تھا۔ ماہر کک کی زیرِنگرانی کہیں سالم مرغ سیخوں پر چڑھا تھا تو کہیں کباب تیار ہو رہے تھے۔ وہ سب کچھ دیر پہلے ہی پہنچے تھے۔ یہ سب ظفری کے دوست لڑکے اور لڑکیاں تھیں ان کی تعداد دس تھی، چھ لڑکے اور چار لڑکیاں یہ سب دولت مند گھرانوں کے آزاد خیال لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور ان کے والدین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ وہ یہاں اپنے دوستوں کے ساتھ ظفری کی برتھ ڈے انجوائے کریں۔ ایک ارتفاع ہی تھی جو آتے ہوئے جھجک رہی تھی کہ شاید اسے اجازت نہ ملے لیکن پھر اسے اجازت بھی مل گئی تھی لیکن اسے واپس جانا پڑا تھا۔ وہ سب اس وقت ہال میں ٹھنڈے مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہال سے باتوں اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں حالانکہ لمبے سفر کے بعد وہ تھک چکے تھے لیکن انہیں اس تھکن کی پروا نہیں تھی۔ ڈیک پر کوئی آئٹم سونگ فل والیوم میں لگا ہوا تھا لیکن ظفری رہائشی حصے میں ماسٹر بیڈروم سے ملحق بار روم میں ایک کیبنٹ کے پاس کھڑا تھا اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں اور لب بھنچے ہوئے تھے۔ یہ سارا کھٹراگ اس نے ارتفاع کو یہاں لانے کے لیے کیا تھا ورنہ اس کی برتھ ڈے کو گزرے تو چار ماہ ہو چکے تھے لیکن ارتفاع......

''اوہ ڈیم اٹ۔'' اس نے مکا بنا کر کیبنٹ کے ریک پر مارا۔ کیبنٹ میں پڑی بوتلیں اور بلوریں جام بج اٹھے۔ وہ ارتفاع کو یہاں کیوں لانا چاہتا تھا یہ صرف وہ جانتا تھا۔

اس نے ایک بوتل نکالی اور ریک سے جام اٹھا کر اس میں وہ مشروب ڈالا اور جام اٹھا کر ہال کی طرف بڑھا اور جب وہ ہال کی طرف جا رہا تھا تو اس کا ذہن نئے سرے سے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

☆☆☆

''السلام علیکم بابا۔'' رواحہ اور عظام لاؤنج میں ایک ساتھ آئے تھے۔

''وعلیکم السلام!'' انہوں نے اخبار سے نظریں اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا اور اخبار ایک طرف رکھ کر خدا بخش کو آواز دی۔

''بچے آ گئے ہیں خدا بخش ناشتا لگا دو۔''

''جی صاحب۔'' خدا بخش نے کچن سے ہی جواب دیا تو وہ عظام کی طرف متوجہ ہوئے۔

''رات نیند تو ٹھیک سے آئی تھی، بیٹا نئی جگہ تھی پرابلم تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں انکل! بہت مزے سے سویا تھا۔'' عظام بہت فریش اور خوش لگ رہا تھا۔

''یہ تو گھوڑے گدھے بیچ کر سویا تھا بابا۔ مت پوچھیں کتنی مشکل سے جگایا ہے۔'' رواحہ ان کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا تھا جبکہ عظام نے دائیں طرف والے سنگل صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''غلط...... میں تمہارے جگانے سے پہلے ہی پاپا کے فون پر جاگ چکا تھا۔''

''اچھا کیسے ہیں تمہارے پاپا... کیا واپس آ گئے ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں، شام تک آئیں گے انہیں وہاں کچھ کام بھی ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں مجھے صبح اور شام فون ضرور کرتے ہیں۔''

''یعنی کہ شام تک تم اِدھر ہی ہو۔'' رواحہ نے تھوڑا سا آگے جھک کر اخبار اٹھایا۔ ''تو پھر کچھ پروگرام بناتے ہیں۔''

''مثلاً کیا پروگرام؟'' عظام نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''سوچ لیتے ہیں، پہلے ناشتا تو کر لیں۔'' رواحہ نے خدا بخش کو ٹرے اٹھائے ڈائننگ ٹیبل کی طرف جاتے دیکھا۔

''پاپا پورا ایک ہفتہ رہیں گے میرے ساتھ۔'' عظام زیادہ دیر اس خوشی کو چھپا نہ سکا۔ رواحہ نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''ہاں، پتا ہے کتنے سالوں بعد میں پاپا کے ساتھ پورا ایک ہفتہ رہوں گا۔'' خوشی اور مسرت اس کی خوب صورت آنکھوں سے چھلکتی تھی اور وہ محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دعا گو تھے۔

''یا اللہ اس بچے کو اپنے باپ کی رفاقت اور محبت عطا فرما اور اس کی محرومیاں دور کر دے۔''

''صاحب آ جائیں، ناشتا لگ گیا۔'' خدا بخش نے ٹیبل کے پاس کھڑے، کھڑے ہی آواز دی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''چلو بچوں پہلے ناشتا کر لو۔'' وہ تینوں جب ایک ساتھ ناشتے کے لیے ڈائننگ روم کی طرف جا رہے تھے جس کا ایک دروازہ لاؤنج میں کھلتا تھا اور ایک ڈرائنگ روم میں تو کچن کی طرف جاتے خدا بخش نے رک کر دل ہی دل میں کچھ پڑھ کر پھونکا۔ انہوں نے مسکرا کر خدا بخش کی طرف دیکھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے اور رواحہ کے گلاس میں ایپل جوس ڈال کر عظام کی طرف دیکھا۔

''آپ کون سا جوس لو گے بیٹا؟ ایپل یا اورنج...... مینگو جوس بھی ہے فریج میں؟''

''اورنج۔'' وہ مسکرایا۔

''اورنج!'' وہ چونکے اور اس کے گلاس میں اورنج جوس ڈالتے ہوئے کہیں کھو سے گئے تھے۔

''سنو میرے لیے صرف اورنج جوس۔'' وہ ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''لیکن مجھے پسند نہیں ہے اورنج جوس۔'' انہوں نے برا سا منہ بنایا۔

''ہاں تو اپنے لیے جو چاہے منگوا لو، مینگو شیک یا جو بھی لیکن میرے لیے اورنج اور صرف اورنج۔'' وہ اس وقت لبرٹی میں ایک کارنر اسپاٹ پر جوس پینے کے لیے رکے تھے اور اب سامنے بچھی بینچ پر بیٹھے تھے۔ وہ کتنی مختلف تھی اور اس کی پسند بھی سب سے مختلف ہوتی تھی۔ دنیا جہان کے لوگوں کو پھلوں میں آم پسند تھا لیکن اسے صرف کینو اور مالٹے پسند تھے۔

''تمہیں آم کیوں پسند نہیں؟'' ایک بار اس نے پوچھا تھا۔

''بس نہیں پسند، بہت میٹھے ہوتے ہیں اور کینو میں مٹھاس کے ساتھ ترشی بھی ہوتی ہے اس لیے مجھے کینو پسند ہیں۔'' اپنی پسند ناپسند کے متعلق اس کی اپنی منطق تھی زندگی کی طرح۔ وہ اورنج جوس کا گلاس ہاتھ میں لیے ہنس رہی تھی۔

''جب تک اس میں ہلکی ترشی نہ ہو جینے کا مزہ نہیں، صرف مٹھاس ہی مٹھاس سے تو دل اوب جاتا

ہے۔ زندگی کو بس کھٹا میٹھا ہونا چاہیے۔“

”لیکن میں چاہتا ہوں ہماری زندگی میں صرف شیرینی ہو مٹھاس ہی مٹھاس۔“

”لیکن میں چاہتی ہوں اس میں تھوڑی ترشی بھی ہو، میں تم سے لڑوں جھگڑوں پھر روٹھ جاؤں اور تم مجھے مناؤ اور اس روٹھنے منانے میں ہی تو زندگی کا حسن ہوگا۔“ اس نے تو زندگی میں تھوڑی سی ترشی چاہی تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ ترشی اتنی بڑھ گئی تھی کہ کڑواہٹ ہوگئی تھی اتنی کڑواہٹ کہ......

”بابا کو تو عادت ہے بیٹھے، بیٹھے کھو جانے کی لیکن جانم تم کہاں کھو گئے ہو؟“ رواحہ نے عظام کا بازو ہلایا۔

”کہیں نہیں۔“ عظام نے چونک کر جوس کا گلاس اٹھالیا۔

”میں سوچ رہا تھا پاپا بھی بالکل تمہارے بابا کی طرح یوں ہی ناشتے کی ٹیبل پر پہلے میرے گلاس میں جوس ڈالتے ہیں۔“

”یہ سارے بابا، پاپا ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اتنے ہی شفیق اور مہربان۔“ رواحہ نے فخر سے ان کی طرف دیکھا۔

”نہیں جی نہیں، سب باپ ایسے نہیں ہوتے۔“ خدا بخش نے جو ٹیبل پر نان والا ہاٹ پاٹ رکھ رہا تھا رواحہ کی بات کی تردید کی۔

”میرے خیال میں تو سب باپ ایسے ہی ہوتے ہیں کیوں بابا؟“ رواحہ نے ان کی طرف دیکھا۔ ”آپ کے بابا جان بھی تو ایسے ہی تھے ناں اتنا ہی خیال رکھتے تھے ناں آپ کا؟“

”اس سے بھی زیادہ۔“ بابا جان کے تصور سے ان کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے۔

”بڑے صاحب کی کیا بات تھی بیٹا، وہ تو اللہ کے نیک بندے تھے بڑے دل اور بڑے ظرف والے۔ انہوں نے تو ہمیشہ مجھ کم مایا، بے حیثیت کو بھی شفقت و محبت کی نظر سے دیکھا۔“ خدا بخش نے ایک تنقیدی نظر ٹیبل پر ڈالی کہ سب کچھ ہے اور پھر مطمئن سا ہو کر کچن کی طرف چلا گیا۔

”ہاں خدا بخش صحیح کہتا ہے، میرے بابا جان ایسے ہی تھے۔ ان کا دل محبتوں کا ایسا خزانہ تھا جس میں ہر ایک کے لیے بے پایاں محبت تھی۔“ انہوں نے نہاری کے ڈونگے سے ڈھکن ہٹاتے ہوئے عظام کی طرف دیکھا۔

”بیٹا یہ نہاری ہے، پائے اور پوریاں چنے بھی ہیں جو پسند ہو لے لو۔“

”آپ نے اتنا کچھ منگوالیا، میں تو بہت لائٹ ناشتا کرتا ہوں بس ایک سادہ سلائس کے ساتھ چائے یا کافی کا ایک کپ اور بوائلڈ ایگ۔“ عظام اتنا ہیوی ناشتا دیکھ کر پریشان سا ہو گیا تھا۔

”یار آج سنڈے ہے اور خدا بخش چاچا سنڈے کو زبردست ناشتا کرواتے ہیں۔ کسی روز دیسی گھی کے پراٹھوں کے ساتھ آملیٹ، آلو کی بھجیا اور اچار کا ناشتا کرنا، مزہ آجائے گا اور آج کے دن کچھ بد پرہیزی کرلو تمہاری اسمارٹنس میں فرق نہیں پڑے گا۔“ ان کے بجائے رواحہ نے جواب دیا۔

”بات اسمارٹنس کی نہیں ہے یار۔“ عظام نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے پسند نہیں ہیں یہ ہیوی کھانے۔“

”ارے، یہ اتنا ہیوی ناشتا میں نہیں کرسکتی۔“ وہ ان کے گھر میں اس کی پہلی صبح تھی اور ٹیبل ناشتے کے

سامان سے بھری پڑی تھی۔ مغز، پائے، نہاری وہ پھر کھو سے گئے تھے ہاتھ میں پکڑا ڈونگے کا ڈھکن انہوں نے نیچے رکھ دیا۔

”بابا، آپ پھر کھو گئے ماضی کی کسی یاد میں؟“

”آہ...... ہاں۔“ انہوں نے چونک کر رواحہ کی طرف دیکھا۔ ”دراصل میری عمر میں آدمی حال کے بجائے ماضی میں زیادہ جیتا ہے۔“

”لیکن بابا ابھی آپ اس عمر کے تو نہیں ہیں جس عمر میں آدمی حال کے بجائے ماضی میں جیتا ہے۔“

”یہ تمہارا حسنِ ظن ہے میری جان۔“ رواحہ کی بات کا جواب دے کر وہ عظام کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”پوریاں اور چنے تو لو بیٹا...... یا میں خدا بخش سے کہہ کر آپ کے لیے سلائس بنواؤں؟“

”نہیں انکل، میں نان کے ساتھ چنے کھاؤں گا مجھے پسند ہیں۔“ عظام نے چنے والا ڈونگا اٹھایا۔

”بیٹا خدا بخش کو اپنی پسند بتا دو، وہ تمہاری پسند کے مطابق کھانا بنا دیا کرے گا۔“

”اور جو تم پسند کرو گے ہم بھی وہی کھالیں گے۔“ رواحہ نے شوخی سے کہا۔ وہ یونہی اپنی شوخی اور شرارتوں سے گھر میں رونق لگائے رکھتا تھا۔

”میری کوئی خاص پسند نہیں ہے یار بس زیادہ ہیوی کھانے نہیں کھاتا۔“ عظام، رواحہ کے مقابلے میں سنجیدہ تھا۔ شاید یہ سنجیدگی بچپن سے ہی باپ اور گھر سے دوری کی وجہ سے اس کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔

وہ ناشتا کر رہے تھے جب خدا بخش رواحہ کا سیل فون اٹھائے آیا۔ جو وہ لاؤنج میں چھوڑ آیا تھا۔

”صاحب آپ کا فون آرہا تھا۔“ رواحہ نے فون لے کر نمبر دیکھا اور عظام کو بتایا۔

”جواد کا ہے۔“ جواد اُن سے سینئر تھا اور ہاسٹل میں رہتا تھا۔ اس لیے عظام سے اس کی کافی دوستی تھی اور عظام کی وجہ سے رواحہ سے بھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ظفری کا کلاس فیلو تھا بلکہ کچھ عرصے تک اس کے گروپ میں تھا لیکن جب سے وہ منزہ رحیم والا واقعہ ہوا تھا وہ ظفری کے گروپ سے الگ ہو گیا تھا تاہم سلام دعا تھی۔

”تمہاری یاد آرہی ہوگی۔ کیا تم نے اسے بتایا تھا کہ تم ہاسٹل چھوڑ رہے ہو؟“ رواحہ نے عظام سے پوچھا۔

”کنفرم تو نہیں لیکن سرسری ذکر کیا تھا کہ اگر پاپا مان گئے تو شاید......“

”تو بس کھد بد ہو رہی ہوگی اسے۔“ رواحہ مسکرایا تب ہی فون پھر بج اٹھا۔

”ہیلو، کیا ایمرجنسی ہے یار، ناشتا تو کرنے دے۔“ ٹشو سے ہاتھ پونچھ کر رواحہ نے فون آن کیا۔

”ایمرجنسی تو نہیں لیکن ایک خبر دینے کے لیے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔“

”ہاضمے کا چورن نہیں تھا تیرے پاس؟“ رواحہ مسکرایا۔

”یہ عظمی بھی فون نہیں اٹھا رہا تھا تو......“

”ہاں تو اس کا فون چارجنگ پر لگا ہے اور وہ اس وقت میرے ساتھ ٹیبل پر بیٹھا ناشتا کر رہا ہے۔ ہاں اب جلدی سے خبر بتا۔“

”ظفری اپنے گروپ کے ساتھ اپنے فارم ہاؤس گیا ہے سال میں دوسری بار اپنا برتھ ڈے منانے۔“

”تو یار تمہارے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں؟ اس کی مرضی وہ چاہے تو سال میں دس دفعہ اپنا برتھ

ڈے منائے۔''

''لیکن یار ظفری کا کوئی کام بے مقصد نہیں ہوتا اور پھر سنا ہے کہ ارتفاع اور اس کی فرینڈز بھی انوائٹڈ تھیں اور اس کے ساتھ جا رہی تھیں۔'' وہ رواحہ کی ارتفاع میں دلچسپی سے آگاہ تھا۔

''نہیں!'' اسے یقین نہیں آیا وہ اٹھ کھڑا ہوا اور فون ہاتھ میں لیے لاؤنج میں آ گیا۔ ''نہیں یار، ارتفاع نہیں جا سکتی بھلا اس کا ظفری کے گروپ کے ساتھ کیا لنک...... سلام دعا کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن......''

''میری کزن نے بتایا تھا اس سے شاید عالیہ نے ذکر کیا تھا کہ وہ اور رافعہ بھی لازمی جائیں گی۔ تاہم کنفرم نہیں ہے۔''

''تو تم کنفرم کرکے بتا دو لیکن...... اگر وہ گئی بھی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اللہ اس کی حفاظت کرے۔'' وہ پریشان سا ہو گیا۔

''یار اگر تم دونوں کا کوئی پروگرام نہیں ہے تو میری طرف آ جاؤ...... بہت بور ہو رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے ہمیں مارکیٹ جانا تھا کچھ بکس خریدنی ہیں، تمہیں بھی پک کر لیں گے۔'' فون بند کرکے وہ واپس آیا تو عظام نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ خاص نہیں...... پروگرام پوچھ رہا تھا میں نے مارکیٹ جانے کا بتایا تو کہنے لگا مجھے بھی پک کر لو۔'' اس نے بظاہر نارمل انداز میں کہا لیکن درحقیقت وہ ارتفاع کے فارم ہاؤس جانے کا سن کر اپ سیٹ ہو گیا تھا۔

''تم مارکیٹ جا رہے ہو؟'' انہوں نے رواحہ کی طرف دیکھا اور پھر ان کی نظریں عظام پر ٹک گئیں۔

''جی بابا۔''

''اور عظام...... میرا مطلب ہے اس کے پاپا سے پوچھ لیتے۔''

''اوہ بابا۔'' وہ ہنس دیا۔ ''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ عظام پر کہیں آنے جانے کی پابندی نہیں ہے۔ بس اس کے پاپا اسے اپنی عدم موجودگی میں گھر پر اکیلا نہیں چھوڑتے۔''

''پھر بھی احتیاط اچھی ہوتی ہے۔'' پتا نہیں کیوں ان کا دل عظام کی طرف کھنچتا تھا۔

''جی بابا۔'' ناشتا کرکے وہ فوراً ہی باہر نکل آئے تھے۔ باہر ملازمہ پورچ اور گیراج وغیرہ دھو رہی تھی اور خدا بخش نے گاڑی باہر کھڑی کر دی تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل کر اپنی گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ رواحہ کو بھی ارتفاع کے فارم ہاؤس جانے پر حیرت تھی۔ ظفری کا کردار اس کے نزدیک مشکوک تھا۔ ابھی رواحہ نے گاڑی کا لاک کھولا ہی تھا کہ قریب کھڑی گاڑی کے پیچھے سے وہ شخص نمودار ہوا۔

''ٹھہریں صاحب۔'' رواحہ اور عظام نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا رنگ بہت سیاہ تھا اور اس کے دائیں رخسار پر کسی زخم کا نشان تھا اور وہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی شہادت کی انگلی سے اپنی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔

بابا کی تنبیہہ یاد آتے ہی رواحہ نے غیر ارادی طور پر ایک ہاتھ سے عظام کو پیچھے کیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

جاری ہے

سوچنے کی بات

فرح طاہر قریشی



آج جب وہ کلاس میں آئی تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی...... سرخ، سرخ سوجی ہوئی آنکھیں، اترا ہوا چہرہ...... لگ ہی نہیں رہا تھا یہ وہ علیزہ ہے جو ہر دم ہنستی کھلکھلاتی رہتی تھی، جو ہر بات کو ہنسی مذاق میں اڑا دیتی تھی مگر آج تو معاملہ ہی الٹ لگ رہا تھا۔ میں مسلسل اسے نوٹ کر رہی تھی...... لیکچر کے دوران بھی علیزہ کھوئی کھوئی ہی رہی۔ میں نے فی الحال اس سے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ میں اچھی طرح جانتی تھی علیزہ مجھ سے ہر بات شیئر کرتی ہے وہ خود ہی سب کچھ بتا دے گی لیکن اسے اس حالت میں دیکھ کر میں خود بھی پریشان ہو گئی تھی کیونکہ علیزہ کل تک تو بہت خوش تھی اتنی خوش کہ بات، بات پر مسکراتی رہی تھی۔

آج کل ویسے بھی وہ بہت خوش تھی کیونکہ دو مہینے بعد اس کی شادی تھی اس لیے وہ شادی کی تیاریوں میں مگن تھی اور ہر روز آ کر اپنی شادی کی خریداری کی ساری تفصیل بتاتی کہ اتنے سوٹ لیے، سوٹ ایسے سلوائے وغیرہ، وغیرہ......

غرض یہ کہ وہ بہت خوش اور مگن رہنے لگی تھی مگر آج ایسا کیا ہوا......؟ پوری کلاس کے ساتھ اس کا بہت دوستانہ رویہ تھا اسی لیے اس کی خاموشی کو سبھی نے شدت سے محسوس کیا تھا جیسے ہی کلاس ختم ہوئی ہم لوگ کینٹین میں آ گئے۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے۔

''یار علیزہ، تم صبح سے کچھ بجھی بجھی لگ رہی ہو...... کیا بات ہے؟ گھر میں سب خیریت ہے ناں......؟'' میں نے سرسری سے لہجے میں اس طرح پوچھا کہ اگر بات پرسنل بھی ہو تو علیزہ کو برا نہ لگے۔ وہ خود سے بتا دیتی تو الگ بات تھی لیکن اب تو میں تجسس سے مجبور ہو کہ خود ہی پوچھ بیٹھی تھی اسی لیے میں خود تھوڑا اجھجک گئی تھی۔

''ہاں کنول......! گھر میں سب خیریت ہے، بس میں تھوڑی پریشان ہوں، یار بات ہی کچھ ایسی ہے جس نے مجھے ہی نہیں میری فیملی کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔''

''یار پلیز مجھے بتاؤ ناں کیا بات ہے اگر میں کچھ نہ بھی کر سکی تو کم از کم کہہ دینے سے تمہارے دل کا بوجھ ہلکا تو ہو جائے گا۔ دیکھو انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔'' میرا اتنا ہی کہنا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کنول دیکھو کیسا زمانہ آ گیا ہے، مجھے تو آج کل کے دور کی سمجھ ہی نہیں آتی، اپنے ہی اپنوں کو اعتماد اور تحفظ نہیں دینا چاہتے...... تم جانتی ہو، میں کتنے الگ مزاج کی لڑکی ہوں لیکن میں اپنی حدود کو بھولی نہیں ہوں۔ اپنے ماں، باپ کی تربیت کو نظر انداز نہیں کیا میں نے... دیکھو جب بھی ابو مجھے لینے نہیں آ سکتے تو میں کالج سے خود ہی رکشے یا وین سے گھر چلی جاتی ہوں کیونکہ مجھے ابو کی مصروفیت کا اندازہ ہے اور پھر میرے خیال میں اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اتنا اعتماد تو آ جاتا ہے کہ مجبوری کے وقت بندہ خود آ جا سکے اور ہر وقت دوسروں پر بوجھ نہ بنا رہے اور پھر خود ابو نے مجھے اجازت دی ہوئی ہے کہ میں نہ آ سکوں تو تم خود سے آ جانا۔'' علیزہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا اور مجھے تجسس نے گھیر لیا کہ آخر اس معمولی سی بات کے اندر کیا بات ہے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں......! تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو......'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔

''اور یہ کہ تمہیں پتا ہے کہ جہاں میری شادی ہونے والی ہے وہ ہمارے دور پرے کے رشتے دار ہیں اور یہ بہت نازک معاملے ہوتے ہیں کنول، لوگ چھوٹی، چھوٹی باتوں کو اتنا نوٹ کرتے ہیں۔'' علیزہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اب مجھے بھی کچھ تشویش ہونے لگی کہ معاملہ سنجیدہ لگتا ہے لیکن کیا......؟

''ہاں یار، آگے بولو ہوا کیا ہے......؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''بس کیا بتاؤں، میری پھپھو نے کہا ہے کہ جب میں کالج سے اکیلی گھر آتی ہوں تو میں سیدھی گھر نہیں آتی بلکہ راستے میں کسی سے ملنے جاتی ہوں، کنول دیکھو جب ابو لینے آتے ہیں تو اپنی ہی گاڑی میں ہم آسانی سے چلے جاتے ہیں لیکن جب مجھے خود سے جانا ہوتا ہے تو تب مسئلہ ہوتا ہے، کبھی رکشا نہیں ملتا تو کبھی وین نہیں...... ظاہر ہے تھوڑی دیر تو ہو جاتی ہے لیکن پھپھو...... وہ سب کے سامنے بڑے دھڑلے سے یہ بات کہہ رہی تھیں۔ تم خود سوچو اگر یہ بات میری سسرال تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا......؟'' علیزہ نے پریشانی سے کہا۔ ''وہ لوگ کیا سوچیں گے؟'' یہ

سب بتا کر علیزہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی اور میں اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر ہولے، ہولے تھپکنے لگی۔ میرے الفاظ گم تھے اور ذہن بری طرح الجھ گیا تھا کہ علیزہ کو کن الفاظ میں تسلی دوں۔

''لیکن علیزہ تمہاری پھپھو ایسے کیوں کر رہی ہیں؟'' میں نے کچھ جھنجلا کر پوچھا۔

''یار تم جانتی تو ہو وہ لوگ ہماری پڑھائی کے کتنے خلاف ہیں لیکن ہم لوگوں نے پھر بھی پڑھا اور اب شادیاں بھی ہم سب کی اچھے گھروں میں ہو رہی ہیں تو بس یہ سب پھپھو کو برداشت نہیں ہو رہا۔'' علیزہ نے اصل وجہ بتائی۔ بات میری سمجھ میں آ گئی تبھی میں نے علیزہ سے کہا۔

''دیکھو علیزہ ایسے مسائل تو زندگی میں آتے رہتے ہیں، بے شک یہ معاملہ چھوٹا نہیں ہے۔ اس کا تمہاری زندگی پر بہت بڑا اثر بھی پڑ سکتا ہے لیکن اس طرح سے رونا مسئلے کا حل نہیں...... تم یا تمہارے بڑے اپنی پھپھو سے بات کرو۔ آخر ان کی بھی تو بیٹیاں ہوں گی، انہیں احساس دلاؤ وہ بنا ثبوت، بنا تحقیق ایسی بات کیوں کر رہی ہیں؟ اگر آج وہ تمہارے ساتھ ایسا کر رہی ہیں تو کل کو ان کی بیٹیوں کے ساتھ بھی کچھ غلط ہو سکتا ہے۔ خیر تم پریشان نہ ہو اللہ کی ذات پر بھروسا رکھو، وہ ضرور بہتر کرے گا۔'' میں نے علیزہ کو تسلی دی اور اگلی کلاس کا وقت شروع ہونے کی وجہ سے ہم دوبارہ کلاس میں آ گئے۔

میں گھر آ گئی لیکن میرا ذہن کئی دن الجھا رہا کہ اس طرح کی باتیں کرنے والوں کا اصل مقصد کیا ہے۔ میں شدید افسوس کی کیفیت میں تھی۔ لڑکی کا کردار ایک موتی کی طرح شفاف ہوتا ہے اگر اسے تھوڑی سی بھی گزند پہنچ جائے تو وہ میلا ہو جاتا ہے اور سب سے بڑی بات اللہ پاک بھی کسی کے کردار پر بات کرنے سے منع کرتا ہے۔ وہ تو لوگوں کے بڑے، بڑے عیوب کی بھی پردہ پوشی کیے رکھتا ہے تاکہ بندا بات کسی پر اتنا سنگین الزام لگایا جائے وہ بھی اپنی سگی بھتیجی پر...... کاش بحیثیت ایک سچے مسلمان ہم زندگی گزار سکتے کہ جس کے ہاتھ یا پیر حتیٰ کہ زبان کی جنبش سے بھی دوسرے کا دل نہ دُکھے۔ علیزہ کی پھپھو نے نہ جانے کس منفی جذبے کے تحت ایک بات تو کر دی لیکن شاید اس کا انہیں خود بھی اندازہ نہیں کہ اس بات کا علیزہ کی زندگی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

ایک علیزہ کی بات تو میں نے آپ کے گوش گزار کر دی۔ نہ جانے ہمارے آس پاس کتنی علیزائیں ہوں گی جو ایسے ہی بہتان، تہمت اور الزام تراشیوں کا نشانہ بنی چلی جا رہی ہیں اور ہم کچھ کہہ نہیں پاتے...... آپ بھی ضرور سوچیے گا اس بارے میں۔

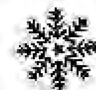
حرفِ دعا

اے ربّ کائنات میں تیرے پوشیدہ ناموں کے وسیلے سے اور تیری اس بزرگی کے واسطے سے جو جلال و عظمت کے پردوں میں ہے، تجھ سے یہ سوال کرتی ہوں کہ اس بے تاب نفس اور کمزور جسم پر ترس کھا، اس لیے کہ جو تیری سورج کی تپش کو برداشت نہیں کر سکتا وہ تیرے جہنم کی آگ کو کیسے برداشت کرے گا اور جو تیرے بادل کی گرج سے کانپ اٹھتا ہے وہ تیرے عذاب کی آواز کو کیسے سن سکتا ہے؟ جسے تیری رحمت اور پیار کی عادت ہے، وہ تیری ناراضی کا سامنا کیسے کرے گا بس الٰہی ہمارے حال پر رحم فرما اور کرم کر اور ہم سب کو معاف فرما دے اور ہم سے راضی ہو جا۔ (آمین)

ازظرف: نزہت جبیں ضیا، کراچی



ناولٹ



ترکِ وفا

نایاب جیلانی

دسواں حصّہ

دریائے نیکر کی پُرسکون لہروں میں اچانک طغیانی آ گئی تھی۔ نیکر کا پانی جو کسی حساس، سوگوار ندی کی طرح خاموش، صابر اور پُرسکون رہتا تھا جو ہائیڈل برگ کی پہچان تھا......اور خدا کی اس سرسبز زمین میں سے دنیا کی حسین ترین وادی کے نشیب میں بہتا تھا۔ جسے نرم گداز اور سفید بادل جالوں کے مانند ڈھانکے رکھتے تھے۔ جس کے کنارے پر گنبدوں والے میناروں، عجائب گھروں، گرجوں اور چھ سو سال پرانی یونی ورسٹی کی

عمارت والا شہر آباد تھا۔ جس کے ایک طرف تنہا، اداس، غمگین، بوجھل، لٹا پٹا اور صدیوں پرانا غموں اور حوادثات کا شکار سرخ قلعہ تھا۔

وہی نیکر جو ہائیڈل برگ کے کنارے بہتا تھا۔ ہائیڈل برگ جیسا قدیم شہر، جس کی چھتیں ایک دوسرے کے ساتھ ہونٹوں کے مانند باہم ملی تھیں۔ شہر کو مقدس پہاڑی سے ملانے کے لیے ایک خاص قدیم پل تھا۔ پُل کی طرف جانے سے پہلے ایک قدیم وضع کے دروازے میں سے گزرنا ہوتا تھا اور پل کے ایک سرے پر وائن، ڈینیوب، نیکر اور موزیلے دریاؤں کے مجسمے تھے اور دوسرے پر نیکی، انصاف، زراعت اور تجارت کے بت استادہ تھے۔ طوفان آتے جاتے رہتے تھے، موسم بدلتے رہتے مگر دریائے نیکر اپنی دھن میں مگن سکون کے عالم میں رواں تھا۔ جیسے اسے تہذیب کے ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بدلتے موسم اسے چونکاتے نہیں تھے، اس کے پانی سے دُرِ خوش آب (عمدہ چمکیلے موتی) نکلتے تھے۔ اس کے جنب، چھپاؤ اور گہرائی میں کئی طرح کے راز پڑے گہری نیند سو رہے تھے اور وہ اپنے اندر کسی کو اترنے نہیں دیتا تھا۔ پانی کی خاموش لہریں درمیان میں حائل تھیں۔ اس کے اندر اترنے کے لیے کمال کا حوصلہ درکار تھا۔ وہ جو ایک ہی حالت میں بہتا تھا، کبھی کبھار ہواؤں کے شور پر ناگواری محسوس کرلیتا۔ اسے ہنگامے اور شور پسند نہیں تھا اور کوئی اس کی لہروں کو منتشر کرتا تو اسے بہت غصہ آتا۔ تب وہ اپنے ٹھیا (مقام) سے ہٹ کر جوش کھانے لگتا تھا۔

ہوا کبھی سا ہو (دوست) بن جاتی تھی اور کبھی نیکر کو غصہ دلا دیتی۔ اسے فاسد ہواؤں پر تاؤ چڑھتا تھا۔ اس کی سرشت میں بے صبرا پن نہیں تھا مگر آتے جاتے موسم اس پر اپنا اثر ضرور چھوڑ جاتے تھے۔ جیسے اب بھی نیکر کے پُرسکون پانیوں میں تھرتھراہٹ ہونے لگی تھی۔ لہروں نے جوش کھایا تھا اور پانی کو غیظ چڑھ گیا۔ نیکر کی پُرسکون، حلیم اور پُرامن ندی میں بالآخر طغیانی آگئی تھی۔ شفاف پانی کی لہروں میں پہلا کنکر کس نے پھینکا تھا؟ اس نے گزرتے سمے سے رک، رک کر اور ٹھہر، ٹھہر کر پوچھا تھا اور جواب جیسے اس کے اپنے اندر سے آیا۔ من ہائیم کی پاگل، پاگل منکشے نے جو ڈار سے بچھڑی کونج کی طرح تھی، اداس، ویران، خاموش، نڈھال اور بدحال۔

دریائے نیکر کی پُرسکون لہروں میں پہلا کنکر منکشے نے پھینکا تھا۔ وہ پہلے کنکر کے ساتھ ہی نیکر کی گہرائیوں سے کئی سال پہلے کا کھویا ہوا، ڈوبا ہوا، گمشدہ راز نکال کر باہر لے آئی تھی۔ وہ بڑی باہمت، دلیر اور نڈر لڑکی تھی۔ تبھی نیکر کے گہرے پانیوں میں بے جھجک اتر گئی تھی۔ وہ پیچ در پیچ خمدار، گھنگرالی اور مرغول بات کررہی تھی۔ عقلِ انسانی کو منجمد کردینے والی بات کررہی تھی۔ سوچ کو دنگ کردینے والی بات کررہی تھی۔ ذہن کو کرنٹ لگا دینے والی بات کررہی تھی۔ وہ کیسے یقین کرلیتا۔ وہ کس طرح مان جاتا؟ اس کی سوچ جیسے تھم کر رہ گئی تھی جبکہ وہ اسے یقین دلانے کے لیے مرقومہ (تحریر شدہ) سچ بھی دکھانے پر تیار تھی۔ اور معیار (آلہ) پیمانہ، کسوٹی پر سونے جیسے سچ کو کھرا اور کھوٹا ثابت کرنے پر بھی تیار تھی۔ وہ جیسے اندر تک حبس اور گھٹن سے معمور تھی۔ ان دیکھے بوجھ تلے خود کو ہر اذیت سے نجات دلانے کے لیے اس کے سامنے اپنا دل کھولنے آئی تھی۔ اس کا یقین بڑا گمبھیر اور پختہ تھا جیسے ذی شاہ کبھی انکاری ہو ہی نہیں پائے گا۔ وہ ایسی نالشی ہی بن کر تو آئی تھی، وہ چاہ کر بھی اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنے دل کو آمادہ کرلیا تھا، وہ اس نالشی کی ہر بات سننے پر دل سے رضامند ہوگیا۔ اس کی سنے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا اور منکشے جیسے نام بہ نام راز کھولنے آئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے ذی شاہ کی چچازاد مون حبیب کا نام لیا تھا۔ تو گویا پہلا راز وہ مون کے متعلق اگلنے والی تھی۔

علی عیسیٰ سے وابستہ اس کے گھر کے متعلقین، کنبے، رشتے داروں میں سب سے پہلے مون حبیب کا ذکر کیا گیا تھا۔ وہ مون حبیب سے ہوتی ہوئی علی عیسیٰ تک آنے والی تھی اور اس کے بعد مالا کے دکھ کا ہر بادباں جیسے کھل جاتا۔ کوئی راز، راز نہ رہتا۔ ذی شاہ کو بس انتظار کرنا تھا، منکشے کی ہر بات مکمل ہونے تک کا۔ وہ عجلت اور بے صبرے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر منکشے پل صراط پر چلنے کا فیصلہ کرکے آئی تھی تو پھر وہ اسے تنہا پل صراط پہ چلنے کے لیے کیسے چھوڑ دیتا...!

پھر اس نے منکشے کے چہرے پر وحشت ناچتی دیکھی تھی۔ وہ کوئی وحشت ناک بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس کے چہرے کا ہر تاثر وحشت انگیز اور ہولناک تھا۔ وہ کچھ حواس باختہ، گھبرائی، خبطی بلکہ مجنون سی بھی نظر آرہی تھی۔ اس کی وحشت بھری گیلی آنکھوں سے کئی راز گر رہے تھے۔ وہ کسی وحوش (صحرائی جانور) کے مانند دکھنے لگی تھی۔ پھر اس نے ذی شاہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جیسے اپنے دل کو تقویت دینا چاہتی ہو۔ اس کا گداز کپکپاتا ہاتھ ذی شاہ کے ہاتھ پر جما تھا۔ انتہائی مضبوطی سے، بڑے بھروسے کے ساتھ جیسے ذی شاہ ''کچھ بھی'' سن کر اس کا ہاتھ ہرگز نہ جھٹکے گا۔ وہ اس کے عہد کو دہرا رہی تھی، جو مقدس قرآن پر ہاتھ رکھ کر ذی شاہ نے منکشے سے کیا تھا۔ اس کا دل وجع کا گڑھ بن رہا تھا، جس سے ہر طرح کا درد اور ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اس نے انتہائی درد میں ڈوبی آواز کے ساتھ کہا تھا۔ جیسے وہ قطرہ، قطرہ پگھل چکی تھی اور اب مزید پگھلنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

''میں نے جو بھی کیا...... اپنے ہر عمل کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تم میری ایلچی گیری (یعنی وکالت) کروگے۔'' منکشے کی آواز اسے بیکراں سوچوں کے سمندر سے کھینچ لائی تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے پھر سے شاکڈ رہ گیا تھا۔ یہ منکشے کیا کہہ رہی تھی؟ وہ اس کی مختار کاری کیسے کرسکتا تھا؟ وہ تو ایک ساہوکار تھا، سوداگر اور تاجر تھا، وہ کسی کی وکالت کرنا نہیں جانتا تھا اور وہ ذی شاہ کو اپنا مختار خاص بنانا چاہتی تھی۔ کیا یہ ممکن تھا...... اگرچہ یہ ممکن ہرگز نہیں تھا۔ پھر بھی اسے منکشے کا وکیل تو بننا تھا۔ اپنے دل کے مجبور کرنے پر۔

اب منکشے گیلی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے وقوعہ سے پہلے کے واقعات بتانے والی تھی، واردات سے پہلے مون حبیب کے وقوع جرم کی کہانی سنانے والی تھی۔ اس کا ڈھانچے جیسا وجود دھیرے، دھیرے کانپ رہا تھا۔ چہرے پر پھر سے وحشت ناچنے لگی تھی۔ آنکھوں سے خوف چھن، چھن کر نکل رہا تھا۔ جیسے اپنی ہلاکت کا خود سے ذکر کرنا اس کے لیے انتہائی عذاب ناک تھا۔ سمِ قاتل کا جام بالآخر اسے پینا ہی پڑا۔ زہر ہلاہل اس کی رگوں کو کاٹ رہا تھا۔ سانس مشکل تھی پر لینی تو تھی ناں...... اگرچہ ہفت اندام پہ خنجر چل رہے تھے، خون رگوں سے پھوٹ رہا تھا، پھر بھی...... پھر بھی زندہ تو رہنا تھا۔ وہ جتنے بھی مخدرات (سن کردینے والی اشیا) کا استعمال کرتی۔ مختل الحواس نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے حواس ہی اس کی اصل سزا تھے۔ وہ اس حقیقت کو دیر سے سہی مگر جان ضرور گئی تھی۔ لمحے چپ چاپ بیتتے رہے، صفحے کھلتے رہے، وہ کہانی کی ابتدا سے پہلے کچھ بتا رہی تھی جیسے ذی شاہ کے پیروں تلے سے زمین کھسکا رہی تھی۔ مون حبیب کیا تھی؟ اس کا ذہن کتنا طاقتور تھا؟ اور اسے کچھ ایسی قوتیں عطیۂ خداوندی کے طور پر ملی تھیں۔

''میں نے مون حبیب کو قتل کردیا تھا...... وہ انتہائی خطرناک، ذہن رکھتی تھی۔ ماہر انتقالِ افکار تھی۔ اسے ایسا علم خدا نے عطا کیا تھا کہ جس کا تعلق انسان کی غیر مادی قوتِ متحرکہ سے تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے تم مون حبیب کی ذات میں اترنا چاہو گے؟ چلو آؤ...... میں تمہیں مون حبیب کی زندگی کا ایک،

ایک صفحہ پڑھاتی ہوں پھر چاہے تو ان غلیظ صفحات کو نذرِ آتش کردینا اور چاہے تو دریا برد کردینا۔ تمہیں اختیار ہے۔ جو دل چاہے کرنا۔'' اس نے سر جھکا کر کہنا شروع کیا تھا۔ ذی شاہ نے سانس تک روک رکھی تھی۔ وہ آج بس منکشے کو سننا چاہتا تھا۔ کوئی سوال اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

اور منکشے نے سلسلۂ کلام وہاں سے جوڑا تھا جب مون حسیب، علی عیسیٰ کے بعد اس کے چاچو حسیب احمد کی دعا بن کر اس دنیا میں آئی تھی۔

وہ من ہائیم کے بجائے بواریا میں پیدا ہوئی۔ وہ ایک حسین صبح تھی۔ سرسبز، تروتازہ اور انتہائی خوشگوار...... یہ صبح حسیب احمد کے لیے کامیابیوں کے در وا کرگئی تھی مگر سچ تو یہ تھا کہ ان کے ہاں ایک بلند بخت بچی نے جنم لیا تھا۔ اس کی پیدائش کے ایک گھنٹے بعد حسیب احمد کو پہلی خوشخبری ملی تھی، انہیں ایکسپورٹ پروموشن بیورو کی رکنیت کا سرٹیفکیٹ مل گیا تھا۔ اب وہ جرمنی میں قدم جما کر کاروبار کرسکتے تھے۔ ڈوئچ لینڈ میں مستقل رہائش کے باوجود شہریت آسانی سے نہیں ملتی۔ شادی اور بچے ہوجانے کے باوجود شہریت ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ گنتی کے چند تارکینِ وطن جرمنی کی شہریت رکھتے تھے۔ ان میں جلد ہی حسیب احمد کا بھی شمار ہوگیا تھا۔ مون کی پیدائش کے ایک سال بعد انہیں رہائشی ویزا حکومت نے جاری کردیا تھا۔ بینک سے گھر خریدنے کے لیے قرضہ بھی مل گیا تھا جو انہوں نے اگلے دو سالوں میں اتار بھی دیا تھا۔ مون کی چوتھی سالگرہ پر وہ اپنی ذاتی کار کے مالک بن گئے تھے اور اس کی پانچویں سالگرہ پر انہوں نے اپنی ذاتی فرم ہیرلخ کے نام سے من ہائیم میں خرید لی تھی۔ جیسے مون کی پیدائش کے بعد ان پر ہُن برسنے لگا تھا۔ ان کی اکلوتی بیٹی بہت بلند بخت تھی۔ بڑی بانصیب تھی۔ آسمان پر چمکتے چاند کی طرح حسین اور اونچے نصیب والی۔

حسیب احمد اپنے حسین، فرمانبردار خوب صورت بچوں میں مگن دن رات کاروبار کی ترقی میں لگ چکے تھے۔ مریم، بچوں کی دیکھ بھال کرتی، ان کا خیال رکھتی، اچھی تربیت کرتی اور اس کے ساتھ، ساتھ وہ آفس میں بھی ان کی بہت مدد کرتی تھی۔ ان کا کاروبار دنوں میں پھلتا پھولتا گیا تھا۔ یہ مریم کی مدد، انتھک کوشش اور بھرپور ساتھ کا کرشمہ تھا۔ وہ بڑے کم عرصے میں شہر کے نامور بزنس مین بن گئے تھے۔ اگلے پانچ سال تک انہیں جرمنی کا پاسپورٹ جاری کردیا گیا تھا۔ اب وہ دیگر ممالک میں بغیر ویزا کے آجاسکتے تھے۔ کاروبار کی ترقی کو دیکھ کر ان کا دل اور زیادہ محنت کے لیے مچلتا تھا۔ وہ رات دن کا فرق بھلائے انتھک محنت کررہے تھے مگر اس دوران وہ اپنے بچوں سے غافل نہیں رہے تھے۔ مریم کی اعلیٰ تربیت اور سختی کی بدولت ان کے دونوں بچے نہایت فرمانبردار اور باتمیز تھے۔

عیسیٰ اسکول جاتا تھا اور مون گھر میں کلاسز لیتی تھی۔ ان دونوں نے انگلش اور عربی میں ایک، ایک مرتبہ قرآن بھی پڑھ لیا تھا بلکہ مون نے تو حفظ کیا تھا۔ دراصل مون کی غیر معمولی ذہانت نے پہلی مرتبہ انہیں ٹھٹکایا بھی اسی وقت تھا جب اس نے قرآن کی کلاس میں جو سبق لیا وہ اسے زبانی یاد ہوگیا تھا۔ پھر ہر روز وہ اپنا سبق دُہراتی تو اس کے ذہن میں جیسے جم جاتا۔ جیسے کمپیوٹر کی طرح ہر لفظ، ہر سبق یا روزمرہ کی چھوٹی موٹی بات فیڈ ہوجاتی تھی۔ وہ قرآن ناظرہ پڑھتی تھی مگر اسے زبانی یاد ہونے لگا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کے اتالیق نے حسیب احمد کو اپنے اسلامک سینٹر میں بلا بھیجا تھا۔ یہ چھوٹی سی قرآن اکیڈمی تھی۔ یہاں بچے اور بچیاں قرآن سیکھتے، سمجھتے اور اسے یاد کرتے تھے۔

حسیب احمد، اتالیق کے بلاوے پر قرآن اکیڈمی آئے تو اتالیق نے بڑے حیران کن انکشافات کیے تھے۔ اتالیق نے بتایا تھا۔ مون عام

بچوں کی طرح سبق یاد نہیں کرتی، نہ رٹا مارتی ہے۔ نہ اونچی آواز میں پڑھتی ہے۔ بس ایک نظر دیکھ کر سیپارہ بند کرلیتی ہے مگر پھر بھی اسے سبق یاد ہوجاتا ہے اور پھر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ سبق کو دوبارہ بھولتی نہیں۔

اتالیق کی گفتگو نے حسیب احمد کو پہلے تو حیران کیا تھا پھر ان کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ ان کی بیٹی کلاس کے ہر بچے سے زیادہ ذہین، لائق اور جلدی قرآن پڑھنے والی بچی تھی۔ ان کا سینہ فخر سے کیوں نہ پھولتا! انہوں نے اتالیق کی حیرانی پر غور نہیں کیا تھا اور نہ اس کی پوری بات پر توجہ دی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ مون نے عیسیٰ سے بھی پہلے قرآن پڑھ لیا تھا۔ اگرچہ عیسیٰ بھی ذہین تھا مگر مون کا مقابلہ ان کی پوری نسل کا کوئی بچہ نہیں کرسکتا تھا۔ انہیں تب اس کا احساس نہیں ہوا تھا...... بلکہ بہت سال تک انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ ان کی بیٹی کیسا قیامت کا ذہن رکھتی ہے۔

وہ اپنے تئیں سارے فرائض ادا کررہے تھے۔ بزنس اور گھر کو بھرپور توجہ دیتے...... مون انہیں جتنی پیاری تھی عیسیٰ اس سے دگنا عزیز تھا بلکہ عیسیٰ میں ان کی جان بند تھی، شاید یہ بات مون نے بہت کم عمری میں ہی محسوس کرلی تھی اور وہ سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔ مون رفتہ، رفتہ اپنے دور صغر (کم سنی) میں ہی ان سے بہت دور چلی گئی تھی۔ وہ چیزوں کو بڑی جلدی اور انتہائی شدت کے ساتھ محسوس کرتی تھی وہ اپنے دور کے ہر بچے سے مختلف تھی۔ اور عجیب بات تو یہ تھی، مون حسیب کے ماں، باپ اپنی بیٹی کی اس اعلیٰ پائے کی انفرادیت کو سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔

اتالیق کے وقتاً فوقتاً بلاوے ان کے ذہن سے نکل گئے تھے اور مون حسیب قرآن حفظ کرکے اسکول جانے لگی تھی۔ حالانکہ آٹھ سال کی عمر میں قرآن یاد کرنا اتنا معمولی واقعہ نہیں تھا مگر مریم اور حسیب نے توجہ ہی نہیں دی۔ اس کی رسمِ بسم اللہ سے لے کر قرآن حفظ کرنے تک وہ اتنے ہی بے پروا اور بے نیاز رہے تھے۔ جیسے مون نے قرآن پڑھ لیا تھا اور ایک ذمے داری ختم ہوچکی تھی۔ اب دوسری ذمے داری دنیاوی تعلیم کی تھی۔ عیسیٰ، مون سے بڑا تھا۔ وہ بہت سلجھا ہوا فرمانبردار بچہ تھا۔ اپنے اسکول وقت پر جاتا، ٹائم سے گھر آتا، کھانا کھاتا، آرام کرتا پھر کھیلنے کے لیے کلب چلا جاتا تھا۔ وہ لڑکا تھا اس کی ایکٹوٹیز لڑکیوں سے مختلف ہی ہوتی تھیں مگر مون کی ایکٹوٹیز عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھیں...... وہ لڑکیوں کے کھیل نہیں کھیلتی تھی، اس کی کوئی سہیلی نہیں تھی، اسے گراؤنڈ میں جانا بھی پسند نہیں تھا۔ ٹی وی میں دلچسپی نہیں تھی۔ گیم کا موڈ نہ ہوتا پھر وہ اسکول سے آکر کیا کام کیا کرتی تھی؟ مریم اور حسیب بھی جان نہیں سکے تھے۔

وہ دونوں صبح دفتر کے لیے نکلتے، دونوں بچوں کو ان کے اسکولوں میں چھوڑتے، انہیں لنچ کرنے کی ہدایت دیتے، پیار کرتے اور آفس چلے جاتے تھے۔ واپسی ہمیشہ رات کو ہوتی تھی۔ بیچ میں مریم گھر آکر بچوں کو ہوم ورک کرواتی، کھانا وغیرہ دیتی اور پھر سلا کر دفتر نکل جاتی تھی۔ وہ شوہر پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی، ان کا کام میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ ان دونوں کی انتھک محنت کا نتیجہ ہیرلخ کی بہترین اور مضبوط ساکھ تھی۔

مریم کے دوبارہ دفتر چلے جانے کے بعد عیسیٰ تو آرام سے سوجاتا تھا مگر مون کیا کرتی تھی؟ وہ ماں کو مطمئن کرنے کے لیے آنکھیں بند کرکے سوتی بن جاتی تھی۔ پھر مریم چپکے سے مون کے سر کو چومتی اٹھ جاتی۔ پردے برابر کرتی، دروازہ بند کرتی اور آفس کے لیے روانہ ہوجاتی۔ اس دوران مون آنکھیں موندے رکھتی تھی پھر جیسے، جیسے مریم کی ہیل ٹک، ٹک کرتی دور ہوتی تھی اس کی پلکیں دھیرے، دھیرے کھلتی جاتی تھیں۔ وہ ہیل کی ٹک، ٹک سے اندازہ

لگاتی تھی۔

”مما کمرے سے نکل گئیں...... مما اب لاؤنج میں ہیں...... مما اب کچن میں ہیں۔ مما اب عیسٰی کے کمرے کی طرف جارہی ہیں۔ مما اب دوبارہ لاؤنج میں سے گزر رہی ہیں...... اور مما اب لاؤنج کے دروازے سے نکل کر ڈرائیور وے پر چل رہی ہیں...... مما اب گیراج میں پہنچ گئیں۔ مما اب گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ گیراج سے گاڑی اب تیزی سے نکل گئی......“ ٹک، ٹک کی آواز اس کے دماغ سے دور ہوتی چلی جاتی تھی پھر وہ مطمئن سی چادر پھینک کر بستر سے اٹھتی۔ اپنی روک کو جھاڑتی، بال سنوارتی پھر کوٹ شوز پہن کر باہر نکل آتی، اس کا رخ عیسٰی کے اسٹوڈیو کی طرف ہوتا تھا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے تک آرام سے عیسٰی کی پینٹنگ کے ادھورے پن کو ختم کردیتی پھر جیسے ہی گھڑی ڈیڑھ گھنٹے کا الارم بجاتی، اس کے دماغ میں کلک سے کچھ روشن ہوتا تھا۔

وہ ”کچھ“ کیا تھا؟ بہت عرصے بعد مون کو اس ”کچھ“ کی سمجھ آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ کلک کی اس آواز کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔ وہ کوئی غیبی قوت تھی، کوئی ایسی طاقت جو اسے خطرے سے پہلے الرٹ کردیتی تھی۔ جیسے ہی عیسٰی کی آنکھ کھلتی، اسٹوڈیو میں موجود مون کے ہاتھ سے برش گرجاتا تھا۔ پھر وہ بستر سے اٹھتا تب مون برش کو اٹھا کر اپنی جگہ پر رکھ دیتی، کلرز سمیٹتی...... گلوز اتارتی، لائٹس آف کرتی دوبارہ اپنے کمرے میں گھس کر بستر پر لیٹنے کے بعد آنکھیں موند لیتی تھی۔

عیسٰی چپل پہن کر واش روم سے ہوکر آتا، بال بناتا، بستر سمیٹتا، بیڈ شیٹ کی شکنیں دور کرتا پھر کچن میں سے جوس کا کین اٹھاتا اور پھر دھیرے، دھیرے اپنے اسٹوڈیو میں گھس جاتا تھا۔ لائٹس آن کرنے کے بعد اس کی آنکھیں کھل جاتیں، عیسٰی کی ادھوری پینٹنگ انتہائی صفائی کے ساتھ مکمل ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سراسیمگی ابھرتی، خوف مچلتا، حیرت چھلکتی اور پھر جیسے وہ شک کی بنیاد پر مون کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتا تھا۔

اس کے سونے سے پہلے پینٹنگ ادھوری تھی، سونے کے دوران مکمل ہوگئی مگر کس طرح......؟ جبکہ مون بھی اپنے بستر میں گم نظر آرہی ہوتی تھی۔ وہ شک سے نکل کر حیران ہوتا پھر ذرا خوف زدہ سا ہوکر پلٹ جاتا تھا۔ جانے یہ ماجرا کیا تھا؟ وہ سمجھ نہ پاتا۔

اور ادھر مون چپل کی چاپ سے اندازہ لگاتی۔ عیسٰی اس کے کمرے میں آیا تھا، کچھ دیر رکا رہا پھر باہر چلا گیا۔ باہر کہاں؟ لاؤنج میں، کچن میں یا اسٹوڈیو میں...... چپل کی چاپ کا رخ لاؤنج سے باہر کی طرف ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ بالکل ٹھیک ثابت ہوتا۔ عیسٰی گیراج سے اپنی سائیکل نکال کر باہر نکل جاتا تھا۔

تب وہ دھیرے، دھیرے پلکیں کھول لیتی تھی۔ جیسے جان بچ جانے پر مسکرا اٹھتی۔ عیسٰی کو چکما دینے میں وہ کامیاب ہوچکی تھی۔ اور اس طرح وہ بے شمار لوگوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوجاتی تھی، اکثر تو مما، پاپا بھی لپیٹ میں آجاتے تھے۔ بہت عرصے تک خطرے سے پہلے اپنے اندر بجتے الارم کو وہ کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔ ایک مدت بعد اسے پتا چلا تھا کہ اس کے اندر جو گھنٹی سی بجتی ہے وہ E S P کی حامل کوئی قوت ہے۔ جسے عرفِ عام میں چھٹی حس بھی کہتے تھے۔

☆☆☆

چھٹی حس کیا تھی؟ اس کا ننھا ذہن جو اتنا ننھا...... ہرگز نہیں تھا...... تب بالکل سمجھ نہیں پاتا تھا۔ بہت عرصے تک اسے چھٹی حس کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ حالانکہ چھٹی حس ہر انسان میں موجود ہوتی ہے، مون میں تھی تو اس میں کیا نیا پن تھا؟ ہر انسان کے اندر کسی مشکل یا انہونی گھڑی میں گھنٹی بج اٹھتی ہے اس گھنٹی کو

چھٹی حس کہتے ہیں جو خطرے سے پہلے خبردار کرتی ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے انسان کے لیے ایک اور اعلیٰ قسم کی نعمت ہوتی ہے جس طرح انسان اللہ کی باقی تمام نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا اسی طرح چھٹی حس جیسی اعلیٰ پائے کی نعمت پر بھی شکر ادا نہیں کرتا بلکہ مون کی طرح اترانے لگتا ہے۔

یہ چھٹی حس مون کے اندر عام انسانوں سے زیادہ قوت رکھتی تھی اور جلد اسے معاملے کی تہ تک پہنچا دیتی۔ جیسے ہی وہ خطرہ محسوس کرتی فوراً اس کا ذہن اگلی ہدایت دینے لگتا کہ...... اب یہ کرنا چاہیے؟ اب یوں کرنا چاہیے۔

اس نے عیسٰی کا اٹھ جانا محسوس کرلیا تھا۔ اس کے اندر زور، زور سے الارم بجنے لگا تھا تب وہ فوراً اسٹوڈیو میں اپنے اثرات مٹاتی کمرے میں بھاگ آئی تھی۔ تب اس نے عیسٰی کو چکما دے دیا تھا، وہ اس کی ادھوری پینٹنگ کو مکمل کر آئی تھی۔ وہ جانتی تھی عیسٰی اپنی چیزوں کے معاملے میں کتنا پکّا ہے۔ وہ اپنے اسکول بیگ سے لے کر سائیکل تک کسی چیز کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا اور مون کی شروع سے عادت تھی وہ اپنی اعلیٰ، قیمتی اور انتہائی امپورٹنٹ چیز چھوڑ کر عیسٰی کی منتخب کی ہوئی چیزوں پر ہاتھ رکھ دیتی تھی۔ اس کی یہ عادت مما کو پسند تھی نہ پاپا کو...... وہ اسے منع کرتے، ڈانٹتے، روکتے اور سمجھاتے تھے مگر مون کو ان کا منع کرنا برا لگتا، وہ ضد میں آکر وہی کام کرنے کی کوشش کرتی جس سے اسے روکا جاتا تھا۔

کل رات مما نے اسے عیسٰی کے اسٹوڈیو میں گھسنے سے منع کیا تھا۔ یقیناً عیسٰی نے شکایت لگائی تھی اور آج وہ عیسٰی کو اس شکایت کا مزہ چکھا چکی تھی۔ وہ جان نہیں پایا تھا، اس کی ادھوری پینٹنگ کس نے مکمل کی تھی؟ وہ کبھی جان ہی نہیں سکتا تھا۔ مون جرم کرکے پھر اثرات بھی مٹا دیتی تھی اور یہ بھی تو ایک ننھا سا جرم تھا، گناہ چھوٹا ہو یا بڑا...... ہوتا تو گناہ ہے، اسی طرح جرم بھی چھوٹا ہو یا بڑا؟ ہوتا تو جرم ہے۔

غلطی یا جرم میں کامیابی حوصلہ بڑھاتی ہے۔ اور حوصلہ بڑھ جائے تو آگے کی طرف قدم خودبخود اٹھتے ہیں پھر روکے سے نہیں رکتے۔ مون کا حوصلہ ان ننھی، ننھی شرارتوں اور انتقام کے باعث بڑھتا جارہا تھا۔ مجال تھی جو کوئی اسے ڈانٹ پڑواتا۔ جب تک وہ بدلہ نہ لے لیتی اسے چین نہیں پڑتا تھا۔ وہ انتہائی ضدی، خاموش طبع اور منتقم مزاج بن چکی تھی۔ وہ کم بولتی اور کم ہنستی تھی۔ لوگوں کی طرف کم متوجہ ہوتی تھی۔ ہاں، لوگ ایسی عجیب سی بچی کو دیکھ کر خوب چونکتے تھے۔ وہ عام بچوں سے بہت مختلف تھی۔ کھیلتی نہ کودتی نہ کوئی ہنگامہ کرتی...... ٹھیک ہے، ایسے بے شمار بچے ہوتے ہیں، مریم کو اگر کوئی احساس دلاتا تب وہ بے نیازی سے کہہ دیتی تھی۔

”میری بھانجی سوزی بھی فطرتاً کم گو، خاموش طبع اور سنجیدہ بچی ہے۔“ مریم کے لیے مون کی عادتیں حیران کن نہیں تھیں۔ وہ سوزی کو دیکھتی تو مون کی طرف سے مطمئن ہوجاتی۔ مریم کی بھانجی سوزی بھی بہت کم گو تھی۔ کھیلنے کودنے سے زیادہ دوسرے کاموں میں دلچسپی لیتی تھی۔ مذہب سے اسے لگاؤ تھا۔ نانی کے ساتھ چرچ جاتی، سروس میں حصہ لیتی اور مقدس انجیل پڑھتی تھی۔ خود مریم بھی بہت سنجیدہ مزاج رکھتی تھی اور بچپن کی عادتیں بدلتی نہیں۔ اس کے لیے مون کا رویہ اچنبھے کا باعث نہیں تھا۔ یہاں تک بات ٹھیک تھی، مریم کے گھر رہنے کے دوران وہ عموماً اپنے کمرے میں گھسی رہتی۔ اسٹوری بکس دیکھتی اور کبھی کوئی گیم کھیل لیتی۔ مسئلہ تو تب پیدا ہوتا جب مریم اور حبیب گھر سے چلے جاتے تھے۔ تب مون کو ان دیکھی آزادی مل جاتی تھی۔ اس کا دماغ ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوجاتا تھا۔ وہ اپنا کوئی بھی پسندیدہ کام کرسکتی تھی۔ عیسٰی کو زچ کرتی، اسے تنگ کرتی، ستاتی مگر بغیر اسے بتائے۔ جب وہ اپنا کوئی

الٹا ہوا کام دیکھتا پھر سخت جھنجلا تا تب موّن بہت حظ اٹھاتی تھی۔ اسے عیسیٰ کو ستا کر لطف آتا تھا۔ وہ موّن سے زیادہ پاپا کے قریب تھا۔ موّن کو اس بات پر سخت قسم کی جیلسی ہوتی تھی مگر اس نے کبھی ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔

معاملات الجھتے تب ہیں جب ان پر توجہ نہیں دی جاتی۔ بچے بگڑتے تب ہیں جب ان پر نظر نہیں رکھی جاتی۔ اگر دیکھا جائے تو مریم اور حسیب کے بچے فرمانبردار تھے، سلجھے ہوئے سے، جھگڑالو نہیں تھے۔ پڑھائی میں بہترین تھے۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ مجموعی طور پر ان میں کوئی کجی نہیں تھی۔ سو مریم اور حسیب مطمئن تھے۔ ان کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ موّن کے ذہن میں کیسی، کیسی تحریک چلتی ہے۔ یا اس کا مینٹل لیول بہت آگے تک کسی غیر مادی قوت متحرکہ سے ملتا ہے۔ یا وہ انسانی سولہ حواس میں عام لوگوں سے زیادہ محسوس کرنے کی، کھوجنے کی، سراغ لگانے کی یا جانچنے کی قوت رکھتی ہے۔ ماہرین روحیت کے مطابق انسانی حواس سولہ شمار کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر لوگ پانچ حواسوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ باصرہ، سامعہ، لامسہ، ذائقہ، شامہ اس سے آگے کتنے جہان ہیں؟ ان پر توجہ کوئی نہیں دیتا حس حرارت پیما، حسِ توازن، حس قربت، حس اعضلاتی. حس وزن اور سب سے اہم ترین چھٹی حس...... ان حواسوں کے ذریعے ادراک جو نتیجہ اخذ کرتا ہے اسے ”عقل“ کہتے ہیں۔

تو کیا موّن حسیب عقل کے لحاظ سے بہت آگے تھی؟ اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا وہ غیر معمولی ذہن کی مالک نہایت منفرد بچی تھی مگر اس کی اصل ذہانت کو کوئی کھوج نہیں پایا تھا۔ اسے کوئی رہنما نہ مل سکا تھا۔

دراصل موّن حسیب کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ اور وہ اپنے اندر کون سی اہم قوت عام انسانوں سے بڑھ کر پالی تھی؟ انسان کی زندگی میں روح کی حیثیت رکھنے والی چھٹی حس...... دیکھا جائے تو یہ حس انسانی زندگی کی محافظ ہوتی ہے۔ اس کا بروقت، مناسب اور درست استعمال بے شمار لوگوں کی زندگیوں کو خطرات سے بچا سکتا ہے۔ یہ حس انسان کو خطرے سے پیشگی خبردار کر دیتی ہے اور وہ مضر قوتیں جنہیں انسانی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ ان سے محفوظ رکھتی ہے۔ جب کوئی حادثہ، سانحہ یا واقعہ اپنے وقوع پزیر ہونے سے پہلے انسانی دل میں، ذہن میں کوئی کھٹکا یا الارم بجا دے تو اس الارم کو چھٹی حس کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی انسان اس خداداد صلاحیت سے آگہی پا جائے اور اس کے تمام ہنٹس (اشاروں) کو بروقت سمجھ جائے تو وہ اپنی زندگی میں بے شمار کامیابیاں پا سکتا ہے بلکہ اپنے عزیز و اقارب، بہن بھائیوں اور دوستوں کو بھی پیشگی اطلاع دے کر محوِ حیرت کر دیتا ہے۔

موّن حسیب کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اس اعلیٰ پائے کی قوت کو جان ہی نہیں پائی۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکی۔ پھر ہوا کچھ یوں کہ جب ادراک کا وقت آیا تب تک اس کی طنابیں غلط ہاتھوں میں چلی گئی تھیں وہ غلط کو صحیح سمجھ کر اسی کی پیروی کرنے لگی تھی۔ وہ خود کو عقل کل کی مالک سمجھتی تھی مگر عمر بھر نادانیاں کرتی رہی۔

یہ بہت سال پہلے کی بات ہے، جب اس نے پہلی مرتبہ اپنے ماں، باپ کو اچانک چونکا ڈالا تھا۔ وہ دن اتوار کا تھا۔ اس روز ان کے گھر میں چھوٹی سی پارٹی تھی۔ پاپا کے چند دوست مدعو تھے۔ مما کی فیملی سے گروسی اور سوزن آئی تھیں۔ تانتے ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑوں میں مصروف تھی، ان کی طلاق کا کوئی چکر چل رہا تھا۔ گروسی کے ساتھ سوزن آئی تھی اور سوزن اس کی دیوانی تھی، موّن بھی اپنا فطری نخرہ اور غرور بھلا کر سوزن کو بہت کمپنی دیتی تھی۔ حقیقی

معنوں میں اسے سوزن سے بہت پیار تھا۔

اس پارٹی میں پاپا کے دوستوں نے موّن کو جانِ محفل کہا تھا۔ وہ اتنی حسین خوب صورت اور مغرور لگ رہی تھی جیسے کسی ریاست کی شہزادی ہو۔ سلک کا پیروں تک آتا میکسی نما ستاروں سے سجا فراک پہنے...... لمبے حسین سیدھے بلونٹی بالوں کی اونچی سی پونی بنائے سر پر ہیروں اور یاقوت کا کراؤن رکھے وہ کسی اسٹیٹ کی وکٹوریہ یا کسی جاگیر کی مہارانی لگ رہی تھی۔

پارٹی جب تک چلتی رہی موّن اور سوزن باتوں میں گم رہیں...... پھر موّن اسے راج ہنسوں کی جوڑی دکھانے لگی۔ وہ تالاب کے کنارے آ رکی تھیں۔ برقی قمقموں سے سجا گارڈن جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور وہ دونوں لوگوں کے جھرمٹ سے الگ تھلگ بیٹھی تھیں۔ تب پانی پہ تیرتے سفید راج ہنس کو دیکھ کر موّن نے سوزی کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”عیسیٰ کو دیکھو، کتنا برا لگ رہا ہے، منہ ایسے پھولا ہے جیسے غبارہ ہو۔“ موّن نے نخوت سے سر جھٹک کر عیسیٰ کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی عیسیٰ اس کی اہمیت سے بہت جیلس ہو رہا ہے۔ تب سوزن نے گردن موڑ کر عیسیٰ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کچھ کچھ بیزار نظر آ رہا تھا۔ سوزی حیران رہ گئی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ اب وہ اسی حیران چہرے کے ساتھ موّن کی طرف رخ کیے بیٹھی تھی جس کی تمام تر توجہ پانی پر تیرتے راج ہنس کی تیراکی پہ تھی۔ اس نے سوزی کی طرف دیکھے بنا جھکی آنکھوں کے ساتھ جواب دیا تھا۔

”وہ بیزار ہے...... کیونکہ پاپا نے اس کے وائلن بجانے کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی خواہش تھی وہ وائلن بجائے مگر پاپا نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ وہ بس میری تعریف کرتے اور سنتے رہے اور مجھے اپنی تعریف اچھی لگتی ہے۔“ موّن نے سابقہ

نخوت سے ناک چڑھا کر جیسے وضاحت کی تھی۔ تب سوزن کا منہ اتر گیا تھا۔

"تو کیا عیسٰی وائلن نہیں بجائے گا؟" اس کی آنکھوں میں بھی مایوسی تیرنے لگی تھی۔ جیسے وہ خاص طور پر علی عیسٰی کے وائلن کی مٹھاس بھری دھنیں سننے آئی تھی۔ اہلِ بواریا موسیقی کے دیوانے تھے۔ مون کی مما بھی اچھا وائلن بجالیتی تھیں مگر عیسٰی کو بہت اعلیٰ قسم کا وائلن بجانا آتا تھا۔ پینٹنگ، فیدر بال، سائیکلنگ کے علاوہ اسے وائلن بجانے کا بہت شوق تھا۔ یقیناً وہ وائلن بجانے کی خواہش رکھتا تھا مگر پاپا نے اس لیے منع کردیا کہ ایک مرتبہ موسیقی کی طرف سب متوجہ ہوگئے تو پھر تین، چار گھنٹے تک اٹھیں گے نہیں جبکہ حسیب احمد کو اگلی صبح ڈورٹ منڈ جانا تھا۔ کاروبار کے لیے دوسرے شہروں میں ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اب تو وہ فن لینڈ، ڈنمارک، آسٹریا اور ہالینڈ تک بھی جاسکتے تھے۔ سو طعام کی دعوت کا جلد ہی اختتام کردیا تھا مگر پھر ہوا کیا؟

محفل میں موجود کوئی بھی شخص جان نہیں سکا تھا، تالاب کے کنگرے سے اٹھ کر وہ مغرور لڑکی بلی کی چال چلتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی تھی۔ پھر اس نے بڑے احتیاط بھرے انداز میں عیسٰی کا ریکارڈ پلیئر اٹھا کر ویوالدی اور بوڑھے باخ کی دھنیں سنی تھیں۔ تین یا چار منٹ کی یہ کوشش مون کے دماغ میں سُر کی لے کو جما گئی تھی۔ اب وہ پورے اعتماد کے ساتھ ویوالدی کی دھن وائلن پر چھیڑ سکتی تھی۔ اس نے بلی کی چال چلتے ہوئے ہال کا رخ کیا تھا۔ ہال کی گلاس وال کے ایک طرف عیسٰی کا وائلن رکھا تھا۔ وہ بڑے پُرسکون انداز میں گلاس وال کی سلائڈ ہٹائے اسٹول گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ وال کی شفاف سطح پر سفید جالی دار نائیلون کا مہین سا پردہ پڑا تھا اور دوسری طرف سلک کا پھولدار...... سامنے کی طرف پھولوں کی ٹوکریاں ٹنگی تھیں۔ پھولوں سے بھری بہار دکھاتیں، فضا کو معطر کرتیں...... جن کی بھینی بھینی مہک ماحول کو خوشبودار بنارہی تھی۔

اس نے ویوالدی کا پہلا سُر بکھیرا تو لان میں موجود ہر نفس کی سانس تک رک گئی۔ یہاں کے لوگ موسیقی کے دیوانے تھے اور موسیقی ہو یا عبادت ہر کام میں دلچسپی اور ذوق دکھاتے تھے۔ اس نے اطالوی موسیقار ویوالدی کے سُر کی نقل بکھیری تھی۔ ویوالدی وہ موسیقار تھا جب وہ وینس کے سان مارکو گرجا گھر میں وائلن بجاتا تب لوگ اسے سرخ بالوں والا پادری کہتے تھے اور جہاں کھڑے ہوتے وہیں جم جاتے تھے۔ ویوالدی کے عشق میں تو جرمن موسیقار دیوہن سیبسٹین باخ بھی مبتلا تھا اور اس چھوٹی سی لڑکی نے ویوالدی کی دھن کو اتنے مکمل، با اعتماد اور بھرپور انداز میں چھیڑا تھا کہ گارڈن میں موجود ہر فرد گردن اچکا کر گلاس وال کی طرف دیکھنے لگا۔ شہر کی کریم اس وقت ان کے گارڈن میں موجود تھی۔ سب کی نگاہوں کا فوکس وہ ہی گلاس وال تھی جس کے سلائڈ اس وقت ہٹے ہوئے تھے اور سفید جالی دار نائلون کے مہین پردے ہل رہے تھے۔ ہوا کے دوش پر لہرا رہے تھے اور اندر سے وہ روح میں اتر جانے والی دھن ماحول کو ساکت کررہی تھی۔ جیسے عالم پہ لمحے بھر کے لیے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

گارڈن میں موجود ہر متنفس حیران تھا انہوں نے عمر بھر کے طویل سالوں میں ایسا نقال کوئی نہیں دیکھا تھا۔ جس نے ویوالدی کی دھنوں کو کمال طریقے سے چرالیا تھا۔

پھر.... ویوالدی کے بعد اس نے باخ موسیقاروں کے سُر فضا کے سپرد کیے تھے۔ ایک نفیس ردھم کے ساتھ ایک اعلیٰ ترین، کمال کی مہارت کے ساتھ وہ سروں، دھنوں اور کلاسیکی موسیقی کے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔ یہ لوگ باتہذیب، منظم اور تعلیم یافتہ تھے۔ موسیقی کے آداب سے اعلیٰ پائے کی

واقفیت رکھتے تھے اور موسیقی کے درمیان بات کرنے کو گناہ خیال کرتے۔ یہ طلسم بالآخر ٹوٹ گیا تھا جب سپر باخ کے سُر اپنے اختتام کو پہنچے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنا میکسی نما فراک لہراتی بڑے تفاخر سے لبوں پر مسکراہٹ لیے شانِ بے نیازی کے ساتھ سیڑھیاں اترتی نیچے آگئی تھی تب لان میں موجود ہر شخص گویا خواب کی کیفیت سے ہڑبڑا کر نکلا تھا پھر تالیوں کی گونج سنائی دی تھی۔ اور دیر تک لوگ تالیاں بجا، بجا کر اسے سراہتے رہے تھے۔ پھر کسی نے جھومتے ہوئے اسے چراغِ شب کا نام دیا تھا۔ وہ ایسے ہیرے کے مانند تھی جو رات بھر چراغ کا کام دے سکتی تھی۔

مون نے بڑے غرور کے عالم میں مما اور پاپا کو دیکھا تھا، ان کے چہروں پر خوشی اور تمتماہٹ تھی پھر اس نے سوزن کو دیکھا تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں تالیاں پیٹ رہی تھی۔ مون کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اب وہ عیسٰی کو دیکھنا چاہتی تھی مگر عیسٰی کہاں تھا؟ اس نے ایک طائرانہ نگاہ پورے لان پر ڈالی۔ عیسٰی اسے دکھائی دے گیا تھا مگر اس کے چہرے پر غصہ نہیں تھا، برہمی نہیں تھی، بس حیرت تھی، ایسی حیرت جس نے مون کو بھی ورطۂ حیرت میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کچھ دیر پہلے جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ مون اسے غصے میں دیکھنا چاہتی تھی، وہ اسے زچ کرنا چاہتی تھی، جلانا چاہتی تھی مگر وہ صرف حیران تھا...... مون جیسے بددل ہوگئی جیسے برہم ہوگئی۔ ساری محنت اکارت گئی تھی۔ اس کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔ عیسٰی کو غصہ نہیں آیا تھا بلکہ اس کی حیرانی مون کو غصہ دلا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ حیران نہیں شاکڈ تھا، مون نے ویوالدی کے سُروں کی نقل اتاری تھی مگر کیسے......؟ اس کی حیرانی بس انہی دو سوالیہ نشانوں کے گرد گھوم رہی تھی۔ ویوالدی کے سُروں کی نقل اتارنا کوئی معمولی معرکہ تھا؟ پھر اس صورت میں جب مون نے پہلے سے کبھی ویوالدی کو سنا ہی نہیں تھا...... تو پھر کس طرح......؟ وہ اتنی اچھی، عمدہ اور اعلیٰ ترین نقل کیسے اتار رہی تھی؟ اس کا ذہن جیسے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرپارہا تھا۔

پارٹی ختم ہوگئی، لوگ مون کی شان میں قصیدے پڑھ کر اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے، محفل برخاست ہوگئی تھی۔ گروسی واپس چلی گئیں اور سوزی یہیں رک گئی۔

ماما، پاپا انہیں روم تک چھوڑ کر ایک، ایک دودھ کا گلاس تھمانے کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ پاپا نے سفر پہ صبح نکلنا تھا سو وہ جلدی سونا چاہتے تھے۔ گھر پر کچھ ہی دیر میں ہُو کا عالم طاری ہوگیا تھا۔ مون اور سوزی کمرے میں چلی گئی تھیں جبکہ عیسٰی دبے قدموں چلتا ہوا پہلے اپنے اسٹوڈیو کی طرف آیا۔ لائٹس آن کرکے وہ اپنی پینٹنگ کو دیکھنے لگا تھا۔ ادھوری تصویر جو یک دوپہر کو نیند کے دوران مکمل ہوگئی تھی مگر کس طرح؟ وہ کئی دن تک اسی شاک میں رہا تھا پھر جیسے بھول بھال گیا تھا۔ اب اگر دوبارہ سوچتا تو جیسے کئی پرتیں کھلنے لگتیں۔

وہ پینٹنگ کو ہاتھ سے چھو رہا تھا۔ یہ ایک مشکل سا منظر تھا۔ آلپس کا کوہستانی سلسلہ، ڈوبتا ہوا سورج اور ساتھ گرتی ہوئی برف دکھانا بہت کٹھن کام تھا۔ ایک طرف کونجیں اڑ رہی تھیں۔ پہاڑوں کی نوکوں پر پھر اچانک ایک کونج ڈار سے بچھڑ گئی تھی اور اب اس کونج کو اداس، ویران حالت میں دکھانا تھا۔ وہ بس آلپس کے پہاڑ بنا کر ہی تھک گیا تھا اور جانتا تھا کہ ایک ہی دن میں پینٹنگ مکمل کبھی نہیں ہوگی، اس کے لیے دو تین دن مخصوص کرنا ہوں گے۔ وہ یہی سوچ کر سوگیا تھا پھر جب اٹھا تو منظر جیسے مکمل تھا۔ یہ منظر مکمل کس نے کیا تھا؟ اب کوئی راز، راز نہیں رہا تھا۔ وہ جان گیا

تھا کہ یہ موون کی کارستانی تھی پر وہ اتنی کم مدت اور کم وقت میں اتنا مشکل منظر کیسے پینٹ کر سکتی تھی؟ اصل حیرانی بس اسی بات پر تھی...... اور اب یہ حیرانی دو چند ہو گئی تھی۔ اوپر ہال کی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنا ریکارڈ پلیئر دیکھا تھا۔ تو گویا موون نے پہلے ریکارڈ پلیئر کو استعمال کیا تھا...... یعنی ویوالدی کے سر سنے تھے پھر ان کی نقل اتاری؟ مگر اتنی کم مدت اور مختصر سے وقت میں اس نے اتنی اعلیٰ پائے کی نقل کیسے اتار لی تھی؟ وہ پندرہ سالہ لڑکا جیسے چکرا کر رہ گیا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی، اس کی بہن غیر معمولی ذہن رکھتی ہے، وہ جس چیز کو ایک مرتبہ دیکھ لیتی یا سن لیتی، وہ چیز اس کے ذہن سے عمر بھر کے لیے نکل نہیں سکتی تھی۔

وہ جیسے شاکڈ سا الٹے قدموں نیچے کی طرف آ گیا...... اب وہ موون کے بیڈ روم کا دروازہ ناک کر رہا تھا۔ پھر وہ ہینڈل گھما کر اندر آ گیا۔ کمرے میں نائٹ بلب آن تھا...... سوزی سنگل بیڈ پر گہری نیند سو رہی تھی تاہم موون ابھی تک جاگ رہی تھی۔ وہ جاگ نہیں رہی تھی تب بھی عیسٰی اسے اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے اندر اتنی بے چینی تھی کہ وہ صبح ہونے تک کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

موون نے اپنے تیز اندازوں سے سمجھ لیا تھا کہ جب سب سو جائیں گے۔ مما، پاپا اپنے کمرے میں چلے جائیں گے تب ضرور عیسٰی اس کے کمرے میں آئے گا، وہ اسی لیے جاگ رہی تھی۔ وہ فی الحال سونا نہیں چاہتی تھی۔ اسے بھی عیسٰی کی بے چینی سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل رہا تھا سو اس موقع کو کیسے گنوا دیتی پھر جیسے ہی اس کی چھٹی حس نے الارم بجایا، وہ ایک دم الرٹ ہو گئی تھی۔

عیسٰی اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ عیسٰی اب اسٹوڈیو کی طرف جا رہا تھا، عیسٰی اب سیڑھیاں چڑھے گا پھر وائلن کو دیکھے گا، ریکارڈ پلیئر چیک کرے گا اور پھر الٹے قدموں موون کے کمرے کی طرف آئے گا...... سو وہ انتظار کرنے لگی تھی۔ عیسٰی آ چکا تھا، اب ناک کر رہا تھا پھر ہینڈل گھما کر اندر آ گیا تھا۔ موون نے آنکھیں کھول لیں، وہ جیسے عیسٰی کی منتظر تھی۔

”موون تم جاگ رہی ہو تو باہر آ جاؤ، مجھے نیند نہیں آ رہی۔ باتیں کرتے ہیں، یہاں سوزی ڈسٹرب ہو گی۔ سفر کر کے آئی ہے۔ یقیناً تھکی ہو گی۔“ عیسٰی نے ہمیشہ کی طرح بڑے مہذب انداز میں بات کی تھی۔ وہ اسی لیے مما، پاپا کی آنکھوں کا تارہ تھا۔ وہ بہت نرم اور شائستہ لہجے میں بات کرتا تھا اور عیسٰی یہ جانتا نہیں تھا کہ موون بھی غیر محسوس انداز میں اس کی نقل کرنے لگی تھی۔ کم گوئی، سنجیدگی اور آنکھ جھکا کر بات کرنا کچھ تو فطرتاً یہ وصف اس میں بدرجہ اتم پائے جاتے تھے اور کچھ وہ عیسٰی کی کاپی کرتی تھی...... مگر یہ بات عیسٰی نہیں جانتا تھا۔

موون نے کچھ دیر سوچا اور پھر آرام سے بستر کو چھوڑتی اٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنے ڈریسنگ گاؤن کا ہم رنگ اسکارف سر پر لپیٹا اور باہر آ گئی۔ وہ دونوں بہن، بھائی اب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ عیسٰی نے لیمپ جلا دیا تھا۔ لاؤنج میں زرد سی ہلکی روشنی پھیل گئی تھی۔ اب وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ موون جانتی تھی، وہ عنقریب موضوع کی طرف آ جائے گا۔ سو وہ جلد ہی موضوع کی طرف آ گیا تھا۔ مگر اس سے پہلے وہ فریج سے کوک اور چاکلیٹس لانا نہیں بھولا تھا۔

”موون! تم نے کیگلے (violin) بجانا کہاں سے سیکھا؟ اور کب سیکھا؟“ اس نے کوک کا ٹن موون کو پکڑا کر حیرت سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں حیرانی کوٹ، کوٹ کر بھری تھی۔ موون کے اندر بڑی مزیدار کھد بد ہونے لگی۔ وہ ایسی بے چینی تو عیسٰی کی آنکھوں میں، اس کے اندر دیکھنا چاہتی تھی۔ کتنے انتظار کے بعد یہ خوب صورت وقت

آیا تھا۔ بالآخر وہ عیسٰی کو چونکانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب اسے دھیرے، دھیرے اپنے آس پاس موجود ہر ایک فرد کو چونکانا تھا جیسے اسے اچانک اپنی کچھ پوشیدہ خوبیوں کا ادراک ہو گیا تھا۔ دراصل آج کی محفل میں پاپا کے فرینڈز نے اس کی بے تحاشا تعریفیں کر کے اسے احساس دلا دیا تھا کہ اس میں کچھ خاص ضرور ہے۔

”کچھ دیر پہلے...... وائلن بجانے سے چار منٹ پہلے......“ موون نے شانِ بے نیازی سے کہا تھا۔ عیسٰی ہکا بکا رہ گیا۔

”تم نے ویوالدی کی دُھن کہاں سے سنی؟ اور کیسے نقل اتاری...... مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، میں ابھی بے یقین ہوں۔“ عیسٰی نے چاکلیٹ کا ریپر پھاڑے بغیر سینٹرل ٹیبل کی طرف اچھال دی تھی۔ اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ پچھلے دو سالوں سے ویوالدی کی دُھنوں کو سن رہا تھا مگر ایک مرتبہ بھی اس کی نقل نہیں اتار سکا تھا جبکہ موون اسے شاکڈ کرنے پر تلی تھی۔ صرف چار منٹ کے دوران وہ ویوالدی کی ہر دھن کو کیسے ذہن میں ترتیب دے چکی تھی! یہ مقام حیرت تھا، وہ کیسے نہ دم بخود ہوتا۔

”تمہیں یقین نہیں آئے گا، میں تمہیں موتسارت (جرمن موسیقار) کی کوئی بھی دُھن سنا سکتی ہوں۔“ موون نے عیسٰی کی آنکھوں میں دیکھے بغیر بڑے اعتماد سے کہا تھا۔ یہ اس کی سب سے بڑی انفرادیت تھی۔ وہ لوگوں کو دیکھے بنا بات کرتی تھی۔ اس کے سامنے کوئی بھی ہوتا، وہ کسی کی نگاہ میں نگاہ ڈال کر بات کرنے کی عادی نہیں تھی۔ وہ اپنے دور کی نہایت عجیب بچی تھی۔ حالانکہ وہ بچپن چھوڑ رہی تھی، لڑکپن کی حدود میں داخل ہو رہی تھی مگر اس کے چہرے کی سنجیدگی کسی بائیس سالہ دوشیزہ سے کم نہیں تھی۔ اس کی بات سن کر عیسٰی جیسے ٹھٹک گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا، موون نے موتسارت کا ہی نام لیا ہے؟ اسے جیسے سننے میں مغالطہ ہوا تھا۔ وہ پھر سے جیسے تصدیق کر رہا تھا اور موون اس کے حواس اڑا رہی تھی۔

”تم اپنا ریکارڈ پلیئر اٹھا لاؤ، موتسارت کی موسیقی سنو، مجھے چار منٹ کا وقت دینا...... میں پیانو بجا کر تمہیں موتسارت کی نقل اتار کر دکھاؤں گی......“

موون نے بڑے تفاخر کے ساتھ جیسے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اتنی پُراعتماد تھی جیسے یہ کام اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ عیسٰی کو دھچکا لگا...... پھر جیسے موون کو جھٹلانے کی خاطر وہ اپنا ریکارڈ پلیئر اٹھا لایا تھا۔ اس نے موتسارت کی دھن سیٹ کی۔ ریکارڈ پلیئر سے سُر بکھرنے لگے تھے۔ چار منٹ گزر گئے، اب وہ ریکارڈ پلیئر آف کر رہا تھا پھر جیسے اس نے چیلنج بھری نظروں سے موون کی طرف دیکھا تھا گویا کہہ رہا ہو...... ”اب کر کے دکھاؤ۔“

موون کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ بکھر گئی تھی پھر جیسے اس نے عیسٰی کا دیا چیلنج قبول کر لیا تھا۔ اس نے پیانو بجایا اور موتسارت کی دھن عیسٰی کی سماعتوں میں اترنے لگی تھی۔ موون کی قوت سامعہ بہت شارپ اور حساس تھی۔ وہ جیسے دم بخود رہ گیا تھا پھر موون نے عیسٰی سے بڑے غرور بھرے لہجے میں کہا۔

”اب تم بجا کر دکھاؤ۔“ وہ چاکلیٹ کھاتی بڑی مسرور تھی۔ جیسے اسے یقین تھا کہ عیسٰی بھی اس کا دیا چیلنج پورا نہیں کر سکے گا اور وہ حقیقتاً ناکام ہو گیا تھا۔ کیونکہ موون اسے جتا، جتا کر شرمندہ کر رہی تھی کہ وائلن کا کون سا سُر فلاں نوٹ سُر سے ہٹا ہوا تھا۔ کہاں ردھم ٹوٹا، کہاں موسیقی کی لہریں بے ہنگم شور سنانے لگی تھیں۔

اگر موتسارت صرف تین برس کی عمر میں پیانو کے سُر سمجھنے لگا تھا، چار برس کی عمر میں وائلن کے بے ترتیب نوٹ سُر پر چونکنے لگا تھا پانچ برس کی عمر میں بڑے اعتماد کے ساتھ پیانو بجانے لگا تھا اور چھ برس کی عمر میں موسیقی کمپوز کرنے لگا تھا تو بلاشبہ وہ ایک

حیران کن تخلیق کار تھا جبکہ اس کی بہن اگر و یوالدی اور موتسارت کی نقل اتار لیتی تھی اور بنا غلطی کیے ان کی دھن بجالیتی تو یہ بھی کم حیرانی والا مقام نہیں تھا۔ علی عیسیٰ جیسے ششدر رہ گیا تھا۔

”یہ حیران کن ہے۔“ بالآخر جیسے اس نے تسلیم کر ہی لیا تھا۔ تاہم آنکھوں میں حیرت اب بھی بھری تھی۔ معاً اسے خیال آیا تھا۔

”تم نے ہی میری گیملدے (پینٹنگ) کو مکمل کیا تھا؟“ اس کی آنکھوں میں پھر سے الجھن تیرنے لگی۔

”یقینی طور پر اسے میں نے ہی مکمل کیا تھا۔“ مون کا تفاخر بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کو متاثر کرنے اور چونکانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ عیسیٰ جیسے رک سا گیا۔

”اتنے کم وقت میں کیسے......؟ میں تو صرف ڈیڑھ گھنٹے تک سویا رہا تھا۔“ وہ کچھ سوچ، سوچ کر بول رہا تھا۔ تب مون نے فخریہ انداز میں اپنا کارنامہ بتایا تھا۔

”میں نے ایک گھنٹا اٹھائیس منٹ میں پینٹنگ مکمل کردی تھی۔“ مون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جیسے علی عیسیٰ کی حیرت اسے محظوظ کررہی تھی۔ یہ بہت انوکھا تجربہ تھا۔ لوگوں کو چونکا کر انہیں ورطۂ حیرت میں ڈالنا اور پھر ان کی حیرت سے لطف اندوز ہونے میں اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی شایان طریقے سے مما، پاپا کو بھی تو تحیر کرسکتی تھی اور اپنے کلاس فیلوز اور ٹیچرز کو بھی حیران کرسکتی تھی۔ تو کیا اسے اور لوگوں کو بھی چونکا کر حظ اٹھانا چاہیے؟ جیسے فیصلہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے اندر موجود حسِ لطیف کو تسکین پہنچانے کے لیے کچھ بھی کرسکتی تھی اور اس کچھ بھی میں بہت کچھ شامل تھا۔ مون کے لیے یہ ایک منفرد قسم کی ایکٹویٹی تھی، ایک انوکھی طرز کا کھیل تھا۔ جسے کھیلنے میں اسے خوب لطف آنے لگا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ اس کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ وہ ہر نئے دن میں نئی طرز کی تازگی محسوس کرتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ایک شائستہ کھیل تھا۔ تہذیب، لیاقت، قابلیت، اخلاق انسانیت، خوش خلقی اور زیبائش سے آراستہ...... اس کھیل میں کسی کا کوئی نقصان نہیں تھا...... وہ محض اپنی ذات کی تسکین چاہتی تھی۔ اس کھیل میں وہ لوگوں کی نگاہوں میں انفرادیت پانے لگی تھی۔ لوگ اسے دیکھ کر چونک جاتے تھے، سرگوشیاں کرتے، اسے دیکھ کر اشارے کرتے اور اسے اپنی نگاہوں میں اعلیٰ مقام دیتے۔ وہ بہت جلد اپنے حلقۂ احباب میں مقبولیت پانے والی تھی۔ اس کی قسمت کا ستارہ بہت بلند تھا اور وہ بہت چھا جانے والا مقام حاصل کرنے والی تھی۔

پھر ہوا یوں کہ عیسیٰ حیران، حیران اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور مون بڑے تفاخر سے مسکراتی ہوئی اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر بھی موجود تھے۔ مون، عیسیٰ، سوزن اور پاپا...... مما ناشتا بنارہی تھیں۔ آج ننھی اپنی ماں کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ اس کی ماں اکثر بیمار رہنے لگی تھی اور وہ ماں کی جگہ کام پر آتی تھی۔ مما نے اپنی سہولت کے لیے انہیں رکھا ہوا تھا۔ ویسے ان کے گھر میں اتنا پھیلاوا نہیں ہوتا تھا۔ مون اور عیسیٰ بڑے نفیس اور مہذب بچے تھے۔ گندگی سے دور رہتے اور عام بچوں کی طرح پھیلاوا نہیں ڈالتے تھے۔ گھر کا کام صفائی وغیرہ ننھی کی ماں کے ذمے تھا اور اس کی بیماری کے باعث اب ننھی کام پر آتی تھی۔ مما کھانا خود بناتی تھیں اور اس معاملے میں بہت کانشس بھی رہتی تھیں۔

ہاں، تو ذکر ہو رہا تھا۔ اس انوکھی صبح کا۔ جو اپنے اصل ڈھنگ سے ہی طلوع ہوئی تھی۔ اس صبح میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ عام دنوں کی طرح عام سی سویر تھی۔ مگر یہ سویر عام کہاں تھی؟ اس صبح پاپا نے ڈورٹ منڈ جانا تھا۔ وہ آفیشل کام کے لیے جارہے تھے۔ اور اکثر جاتے رہتے تھے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پاپا کے آفیشل ٹورز کے دوران مما ان کے آفس کو دیکھتی تھیں۔ وہ پاپا کی بہت مدد کرتی تھیں۔ وہ ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں تھیں اور بڑے منظم طریقے سے دفتر اور گھر کو دیکھتی تھیں۔

جب پاپا ”سی یو سون“ بول کر دونوں بچوں کو پیار کرکے جانے لگے تب اچانک مون نے انہیں روک لیا تھا۔

”آپ کہاں جارہے ہیں پاپا؟“ وہ جوس پیتی اچانک بولی تھی۔ جیسے ان کی تیاری کو بڑی حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور ان کے اٹھنے سے پہلے اس نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ پاپا کہیں جانے کے لیے اتنا تیار بیٹھے ہیں اب جو اس نے دھیان دیا تو پاپا کے سفری بیگ پر بھی نظر پڑ گئی تھی جسے مریم آخری مرتبہ سرسری انداز میں چیک کررہی تھی کہ آیا کوئی چیز رہ تو نہیں گئی تھی۔

”ڈورٹ منڈ...... تم لوگوں کے چاکلٹس آجائیں گے۔“ انہوں نے باری، باری عیسیٰ اور مون سے کہا تھا۔ جیسے انہیں یقین تھا کہ وہ چاکلیٹس کی فرمائش ہی کرے گی۔ ان دنوں مون کو چاکلیٹس کھانے کا جنون تھا۔

”کیا جانا ضروری ہے؟“ اس نے ایک مختلف بات کی تھی۔ وہ کچھ حیران ہوئے پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی، وقت آگے کھسک رہا تھا ان کی فلائٹ کا ٹائم قریب، قریب تھا۔

”بہت ضروری ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر بیٹی کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سرخ، سنہری بال منہ پر گر رہے تھے۔

”کتنا ضروری ہے؟“ مون نے ایک بھوں اچکا کر پوچھا تھا۔ اب کہ اس کے سوال نے انہیں چونکا دیا تھا۔

”اٹس ویری امپورٹنٹ......“ وہ کچھ، کچھ الجھ گئے تھے پھر جیسے اپنی الجھن مٹانے کی غرض سے بولے۔ ”واٹ ہیپنڈ؟“ ان کے چہرے پر تفکر کے سائے پھیل گئے تھے۔ تب اس نے جوس کا گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ آج سفر نہ کریں۔“ اس کی آنکھوں میں ہلکی، ہلکی پریشانی تھی، جس نے مما، پاپا کے ساتھ عیسیٰ اور سوزن کو بھی ٹھٹکا دیا تھا۔ پاپا کے بجائے مما نے قدرے برہمی سے پوچھا۔

”کیوں...... کیا وجہ ہے؟“ وہ ناشتا کررہی تھیں۔ ایک دم خفا ہو کر کہنے لگیں۔ گویا صبح، صبح بدشگونی کی بات انہیں پسند نہیں آئی تھی۔

”بس مجھے لگتا ہے، پاپا کا آج سفر کرنا مناسب نہیں۔“ مون نے دوٹوک بات کرکے دوبارہ سے جوس پینا شروع کردیا تھا۔ اب وہ اپنی E S P کی حامل قوت کا ذکر کیسے کرتی؟ کیا یہاں بیٹھے افراد اس کی بات پر یقین کرنے والے تھے؟ حالانکہ ابھی ابھی پاپا کا سفری بیگ دیکھ کر اس کے اندر مخصوص الارم بجا تھا۔ پاپا کہاں جارہے ہیں؟ پاپا کیوں جارہے ہیں؟ پاپا کو ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ کم از کم آج کے دن نہیں۔

”تمہیں کیوں لگتا ہے؟ کیا تمہیں الہام ہوا ہے؟ یا کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے؟“ اب کہ مریم کا لہجہ برہم نہیں تھا۔ وہ خاصی نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔ تاہم ناشتے سے مریم نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ وہ ایک دم وسوسے کا شکار ہوگئی تھیں۔ کیا خبر، مون نے کوئی سپنا دیکھا ہو؟ بھیانک سپنا......

”خواب نہیں دیکھا...... پر میرا دل کہہ رہا ہے جیسے آج کچھ ہوجائے گا۔ پاپا کو نہیں جانا چاہیے۔“ مون نے کچھ بے چینی سے اپنی بات مکمل کی تھی تب پاپا نے بڑے پیار سے ان دونوں ماں، بیٹی کو سمجھایا تھا۔

”وہم نہیں کرو، کچھ بھی نہیں ہونے والا۔“ وہ

مطمئن تھے اور اب اپنا کوٹ پہن رہے تھے۔ یعنی وہ رکنے والے نہیں تھے۔ موں مضطرب سی کھڑی ہوگئی تھی پھر اس نے ماں کو اشارہ کیا۔

''آپ پاپا کو روک لیں مما......'' موں التجا کررہی تھی۔ مریم بے چین کھڑی تھی جبکہ عیسٰی کسی بھی چیز کی طرف دھیان دیے بغیر صرف موں کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یک ٹک، حیرانی کے عالم میں جیسے کچھ کھوجنا چاہ رہا تھا۔ مگر موں کے تاثرات ایک دم سپاٹ تھے۔ کچھ بھی اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ وہ جیسے ناکام سا ہوگیا۔

''حسیب! آپ ڈورٹ مائنڈ نہ جائیں۔'' مریم نے موں کے دل کی بات چھین لی تھی۔ وہ موں کے وہم کا شکار ہوگئی تھیں اور مریم نے حسیب کو روکنے کی پہلی کوشش بالآخر کر ہی دی تھی۔

''مریم! تم بھی......'' وہ جیسے زچ ہوگئے تھے۔ ''موں تو بچی ہے، تم تو سمجھدار ہو، جانتی بھی ہو، میرا جانا کتنا اہم ہے۔'' وہ جھنجلا کر رہ گئے تھے۔ گویا ان ماں، بیٹی نے انہیں گہری کشمکش میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ آگے جانے اور رک جانے کے درمیان پھنس گئے تھے۔

''زندگی سے زیادہ ''اہم'' کچھ نہیں ہوتا پاپا!'' ان کی چھوٹی سی بیٹی نے جیسے ایک مرتبہ پھر انہیں ٹھٹکا دیا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے تھم سے گئے تھے۔ موں نے کتنی گہری اور اہم بات کی تھی۔ اتنی سی عمر میں اتنی سنجیدہ بات...... جیسے وہ کسی تجربے کی روشنی میں کہہ رہی ہو۔

''میری زندگی کو بھلا کیا خطرہ ہے؟'' حسیب نے مذاقاً گفتگو کو ختم کرنے کے لیے کہا تھا۔ مگر موں مذاق کے موڈ میں کہاں تھی۔ وہ ان کی بات سن کر عجیب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ انہیں کم از کم موں کی نظریں کچھ عجیب ہی لگی تھیں۔

''پاپا! حادثے بتا کر نہیں ہوتے...... پھر بھی احتیاط ضروری ہے، آپ نے کبھی نوٹ کیا؟ ہمارے اندر کسی انہونی کے وقت کچھ گونج جاتا ہے۔ جیسے دل بجھ سا جاتا ہے یا ہلکے ہلکے وسوسے چٹکیاں بھرتے ہیں۔ میرے ساتھ ایسا ضرور ہوتا ہے؟ جانے آپ کے ساتھ ہوتا ہے یا نہیں۔'' موں نے اتنی گہری بات بہت عام سے لہجے میں ان کے گوش گزار کردی تھی۔ حسیب اور مریم کے ساتھ عیسٰی بھی ٹھٹک کر موں کو دیکھنے لگا تھا جبکہ سوزن پہلے ہی ورطۂ حیرت میں مبتلا بیٹھی تھی۔ اس کی اکلوتی کزن ہمیشہ سے اسے چونکاتی آئی تھی۔ آج بھی اسے چونکا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کوئی انہونی بات ہی کرتی تھی جسے عقل تسلیم ہی نہیں کرتی...... مگر وہ ہو کر رہتی تھی۔

''میرے ساتھ بھی ایسا ضرور ہوتا ہے، میرا دل بھی کہہ رہا ہے آپ نہ جائیں۔'' مریم نے گویا فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ جیسے بے بس ہوگئے تھے۔ اگرچہ ان کا اپنا دل کچھ بوجھل سا تھا۔ طبیعت بیزار تھی مگر وہ اس بوجھل پن کو نیند کی کمی سے عبارت کررہے تھے۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے شاید طبیعت مضمحل تھی۔ ان کے دل میں بھی کچھ عجیب سی بے چینی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے پارہے تھے۔ مگر مریم اور موں اس بے چینی کو خطرہ قرار دے رہی تھیں۔ تو کیا انہیں اپنی بیوی اور بیٹی کی بات مان لینی چاہیے؟ وہ تذبذب کا شکار کھڑے سوچتے رہ گئے تھے۔

''پاپا آپ نہ جائیں۔ مما اور موں منع کررہی ہیں۔ نقصان ہوتا ہے تو ہوتا رہے، کیا خبر یہ سفر آپ کے لیے ٹھیک نہ ہو۔'' بہت دیر بعد عیسٰی نے بھی لب کشائی کی تھی۔ جب موں اتنا اصرار کررہی تھی تو پھر بحث بیکار تھی۔ کیا پتا، وہ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس نے کوئی خواب دیکھا ہو یا پھر اس کے دل کا وسوسہ بے بنیاد نہ ہو۔ کچھ بھی تو متوقع ہوسکتا تھا۔

''اُف...... تم بھی۔'' پاپا زچ ہوا ٹھے تھے۔

''میں کون سا خود کار ڈرائیو کرنے والا ہوں جو

ایکسیڈنٹ کا خدشہ ہوگا۔'' وہ ذرا چڑ گئے تھے۔ سب کی ایک ہی تکرار نے انہیں عاجز کردیا تھا۔

''اللہ نہ کرے......'' مریم دہل گئی تھی۔

''بائی ائر جارہا ہوں...... پھر کس لیے ٹینشن ہے؟ آرام دہ سفر ہوگا۔ زیادہ طویل بھی نہیں۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے تھے۔ تو گویا وہ قطعاً رکنے والے نہیں تھے۔ موں سخت مضطرب ہوگئی تھی۔ وہ کیسے پاپا کو روکے؟

''پاپا! میرا دل کہہ رہا ہے، آج کچھ ہو کے رہے گا۔ آپ نہ جائیں پاپا پلیز......'' موں کچھ ملتجی ہوگئی تھی۔ پاپا ان کے وسوسوں اور وہموں کو بے بنیاد کہہ رہے تھے۔ شاید ان کے وہم بے بنیاد ہی تھے۔ پاپا نے ان سب کو الوداعی مسکراہٹ سے نوازا تھا پھر موں کو خصوصی پیار کرکے باہر نکل گئے تھے۔ مریم کچھ افسردہ ہورہی تھی، جیسے اس کا دل بجھ رہا تھا۔ موں، پاپا کے چلے جانے کے بعد دوبارہ ناشتے میں مصروف ہوگئی تھی۔ گویا اس کا تفکر اب ختم ہوچکا تھا۔ وہ انہیں خبردار کرچکی تھی۔ اب پاپا کے عمل کی ذمے داری ان کے اپنے سر تھی۔ مریم کو اب موں کی بے نیازی پسند نہیں آرہی تھی۔ برتن سمیٹتے ہوئے مریم کن انکھیوں سے موں کے ہمیشہ والے سپاٹ تاثرات کو دیکھ رہی تھی پھر عیسٰی اور سوزن کے اٹھتے ہی وہ موں کے برابر آبیٹھی۔ گویا مریم کے اندر بھی کھد بد ہورہی تھی۔ دراصل وہ موں کے وسوسے اور وہم کی کھوج کرنا چاہتی تھی۔ آخر موں نے آج کیا محسوس کیا تھا؟

''موں بیٹا......! یہ جو تم نے پاپا کو روکا، تم نے آخر کیوں روکا؟ تم نے کیا دیکھا؟'' مریم کے لہجے میں دبا، دبا تجسس اور تفکر بھی تھا۔ وہ ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ ہوچکی تھی۔ اسے موں کی بات بہت غیر معمولی لگی تھی۔ موں کے تاثرات بھی اس لمحے کچھ ایسے ہی تھے۔

''میں نے غلط کیا جو پاپا کو روکا، اب آپ سب

قومی زبان و تشخص کی اہمیت

کیا آپ کو معلوم ہے کہ 1945ء میں جب جاپان پر تاریخ کا بدترین وقت آیا اور اس کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو کو امریکی جنرل میک آرتھر کے سامنے لاچار انداز میں بیٹھ کر آئندہ کے لیے امریکا، جاپان تعلقات کے معاملات طے کرنا پڑے تو ہیرو ہیٹو نے واحد شرط کیا رکھی تھی؟ جی ہاں ہزیمت خوردہ شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے کہا تھا۔

''میرے نظام تعلیم اور جاپانی زبان کو نہ چھیڑنا۔'' یہ انتہائی دانشمندانہ اور دور رس نتائج کا حامل فیصلہ تھا اور اس فیصلے کے ثمرات دیکھیے کہ کتنی جلد جاپان دنیا کا مضبوط ترین معیشت کا حامل ملک بن گیا۔ دانشمند قوم کے دانشمند رہنما ایسے ہی فیصلے کرتے ہیں۔ قائد اعظم بھی ہمارے دانش مند رہنما تھے۔ تبھی انہوں نے دوٹوک انداز میں اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کا کھل کر اظہار کیا تھا۔

چین 1949ء میں آزاد ہوا تو وہاں بے شمار ایسے اسکول و کالج تھے جہاں انگریزی رائج تھی۔ ماؤزے تنگ نے آزادی کے ساتھ اعلان کردیا کہ ذریعۂ تعلیم بھی صرف چینی زبان ہوگا۔ چین کی ترقی آج ہمارے سامنے ہے۔ فرانس میں لفظ برگر جیسے الفاظ تک ادا کرنے پر پابندی ہے اور جو بھی الفاظ فرانسیسی زبان میں دستیاب ہوں ان کی جگہ انگریزی کا لفظ منتخب کیا جائے تو ایسے شخص پر جرمانہ عائد کردیا جاتا ہے۔ اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد ہی عبرانی زبان کو رائج کردیا گیا حالانکہ یہ قوم پوری دنیا میں تقریباً ڈھائی سو سال دربدر رہی۔

انتخاب از۔ کالم جواں فکر تحریر ڈاکٹر نوید اقبال

مرسلہ: نفیسہ آرا، یو اے ای۔

میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ابھی تو عیسٰی اور سوزن کی بھی تفتیش بھگتوں گی۔'' مون نے بگڑ کر انتہائی بدتمیزی سے کہا تھا پھر اپنی اسکرٹ کو جھاڑتی نخوت سے بولتی ہوئی اٹھ گئی تھی جبکہ مریم کچھ ہکا بکا ہوگئی۔ یہ مون کو بھلا کیا ہوا تھا؟ وہ ایسی تو نہیں تھی؟ مریم دق سی بیٹھی اپنی لاڈلی کو جاتا دیکھتی رہ گئی تھیں۔

مون نے مریم سے جو کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ اسے عیسٰی اور سوزن کی بھی تفتیش بھگتنا پڑی تھی۔ جب وہ تیار ہو کر اسکول جانے لگی تب عیسٰی نے مون سے پوچھا۔

''تم نے پاپا سے ایسی بات کیوں کہی؟'' وہ بھی حیران تھا مگر زیادہ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ جیسے مون کی بات کے پس پردہ کسی وجہ کو کھوجنا چاہتا تھا۔ پہلے سے چڑی مون کچھ اور چڑ گئی تھی۔

''ایک جرم سرزد ہوگیا تھا مجھ سے...... آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی......'' مون بھنائی، بھنائی سی اپنا اسکول بیگ چیک کرنے لگی تھی۔ جب پاپا کی کار کا ہارن سنائی دیا تھا۔ مون کے بیگ میں کتابیں رکھتے ہاتھ رک سے گئے تھے۔ عیسٰی ٹائی کی ناٹ لگاتا تھم گیا تھا۔ سوزن اسکول شوز پہن رہی تھی۔ لیسز بند کرتی حیران رہ گئی تھی۔ مریم کچن سے متحیر سی باہر نکل آئی۔

''حبیب واپس آگئے......'' مریم نے جیسے سکون سے بھری سانس خارج کی۔ دل کی ساری بے چینی سمٹ کر ایک نکتے میں ڈھل گئی تھی۔ مریم جیسے مطمئن ہوگئی۔

''پاپا آگئے......؟'' عیسٰی کے تاثرات بھی کم و بیش مریم جیسے تھے۔ وہ ٹائی کو پکڑے، پکڑے انٹرنس ڈور تک گیا تھا۔

''تو کیا واقعی پاپا آگئے......؟'' مون نے بیگ کو ایک طرف رکھ دیا تھا۔ وہ منتظر نظروں سے لاؤنج کے انٹرنس ڈور کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں سے کچھ دیر بعد پاپا داخل ہونے والے تھے۔ سوزن کے تاثرات ان سب سے مختلف تھے۔ اس کے انتہائی سرخ پھولے اور چکنے گالوں پر مسکراہٹ کے ننھے گڑھے پڑ رہے تھے۔ کانوں میں پڑی بالیاں جھول رہی تھیں۔ جن کے نیچے موٹا سا سنہری موتی لٹک رہا تھا۔ وہ جیسے بے یقین نظروں سے مون کو دیکھ رہی تھی۔

''انکل نے تمہاری بات مان لی۔'' سوزن اب بھی حیران اور بے انتہا حیران تھی۔ تب مون نے چونک کر اپنی بے ضرر سی کزن کو دیکھا تھا پھر جیسے سر جھٹک کر بولی۔

''لگتا ہے پاپا کی فلائٹ مس ہوگئی۔'' مون کے تاثرات اب بھی سپاٹ تھے۔ وہ دوبارہ سے اپنا اسکول بیگ چیک کرنے لگی تھی۔ گویا اسے پاپا کے آنے یا نہ آنے سے فرق نہیں پڑا تھا۔ انہوں نے کون سا اس کی بات مانی تھی۔ اب اگر واپس آئے بھی تھے تو اپنی مرضی سے...... سو وہ کندھے اچکا کر سوزن کی طرف متوجہ ہونے کے بعد موضوع گفتگو بدل رہی تھی۔ آج سوزن کا ایڈمیشن مون کے اسکول میں ہونا تھا۔ گروی اسے یہاں اسی مقصد کے تحت چھوڑ گئی تھیں۔ بواریا میں گھر کے کاموں اور نانی کے باڑے میں الجھ کر وہ پڑھائی نہیں کرسکتی تھی اسی لیے نانی اسے یہاں چھوڑ گئی تھیں تاکہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ پڑھ سکے۔ مون نے سوزن سے پڑھائی کے متعلق بات کرنا شروع کردی تھی۔ درپردہ پاپا پر جتانا بھی مقصود تھا کہ وہ اس کی بات نہ مان کر چلے گئے تھے اور اب واپس اپنے ہی کسی کام کی وجہ سے آئے تھے۔ مون کی بات کے احترام میں نہیں۔

''تمہارا پسندیدہ مضمون کون سا ہے؟'' وہ پاپا کو اندر آتا دیکھ کر سوزن سے مخاطب تھی۔ عموماً ان کے گھر میں اردو بولی جاتی تھی۔ سوزن بھی بہت اچھی اردو بول لیتی تھی پھر پاپا نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ

گھر میں ڈوچ نہیں بولی جائے۔ اردو بولی جائے تاکہ ان کی اردو زیادہ امپرو ہوسکے۔ ورنہ اردو سکھانے کے لیے الگ سے ٹیوٹر رکھنا پڑتا مگر اب وہ محض پاپا کو چڑانے کے لیے اونچی آواز میں سوزن سے ڈوچ میں مخاطب تھی۔

سوزن نے کچھ حیران ہو کر ڈوچ میں ہی جواب دیا تھا۔ تب تک پاپا اندر آچکے تھے اور مون کی بات بھی سن چکے تھے۔ تبھی ان کے چہرے پر خفگی نمایاں تھی۔ جیسے وہ سمجھ چکے تھے کہ مون انہیں غصہ دلانے کے لیے ایسا کررہی ہے کیونکہ انہوں نے گھر میں ڈوچ بولنے پر سخت پابندی لگا رکھی تھی۔

''مجھے افسوس ہے۔'' انہوں نے بہت برہم لہجے میں مون کو مخاطب کیا تھا۔ وہ جیسے ان کے کچھ بولنے کی ہی منتظر تھی۔

''واپس آنے پر یا ڈورٹ منڈ نہ جانے پر؟'' مون چمک کر بولی تھی۔ اس نے بیگ میں کتابیں رکھ لی تھیں۔ اب زپ بند کررہی تھی۔

''ڈوچ بولنے پر......'' تب سوزن زیرلب بڑبڑائی۔ اس کی آواز مدہم تھی۔ حبیب احمد اپنا بریف کیس صوفے پر رکھ کر مریم کی طرف متوجہ ہوگئے تھے جو ان سے واپسی کی وجہ پوچھ رہی تھی۔

''فلائٹ نکل گئی۔ تم لوگوں نے صبح ہی صبح بحث اتنی لگا رکھی تھی...... گھر سے ہی لیٹ نکلا تھا میں۔'' اب وہ فون اٹھا کر ٹرین کے ٹائم کا پوچھ رہے تھے۔ یقیناً ٹرین سے ڈورٹ منڈ جانے والے تھے۔

''ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔'' مریم نے نرمی سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ عیسٰی اب ٹی وی لگا کر شوز پہن رہا تھا۔ جب اچانک بریکنگ نیوز نے ان سب کو چونکا دیا تھا۔ مریم کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا تھا جبکہ سوزی ہکا بکا رہ گئی۔ عیسٰی اور حبیب احمد دم بخود تھے۔ البتہ مون کے تاثرات سب سے الگ تھے۔ اس کے لیے بریکنگ نیوز میں کوئی دلچسپی والی بات نہیں تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''یہ کیا ہوا......؟'' سب سے پہلے مریم نے سنبھل کر چیخ کا گلا گھونٹتے ہوئے لب کشائی کی تھی۔

''ائر کریش......'' عیسٰی زیرلب بڑبڑایا تھا۔ ڈورٹ منڈ جانے والی ڈومیسٹک فلائٹ حادثے کا شکار ہوگئی تھی۔ یہ لوگ جیسے بے جان بت بن گئے تھے۔ پتھر میں ڈھلے اور حبیب احمد صوفے پر ڈھے گئے۔ ان کے اپنے الفاظ جیسے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

''میں بائی ائر جارہا ہوں...... کون سا خود کار ڈرائیو کرنے والا ہوں جو ایکسیڈنٹ کا خدشہ ہو۔'' انہوں نے اپنا سر تھام لیا تھا۔ بڑے بول جو منہ پر آپڑے تھے۔ دل کی حالت غیر تھی جو سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ باقی لوگ الگ شاکڈ تھے۔ ٹی وی پر حادثے کی تفصیلات چل رہی تھیں اور ان کے کانوں میں مون کے وسوسے گونج رہے تھے۔

''میرا دل کہہ رہا ہے، آج آپ سفر نہ کریں۔'' انہوں نے گردن موڑ کر اپنی لاڈلی بیٹی کی طرف دیکھا تھا جس کی بحث نے انہیں بہت دیر کرادی تھی ورنہ وہ ٹائم سے جہاز میں سوار ہوجاتے اور اب تک ان کی ہڈیاں بھی جل چکی ہوتیں۔ جانے کیوں ان کے اندر عجیب سی فخریہ لہر اٹھی تھی۔ ایک ٹھاٹھیں مارتا عجیب سا طوفان جوش کھانے لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مون کی طرف آئے تھے پھر انہوں نے مون کو اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا۔

''میری پیاری بیٹی......! تمہاری وجہ سے، صرف تمہاری وجہ سے میں لقمۂ اجل بننے سے رہ گیا۔'' وہ آنسو بھری آنکھوں سے مون کا سر چوم رہے تھے۔ ان کے لہجے میں واضح تشکر تھا۔ وہ اللہ کا شکر ادا کررہے تھے جو وہ واپس صحیح سلامت اپنے بچوں میں پہنچ چکے تھے اور ادھر مون کے دل کی حالت عجیب تھی۔ اس کا وہم، وسوسہ۔ یا ESP کی حامل قوت کا اشارہ ایک ٹھوس حقیقت بنا سامنے کھڑا تھا۔

وہ خود بھی متحیر رہ گئی تھی۔ اس نے صبح، صبح الارم کی گھنٹی اپنے اندر ٹن، ٹن بجتی محسوس کی تھی۔ اسے لگا، آج کا دن اس کی فیملی کے لیے اچھا نہ ہوگا...... یا اس کے پاپا کسی نقصان سے دوچار ہونے والے تھے۔ اگرچہ نقصان ان کا اب بھی ہوا تھا۔ ایک بڑا ٹینڈر ہاتھ سے نکل گیا تھا مگر جب اللہ نے جان بچادی تھی تو پھر جہان تو مل ہی سکتا تھا۔

ایک غرور بھری مسکراہٹ لیے مون نے حاضرین کے چہروں کو دیکھا تھا۔ وہ سب جیسے ستائشی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ مون کی گردن لمحے بھر میں تن سی گئی تھی۔ جیسے کلف نے اسے اکڑا دیا تھا۔ غرور نے ان سب لوگوں میں مون کو ممتاز کردیا تھا۔ آخر جو الارم مون کے اندر بجا تھا، وہ عیسیٰ، سوزن یا مما کے اندر کیوں نہیں بجا؟ وہ لوگ تو زیادہ پڑھے لکھے تھے، خصوصاً مما، پاپا......اور عیسیٰ بھی بہت ذہین تھا، پھر اس کی ذہانت نے اسے حادثے سے پہلے خبردار کیوں نہیں کیا۔ یہ الارم صرف مون کے اندر ہی کیوں بجا تھا، اس کا مطلب تھا، مون کے اندر کوئی خاص خوبی تھی اور اسی نادیدہ خوبی نے اسے اتراہٹ میں مبتلا کردیا تھا اور یہ اتراہٹ آگے جاکر اس کے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوئی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا پھر یوں ہوا کہ گھر والوں کے علاوہ مون کے آس پاس جتنے بھی قریبی لوگ تھے سب اس کے اندازوں اور سو فیصد درست تکوں پر ہی ٹھٹکنے لگے تھے۔

ایک دفعہ بواریا میں ان کے قیام کی مختصر مدت کے دوران مریم کو بھی کچھ دن ان کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ جس دن مریم واپس آرہی تھی، اس دن مون نے اسے روک لیا۔

''مما! نہ جائیں، آج رک جائیں، کل اکٹھے نکلیں گے۔'' وہ لوگ چھٹیاں گزارنے آئے تھے۔ مریم کو پہلے جانے کی جلدی تھی کیونکہ وہ حسیب کے لیے بہت متفکر تھی۔ انہیں کھانے پینے میں مسئلہ نہ ہو۔ ننھی کی ماں بھی نہیں آرہی تھی۔ سو وہ آج من ہائیم جانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر مون نے روکا تو جیسے کسی خدشے کے تحت رک سی گئیں کیونکہ مون جب بھی کسی بات سے منع کرتی تھی تب کچھ نہ کچھ ضرور ہوجاتا تھا۔ سوئے اتفاق عیسیٰ بھی اس وقت ان دونوں کے قریب بیٹھا تھا اور ماں، بیٹی کی باتیں سن چکا تھا۔ تبھی مریم کی طرف دیکھ کر نرمی سے بولا۔

''آپ چلی جائیں مما......! پاپا کو مسئلہ ہوگا۔ ہم کل شام تک آجائیں گے۔'' عیسیٰ ماں کے تذبذب کو جان گیا تھا۔ کیونکہ مون نے جو ایک دو مرتبہ درست تکے مار کر انہیں ہراساں کیا تھا سو وہ اب در پردہ مون کی باتوں کو بہت اہمیت دینے لگی تھیں جو عیسیٰ کو مناسب نہیں لگتا تھا۔ مریم کے ذہن میں مون کی باتوں کا اثر گہرا ہونے لگا تھا۔ اس کو لگتا، مون جو بھی کہتی ہے، وہ سو فیصد نہ سہی مگر کچھ تو درست ہوتا ہے۔ اب بھی مون کے روکنے پر وہ رک گئیں جبکہ عیسیٰ چاہتا تھا، وہ چلی جائے۔ مریم چلی جائیں تو مون کے روکنے والا وہم بھی جاتا رہتا۔ مگر مریم جاتی تو تب ناں...... وہ تو مون کے وسوسوں کا شکار ہونے لگی تھیں۔ مریم کو لگ رہا تھا مون کی چھٹی حس جو کہہ رہی ہے، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ان کا جانا مناسب نہیں...... کیا خبر، کچھ ہو نہ جائے۔

''نہیں جاتی، کچھ زیادہ ضروری بھی نہیں...... کیا پتا آج کے دن میں سفر مناسب نہ ہو۔'' مریم نے کچھ سوچ کر جواب دیا تھا۔ تب عیسیٰ چڑ کر رہ گیا۔

''یہ ماہرِ فلکیات نہیں، جو دنوں، ہفتوں اور ستاروں کا حساب لگا کر لوگوں کو بتاتی ہے آج کا دن کیسا ہوگا؟ نہ اسے الہام ہوتے ہیں...... آپ اس کی باتوں میں نہ آئیں مما! اگر ایسی بات ہے تو بھی تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' وہ شدید ناگواری کے عالم میں بولتا چلا گیا تھا۔ اسے لگتا جیسے روز بروز مما، سوزی، پاپا اور تانتے وغیرہ مون کے نادر مشوروں پر

عمل کرنے لگی ہیں۔ اور وہ ہر نیا کام کرنے سے پہلے مون کو بتانا ضروری سمجھتی تھیں، اگر مون اوکے کرتی تو وہ کام کیا جاتا۔ مون اس اہمیت پر بہت مسرور تھی۔ جیسے تمام کیمروں کا رخ اس کی طرف ہوگیا تھا اور وہ گھر کے ثانوی فرد سے مرکزی حیثیت اختیار کرگئی تھی۔ اس خوبی پر وہ اتراتی پھرتی تھی۔ پہلے پاپا، عیسیٰ کو اپنے زیادہ قریب رکھتے تھے اور وہ کم عمر ناتجربہ کار ہونے کے باوجود بزنس کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ پاپا کو کئی بہترین مشورے بھی دیتا مگر مون کی اس اضافی خوبی کے باعث اب اس سے بھی کچھ نہ کچھ مشورہ ضرور کرتے۔ عیسیٰ، مون کی اہمیت پر جیلس نہیں تھا مگر وہ مون کی چھٹی حس سے ضرور خار کھانے لگا تھا۔ شاید ان دونوں بہن، بھائیوں کے درمیان دراڑ بھی اسی ESP کی حامل قوت کی وجہ سے آئی تھی کیونکہ مون نے یہ وتیرہ بنالیا تھا، جب بھی کوئی ایونٹ ہوتا، کوئی ضروری کام ہوتا، کسی نے سفر پر جانا ہوتا وہ ضرور کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑ دیتی جو ہر دفعہ نہ سہی مگر پھر بھی خوب نشانے پر درست لگتا تھا۔ اکثر تو مون، عیسیٰ کو بھی حیران کردیتی تھی۔ اور وہ اگرچہ مون کے متاثرین میں دھیرے، دھیرے شامل ہورہا تھا مگر تسلیم کرنے سے کتراتا رہا تھا۔

''اوکے...... میں ماہر فلکیات نہیں، نہ مجھے الہام ہوتے ہیں مگر میرا دل پھر بھی کہہ رہا ہے کہ آج کچھ ہو کر رہے گا۔'' وہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی اور بہت غصے میں کہہ رہی تھی۔ جیسے عیسیٰ کی بات اسے سخت بری لگی تھی۔

''کچھ بھی نہیں ہونے والا...تمہارا دل، تمہاری باتیں اور تمہاری اسٹوپڈ چھٹی حس ہم سب کو محض اپنا محتاج کرلینا چاہتی ہے...... ہم تمہارے اشاروں پر ناچیں، تم سے مشورہ لے لیں اور جو تم کہو، اسے درست مانیں۔'' عیسیٰ نے تحمل سے جیسے جتا، جتا کر اس کے غصے کا گراف بڑھا دیا تھا۔ مون کی رنگت پل بھر میں متغیر ہوگئی۔

''مجھے کسی کو اپنا محتاج بنانے کی ضرورت نہیں...... اور تم...... کیوں میری امپورٹنس سے جلتے ہو؟'' مون نے انتہائی تلخ لہجے میں بہت ٹیچ بات کی تھی، اب کہ عیسیٰ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

''میں کیوں جلوں گا؟ تمہاری حرکتیں خود تمہیں مشکوک بنارہی ہیں...... مگر تم اپنے تکبر میں کچھ سمجھتی نہیں...... جو کچھ تم کررہی ہو، غلط ہے، اپنی اس چھٹی حس کو سمجھاؤ...... تم ہر ایک کو وہم میں مبتلا کررہی ہو...... جو کہ ٹھیک نہیں، ہر بندہ اپنا کام چھوڑ کر نہیں بیٹھ سکتا ...... مگر تمہارے چھوڑے ہوئے وسوسے نما شوشے ذہنوں کو الجھا دیتے ہیں۔ کام نہ بھی بگڑنا ہو تب بھی بگڑ جاتا ہے۔'' عیسیٰ نے کھردرے انداز میں اپنی بات مکمل کی تھی۔ مریم ان دونوں کو جھگڑتے دیکھ کر ہولق ہورہی تھی۔ پھر ایک دم دونوں کو ڈپٹ کر بولی۔

''کیا فضول تکرار ہے......بس کرو اب، خواہ مخواہ بات کو طول دیتے ہو۔'' مریم کو غصہ آگیا تھا۔ وہ دونوں کچھ پل کے لیے چپ کرگئے تھے۔ مون کی آنکھوں میں شدید غصہ تھا۔

''ایک تو میں تم سب کا بھلا کرتی ہوں، اوپر سے باتیں بھی مجھے سنائی جاتی ہیں۔'' مون نے زیرِ لب بڑبڑا کر کہا۔

''ہمیں ایسا بھلا نہیں چاہیے...... جو ہمیں ہمارے مقصد سے ہٹادے۔ جو ہونا ہوتا ہے، ہو کر رہتا ہے، تم کچھ کہو یا نہ کہو...... پاپا کی فلائٹ نے ہر صورت مس ہونا تھا تم کچھ کہتی یا نہ کہتیں...... ان کا سفر بائی ائر نہیں، بائی روڈ لکھا تھا اور دوسرے اوپر سب کچھ طے ہوچکا ہے۔ اول روز سے ہی، ہمارا ہر اچھا اور ہر برا۔'' عیسیٰ اب کے کچھ رسان سے بولا تھا۔ ماں کے چہرے پر لکھی ناگواری اسے نظر آرہی تھی۔ انہیں شاید ان دونوں کی تکرار پسند نہیں آرہی تھی۔

"اور پرسب کچھ لکھا جا چکا ہے......اس سے کون انکاری ہے؟ لیکن تم میری چھٹی حس کو جھٹلا نہیں سکتے۔ عام لوگوں سے زیادہ میرے اندر یہ قوت پائی جاتی ہے۔ اور پاپا کی فلائٹ مس ہونا ہی تھی، اللہ نے انہیں حادثے سے بچانا تھا مگر وسیلہ تو میں بنی...... میں نے پاپا کو روکا تھا۔" مون نے زہر خند انداز میں جیسے اسے جتلایا تھا۔

"ہونہہ......تم نے روکا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے آج تم گوئٹے کو چھوڑ کر علم نجوم اور اس کی فلاسفی، بروج اور شخصیت، برجوں کا طلسم کدہ، پریکٹیکل پامسٹری اور خوابوں کی تعبیر وغیرہ جیسی چیزوں پر ریسرچ کر رہی ہو؟" عیسیٰ استہزائیہ بولا تھا۔ حقیقتاً اسے مون پر شک تھا کیا خبر وہ لائبریری سے لے کر اس قسم کی کتابیں پڑھتی ہو۔ ویسے تو اسے گوئٹے کو پڑھنے کا جنون تھا۔ اس نے گوئٹے کا رزمیہ ڈراما "گوٹزوان بریشن جن" اور اس کی خودنوشت پر مشتمل ناول "دی سارو آف ینگ......" پڑھ رکھا تھا۔ گوئٹے چھ زبانیں جانتا تھا اور اس نے اسٹیج کرافٹ، طبیعات، فلکیات، فلاسفی اور سائنسز سے متعلق کئی کتابوں کا جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ کل تک مون گوئٹے، موتسارٹ، ویوالدی، ویلن ٹاسنا ولاڈی اور رونالڈ کی طرح کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دینا چاہتی تھی مگر اب نہ جانے فلکیات، علم نجوم اور علم الاعداد سیکھنے کے جنون میں مبتلا ہو گئی تھی۔ حالانکہ عیسیٰ کے یہ اندازے بالکل غلط تھے۔ مون نے تو کبھی اس قسم کی کوئی کتاب دیکھی تک نہیں تھی۔ حقیقتاً اس کے اندر ایسی قوت ضرور تھی اور کچھ حساس الارم عام انسانوں سے بڑھ کے تھے۔ جو خطرے سے پہلے ٹن، ٹن گھنٹی بجا دیتے تھے۔ یہ ایک خداداد صلاحیت تھی۔ اس میں کسی کی ذاتی کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ بس عیسیٰ کو اس کی اتراہٹوں اور نخوت پر غصہ آتا تھا۔ جب سے تانتے، پاپا، مما، گروی نے اسے الگ قسم کا پروٹوکول دینا شروع کیا تھا، اس کا مزاج ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ خود کو کوئی الگ قسم کی مخلوق سمجھنے لگی تھی اور مون کا خیال تھا کہ عیسیٰ اس کی اہمیت سے جلتا ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ عیسیٰ تو اس کے غرور سے خوفزدہ رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا، مستقبل قریب میں مون بہت خسارہ اٹھانے والی تھی۔ بس یہی چھوٹی، چھوٹی وجوہات تھیں جن کی بنا پر دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جب بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتا، مون الٹا ضد میں آ کر وہی کام کرتی۔ جھگڑا کرنے کی دونوں کو عادت نہیں تھی، نہ شور کرتے نہ ہنگامہ کرتے، بس وہ اسے سمجھاتا اور مون اسے تاؤ دلانے کے لیے بڑے سلیقے کے ساتھ وہی کام کر لیتی۔ اس نے اب بھی تکے مارنے اور شوشے چھوڑنے ترک نہیں کیے تھے بلکہ اس دن مریم کو من ہائیم جانے سے روک کر وہ ایک مرتبہ پھر گھر والوں کی نگاہوں میں اونچا مقام پا گئی تھی۔ سوئے اتفاق نانی کو شام کے قریب انجائنا کا ہلکا سا اٹیک ہو گیا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ ایمبولینس بروقت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مریم کی گاڑی موجود تھی۔ سو گروی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور بروقت اسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے بھی یہی کہا وہ لوگ ذرا سی دیر کرتے تو نقصان کا خدشہ تھا۔ ادھر تو جیسے کمال ہی ہو گیا۔ تانتے اور مما نے مون کو سینے سے چمٹا کر بھرپور تشکر کا اظہار کیا۔ مون نہ روکتی یا اس کی چھٹی حس الارم نہ بجاتی تو مما یقیناً من ہائیم پہنچ چکی ہوتیں۔ نانی کا بچنا بھی محال تھا۔ ان کی تکلیف بڑھ جاتی۔ خیر، اس واقعے کے بعد عیسیٰ نے مون سے بحث کرنا چھوڑ دی تھی۔ ان دنوں مون نے چونکہ سب کی نظروں میں الگ سا مقام پا لیا تھا۔ سو، سوزن بھی اسے بڑی قابل احترام ہستی سمجھتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ مون نے ایک دن سوزن کی ذاتی تجوری پر حملہ کر دیا تھا۔ اس دن سوزن باڑے

میں مصروف تھی اور جانوروں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ مون پہلے تو باڑے کی طرف آئی پھر مویشیوں کی گندگی کو دیکھتی واپس اندر چلی گئی تھی۔ اس کی نفاست پسند طبیعت پر گندگی سخت گراں گزرتی تھی۔

وہ میوزک سنتی سوزن کے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ جب اس کے منی باکس پر مون کی نگاہ پڑی تھی، کچھ متجسس ہو کر مون نے سوزی کا منی باکس کھول لیا تھا۔ اسے اندر سے کچھ سکے ملے...... وہ حیران نہیں ہوئی تھی۔ اس نے منی باکس کو بند کر دیا تھا پھر اسے اٹھا کر دراز میں رکھ آئی۔ جب اس نے دراز کھولی تب اس کی نگاہ ایک اور باکس پر پڑی۔ وہ مون نے باکس اٹھا کر کھول لیا۔ ایک خوب صورت جگمگاتی رسٹ واچ نکل آئی تھی۔ مردانہ طرز کی یہ گھڑی مون کو حیران کر گئی۔ سوزن کے کمرے میں نئی نکور چمکتی مردانہ گھڑی کیوں رکھی تھی۔ فطری تجسس جیسے عود آیا تھا۔

"یہ کس کے لیے ہے؟" اس نے گھڑی کو اٹھا کر ہاتھ میں لیا تھا۔ "بھلا یہ کس کے لیے ہو سکتی ہے؟" مون کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ جیسے کلک کے ساتھ کچھ روشن ہو گیا تھا۔ سوزن اور عیسیٰ تو کیا سوزی نے یہ گھڑی عیسیٰ کے لیے لے رکھی ہے؟ اسے معاملے کی تہ میں جانے کے لیے پندرہ سال کی عمر میں بھی بہت سوچ بچار اور گہرائی میں اترنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ گویا لمحوں میں معاملہ سمجھ گئی تھی۔ پھر سوزی جب کمرے میں آئی تو مون نے بغیر جھجکے دوٹوک لہجے میں سوزن سے سوال کیا تھا۔

"یہ تم نے عیسیٰ کے لیے خریدی ہے؟" اس کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ سوزی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس سے کچھ بات ہی نہیں بن پائی تھی۔ وہ شاید کوئی جھوٹ بول لیتی یا بات کو گھما ڈالتی مگر مون نے اسے موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اسے لگا، وہ سچ نہیں بولے گی تو

ہار اور جیت

کسی کی سب سے بڑی ہار......
کسی کی آنکھوں میں آنسو آپ کی وجہ سے

اور

زندگی کی سب سے بڑی جیت
کسی کی آنکھوں میں آنسو آپ کے لیے

مرسلہ: نفیسہ نہال، لاہور

اچھی بات

کسی کو کچھ دینا ہے تو اسے اچھا وقت اور دعا دو کیونکہ تم ہر چیز واپس لے سکتے ہو مگر کسی کو دیا ہوا اچھا وقت اور دعا نہیں لے سکتے۔

مرسلہ: اریبہ حسین، لاہور

مشکل میں پھنس جائے گی۔ یہ حسین آنکھوں اور خطرناک ذہن والی اس کی کزن اندر گھس کے دل کی تہوں میں چھپے اس راز کو بھی نکال لے گی جسے سوزن نے خود سے بھی چھپا رکھا تھا۔ وہ جیسے مون کے ذہن اور اندر تک کھوجتی آنکھوں سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اور اسی خوف نے سوزن کو سچ بولنے پر اکسایا تھا۔

"ہاں، میں نے عیسیٰ کی برتھ ڈے کا گفٹ لیا ہے۔ اپنی پاکٹ منی جمع کر کے۔" سوزن کی آواز کپکپا گئی تھی۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔ مون کی کھوجتی نظریں اس کے آر پار اتر رہی تھیں۔

"صرف عیسیٰ کے لیے۔ میرے لیے تو آج تک کچھ نہیں لیا۔ عیسیٰ کے لیے اتنا تردد......؟ پاکٹ منی جمع کی پھر گفٹ خریدا، کوئی خاص بات ہے کیا......؟" مون نے معنی خیزی کی انتہا کر دی تھی۔ وہ جیسے پھنس کر رہ گئی۔ اب بھلا کیا جواب دیتی۔ جو دل کی دھڑکنیں شور کر رہی تھیں، وہ شور مون کو سنائی نہیں دے سکتا تھا پھر بھی مون نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔

"عیسیٰ کے لیے ہی کیوں......؟ میرے لیے

کیوں نہیں۔" وہ تن فن کر رہی تھی۔ نخوت سے بول رہی تھی۔ سوزن کا سر اور بھی جھک گیا تھا اور مون اسے بھگو بھگو کر مار رہی تھی۔ بالآخر وہ نم آواز میں بول ہی پڑی۔

"عیسٰی مجھے اچھا لگتا ہے...... بہت اچھا لگتا ہے۔" سوزن نے گویا اعترافِ جرم کرلیا تھا۔ "وہ میرے دل کو بہت اچھا لگتا ہے...... اتنا کہ حد نہیں...... میں چاہتی ہوں، وہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔" وہ ہونٹ کچل رہی تھی جیسے بہت غمگین تھی۔ بہت اداس تھی اور اپنے دل کی بے اختیاری پر خود سے بھی نالاں تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں محبت کرنا اور پھر اس محبت کا اظہار کر دینا، اس ملک میں کچھ انوکھا یا عجیب نہیں تھا۔ سوزن کی ہم عمر لڑکیوں کے بے شمار بوائے فرینڈ تھے۔ ان میں سے ایک آدھ تو شادی بھی کرچکی تھیں۔ اب اگر سوزی کو محبت ہوئی تو یہ کون سا انوکھا معاملہ ہوا تھا۔ مسئلہ تو یہ تھا جو اسے عیسٰی سے محبت ہوئی تھی۔ سوزن کے اعترافِ محبت نے خلافِ توقع مون کو غصہ نہیں دلایا تھا بلکہ وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔ سوزی جیسی دبو، مسکین اور اس کی شخصیت کے سامنے ماند پڑتی بھابی تو اسے کہیں مل ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی مون کے کنٹرول میں رہتی۔ اس کے حصار میں، اس کی خوبیوں کو سراہتی ہوئی۔ مون کے سامنے جھکی ہوئی۔ وہ کبھی مون کا اور اپنا موازنہ یا مقابلہ نہ کرتی۔ مون کو ایسی ہی بھابی کی تو ضرورت تھی۔ اس پہلو پر غور کیا تھا اس نے، کچھ دن پہلے بھی...... اور اب جیسے اس کی سوچوں کو کنارہ مل گیا تھا۔

عیسٰی کی شخصیت کے سامنے ماند پڑتی سوزن ان دونوں بہن، بھائی کے سامنے عمر بھر سر اٹھا نہیں پائے گی۔ تو پھر یہ سودا کوئی خسارے کا نہیں تھا۔ ویسے بھی سوزن اپنے ماں، باپ کے جھگڑوں، طلاق اور غربت کے باعث بہت سنجیدہ، افسردہ اور چپ چپ رہنے لگی تھی۔ وہ اندر سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جسے ایک گھر کی خواہش تھی۔ اسے محبت بھرا پرسکون ماحول چاہیے تھا۔ اور مون کا گھرانا اس لحاظ سے بہت آئیڈیل تھا۔ ان کے ماں، باپ کی محبت، سکون، ایک دوسرے کا احترام، اس کے علاوہ بچوں سے خصوصی لگاؤ قابل ستائش تھا۔ وہ مون کے گھر کا ہمیشہ کے لیے حصہ بن جانا چاہتی تھی اور مون نے اس کی خواہش کو اور بھڑکایا تھا۔ وہ اس کا ساتھ دینے پر جیسے تیار ہوگئی تھی۔ مگر اس دوران ایک اور عجیب واقعہ رونما ہوا تھا۔ اتنا حیران کن، عجیب اور انوکھا کہ مون کی پوری ہستی ہل کر رہ گئی تھی۔ جیسے وہ تھرا اٹھی تھی۔ سوزن کو محبت کی راہوں پر اندھا دھند بھاگنے کا مشورہ اور ساتھ دینے کا وعدہ کرکے وہ محبت جیسی پُرتپش آنچ سے خود بھی محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔

محبت جو دیکھنے میں پُرکشش تھی
جس کی لذت میں مٹھاس تھی
جو شبنم، صندل، اور چاندنی میں گوندھ کر
سامنے آتی
سنہری پتوں میں لپٹ کر بجتی
مندروں کی گھنٹیاں بجاتی اور مسجدوں میں
گھنٹے ٹیکتی
غنچوں میں کھلتی پھر صحراؤں میں بھٹکتی
بن سنور کے آتی اور ویران اجاڑ کر دیتی۔

محبت جو ہر روپ میں مون حسیب پر اچانک جھپٹی تھی یوں کہ وہ حواس باختہ رہ گئی۔ بھلا یہ محبت اسے ہوئی کب تھی؟ اور کس سے؟

من ہائیم پر یہ صبح اپنے معمول سے وارد ہوئی۔ بڑا مصروف سا دن تھا اور بڑی مصروف سی شام گزری تھی۔ کھانے سے کچھ دیر پہلے پاپا کے ساتھ کوئی نوجوان آیا تھا۔ خوش شکل، سنجیدہ اور بڑا ہی پُراسرار...... یہ پروفیسر بشر تھا۔ غیر قانونی طریقے سے جرمنی آنے والا۔ خیر، اب تک تو سیٹلڈ ہوچکا تھا۔ یہ انہیں بعد میں پتا چلا۔ پاپا نے پروفیسر بشر کی بہت مدد

کی تھی۔ اسے ڈیڑھ سال تک چھپائے رکھا۔ پھر اس کے پیپرز بنوائے اور اب وہ کھل کر جرمنی میں گھوم پھر سکتا تھا۔ چاہتا تو کاروبار کرلیتا یا پھر جاب وغیرہ کرلیتا۔ پاپا اس کی ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ کرچکے تھے۔ وہ ہر پاکستانی کی یوں ہی مدد کیا کرتے تھے۔ اس میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا۔

کھانے کی میز پر پاپا نے پروفیسر بشر سے ان سب کا تعارف کروایا تھا۔

"یہ میری جند جان، میرا بیٹا...... میرا عشق، میری جان، میرا علی عیسٰی...... اور یہ میری انتہائی خطرناک بیٹی...... اس سے ذرا بچ کر رہنا...... بہت خوفناک انکشاف کرتی ہے اور یہ میری بیوی کی بھانجی سوزن......" پاپا نے مسکراتے ہوئے تعارف کی رسم نبھائی تھی۔ بڑا مختصر مگر بڑا ہی جامع تعارف تھا۔ پروفیسر ایک، ایک چہرے کو غور سے تکتا لمحے بھر کے لیے منجمد رہ گیا تھا۔ حسیب احمد کیا کہہ رہے تھے؟ اس نے دوبارہ غور کیا۔

"اور یہ میری انتہائی خطرناک بیٹی، اس سے ذرا بچ کر رہنا...... بہت خوف ناک انکشاف کرتی ہے۔" پروفیسر بشر بڑے غور اور گہرائی میں جا کر اس کم عمر، خطرناک دوشیزہ کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ پھر جیسے وہ ٹھٹک گیا۔ اگرچہ حسیب احمد نے مذاقاً بات کی تھی مگر پروفیسر بشر جیسے ٹھٹک کر منجمد ہوگیا تھا۔ وہ خطرناک چہرے والی خطرناک لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ٹھٹکنے کی وجہ مون کا نوخیز حسن ہرگز نہیں تھا۔ حسن کی پروفیسر بشر کے نزدیک کوئی اوقات تھی اور نہ کوئی اہمیت تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار حسین چہرے دیکھے تھے۔ اسے حسن کبھی متاثر نہیں کرتا تھا۔ اور جو چیز اسے متاثر کرتی تھی وہ پروفیسر بشر کو اس لڑکی کی آنکھوں میں بخوبی نظر آرہی تھی۔ مقابل کو تسخیر کرلینے والی چمک، انوکھا سا...... پُرغرور چہرہ...... ذہانت چھلکاتی عجیب تر آنکھیں...... مقناطیسی طاقت رکھنے والی عجیب گہری آنکھیں پروفیسر بشر کو جیسے اپنا گوہرِ مقصود اچانک مل گیا تھا۔ ذہن کی پُراسرار قوتوں کو کھوج نکالنے والے ایک ماہر کے سامنے اس کا گوہرِ مقصود بیٹھا تھا۔

اس نے جیسے بیٹھے، بٹھائے سامنے بیٹھی لڑکی کے ذہن کی اعلیٰ اور ادنیٰ سطح کو جانچنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے اپنے دماغ سے ہر سوچ کو جھٹک کر مون کو ذہنی پیغام دے کر اسے پرکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس دوران پروفیسر بشر نے اس بات میں احتیاط کی کہ عیسٰی اور حسیب احمد میز سے اٹھ جائیں۔ اس کی توقع کے عین مطابق حسیب احمد کی کال آگئی اور علی عیسٰی کو اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرنا تھی۔ وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے تھے۔ اب ڈائننگ ہال میں تین نفوس بیٹھے تھے اور تینوں ہی ایک دوسرے سے بے نیاز تھے۔ سوزن، مون اور پروفیسر...... تینوں سر جھکائے کھانا کھا رہے تھے۔

پروفیسر کے لیے یہ موقع بڑا اہمیت کا حامل تھا۔ اس نے سنہری مواقع کبھی گنوائے نہیں تھے سو، اب بھی اپنی نگاہوں کو مون کے کراؤن پر جما کر وہ یکسوئی کو کھینچ رہا تھا۔ ذہن کی یکسوئی اس کے عمل کی کامیابی کا اہم مہرہ تھی۔ ادراک ماورائے حواس کی تمام تر بنیاد یکسوئی اور توجہ پر قائم تھی کیونکہ ہر وہ کام جن کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے اور ذہن کے تخلیقی حصوں سے جڑا ہوتا ہے اس وقت تک انجام نہیں پاسکتے جب تک پوری طرح ان کے مقاصد کے لیے ذہنی یکسوئی اور توجہ پیدا نہ کرلی جائے۔ محویت، استغراق اور ذہنی یکسوئی کے بعد شعور کی باقی سرگرمیوں کو بلاک کرنا ہوتا ہے۔ وہ ماہر انتقالِ افکار تھا۔ اور یہ کام اس کے لیے اتنا معمولی تھا جیسے کون آئس کریم کھاتے ہوئے اس کا کچھ حصہ پگھل جانا یا چاکلیٹ کا ریپر اتارنا...... محض لمحے بھر کی دیر میں۔

انسانی ذہن جو ایک اخباری دفتر کی طرح ہوتا

ہے جس کے ٹیلی پرنٹر پر ہر وقت طرح، طرح کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ جسم کا ہر عصب دماغ سے ہمہ وقت کانٹیکٹ میں رہتا ہے۔ آنکھیں، کان، ناک ہر عضو اپنا، اپنا تاثر دماغ تک پہنچاتے ہیں پھر شعور تمام پیغامات وصول کرنے کے بعد اپنے طور پر ان کا تجزیہ کرتا ہے اور تراش خراش کرنے کے بعد اہم فیصلے کرواتا ہے۔

پروفیسر جانتا تھا...... انسانی شعور کی سرگرمیاں بے حد وسیع اور متنوع ہیں۔ جیسے کسی بڑے کمیشن ایجنٹ یا اسٹاک بیورو کا صدر دفتر ہو۔ اس میں دنیا جہان سے منڈی کے اتار چڑھاؤ کی رپورٹس وقتاً فوقتاً آتے جاتی ہیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ چہار طرف سے ٹیلی پرنٹر آتے ہیں۔ ہر لحہ نئی رپورٹ، نئی خبر آتی ہے۔ ایسے میں اسٹاک بیورو کا پورا اسٹاف اپنا، اپنا کام چھوڑ کر کسی اور کام میں محو ہو تو سارا انتظام بگڑ جائے گا۔

سو اس کے لیے احتیاط بہت ضروری تھی۔ وہ دس سالوں کی ریاضت کے بعد چاکلیٹ سے ریپر اتارنے والی پوزیشن تک آیا تھا۔ اب یہ کام اس کے لیے بالکل معمولی تھا۔ اتنا عام اور ہلکا سا...... جیسے وہ پھونک سے کوئی کاغذ اڑانے والے انداز میں ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پیغام پہنچا رہا تھا۔

انتقالِ افکار کی زد میں وہی خیالات آتے ہیں جن کی کوئی تصویر یا مجسمہ نہیں بن سکتا۔ یہ خیال کائنات سے اخذ کیا جا سکتا ہے اور جس کو چاہے بھیجا جا سکتا ہے۔ ہر خیال اپنی بناوٹ کے لحاظ سے روشنی اور آواز کے مانند ہے۔ جس طرح روشنی اور آواز کی لہروں کو ٹیلی فون اور ٹی وی کے ذریعے بھیجا اور وصول کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح خیالات کی لہروں کو بھی نشر، اخذ اور دوسرے دماغ تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

پروفیسر نے اپنی مشقوں، تجربات اور سیکھنے کے مراحل میں بے شمار سائنسدانوں کے قول حفظ کیے تھے جیسا کہ الائٹ سن کہتا ہے۔ روشنی، بجلی، حرارت اور مقناطیسیت یہ سب مادے کی مختلف اور بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ اور ان کو توانائی کی لہریں کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انسانی خیال بھی لہروں کی شکل میں سفر کرتا ہے۔ گو ہم خیال کی لہروں کو نہ دیکھ سکتے ہیں، چھو اور نہ سونگھ سکتے ہیں تاہم محسوس ضرور کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے احساس کا قوی ہونا بے حد اہم ہے۔ ہر شخص میں احساس کو محسوس کرنے کی قدرت اور صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ اب سامنے بیٹھی خطرناک ذہن رکھنے والی لڑکی میں احساس کو محسوس کرنے کی کتنی صلاحیت موجود تھی؟ اس بات کو جاننے کے لیے پروفیسر نے ایک پیغام نشر کیا تھا۔ ہلکا سا... بے ضرر پیغام...... اب دیکھنا یہ تھا کہ چمچے پر نگاہ جمائے بیٹھی لڑکی کا ذہن کتنا قوی اور مضبوط تھا؟ کیا وہ پروفیسر کے پیغام وصول کر سکتی تھی؟

پروفیسر جو مون کے چہرے پر نگاہ جما کر بیٹھا تھا، لمحے بھر میں اس کے تاثرات بدلتے دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر جیسے مون نے چمچ ہاتھ سے رکھ کر کچھ چونکتے ہوئے پروفیسر بشر کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ یہ خیر مقدمی مسکراہٹ تھی۔

''میں ٹھیک ہوں اور پڑھتی ہوں۔'' اس نے جس انداز میں انتہائی پُرسکون، خاموش ماحول میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ اس چیز نے پروفیسر کو نہیں البتہ سوزن کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ وہ ایسی نظروں سے مون کو دیکھ رہی تھی جیسے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ اس سے بھلا یہ سوال پوچھا ہی کس نے تھا؟ جس کا جواب مسکرا کر دے رہی تھی۔ ابھی سوزن انہی سوچوں میں گم تھی جب پروفیسر نے انتہائی پُرجوش آواز میں ''انٹیلی جینٹ'' بولا تھا۔ اس کے چہرے پر ستائش ابھر رہی تھی۔ جیسے وہ حیرانی کے سمندر سے نکل کر آ رہا ہو۔

اس کے بھیجے گئے پیغام کو ایک سو اسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھی پہلے مون کا وصول کرنا اسے بری طرح چونکا گیا تھا۔ گویا وہ ایک قوی دماغ رکھنے والی لڑکی تھی۔ مگر ماہیتِ افکار میں ماہر نہیں تھی۔ سو اس نے جواب بول کر دیا تھا۔ اگر اس کے ذہن کو پالش کر دیا جاتا تو وہ ایک دنیا کو اپنے ذہن سے تسخیر کر سکتی تھی۔

''انسانی دماغ اپنے اندر بے شمار حیرت انگیز صلاحیتیں رکھتا ہے اور ان صلاحیتوں میں چھپی ہوئی پُراسرار قوتیں کبھی کبھار اپنا اظہار کر کے ہمیں دنگ کر دیتی ہیں۔'' میں نے اپنے سامنے ایک کندن دماغ کو دیکھا ہے، میں ابھی تک ورطۂ حیرت میں مبتلا ہوں۔'' پروفیسر بشر کی آواز اسے سوچوں کے اژدہام سے کھینچ لائی تھی۔ جس بھرپور انداز میں وہ مون کو سراہ رہا تھا۔ جس طرح سے تعریف کر رہا تھا۔ مون کے لیے یہ سب بہت منفرد اور انوکھا تھا۔ تعریف بھلا کسے بری لگتی ہے! اور مون کو تو ویسے بھی تعریفوں کا فوبیا ہو گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی پرستاروں کی طویل قطار اس کے دائیں بائیں ہو اور وہ ان کے درمیان کسی ملکہ کی طرح گردن تان کر چلتی رہے۔ کہتے ہیں تعریف اور شہرت کا نشہ، دونوں ہی زہر گھلا امرت ہے۔ جس کو چڑھ جائے تباہ کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ مون کو بھی تعریفوں کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ پہلے گھر والے کیا کم تھے جو اب ایک اجنبی شخص کی تعریف نے اسے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ پروفیسر ایک ماہرِ فلکیات بھی تھا۔ وہ خود کو پاکستان کا نیشنل کہلاتا تھا تاہم پانچ سال پہلے وہ جرمنی غیر قانونی طریقے سے داخل ہوا تھا۔ جب اس نے اپنا ملک چھوڑا تب وہ ایک مقامی یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اس کے پچھلے پاسپورٹ اور آئی ڈی کارڈ کی کاپی سے پتا چلتا تھا وہ انڈین شہریت رکھتا ہے تاہم وہ خود کو پاکستانی کہلواتا تھا۔ اسے اپنے باپ کی وجہ سے خود کو پاکستانی کہلوانا پسند نہیں تھا۔ بقول پروفیسر اس کا باپ پنجاب کے ایک زمیندار کا بیٹا تھا۔ وہ آگرہ گھومنے کے لیے گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ پروفیسر کی ہسٹری سے مون کو ہرگز دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم پروفیسر کی اپنی شخصیت نہایت دلچسپ تھی۔

اگلے چند دن تک پروفیسر ان کے گھر آتا رہا تھا۔ وہ عموماً اس وقت آیا کرتا تھا جب مون اسکول سے آ چکی ہوتی۔ پھر وہ ایک لمبی نشست کے بعد گھر کو لوٹتا تھا۔ اس نے ''بیدی نونگ'' کے نام سے ذاتی اکیڈمی بنائی تھی۔ جس میں نہ جانے وہ کس قسم کی باقاعدہ تعلیم دے رہا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد مون بیدی نونگ کی باقاعدہ ممبر بن گئی تھی۔ اور بشر نے پارٹنر شپ پہ یہ کام آگے بڑھا دیا...... بیدی نونگ ایک لینگویج انسٹی ٹیوٹ تھا جس میں بے شمار زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ یونہی گزر گیا اور مون کو بیدی نونگ کی اصل حقیقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس پُرسکون رواں ندی میں پہلا کنکر آخر کب پڑا تھا؟

جب ایک رات پاکستان سے مون کے تایا پہلی مرتبہ ان سے ملنے چلے آئے تھے۔ تایا ذوالفقار جو مون کے پاپا جانی کے سگے بھائی تھے اور جنہیں مون نے پہلی مرتبہ اپنے روبرو دیکھا تھا۔ تایا اس کے لیے ایک عام سی شخصیت تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر اتنی ہی کٹھور اور روکھی رہی تھی جتنا اسے ہونا چاہیے تھا تاہم عیسیٰ بے انتہا خوش تھا۔ تانتے اور گروی کے بعد پہلا قریبی اور عزیز ترین پاپا کی طرف سے رشتہ میسر آیا تھا۔ وہ تو جیسے تایا سے مل کر پاگل ہو رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اسکول چھوڑ کر تایا کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ تایا کی محبت میں ایسی دیوانگی کہیں دیکھی سنی نہیں لگتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر تایا کو نوالے بنا، بنا کر کھانا بھی خود کھلاتا۔ ان دنوں تایا کی پسند سے مینیو ترتیب دینے میں اسے کتنا کھپنا پڑتا تھا۔ وہ ماں سے الجھ پڑتا۔

"مما! تایا پھیکے کھانوں کے عادی نہیں ہیں۔ یہ بدمزہ ڈشز وہ کیسے نگلیں گے؟ وہ تو دیسی کھانوں کے عادی ہوں گے، کہیں... بیچارے بیمار نہ پڑ جائیں۔" عیسیٰ کی جیسے جان پر بن آتی تھی۔ مریم خود پریشان ہو جاتی۔ سمجھ نہیں آتی تھی جیٹھ صاحب کی اعلیٰ ترین تواضع کیسے کرے؟ ایک طرف بیٹا بوکھلائے دیتا تھا۔ کچھ ان دنوں مریم کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ سینے میں ٹیس اٹھتی تو گھنٹوں وہ درد سے بے حال رہتی۔ تنگ آ کر ٹیسٹ کروا آئی تھی۔ ابھی رپورٹس نہیں ملی تھیں اب جیٹھ صاحب پہلی مرتبہ آئے تھے۔ وہ کیسے بیمار بن کر بستر سنبھال لیتی۔ وہ بھلا کیا سوچتے...... اور اِدھر عیسیٰ کو کچھ بھی تایا کے شایانِ شان نہیں لگتا تھا۔ حالانکہ وہ بہت سادہ مزاج انسان تھے مگر عیسیٰ تو......

"پھر کیا کرنا ہے؟" مریم الجھ کر پوچھتی۔

"ہوٹل سے کھانا منگوا لیتے ہیں۔" اس کے ذہن میں پاکستانی ریسٹورنٹ گھومنے لگتے۔ عیسیٰ فوراً انکار کر دیتا۔

"نہیں مما! تایا کیا سوچیں گے، وہ ایک آدھ دن کے لیے آئے اور ہم انہیں گھر کا کھانا بھی نہیں کھلا سکے۔" وہ مریم کو اور بھی بوکھلا دیتا، مریم پریشان ہو جاتی۔ اب کوئی اور آپشن بچتا نہیں تھا۔ پھر عیسیٰ نے ہی اس کا ٹھوس حل نکالا۔ کوکنگ کی بکس اٹھا لایا۔ ایشین فوڈز ریسیپیز...... جس کی مدد سے ان ماں، بیٹے نے پُرتکلف ڈنر تیار کیا تھا۔ جسے میز پر سجا دیکھ کر تایا حیران ہی تو رہ گئے تھے۔ پھر اِن کے دل میں مریم کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ان کا افسوس کچھ اور بھی بڑھ گیا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا حبیب! مریم اور بچوں کو ہم سے دور رکھا۔" تایا شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ عیسیٰ کا دل بھی رنج سے بھر گیا تھا۔ وہ اپنے پیارے تایا سے پہلے کیوں نہیں مل سکا۔ وہ لوگ کتنے عظیم رشتوں سے دور تھے۔ عیسیٰ کے دل میں اپنے پیارے رشتوں سے محبت کی ہڑک اچانک بیدار ہو گئی تھی۔ اور مون کو خواہ مخواہ غصہ آنے لگتا تھا۔ اسے عیسیٰ کی جذباتیت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی جبکہ تایا کا عیسیٰ پر فدا ہونا تو دیکھا ہی نہیں جاتا تھا۔ تایا کو بھی عیسیٰ کے علاوہ کچھ اور نہ سوجھتا...... وہ تین دن رکے رہے تھے اور ان تین دنوں میں تایا اور عیسیٰ یک جان دو قالب ہو گئے۔

پھر یوں ہوا کہ تایا کی موجودگی کے دوران ہی ایک مرتبہ پروفیسر بشران کے گھر چلا آیا تھا۔ تایا کو وہ پُراسرار آدمی ذرا نہ بھایا۔ انہوں نے پروفیسر کے اٹھتے ہی اپنی ناگواری ظاہر کر دی تھی۔

"یہ کون آدمی تھا حبیب...... مجھے تو ذرا اچھا نہیں لگا۔ اسے باہر تک ہی محدود رکھو......" تایا کی تجربہ کار نظروں نے نہ جانے کیا محسوس کر لیا تھا۔ جو وہ بگڑ کر کہہ رہے تھے۔ مون نے دیکھا تھا، عیسیٰ کے چہرے پر بھی ناگواری تھی۔

"تایا جان! مجھے بھی یہ آدمی اچھا نہیں لگتا۔" وہ بھی کہے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ تب حبیب احمد فوراً بولے تھے۔

"میں نے اس کی بہت مدد کی ہے بھائی صاحب! اب بھی کچھ نہ کچھ پوچھنے آ جاتا ہے، عجیب لسوڑا ہو گیا ہے۔ جان نہیں چھوڑتا۔" گویا پاپا بھی پروفیسر بشر سے بیزار تھے اور اس سے کسی نہ کسی طریقے سے جان چھڑوانا چاہتے تھے۔ مون کو اس لمحے پاپا کچھ اچھے نہیں لگے تھے۔ جو بندہ اس کی پسندیدگی کے مرتبے پر فائز ہو جاتا اسے عموماً عیسیٰ اور پاپا ریجیکٹ کر دیتے تھے۔ نہ جانے یہ مون کے ساتھ کیسا المیہ تھا۔

"اسے پہلی فرصت میں گھر آنے سے منع کرو۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگا۔" تایا اپنی ناپسندیدگی کی وضاحت نہیں کر پا رہے تھے۔ سچ تو یہ تھا اس آدمی کا

مون کو تاڑ نا انہیں حد سے زیادہ برا لگا تھا۔ پھر تایا نے محسوس کیا تھا وہ صرف مون سے ہی بات کرنا چاہتا تھا اور اسی کے اردگرد طواف کرتی نظروں کا حصار کھینچے ہوئے تھے۔ تایا کی پروفیسر کے بارے میں رائے اگرچہ بالکل درست تھی مگر مون کو تایا اس لمحے حد سے زیادہ برے لگے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی برہمی چھپا نہیں پائی تھی۔

پروفیسر بہت نائس ہے۔ آپ کو شاید پروفیسر کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' مون کی حمایت نے عیسیٰ کے چہرے کا رنگ متغیر کردیا تھا۔ اسے مون پر بے انتہا غصہ آیا۔ اسے کیا ضرورت تھی بڑوں کے درمیان بیٹھ کر ان کی درست بات کو غلط کہنے کی ...... ان کے ناپسندیدہ بندے کو پسندیدگی کی سند دینا ...... اسے بڑوں کا کچھ تو لحاظ ہونا چاہیے تھا مگر وہ تو بڑی بے دید بیٹھی تھی۔ عیسیٰ کو بے انتہا غیظ چڑھا تھا اور مون اپنی اہمیت کا گراف کم از کم عیسیٰ کی نظر سے گرا رہی تھی۔

''تم نہیں جانتی بیٹے!'' تایا نے بڑے شہد آگیں لہجے میں جیسے مون کو ٹوکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں چپ رہنے کی سرزنش کی تھی مگر وہ مون ہی کیا جو سمجھ کر خاموش ہوجاتی۔

''وہ ہمارا گیسٹ تھا تایا! آپ اس کے بارے میں ایسے الفاظ مت بولیں۔'' مون کی بکواس نے عیسیٰ کو تاؤ دلا دیا تھا۔ اس کے تیور بگڑ گئے تھے۔

''جسٹ شٹ اپ!'' وہ بھنچی آواز میں چیخا تھا۔ ''اٹھ کر جاؤ تم۔'' عیسیٰ بہ مشکل ضبط کررہا تھا ورنہ شاید اس کا ہاتھ ہی اٹھ جاتا پھر بات زیادہ بھی بگڑ سکتی تھی۔

''تم ...... مون کو بھی غیظ چڑھ گیا۔ ''یہ تم مجھ سے کس لہجے میں بات کررہے ہو؟'' وہ جیسے دہاڑی تھی۔

''بکواس بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔'' عیسیٰ نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ پھر بھی اسے شدید توہین کا احساس ہوا تھا۔ وہ جیسے تھرا اٹھی تھی۔ جبکہ تایا نے بہ مشکل سیز فائر کروایا تھا مگر انہیں مون کی بدزبانی اور پروفیسر کے لیے فضول کی تکرار بہت بری لگی تھی۔ اگرچہ انہوں نے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا پھر بھی عیسیٰ جانتا تھا انہیں مون کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کٹ سا گیا تھا۔ مگر مون کو کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ اس کا یہ غیر مہذبانہ عمل اس کی آئندہ زندگی کے لیے بہت بڑا پہاڑ ثابت ہونے والا تھا مگر وہ کچھ سوچ لیتی تو تب ناں ......

پھر رات کو موقع پاکر عیسیٰ نے مون کی پھر سے کلاس لی تھی۔

''یہ تم تایا کے سامنے اتنی بک، بک کیوں کررہی تھیں؟'' اس کی آنکھوں میں غصہ بھر گیا تھا۔ حالانکہ وہ خود کو بہت سمجھا بجھا کر آیا تھا۔ وہ مون سے تلخ کلامی نہیں کرے گا مگر پھر بھی ......

''کون تایا؟ میں کسی تایا کو نہیں جانتی ...... نہ جانے کہاں سے رشتے دار اٹھ کر آجاتے ہیں۔'' وہ بھی تمام ہتھیاروں سے لیس بیٹھی تھی اور کوئی بھی وار خالی نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ وہ دونوں اس وقت سٹنگ روم میں موجود تھے اور دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھے کہ سٹنگ روم سے ملحقہ لاؤنج میں تایا بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں جو ان کے جھگڑے کی آواز پر چونک گئے تھے۔

''بکواس نہیں کرو ...... تمہیں جانے کیا ہوگیا ہے؟ تم تایا کے لیے کیسے الفاظ استعمال کررہی ہو ......؟ اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ تو تایا آئے ہیں۔'' عیسیٰ کو شدید صدمہ پہنچا تھا۔ وہ جیسے کچھ بول ہی نہیں پایا گنگ سا رہ گیا تھا۔

''میرے سامنے اس بڈھے کا ذکر مت کرو۔ جانے کون سا مفاد لے کر آیا ہے۔ بھوکے، ننگے پاکستانی ...... سالوں بعد بھائی کی یاد آگئی۔ اپنے کسی بیٹے کا ویزا لگوانا ہوگا۔'' مون زہر خند ہوکر چلا اٹھی

تھی اور عیسٰی کے کانوں میں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔
وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ مون ہی بول رہی تھی کیا......؟
''زبان اتنی لمبی ہوگئی ہے تمہاری؟ یہ تم ... کر رہی ہو؟ تایا کے لیے ایسے گندے الفاظ......؟'' عیسٰی بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا جو پہلے کی طرح مطمئن اور بشاش بیٹھی تھی۔
''ہاں، کچھ غلط نہیں کہا میں نے...... وہ اپنے کسی مفاد کے لیے آئے ہیں۔ آخر پہلے کیوں نہیں آئے۔'' اب وہ زہر پھونک کر مطمئن سی بول رہی تھی۔ عیسٰی پھر سے سن ہوگیا۔
''ان کا کوئی مفاد نہیں...... ہماری محبت میں چلے آئے ہیں، تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تایا کے لیے اتنے غلیظ الفاظ بولو۔'' اس نے اپنے اندر تنفر کی لہر دباتے ہوئے بہ مشکل کہا تھا۔
''ہونہہ تایا! دیکھ لینا...... اپنے کسی بیٹے کا مستقبل سنوارنے آئے ہوں گے۔'' وہ ابھی تک اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔
''وہ کوئی بھوکے ننگے نہیں...... اپنی ذاتی فرم چلا رہے ہیں۔'' عیسٰی کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ اس کی گردن ہی مروڑ ڈالتا۔
''یعنی ہمارے پاپا کا حصہ بھی کھا رہے ہیں۔''
مون بڑی دور کی کوڑی لائی تھی۔ وہ بھنا اٹھا تھا۔
''مون! ذرا بھی خوف خدا نہیں تمہیں...... ایسے گھٹیا الزام......'' وہ کانوں تک سرخ ہوگیا تھا۔
''دیکھ لینا...... بات یہی نکلے گی۔ تایا یا تو پیسوں کی امداد لینے آئے ہیں یا اپنے بیٹوں کے اسپانسر ویزوں کی بات کریں گے۔'' مون گویا تایا کے اندر سے ہو کے آئی تھی۔ حالانکہ وہ یہ بکواس محض عیسٰی کو تپانے کے لیے کر رہی تھی۔ اس میں یقیناً کوئی صداقت نہیں تھی۔ وہ اتنا تو جانتی تھی کہ تایا کوئی فٹ پاتھ سے اٹھ کر نہیں آئے مگر پھر بھی اپنی بھڑاس نکال رہی تھی۔ تاکہ لاؤنج میں موجود تایا سن لیں۔ در پردہ وہ اپنا بدلہ چکا رہی تھی۔
''تایا کے بیٹے ماشاء اللہ سے اسٹیبلشڈ ہیں۔ ذیشان امریکا سے پڑھ کر آیا ہے۔ ذی شاہ اور شاہی بھی بیرون ملک آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے جرمنی میں کوئی چارم نہیں۔'' عیسٰی نے جیسے جتلا کر اس کا منہ بند کروانا چاہا تھا مگر اس کا منہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔
''ہونہہ...... تم نہیں سمجھ سکتے......'' مون زچ ہو کر چیخی۔
''تم تو خوب سمجھتی ہو ناں...... بنا کچھ جانے بکواس کرنے کا انجام...... اچھا نہیں ہوتا۔'' وہ تھک ہار کر بولا۔
''مجھے پروا نہیں۔'' مون نخوت سے سر جھٹک کر رہ گئی۔
''اس بات پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے گہرے درد بھرے لہجے میں کہا۔
''اور یہ کام تم اچھی طرح سے کر سکتے ہو۔'' اب وہ مسکرا رہی تھی۔ جیسے اپنی بھڑاس نکال کر فریش ہو چکی تھی۔
''میں تمہیں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔'' عیسٰی بس سا ہو کر اٹھ گیا تھا۔ اس کا دل خوب بھر بھر آرہا تھا۔ مون کی بکواس نے اسے اپ سیٹ کر دیا تھا۔ جب وہ لاؤنج سے گزرا تب تایا اپنے روم کی طرف جا رہے تھے۔ گیسٹ روم جو ان کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ عیسٰی کچھ پل کے لیے سن سا ہوگیا۔ کیا تایا نے ان کی تکرار سن لی تھی؟ وہ لاؤنج سے اٹھ کر جو جا رہے تھے۔ عیسٰی کے بدن سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ اپنی ہی نظر سے جیسے گر گیا تھا۔

مون کی ا[illegible]ن کا کیا اثر ہونے والا تھا؟ کیا یہ مالا کی زندگی کی تبا[illegible]ی کا آغاز تھا؟ یہ سب ضرور جانیے لیکن اگلے ماہ......



اہم کون

سیما یاسمین مجتبیٰ

رم جھم برستی بارش میں اچانک منزہ کو کسی چھوٹے سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ وہ چونک اٹھی۔
''اتنی تیز بارش میں یہ ننھی سی جان کہاں ہے۔''
وہ اپنے سویٹ [illegible] اور سفید و سرخ بوگن ویلا سے آراستہ برآمدے کے ستونوں کی آڑ سے لان کے گھنے درختوں کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے رونے کی آواز آرہی تھی۔
''کیا ہوا منزہ بی بی، اس اندھیرے میں کیا ڈھونڈ

ایک دن تم لوگوں کو تمہاری اولاد کا دکھ دکھائے گی۔ شرم نہیں آتی اس طرح کی بکواس کرتے ہوئے۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے اولاد کو آزمائش اور امتحان کہا ہے۔" وہ لوگ چپ ہو جاتے لیکن ان کے سخت دل منزہ اور پپو کے پیار اور اس کے لیے منزہ کی بے پناہ چاہت کو سمجھ ہی نہ پاتے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں پھر یہ پپو کے لیے تمہاری چاہت سے کیوں جلتے ہیں۔ پپو اتنا معصوم ہے تمہاری وجہ سے اسے زندگی میں خوشیاں ملی ہیں۔ اس کی صحت اچھی ہوگئی ہے، ہر وقت خوش رہتا ہے۔ ان کا تو کچھ نہیں بگاڑتا...... پھر یہ اس سے کیوں دشمنی رکھتے ہیں۔" فریحہ کبھی کبھی منزہ سے اداسی سے کہتی۔

"ایسے ہی لوگ کٹھور دل ہوتے ہیں جو اللہ کی مخلوق کو خاطر میں نہیں لاتے بس ظاہری خوشیوں کی طرف بھاگتے ہیں۔" تبھی منزہ بے پروائی سے کہتی۔ بات کرتے کرتے وہ چونکی۔ "پپو کہاں ہے؟ ابھی تو یہاں ہی کھیل رہا تھا۔" فریحہ بھی چونک اٹھی اور دونوں اسے آوازیں دیتی ادھر ادھر ڈھونڈنے لگیں۔ باقی بچے اپنے کھیل میں مست تھے۔ پپو اچانک قریب کے درخت کی ایک ٹہنی پر بیٹھا شوخ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ سب کو پریشان اور اپنے لیے فکر مند دیکھ کر وہ خوش ہو رہا تھا۔ اچانک منزہ کی اس پر نظر پڑی اور وہ چلائی۔

"وہاں کیا کر رہے ہو، گرے تو بہت چوٹیں آئیں گی، اترو نیچے۔" مگر وہ مزید شریر ہوگیا اور اوپر کی شاخوں کی طرف چڑھتے ہوئے منزہ کو پلٹ، پلٹ کر دیکھتا رہا اور پھر وہ ان شاخوں پر سے پڑوس کی چھت پر کود گیا۔ منزہ نے خوف زدہ نظروں سے فریحہ کی طرف دیکھا۔

"وہ تو اپنے دشمنوں کی چھت پر چلا گیا ہے۔ ہمیں اسے فوراً واپس لانا ہوگا۔" فریحہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں ہی ٹھہرو۔ باقی بچوں کا خیال رکھو میں اسے لاتی ہوں۔" منزہ بے تابی سے چکر لگاتی پپو کی سلامتی سے واپسی کی دعا کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس گھر کے بچے تو کیا بڑے بھی تند مزاج ہیں اور وہ پڑوسیوں کو ستانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

تھوڑی دیر میں فریحہ ہانپتی کانپتی واپس آئی۔ پپو اس کی گود میں تھا اور اس کی ٹانگ زخمی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ وہ بہت اذیت میں تھا۔ فریحہ نے غصے سے بتایا۔

"ان سب نے پپو کو گھیر کر اس پر خوف ناک کتا چھوڑا ہوا تھا۔" منزہ نے مزید کچھ نہیں سنا اور مالی بابا سے ٹیکسی منگوا کر پپو کو ڈاکٹر کو دکھانے اسپتال لے گئی۔ جہاں انجکشن اور دواؤں کے ساتھ پیر پر بینڈیج بھی کی گئی اور ان پندرہ دنوں میں منزہ نے پپو کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیے۔

بیماری میں پپو، منزہ کے اور قریب ہوگیا۔ وہ اس کی گود میں سوتا۔ اس کے ہاتھوں میں چہرہ چھپالیتا۔ جب وہ تھک کر اسے اس کے چھوٹے سے بیڈ پر لٹانے لگتی تو ماں کہتے ہوئے وہ اس کے بازو پکڑ لیتا اور وہ پیار سے اس کو سمیٹ لیتی۔ نعیم دور سے یہ منظر دیکھ کر دھیمی مسکراہٹ سے کہتا۔

"پاگل عورت۔" اور پھر سوچ میں پڑ جاتا۔ "اگر پپو کو خدانخواستہ کچھ ہوگیا تو منزہ کا کیا حال ہوگا؟" پھر وہ سر جھٹک دیتا۔ "تھوڑا بڑا ہو جائے تو پپو خود ہی ہم عمر ساتھیوں میں خوش رہے گا اور منزہ کی ایک نہیں سنے گا تو وہ خود ہی اسے بھول جائے گی۔"

مگر ہر گزرتے پل کے ساتھ منزہ اس سے زیادہ قریب ہوتی گئی۔ اس کے لیے مزے کے کھانے بناتی، ٹھیک بھی ہوگیا تو زیادہ زمین پر اترنے نہیں دیتی۔ خود اس کے ساتھ کھیلتی رہتی اور پپو اب بیزار سا رہنے لگا۔ وہ اپنے ہم عمر ساتھیوں کو دوڑتے بھاگتے، آپس میں کھیلتے خوش ہوتے دیکھتا تو اسے اپنا گھر قید خانہ لگنے لگا اور وہ وہاں سے نکلنے کے مواقع ڈھونڈتا رہتا۔

ایک روز اسے موقع مل ہی گیا۔ منزہ دھوبی کے جانے کے بعد لاؤنج اور باہر کے برآمدے کا درمیانی دروازہ بند کرنا بھول گئی اور الماری میں کپڑے سیٹ کرنے لگی پپو اپنے بستر پر سے جست مار کر اترا اور تیزی سے دروازے سے باہر دوڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ سڑک کے آخر میں کھڑے لڑکوں کے نرغے میں آگیا جو خوفناک آوازیں نکال کر اسے ڈرا رہے تھے۔ پپو نے تو صرف منزہ اور فریحہ کی بے پناہ چاہت دیکھی تھی اسے ان درندہ صفت انسانوں کا علم نہ تھا۔ وہ تو ابھی اتنا چھوٹا تھا کہ صرف ماما ہی کہہ سکتا تھا اور ساری دنیا کو اپنی ماں کی گود سمجھتا تھا۔ اس کی یہی معصومیت اس کے لیے تباہی کا باعث بن گئی۔ ان بظاہر پڑھے لکھے ماڈرن لڑکوں نے پپو کے اوپر چادر ڈالی اور سختی سے پکڑ کر جانے کہاں لے گئے۔

ادھر فریحہ تک اطلاع پہنچ گئی کہ اس کا ننھا پپو اغوا کرلیا گیا ہے۔ وہ جلدی سے منزہ کے پاس دوڑی آئی جو پپو کو ہر طرف تلاش کر رہی تھی اور کھلا دروازہ دیکھ کر سمجھ گئی کہ بچہ گھر سے باہر نکل گیا ہے مگر اس کے ساتھ ظالم انسانی ہیولے ایسا گھناؤنا سلوک کریں گے یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا اور جب فریحہ نے اسے مختصراً بتایا کہ پپو کو اغوا کرلیا گیا ہے اور کتنے بڑے نامور افراد اس میں شریک ہیں تو منزہ چلا اٹھی۔

"اللہ ان سب کی اولاد کا یہی حشر کرے۔ میری محبت پر وار کیا ہے۔ میرے آنکھ کے تارے کو مجھ سے جدا کردیا۔" وہ بے اختیار رو پڑی۔ "نہ جانے وہ معصوم کتنی تکلیف میں ہوگا۔ نہیں چھوڑوں گی میں ان سب کو۔" اور اس نے ہر گھر کا دروازہ بجا دیا اور دہاڑی۔

"کہاں ہے میرا پپو واپس کرو نہیں تو یاد رکھو میرا اللہ تم سب سے میرا انتقام لے گا۔ تمہارے جگر کے ٹکڑے بھی تم سے اسی طرح چھین لیے جائیں گے۔ تم سب ان کے غم میں پاگل ہو جاؤ گے۔ قہر ٹوٹے گا تم سب پر۔" پپو کی بڑی سی خوب صورت تصویر فریم کرکے لاؤنج میں پھولوں کے فریم میں لگادی گئی۔ منزہ کو تمام انسانی شکلوں سے نفرت ہوگئی تھی۔ نعیم اسے بہت تحمل اور پیار سے سمجھاتا مگر وہ ایک ہی سوال کرتی۔

"کہاں ہے میرا پپو؟" اور رو پڑتی۔ تب ایک روز ان کے تھانے کی حدود کے ڈی ایس پی، نعیم کے ساتھ ان کے گھر آئے اور سامنے بے چین کھڑی منزہ کو سلام کرتے ہوئے بولے۔

"آپ مجھے پپو کی تصویر دکھا دیں میں انشاء اللہ جلد اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ میرا یہاں حال ہی میں ٹرانسفر ہوا ہے کیونکہ آپ کی بددعاؤں نے اہلِ محلہ کو ہلا دیا ہے۔" منزہ کچھ نہیں بولی۔ نعیم ان کو پپو کی قد آدم تصویر کے قریب لے آیا اور ڈی ایس پی صاحب کا چہرہ فق ہوگیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ تصویر کو گھورتے ہوئے بولے۔

"یہ...... یہ سرمئی رنگت، سفید چہرے اور سبز بڑی، بڑی آنکھوں کی بلی۔ یہ...... یہ پپو ہے۔ میں سمجھا کسی بچے کے اغوا کی بات ہے۔ حد ہوگئی۔"

"واقعی حد ہوگئی، بے زبان معصوم جانوروں کو انسان نہ بخشے۔ ان کے جذبات کا خیال نہ کرے، ان کی بے زبانی، ان کی محبت کی پروا نہ کرے ان پر ظلم توڑے تب تو واقعی عذابِ الٰہی کا وقت ہی آگیا ہے۔ بتاؤ کہاں ہے میرا پپو؟ ورنہ دیکھ لینا تم سب اپنے، اپنے پپوؤں کو روؤ گے۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ "میرا پپو لا کر دو! کہاں ہے میرا پپو......؟"

تب وہ پولیس افسر ہوا کی رفتار سے بھاگا کہ منزہ کا پپو تو اسی کے گھر میں تھا اور اس کے اپنے بچے اس سے بہت خوش تھے۔ منزہ اپنے پپو کو آوازیں دیتی رہی۔ ڈی ایس پی نے گھر پہنچ کر اس بلی کے بچے کو باہر جانے کا راستہ دکھایا...... آج اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ جس شہر میں انسانی جانوں کا خون آئے دن کے ہنگاموں میں ارزاں ہو وہاں ایک بے زبان جانور کے لیے کسی کے دل میں اتنی محبت بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اتنا اہم ہو جائے جتنا کہ کسی بھی انسان کے لیے کوئی دوسرا انسان اہم ہونا چاہیے۔

انہوں نے مل جل کر اس کی تکا بوٹی کر ڈالی۔'' بابر بھی ہنسنے لگے۔

''دراصل یہ علاقہ بہت پسماندہ ہے۔ تعلیمی ماحول تو کہیں دور دور کی بستیوں میں بھی نہ ملے گا۔ تعلیم کی کمی کی بنا پر لوگ بدروحوں، بھوت پریت اور جادو ٹونے پر بہت یقین رکھتے ہیں۔'' خرم نے سنجیدگی سے کہا۔

''تعلیم کی روشنی اور اسلامی معلومات کا نہ ہونا تو ہے ہی بنیادی سبب لیکن باہر کے ملکوں میں بھی جادو ٹونے پر یقین رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے...... افریقا کا کالا علم تو کہتے ہیں انسان کو مافوق البشر طاقتوں کا مالک بنا دینے کی قوت رکھتا ہے۔ میں نے خود ایک جگہ پڑھا کہ اگر شکاری اپنے ہتھیار یعنی رائفل، بندوق وغیرہ وہاں کے کسی سیانے سے دم کروالے یعنی اس پر جھاڑ پھونک کروالے تو جانور سے بھی مات نہیں کھا سکتا یعنی ہتھیار کامیاب وار کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔'' بابر بھی سنجیدہ ہو کر بولے۔

''آپ کا مطلب ہے کہ جھاڑ پھونک افریقا میں مذہبی عمل کا درجہ رکھتا ہے؟'' ڈاکٹر خاور نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''بالکل ٹھیک سمجھے۔'' بابر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بتایا۔'' وہاں ہر بستی میں مخصوص معبد بنے ہوئے ہوتے ہیں جہاں قبائلی سردار شکاری کی بندوق پر دم کر کے دیتے ہیں، یہ ان کا اعتقاد ہے۔''

''بھائی جان ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے بھی پڑھا ہے افریقی لوگ یہ معبد کسی پوشیدہ جگہ پر تعمیر کرتے ہیں۔ اس کے اندر جانے کے لیے صرف ایک سوراخ ہوتا ہے وہ بھی اتنا تنگ کہ ایک بندہ... بہ مشکل رینگ کر اندر گھس سکتا ہے۔ وہاں معبد کے اندر دو بت رکھے ہوتے ہیں۔'' خرم نے بھی مسکراتے ہوئے تائید کی۔

''لاحول ولاقوۃ!'' خاور زور سے بولے۔'' دنیا میں بھی کیسے کیسے احمقانہ رسم و رواج بکھرے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے بڑھ کر سچا اور مکمل دین کوئی ہو ہی نہیں سکتا جو ہمیں ہر طرح کا شعور اور ذہنی اجالا مہیا کرتا ہے۔ باقی سب جھوٹے ہیں۔'' پھر انہوں نے کچھ موضوع بدلا اور خرم کو مخاطب کیا۔'' بھائی تمہارا کیا خیال ہے موہن داس کی گائے کو آخر کس نے مار ڈالا؟''

''اس سلسلے میں، میں بھی کشمکش کا شکار ہوں۔'' خرم نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

''کیوں بھائی جان؟'' اچانک کسی خیال کے تحت اس نے بابر کو مخاطب کیا۔'' کیوں نہ کل صبح ہم لوگ تحقیقات کا آغاز موہن داس کے باڑے سے کریں جس میں اس کے نوکروں، ہاریوں سے پوچھ گچھ شامل ہو۔''

''ویری گڈ آئیڈیا۔'' بابر نے فوراً اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ طریقۂ کار یقیناً امید افزا رہے گا۔'' وہ یہیں تک کہنے پائے تھے کہ ان کی آواز اچانک باہر سے ابھرنے والی چیخوں میں دب کر رہ گئی۔ رات کے سناٹے میں ایک سنسنی خیز دھما کا ہوا تھا۔ ایک دم ہی وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ یہ تینوں اٹھ کر کمرے سے باہر بھاگے۔

تینوں بھائیوں میں سے صرف خرم تکیے کے نیچے سے اپنا ریوالور نکال کر دوڑا تھا۔ آج کی رات پورا چاند آسمان پر روشن تھا اور بھرپور چاندنی سے جنگل چمک رہا تھا۔ مصفا اور شفاف کرنیں نقرئی بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ ٹھنڈک البتہ ہڈیوں میں اتری جا رہی تھی۔ ایسے میں یہ لوگ دور تک بھاگے چلے گئے مگر پتا نہیں چل رہا تھا کہ درحقیقت قصہ کیا ہے؟

خرم کا باورچی ریسٹ ہاؤس میں اکیلا کھڑا تھر تھر کانپتا رہ گیا۔ تبھی خرم کو احساس ہوا کہ وہ جوش ہی

جوش میں رحمت بابا کی کُٹیا تک بھاگتے چلے آئے ہیں۔ چیخوں کا عقدہ یہیں پہنچ کر کھلا۔

ریشم اور رحمت بابا لوگوں کے نرغے میں کھڑے ان کے سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ریشم تو اب تک پوری جان سے لرزے جا رہی تھی۔

ایک تو رات، اوپر سے جنگل کی ہولناکی میں لوگوں کی دہشت زدہ آوازوں سے منظر اور بھی بھیانک ہو گیا تھا۔ خوف زدہ مویشی بری طرح ڈکرا رہے تھے۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد تفصیل یوں ملی کہ......

رحمت بابا رات کو دو تین دفعہ حاجت کے لیے اٹھا کرتے تھے۔ آج کل ان کی طبیعت خراب تھی اس لیے احتیاطاً ریشم ہر دفعہ ان کے ساتھ اٹھ کر کٹیا سے باہر آیا کرتی تھی۔ آج جیسے ہی یہ دونوں باہر نکلے تو ایک عجیب و غریب صورتِ حال پیش آئی۔ جس نے ان دونوں کے ہوش اڑا دیے۔

کسی درندے نے باڑے کے اردگرد لگی ہوئی مضبوط لکڑیوں کی بلیوں کو پھلانگ کر مویشیوں پر ہلا بول دیا تھا۔ مویشیوں نے خوف زدہ ہو کر ڈکرانا اور رسیاں تڑوانا شروع کر دیا۔ ان کی بھگدڑ سے پورا علاقہ متاثر ہوا۔ خوف کی ہی شدت سے ریشم کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ اس کی اب تک کی زندگی میں کبھی ایسا ہولناک سانحہ پیش نہ آیا تھا۔

جن مویشیوں نے رسی تڑوانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی ان میں سے کسی نے خوف زدہ ہو کر باڑے کے دروازے کو ٹکریں مارنی شروع کر دیں بالآخر دروازہ ایک طرف سے ٹوٹ گیا۔ اب شاید حملہ آور درندہ بھی اسی ٹوٹے ہوئے دروازے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا بہرکیف جاتے جاتے وہ ایک دو بھیڑیں بھی منہ میں دبا لے گیا۔

لوگوں نے بہ مشکل تمام مویشیوں کو پکڑ دھکڑ کر دوبارہ باڑے میں ڈالا۔ تاہم یہ ابھی تک معلوم نہ ہو پایا تھا کہ حملہ آور درندہ دراصل کون یا کیسا تھا؟

''بابا آپ نے باڑا پھلانگنے والے جانور کو دیکھا تھا؟'' خرم نے رحمت بابا سے دریافت کیا۔

''نہ بیٹا، میری نظر تو بہت موٹی ہے میں بھلا کیا دیکھ پاؤں وہ بھی بھلا رات کو؟ ریشم شاید کچھ بتا پائے۔'' انہوں نے فوراً جواب دیا۔ وہ ریشم کی طرف متوجہ ہوا۔ اچانک ہی ریشم سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اتنے سارے لوگوں اور خصوصاً خرم کے ساتھ صاف ستھری شخصیت کے مالک دو افراد کو دیکھ کر وہ ٹپٹا گئی چند لمحوں کے لیے چپ کی چپ رہ گئی۔ خرم نے براہِ راست اسی سے استفسار کیا۔

''سوچ کر بتاؤ وہ کیسا جانور تھا؟ کچھ تو نظر آیا ہوگا؟''

''نہیں جی۔'' اس نے ہمت سے کام لے کر بالآخر جواب دیا۔'' میں نے بس باڑے کے اندر کسی کے کودنے کی دھمک سنی تھی پھر جانوروں نے ڈکرانا شروع کر دیا بہت شور مچ گیا......''

''بیٹا اندر چل کر بیٹھو۔ یہاں بہت پالا پڑ رہا ہے۔ گرم چائے پیو۔'' رحمت بابا نے خرم کا شانہ ہلا کر کہا۔

''نہیں بابا، اب بہت رات چلی گئی کل دیکھیں گے۔ آپ یہ بتائیے کہ زیادہ جانوروں کا نقصان تو نہیں ہوا؟''

''نقصان کا تو کچھ پتا نہیں بیٹا۔'' بابا نے بہت بے چارگی کے عالم میں جواب دیا۔'' اس وقت رات کے اس سمے کون باڑے میں گھس کر شمار کرے۔ سویرا ہوگا تو دیکھیں گے مگر میرا خیال ہے کہ جنگل کا کوئی بڑا جانور لاگو ہو گیا ہے ورنہ اس طرح باڑوں کے اندر کود کر کوئی معمولی جانور نہیں آ سکتا۔ اتنی زندگی ہماری اسی جنگل میں بیت گئی۔'' جیسے ہی انہوں نے باڑوں کہا خرم کا ذہن یکلخت موہن داس کے باڑے کی طرف گھوم گیا۔

بابر اور خاور بھی چونک گئے تھے۔ تاہم خاموش رہے۔ خرم ہی ان سے بات چیت کرتا رہا پھر صبح آنے کا وعدہ کر کے وہ لوگ ریسٹ ہاؤس واپس آ گئے۔

اگلی صبح خرم جلدی اٹھ کر اپنے معمول کے مطابق ایک فاریسٹ گارڈ کے ہمراہ جنگل کے دورے پر چلا گیا اور یہ دونوں دن چڑھے تک سوتے رہے۔

دس بجے کے قریب وہ دورے سے واپس آیا۔ باورچی خانے میں خود کھڑے ہو کر ناشتا تیار کروایا، اس اثنا میں بابر اور خاور بھی اٹھ بیٹھے۔ غسل سے فارغ ہو کر تینوں نے مل کر ناشتا کیا اور تیار ہو کر ریسٹ ہاؤس سے باہر آ گئے۔

گزشتہ تین دنوں میں ان لوگوں نے جو پرندوں اور جانوروں کا شکار کیا تھا خرم نے مختلف گھروں میں بانٹ دیا تھا مگر آج شکار کا موڈ نہ بن سکا اور یہ لوگ رحمت بابا کی کٹیا کی طرف چل دیے۔ وہ انہی کے انتظار میں باہر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

''بیٹھو بیٹا۔'' انہوں نے سب کے سلام کا جواب دیتے ہوئے چارپائی کی طرف اشارہ کیا جو وہ صبح سویرے ہی بچھائے بیٹھے تھے۔ آج انہوں نے ریشم کو مویشی چرانے کے لیے بھی جانے نہیں دیا تھا۔

''بابا جانوروں کو صبح دیکھا؟'' خرم نے بیٹھنے سے قبل دریافت کیا۔

''نہیں بیٹا۔'' انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔ ''میں نے سوچا کہ تم خود آ کر دیکھو گے، اس لیے......''

''ٹھیک ہے، چلیں اب دیکھ لیتے ہیں۔'' خرم نے کہا اور یہ لوگ باڑے کی طرف چل دیے۔

یہاں اس وقت ریشم موجود تھی جو باڑے کے ٹوٹے ہوئے دروازے کی مرمت کرنے میں لگی تھی۔ ان لوگوں کو دیکھ کر وہ ایک طرف ہو کر... کھڑی ہو گئی۔

''ہاں بھئی کیسے ہیں تمہارے مویشی؟ کوئی کم تو نہیں ہوا؟'' خرم نے براہِ راست اسی سے پوچھ لیا۔

''جی وہ......ایک بھیڑ کم ہے۔'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔ ''لال رنگ کا بھیڑ کا بچہ تھا۔ ابھی دو ماہ کا تھا، وہ گم ہے۔''

''اوہ......اچھا گھر میں اندر تلاش کیا کہیں چھپا بیٹھا ہو؟''

''نہیں......اندر نہیں ہے۔'' اس نے وثوق سے جواب دیا۔

''باقی جانوروں میں سے دو بکری کے بچوں کی ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ ایک کی دم اور کان پر زخم آیا ہے۔ میں نے سب کی مرہم پٹی کر دی ہے۔'' ڈاکٹر خاور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا۔

''یہ خود اچھے ڈنگر ڈاکٹر ہیں کسی سے مدد ہی نہ مانگی۔''

ان لوگوں نے ایک ہی نظر میں باڑے کا جائزہ لے لیا تھا ذرا سی دیر میں باہر نکل آئے۔ بہت منع کرنے کے باوجود رحمت بابا نے ایک نہ مانی اور چائے بنوالی۔ ریشم نے الائچی کی خوشبودار چائے کے ساتھ مونگ کی دال کے پاپڑ بھی سینک کر سامنے لا رکھے تھے جو اس نے اور بسنتی نے مل کر بیلے تھے اور مٹکا بھر کر رکھے تھے۔ چائے کے دوران رحمت بابا بولے۔

''صبح سویرے سے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ ہر کسی کا یہی کہنا ہے کہ کوئی بدروح پیچھے لگ گئی ہے۔ وہی مویشیوں کو باڑے سے گھیر گھیر کر لے جا رہی ہے۔ کسی سیانے کو بلا کر دکھانا چاہیے لیکن بیٹا میں صاف کہے دیتا ہوں یہ سب وہم ہے ان کا۔ کوئی بلا ولا نہیں ہے، یہ سب کسی لاگو جانور کا کام ہے۔ میرے ہاتھ پیروں میں تو قوت نہیں ہے ورنہ میں اسے مار گراتا۔ اللہ تم لوگوں کو وہ طاقت اور ہمت عطا فرمائے کہ تم یہاں کے بے وقوف اور معصوم لوگوں کے کام آسکو اور کسی صورت اس شریر جانور کو شکار کرنے میں کامیاب ہو جاؤ جس نے ہماری نیندیں اڑا لی ہیں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' ان سے دعائیں لیتے ہوئے یہ لوگ موہن داس کے باڑے پر آ پہنچے۔ موہن داس انہیں گھر پر ہی مل گیا۔ آج وہ بہت صحیح الدماغ نظر آ رہا تھا۔ آج اسے اپنے جذبات پر پورا قابو تھا۔

یہاں پر ذرا سی تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ تمام حالات تقریباً اسی انداز میں پیش آئے تھے جو رحمت بابا کے باڑے میں پیش آئے تھے۔ رکھوالے نے ڈرتے، ڈرتے سچ اگل دیا۔

''صاحب جی، باہر سے کوئی چیز اڑتی ہوئی آئی اور باڑے میں کود پڑی۔ بس پھر کیا تھا باڑے کے اندر بھونچال آ گیا۔ سب جانور ایک دوجے کے پیچھے بھاگنے، دوڑنے لگے اسی بھاگا دوڑی میں باڑے کا در کھل گیا۔ گا دما تا خبر نہیں کب اور کیسے چل کر باہر نکل آئی۔''

''یاد کرو تم نے جنگل کا کوئی جانور وہاں گھومتے پھرتے دیکھا تھا؟'' بابر نے زور دے کر دریافت کیا۔

''جی نہیں۔'' رکھوالے نے تقریباً گھگھیاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایک تو جی ان دنوں چاند بھی دیر سے نکلتا تھا۔ دوجے پھر مجھے وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی، میں گہری نیند سوتا رہ گیا تھا۔''

''ممکن ہے درندے نے اس کے سامنے ہی گائے کی تکا بوٹی کی ہو اس لیے یہ اس درندے کا نام بتانے سے گریز کر رہا ہے۔'' بابر نے معنی نگاہوں سے خرم کی طرف دیکھا اور انگریزی میں بولے۔ خرم نے اثبات میں گردن ہلائی پھر رکھوالے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے کچھ دور چلا گیا دونوں میں کچھ باتیں ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد خرم نے ان دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور جنگل کی طرف چل دیے۔ رکھوالا واپس اپنے ٹھکانے پر چلا گیا۔

''کیا بتایا اس نے؟'' بابر نے بے صبری سے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' خرم نے مایوسی سے سر ہلا کر جواب دیا۔ ''اس نے حقیقت میں کچھ نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو بتا دیتا۔ میرا خیال ہے وہ واقعی مدہوشی کی نیند سوتا رہ گیا۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ اس رات اس نے بھنگ گھوٹ کر پیالے پہ پیالہ چڑھا لیا تھا اس لیے دنیا مافیہا سے بے خبر پڑا سوتا رہ گیا۔''

''یہ اس کا روز کا ہی معمول ہوگا، خرم تم بھی معلوم نہیں کس بے ہودہ بے سُرے ماحول میں پڑے ہو۔ معلوم نہیں کیسے وقت گزار لیتے ہو ان جاہل اجڈ لوگوں میں۔ میرے جیسا تو ایک دن میں ہی ان سب کا سر پھوڑ کر یہاں سے روانہ ہو جائے۔ خدا کے واسطے اپنا ٹرانسفر کرواؤ اس جنگلی ماحول سے۔ اماں جان سن پائیں تو فصیحتہ کر ڈالتیں۔'' خاور منہ بنا کر بولے۔

''خدا کے لیے یار اپنی تقریر روکیں اور کبھی انہیں سنانے نہ بیٹھ جائیے گا۔'' خرم نے جلدی سے انہیں روکا۔ بابر ہنسنے لگے۔ خاور نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیوں بھائی جان میں نے غلط کہا ہے بھلا؟ کس قدر توہم پرست اور جاہل لوگ ہیں یہاں کے۔ ذرا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنانے میں ماہر ہیں۔ اتنے لوگوں میں صرف وہ رحمت ہی ذرا معقول سے بندے نظر آتے ہیں۔ نڈر بھی ہیں، سلجھے ہوئے بھی بس انہوں نے جنوں بھوتوں کی کہانیاں نہیں سنائیں۔ باقی رہی ان کی وہ صاحب زادی......'' خاور نے رک کر دانستہ آہ بھری۔ بابر اور خرم چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک لمحہ تھم کر خاور نے اپنی بات مکمل کی۔

''ان کے لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا، یہ گستاخی ہوگی کیونکہ...... کیونکہ وہ چائے نہایت مزے کی بناتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ رات کو بھوتوں اور بدروحوں کے خوف سے وہ بھی تھر تھر کانپ رہی

تھیں۔'' بابر نے بے اختیار قہقہہ لگا کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا، خرم چپ رہا۔

☆☆☆

کامی دوڑتا ہوا باہر سے آیا۔ دروازے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا اور زور سے چلّایا۔

''افشاں، نومی دوڑ کر آؤ دیکھو اپنے ٹیوٹر مسٹر منوں آئے ہیں اور تم سب کو بلا رہے ہیں۔ جلدی آؤ جلدی بھاگ کر۔''

معصومہ وہیں بڑے کمرے میں بیٹھی تکیہ کا غلاف کاڑھ رہی تھی اس نے بھی کامی کی بات سنی۔ شرمین تھوڑی دیر پہلے تینوں کو پڑھا کر روانہ ہوئی تھی۔ اس سے پہلے یہ بچے باہر جاتے اس نے جلدی سے انہیں پکار لیا۔

''نومی...... کامی اِدھر آؤ میرے پاس...... کہاں جا رہے ہو؟ کون آیا ہے؟''

''بجو وہ تھے ناں... ہمارے پہلے والے سر۔ سر منوں وہ واپس آ گئے ہیں۔ باہر والے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ ابھی مجھے بلوایا تھا کہہ رہے تھے سارے بچوں کو بلاؤ۔ پڑھائی شروع کرنی ہے۔'' کامی نے قریب آ کر تفصیل بتائی۔

''آئے ہائے، میں تو ہرگز نہ پڑھوں گی ان سے۔ ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے ہیں۔ مجھے تو مس شرمین اچھی لگتی ہیں۔'' افشاں نے شور مچا دیا۔

''اور میں بھی...... میں بھی مس شرمین سے۔'' نومی نے آگے بڑھ کر اس کی تائید کی۔

''خیر...... سر منوں پڑھاتے تو اچھا ہیں۔'' کامی منہ بنا کر بولا۔

''میرا خیال ہے تم سب لوگ ابھی ان کے سامنے مت جاؤ۔ بابر بھائی جان اور خاور بھائی آ کر خود ہی بات کر لیں گے ان سے۔'' معصومہ نے سب کے تبصرے سن کر جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے، بجو کا کہنا درست ہے۔'' نومی اور افشاں فوراً مان گئے مگر کامی نے اعتراض جڑ دیا۔

''کیوں بھئی، یہ تو غلط بات ہو گی۔ آخر وہ ہمارے سر ہیں۔ بلوایا ہے انہوں نے۔ ہمیں یوں بھی سلام کو تو جانا چاہیے ناں۔''

''میں جانے کو منع نہیں کر رہی ہوں۔ میرا مطلب ہے ابھی تو مس شرمین پڑھا کر گئی ہیں اس طرح ان کی بھی حق... تلفی ہو گی۔'' معصومہ نے پیار سے کہا۔

''کہنا تو آپ کا بھی ٹھیک ہے۔'' کامی نے قائل ہو کر ہاں میں ہاں ملائی۔ ''سر منوں گئے بھی تو بتائے بغیر تھے اب تو فیصلہ بھائی جان ہی کریں گے۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اکیلا ہی باہر چلا گیا۔

معصومہ کا جی کڑھائی سے اوب گیا وہ وہاں سے اٹھ کر روبی کی طرف آئی۔ وہ مشین پر بیٹھی بوا کی پوتی کا کرتہ پاجامہ سی رہی تھی۔ معصومہ کو دیکھ کر مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔

''آ گئیں...... دل نہیں لگا ناں اکیلے؟''

''خبر ہی ایسی ہے کہ آپ بھی سن کر اچھل پڑیں گی۔'' معصومہ نے قریب بیٹھتے ہوئے راز داری سے کہا۔

''کیوں؟ کیا خاور اور شرمین کا آمنا سامنا ہو گیا ہے؟''

''آمنا سامنا بلکہ یہ سمجھیے کہ آمنے سامنے ہونے کے امکانات ختم۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' روبی نے سلائی موقوف کر دی اور تقریباً چیخ اٹھی۔ ''کہیں ممانی جان نے شرمین کو منع تو نہیں کر ڈالا پڑھانے سے؟ سچ کہنا کہیں ایسا تو نہیں ہو گیا؟''

''اس سے بھی بڑھ کر تشویش ناک خبر ہے۔ کامی بتا کر گیا ہے کہ ان کے پچھلے ٹیوٹر سر منوں لوٹ آئے ہیں۔ بچوں کو پڑھانے کے لیے بلا رہے تھے۔'' معصومہ نے افسوس کے لہجے میں منہ بگاڑ کر

جواب دیا۔

''تو کیا...... شرمین پڑھا کر نہیں گئی؟'' روبی نے بے حواس کر پوچھا۔

''ارے آپ تو اپنے حواسوں پر سے صدقہ دیجیے۔'' معصومہ نے جل کر کہا۔ ''کہو کھیت کی، سن رہی ہیں کھلیان کی۔ بندی آپ سے یہ عرض کر رہی ہے کہ شرمین کی گنجائش ختم ہو چکی، سر منوں واپس آ گئے ہیں۔'' روبی جو پوری بات سمجھ کر کسی سوچ میں ڈوب چکی تھی بولی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو شرمین کی گنجائش تو واقعی ختم ہو گئی اور اب خاور سے سامنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''ہائے روبی آپا اس طرح مت کہیے۔ مس شرمین کو دیکھتے ہی میں نے تو جانے کتنے سہانے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ اتنی پیاری اور خوش اخلاق ہیں کہ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی دوسری نہ ملے گی۔ یقیناً خاور بھائی کے جی کو کوئی بات لگی ہے لیکن اب تو یوں لگ رہا ہے......''

''حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔'' روبی اسی کے لہجے میں مایوسی سے بولی۔

''رو...... بی آپا۔'' معصومہ چڑ کر چلّائی۔ ''یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے خدا کے لیے سنجیدہ ہو کر سوچیں۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں معصومہ سمجھو شرمین کا پتا کٹ گیا کیونکہ ممانی تو شاید پہلے ہی اس سے چڑ چکی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔'' روبی نے سچ مچ سنجیدہ سا چہرہ بنا کر کہا۔

''کیوں، کیوں چڑ چکی ہیں؟ کیا کیا ہے انہوں نے؟'' معصومہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

''اتنی جلدی بھول گئیں یاد نہیں ممانی جان نے اسے کہا تھا کہ اپنی دادی اماں سے کہو ہماری رضائیاں سی دیں مگر شرمین نے ہاں نہ کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ اندر ہی اندر کتنی خفا ہوں گی وہ اس سے۔'' روبی نے اسے گھور کر دیکھا۔

''ارے ہاں...... خوب یاد دلایا آپ نے۔'' معصومہ نے چونک کر کہا پھر بے چین ہو کر کہنے لگی۔ ''اللہ روبی آپا کچھ کیجیے۔ کچھ تو کیجیے ورنہ اماں جان ضرور بہ ضرور سر منوں کو بلوا لیں گی اور بے چاری مس شرمین......''

روبی سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ دونوں دیر تک سر جوڑے بیٹھی رہیں مگر کوئی تدبیر عقل میں نہ سما رہی تھی۔ جس پر عمل کرکے اس نئے بحران سے باہر نکلا جا سکتا بلکہ تھوڑی دیر میں ہوا یہ کہ نائمہ بیگم اور شمسہ بیگم دونوں باتیں کرتی ہوئی وہاں آ نکلیں اور اسی کمرے میں براجمان ہو گئیں۔

معصومہ انہیں دیکھ کر سہم سی گئی روبی بھی اس کی صورت دیکھ کر رہ گئی۔ اب اس کا دل سلائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ بہانے سے آگے پیچھے باہر آ گئیں۔ یہاں سب سے پہلا ٹکراؤ کامی سے ہو گیا۔

''ارے کامی۔'' معصومہ نے اسے پکارا۔ ''اپنے سر منوں کے آنے کا اماں جان کو تو نہیں بتایا؟''

''اوفوہ۔'' اس نے سر سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں تو بھول ہی گیا تھا اچھا ابھی بتا کر آتا ہوں۔''

''ارے...... رکو، رکو۔'' معصومہ نے اسے روکا۔ ''ابھی تم اماں کو نہ ہی بتاؤ تو بہتر ہو گا۔''

''کیوں بجو؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بس یونہی، تم ذرا ٹھہرو تو۔''

''آپ کی مرضی۔'' کامی نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور وہاں سے چلا گیا۔

''کاش خاور بھائی آج ہی لوٹ آئیں تو شاید کچھ ہو جائے۔'' معصومہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

''روبی آپا کوئی فون ہی کیجیے انہیں۔''

''کوئی رابطہ نمبر ہی نہیں ہے تو کیا کریں۔''

''وہ بھی معلوم نہیں کون سے انوکھے علاقے

میں گئے ہیں شکار کھیلنے۔“

”ہاں بھئی ان کا شکار کا شوق پورا ہونا چاہیے یہاں بلا سے قیامت ہی کیوں نہ بیت جائے۔“

”خاور بھائی بیچارے کو بھلا کیا معلوم کہ ان کے جاتے ہی نئی ٹیوٹر آجائیں گی۔ یہ بھی خوب اتفاق ہے۔“

”اتفاقات ہیں زمانے کے۔“ روبی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اور ان سرمنوں کو بھی واپس آنے کی خوب سوجھی۔ اول تو بغیر اطلاع کے اتنے طویل عرصے غائب رہے اور اب آئے ہیں تو کیسے ہتھیلی پر سرسوں جما رہے ہیں۔“

ان دونوں کی وہ شام غارت ہو کر رہ گئی۔ دونوں دیر تک سر جوڑ کر بیٹھی اس نئے مسئلے کا حل تلاش کرتی رہیں۔ بادل گھر گھر آنے کی وجہ سے آج سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک اور تیزی بڑھ گئی تھی۔ اس کے باوجود لان میں بچے پورے جوش و خروش کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ کامی اور نومی کے دو دوست پڑوس کی کوٹھی سے آ گئے تھے۔ اس لیے کھیل پوری سنجیدگی سے جاری و ساری تھا۔

رفتہ رفتہ سانولی شام سیاہ رات میں تبدیل ہو گئی اور پوری کوٹھی میں برقی قمقمے جگمگا اٹھے۔ اماں کے بلوانے پر روبی، معصومہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی۔ وقت دبے پاؤں گزر گیا تھا۔

اگلی صبح کوئی دس بجے کا وقت ہو گا۔ سب لوگ بڑے کمرے میں موجود تھے۔ پھوپی شمسہ اور روبی بھی آئی ہوئی تھیں اتوار ہونے کی وجہ سے بچے گھر پر ہی تھے۔ باہر کے ملازم نے ایک بند لفافہ لا کر نائمہ بیگم کے ہاتھ میں دے دیا۔

”کیا ہے یہ، کس نے دیا ہے؟“ انہوں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ...... کامی میاں کے ماسٹر صاحب نے دیا ہے بیگم صاحب۔“ ملازم نے ادب سے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ انہوں نے چشمہ ڈھونڈتے ہوئے اسے جانے کو کہا۔

روبی اور معصومہ نے بیک وقت چونک کر لفافے کی طرف دیکھا معصومہ بڑبڑائی۔

”مارے گئے آپا سرمنوں نے بھیجا ہے کوئی لفڑا۔“

”چپ رہو تم۔“ روبی نے اسے جھڑک دیا اور آگے کو کھسک کر دیکھنے لگی۔

نائمہ بیگم نے پہلے تو لفافے کا بغور جائزہ لیا پھر کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں چاک کر ڈالا۔ اندر سے ایک چھوٹے سائز کا پرچہ برآمد ہوا جس پر سرمنوں نے اپنی عرضداشت تحریر کی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ غور سے پڑھتی، سمجھتی رہیں پھر ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

”لو بھیا اور سن لو مردے زندہ ہو گئے۔“

”اے ہے کیا کہہ رہی ہو نائمہ؟“ شمسہ بیگم نے ہول کر دریافت کیا۔

”تو کیا غلط کہہ رہی ہوں؟ یہ کیا لکھا ہے ماسٹر صاحب نے آپ بھی پڑھ لیجیے۔“ انہوں نے ناک چڑھا کر پرچہ ان کو تھما دیا۔

شمسہ بیگم نے پرچہ لے کر روبی کو دے دیا معصومہ بھی بے تابی سے جھک گئی اور دونوں جلدی جلدی پڑھنے لگیں۔ سرمنوں نے بچوں کی والدہ سے مخاطب ہو کر لکھا تھا کہ وہ بہت ضروری کام سے دوسرے شہر چلے گئے تھے جس کی اطلاع وہ کسی مجبوری کی بنا پر دے نہیں سکے تھے مگر اب قصہ مختصر وہ آ چکے ہیں اور بچوں کو دوبارہ پڑھانے کی درخواست کر رہے تھے۔ پوری تحریر سنانے کے بعد روبی نے ایک گہری سانس لی اور اپنی ممانی کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ صاف الجھن میں دکھائی دے رہی تھیں۔

”چلو شکر ہے ماسٹر صاحب آ گئے۔ ارے ہم کہتے ہیں اس میں اجازت طلب کرنے کی کیا ضرورت ہے بس پڑھائیں بچوں کو اور کیا۔“ شمسہ بیگم خود بخود مطمئن ہو کر کہنے لگیں۔

”لیکن پھوپی اماں اب تو مس شرمین آ رہی ہیں۔“ معصومہ ڈرتے، ڈرتے دبی زبان میں بولی۔

”اے آنے دو۔“ انہوں نے بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر جواب دیا پھر دفعتاً کچھ سوچ کر بولیں۔ ”اور اگر ایسا ہی کچھ تم لوگوں کو تردد ہے تو پڑھانے دو دونوں کو۔ اچھا ہے یہ جو ہیں آفت زدہ بچے ذرا نچلے تو بیٹھیں گے، سارا دن ناچے، ناچے پھرتے ہیں۔“ معصومہ اور روبی پریشانی کے باوجود مسکرانے لگیں۔

نائمہ بیگم خاموش کسی غور و فکر میں مستغرق بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کسی کے تبصرے کو قابلِ توجہ نہ سمجھا۔

”اے دلہن کوئی جواب دو۔ بیچارے کے رقعے کا۔ کاہے کو کشمکش میں رکھا ہوا ہے غریب کو۔“ شمسہ بیگم نے ٹہوکا دیا۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ ہم نے سنا نہیں۔“ انہوں نے چونک کر نند کی طرف دیکھا پھر خالی الذہنی سے پوچھا۔

”اے لو بی! ان کے تو حواس ہی جاتے رہے۔“ شمسہ بیگم نے ماتھا پکڑ کر کہا۔

”ہم کچھ سوچنے لگے تھے۔ آپ کہیے کیا کہہ رہی تھیں؟“ نائمہ بیگم نے پاندان اپنی طرف کھسکایا اور بے نیازی سے کہا۔ اس دفعہ شمسہ بیگم نے تحمل سے سمجھا کر کہا۔

”ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اس نگوڑ مارے ماسٹر جی کے لیے اس قدر فکر و تردد کی کیا ضرورت ہے؟ کہلوا بھیجو کہ آ کر پہلے کی طرح پڑھا جایا کرے۔ ہاں اس طرح غائب مت ہو بچے پریشان کرتے ہیں۔“

”یعنی اسے دوبارہ ٹیوٹر مقرر کر دیا جائے؟“ نائمہ بیگم نے چھالیا کترتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل...... ہمارا یہی مطلب ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“ انہوں نے اچانک منہ لال کر کے جواب دیا۔ ”ہم ایسے بہانے باز اور مطلبی شخص کو ہرگز اپنے بچوں پر مقرر نہ کریں گے۔ خواہ لڑکے ہی کیوں نہ کہیں۔“ پھر انہوں نے روئے سخن کامی کی طرف موڑا اور تیز آواز میں حکم دیا۔

”جاؤ باغ علی کو بلا کر لاؤ۔“ چند لمحوں میں باغ علی آ موجود ہوا۔ سراسیمہ اور گھبرایا ہوا۔

”جی بیگم صاحب، فرمائیں۔“

”باغ علی!“ نائمہ بیگم نے... تحکمانہ لہجے میں اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”جاؤ اور بچوں کے ٹیوٹر سے جا کر کہہ دو کہ ان کا بھیجا ہوا پرچہ ہم نے پڑھ لیا ہے مگر اب کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ بچوں پر دوسرے ٹیوٹر کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہم اس شریف ٹیوٹر کو دوبارہ منع نہیں کر سکتے۔ ان کی واپسی بہت تاخیر سے ہوئی ہے۔ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے وہ جا سکتے ہیں۔“ شمسہ بیگم ہکا بکا ہو کر ان کی صورت تکنے لگیں۔

روبی اور معصومہ نے بے اختیار خوشی کا نعرہ لگایا۔ معصومہ تو جوشِ مسرت سے اچھل کر بھاگی اور ماں سے جا کر لپٹ گئی۔

”ارے میری امی جان کتنی اچھی، کتنی پیاری ہیں۔ ہائے آج تو مزہ آ گیا۔ امی آپ کا فیصلہ بہت مناسب ہے۔“

”اے ہے، اس فیصلے میں تیرے لیے خوشی کا کون سا پہلو نکل آیا؟ تجھے کیا دشمنی تھی اس ٹیوٹر غریب سے؟“ انہوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ معصومہ سٹپٹا سی گئی روبی بھی پریشان ہو گئی۔

وہ تو اللہ بھلا کرے پھوپی اماں کا کہ انہوں نے نائمہ بیگم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور یہ دونوں دم دبا کر وہاں سے نکلیں... مگر شرمین کے رہ جانے سے ان کے دل باغ، باغ ہو رہے تھے۔

☆☆☆

ایک صبح خرم جنگل کا چکر لگا کر ریسٹ ہاؤس پہنچا تو دیکھا کہ ایک شخص باورچی سے باتیں کر رہا ہے بغور دیکھ کر اسے یاد آیا کہ یہ وہی ہے جس نے

بیل ہلاک کر ڈالا اور اچھلتا کودتا ہوا چیخیں مارتا جنگل میں گھس گیا اور میں اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ پایا۔''

''تم اِدھر اکیلے جھونپڑی باندھ کر کیوں رہ رہے ہو؟ ڈر نہیں لگتا؟'' ڈاکٹر خاور نے اس سے جرح کی۔

''میں جنگل کے جانورں سے نہیں بلکہ شہر کے شہری لوگوں سے ڈرتا ہوں۔ یہاں تو میرے پندرہ بیس مویشی کھلے کھیت میں بندھے رہتے ہیں۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں آنکھیں بند کر کے بولا۔

''تم نے اپنے مویشی کھلے کھیت میں کیوں باندھے؟''

''صاحب اس سے پہلے کبھی کسی جانور نے پالتو مویشی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔'' پھر اس نے ان تینوں کو بغور دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''آپ لوگ کہاں جارہے ہیں؟''

''بارہ سنگھوں کا شکار کرنے۔'' خاور نے جواب دیا۔

''اس وقت آپ لوگ بارہ سنگھوں کا خیال ترک کر کے اس خونخوار بھالو کو شکار کریں۔ اسے ٹھکانے لگانے سے آپ کو ثواب ہوگا۔ آپ نہیں جانتے میری جائداد یہی تھوڑے سے مویشی ہیں اگر بھالو اسی طرح سے میرے بیلوں، بھینسوں کو ہلاک کرتا رہا تو میرے بچے بھوکوں مرجائیں گے۔'' اس نے ملتجی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے فریادی انداز میں کہا۔

اس کی داستانِ غم سننے کے بعد بابر بھی بارہ سنگھوں کے بجائے اس خونی ریچھ کے شکار کو ترجیح دینے لگے۔

''کیوں بھئی، کیا خیال ہے اس ریچھ کے متعلق؟'' انہوں نے خرم کو مخاطب کر کے پوچھا۔

خرم انہیں کوئی جواب دیے بغیر اس شخص کو مناسب الفاظ میں تسلی وتشفی دینے لگا اور اسے مطمئن کر کے یہ لوگ آگے بڑھ گئے۔

اب سہ پہر ڈھلنے لگی تھی بھوک سے خاور کی آنتیں قل ھواللہ پڑھ رہی تھیں مگر بھائیوں کے خیال سے چپ تھے۔ خرم آگے، آگے چلتے ہوئے بولا۔

''اب مجھے مکمل یقین ہو چکا ہے...کہ...'' اچانک ان کی آوز بند ہوگئی۔ انہیں اپنے قریب سے ہی ہڈیاں ٹوٹنے کی صاف آواز سنائی دی تھیں۔ تینوں نے بیک وقت چونک کر دیکھا۔ ان کے سامنے سے قدرے ہٹ کر لمبی، لمبی گھری جنگلی گھاس تھی اور داہنی طرف ایک سوکھا گڑھا تھا۔ ان کی نگاہیں ایک دہشت ناک نظارے پر جم کر رہ گئیں۔ یہ کوئی پندرہ فٹ گہرا گڑھا تھا جس کے دہانے پر بھی چھوٹی، چھوٹی گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس گڑھے میں اس وقت ایک پہاڑی بکرا مُردہ حالت میں پڑا تھا جس کی ہڈیاں دو خونخوار بھیڑیے توڑ توڑ کر چبا رہے تھے۔

عین اسی وقت سامنے والی اونچی گھاس سے ایک کالا ریچھ برآمد ہوا۔ وہ بہت بڑا ریچھ تھا۔ ایک غیر معمولی اور قد آور ریچھ۔ اچانک وہ رک گیا اور اپنی تھوتھنی ہوا میں بلند کر کے زور زور سے سونگھنے لگا۔ اس نے یقیناً گوشت کی مخصوص بُو سونگھ لی تھی۔

یہ لوگ اس وقت دیودار کے درختوں کے نیچے تھے پلک جھپکتے میں تینوں ایک دوسرے کو اشارہ کر کے درختوں کے موٹے تنوں کے عقب میں چھپ گئے اور سانس تقریباً روک کر کھڑے ہوگئے۔

ریچھ اچانک زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور چند لمحوں کے بعد بڑی احتیاط سے آہستہ، آہستہ گڑھے کی سمت بڑھنے لگا۔ وہ ایک محض سائے کی طرح سے حرکت کررہا تھا۔

جوں جوں وہ گڑھے کے قریب تر ہورہا تھا زیادہ سے زیادہ محتاط ہورہا تھا۔ جب وہ گڑھے سے چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو پیٹ کے بل زمین پر

بیٹھ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ رینگتا ہوا گڑھے کے کنارے پہنچ گیا اور سر جھکا کر اندر جھانکنے لگا۔ دونوں بھیڑیے مزے سے بکرے کو ہڑپ کرنے میں مصروف تھے۔

''اب کیا ہوگا؟ آگے کیا ہونے والا ہے؟''

تینوں بھائیوں کے جسم شدتِ احساس سے تنے ہوئے رسے کے مانند تھرّا رہے تھے۔ حلق اور ہونٹ دفعتاً سوکھ گئے تھے۔ خرم کو حیرت ہورہی تھی کہ وہ ریچھ دو خونخوار جانوروں کے منہ سے ان کی خوراک جھپٹ لینے کے چکر میں کتنی ہوشیاری اور دلیری سے کام لے رہا تھا۔ اس وقت وہ جنگل کا ایک نڈر اور بہادر کردار لگ رہا تھا۔

چند لمحے ریچھ اسی طرح گڑھے کے اندر جھانکتا رہا، جھانکتا رہا اچانک وہ ایک زبردست چیخ مار کر گڑھے کے اندر کود گیا۔ اس چیخ کا مقصد غالباً بھیڑیوں کو خوفزدہ کرنا تھا لیکن اثرات الٹ ہوگئے تھے۔ اب گڑھے کے اندر گھسان کا رن پڑ چکا تھا۔ ان تینوں کا جنگلی درندوں کی نبرد آزمائی دیکھنے کا یہ پہلا تجربہ تھا اور وہ بھی اس قدر قریب سے کہ ان کی سانسیں رکی جارہی تھیں۔

گڑھے کے اندر وہ دیو ہیکل ریچھ اور بھیڑیے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہورہے تھے ان کی تیز اور خوف ناک آوازیں ارد گرد زور، زور سے گونج رہی تھیں۔ مقابلہ زبردست تھا' وقت سانس روکے کھڑا تھا۔ چھوٹے' چھوٹے جانور اِدھر اُدھر دم دبائے بھاگ اور چھپ رہے تھے۔ گڑھے کے اندر غراہٹوں کا کہرام اٹھا ہوا تھا۔

''بھائی جان نکلیں یہاں سے۔'' ڈاکٹر خاور نے تھرائی ہوئی سرگوشی کی مگر خرم اور بابر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں اس فکر میں تھے کہ کہیں لڑتے ہوئے درندے درختوں کے عقب میں نہ نکل آئیں۔ اس خیال سے وہ چوکنے انداز میں ہتھیار تھامے مستعد کھڑے تھے۔

یہ جنگ تقریباً پانچ سات منٹ تک جاری و ساری رہی۔ جب ریچھ نے اپنی دانست میں بھیڑیوں کو ٹھیک ٹھاک توڑ پھوڑ ڈالا تو دفعتاً چھلانگ لگا کر گڑھے سے باہر نکل گیا۔

اس کے پیچھے دونوں بھیڑیے بھی ایک دوسرے کو بھنبوڑتے غم وغصے کی حالت میں چیختے ہوئے لپکے مگر ان سے زیادہ منحوس چیخ ریچھ کی تھی جو ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے بجلی کی سرعت سے دوڑتے اونچی، اونچی جنگلی گھاس میں روپوش ہوگئے۔

جہاں ایک لمحہ پہلے خوف ناک درندوں کی ہیبت ناک آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا اب مکمل سکوت طاری ہو چکا تھا۔ ان تینوں کے زور، زور سے دھڑکتے ہوئے دل اپنی اصلی حالت میں آگئے۔ بلا ٹلی تو جان میں جان آئی اور بندوقوں پر ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

''آپ نے غور کیا ریچھ ایسی آواز میں چیخ رہا تھا جیسے کوئی انسان ہو۔'' ڈاکٹر خاور نے ڈرے ہوئے انداز میں لہراتی گھاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سچ ہے۔'' خرم نے اس کی تائید کی۔ ''ریچھ اور انسانی چیخ ایک دوسرے سے بالکل مشابہ ہوتی ہے بلکہ زیادہ فاصلے سے تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ آیا انسان ہے یا ریچھ۔''

''اس سے بڑا اور ہیبت ناک ریچھ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔'' خاور نے جھرجھری لے کر کہا۔

''ریچھ کی چربی گٹھیا کے مریضوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔ اگر ہم اس موٹے تازے ریچھ کا شکار کرسکیں تو اس کی چربی بہت سے لوگوں کے کام آجائے۔ یار مجھے تو یوں لگتا ہے لوگوں کے جانوروں کو ہلاک کرنے والا درندہ یہی دیو قامت

اور زور آور ریچھ ہے۔ ہاں یاد آیا اس روز رحمت بابا کی بیٹی یہی تو کہہ رہی تھی کہ باڑے پر اوپر سے کوئی کالی چیز کودی تھی۔" بابر کچھ سوچ کر بولے۔

"آپ کا مشاہدہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ابھی جس آدمی سے ملاقات ہوئی تھی اس کی باتوں کے بعد میرا دماغ بھی خود بخود اسی طرف گیا تھا۔" خرم چونک کر بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

اب یہ لوگ گھنی جھاڑیوں سے بچ، بچ کر جنگل کے گنجان سے کھلے حصے کی طرف چل رہے تھے۔ سورج مغربی افق کی طرف محوِ سفر تھا۔ شام کی آمد، آمد تھی اور خرم جلد از جلد ریسٹ ہاؤس پہنچنا چاہ رہا تھا۔ جب یہ لوگ ریسٹ ہاؤس پہنچے تو یہاں ایک نیا منظر دیکھنے کو ملا۔ آس پاس کی بستیوں کے پانچ سات مرد اور چند عورتیں برآمدے میں بیٹھے ان کے آنے کا انتظار کررہے تھے۔

"جنگل بابو!" ایک بوڑھے شخص نے چلّا کر خرم کو مخاطب کیا۔ "اس بلا کو ختم کر ڈالو جی۔ ہم عمر بھر آپ کے بال بچوں کو دعا دیں گے۔ وہ ہمارے جانور ہر روز کھا رہی ہے۔ ہلاک کررہی ہے۔ ہم تو اگلے چند دنوں میں بغیر ڈھور ڈنگر کے رہ جائیں گے جی۔" معلوم ہوا کہ اس غریب کی تین بکریاں تھیں جن میں سے دو بکریاں اس اَن دیکھی بلا کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ اسی طرح کے بے شمار قصے انہیں سننے کو مل رہے تھے۔

ان لوگوں کی باتوں کے دوران خرم کو بار، بار رحمت بابا کا کہا ہوا ایک جملہ یاد آرہا تھا جو انہوں نے ایک دن کہا تھا۔

"بیٹا ریچھ لاگو ہوگیا ہے۔" کم از کم آج کالے ریچھ کا کردار لوگوں کی شہادتوں کی روشنی میں خاصا کھل کر سامنے آگیا تھا۔ خاور نے روتے ہوئے لوگوں میں اپنا لایا ہوا سارا شکار تقسیم کردیا اور خرم نے دلاسے دے کر انہیں رخصت کیا۔ غسل سے فارغ ہو کر سب نے کھانا کھایا۔

"بہت دن ہوگئے آئے ہوئے، میری تو چھٹی قریب الختم ہے۔ اب گھر چلنے کی تیاری کرنی چاہیے۔" کھانا کھا کر خاور کہنے لگے۔

"شکار کا شوق پورا ہوگیا جناب کا؟" خرم نے مسکرا کر چھیڑا۔

"الحمدللہ۔" انہوں نے فوراً جواب دیا۔ "میں نے تو جی بھر کے شکار کا لطف اٹھایا بلکہ آج ایک دلچسپ اور خونریز معرکہ بھی مشاہدہ کرلیا اب بھائی کا معلوم نہیں۔"

"چھٹی تو میری بھی ختم ہورہی ہے مگر سوال یہ ہے کہ موجودہ مسئلہ تو حل ہوجائے۔ خرم کو تنہا چھوڑ جانا، جی نہیں مان رہا۔" بابر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں یہ قصہ افسرانِ بالا کے سامنے رکھ دوں گا۔ وہ خود ہی کوئی شکار پارٹی روانہ کریں گے۔" خرم نے بے پروائی سے کہا۔

"جبکہ ہمارے بھائی جان چاہتے ہیں کہ یہ معرکہ خود سر کریں تاکہ یہاں کی عوام الناس میں ریچھ کی چربی بانٹ کر جائیں۔" خاور نے ہنس کر کہا۔

یہ لوگ رات گئے تک یہی باتیں کرتے رہے مگر کوئی لائحہ عمل طے نہ ہوسکا۔ خاور بوری شکل بنائے رہے اچانک انہیں دور کی سوجھی، اچھل کر بولے۔

"وہ مارا...... آگئی ترکیب سمجھ میں۔ آپ اصلی شکاریوں کی طرح روایتی بکرا کیوں نہیں استعمال کرتے؟"

"اور مچان کہاں باندھی جائے؟" خرم نے دلچسپی لے کر پوچھا۔

"ریسٹ ہاؤس سے باہر بکرا باندھیے درخت سے اور ریسٹ ہاؤس کی کھڑکی سے شکار کیجیے...... کیسا؟" خاور نے برجستہ جواب دیا پھر اپنی پیٹھ خود ہی تھپکنے لگے۔

"ویسے بات تو سمجھ میں آرہی ہے۔ تجویز قابلِ غور ہے۔" بابر نے ستائشی انداز میں کہا۔ پھر واقعی انہوں نے اسی ترکیب پر عمل کر ڈالا۔

دوسرے دن خرم جنگل کا دورہ کرکے لوٹا تو ایک شخص ایک تندرست بچھڑے کا رسہ تھامے کھڑا تھا۔ جو اس نے خرم کی ہدایت پر ایک قریبی شیشم کے درخت سے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا۔

رات بے حد سرد اور کٹیلی تھی۔ رات کی زلفیں بکھرنے سے پہلے جب آگ کا گولا افق کے پیچھے چھپ گیا۔ شفق کی لالی ختم ہوگئی۔ ہر طرف اندھیاروں کی پھوار پڑنے لگی تو تینوں بھائیوں نے ریسٹ ہاؤس کی مغربی کھڑکی کو آج کی رات اپنا مسکن بنالیا تھا۔ یہاں سے شیشم کا وہ درخت بالکل سیدھ میں دکھائی دے رہا تھا جس کے نیچے بچھڑا بندھا ہوا تھا۔ ستاروں کی چمکیلی روشنی میں بچھڑا صاف نظر آرہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ بستی کے پالتو جانوروں پر لاگو ہوجانے والا ریچھ اکیلا بچھڑا دیکھ کر ضرور اس پر حملہ کرنے کی نیت سے جنگل سے برآمد ہوگا۔ انہوں نے ماہر اور تجربے کار شکاریوں کی طرح ایک مکمل اور پکا لائحہ عمل تیار کرلیا تھا۔

وہ کھانے پینے سے فارغ ہوکر نہایت اطمینان کے ساتھ محوِ انتظار تھے۔ مشرق کی سمت سے روشنی آرہی تھی۔ دور، دور کھڑے درختوں کی شاخیں زمین پر مبہم سے سائے ڈال رہی تھیں تب چاند نکل آیا اور مخملی وادی میں چاندنی کا دھارا بہنے لگا۔

گو کہ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کب اور کس طرف سے آئے گا یا آئے گا بھی یا نہیں۔ مگر ان کا قیافہ کہتا تھا کہ اگر یہ وہی ریچھ ہے تو اپنے طریقہ، واردات کے مطابق ضرور آئے گا بشرطیکہ کسی دوسری بستی کے کسی باڑے میں کود لگانے نہ پہنچ جائے۔

رفتہ رفتہ رات قریب الختم ہوگئی۔ بابر اور خرم اونگھنے لگے۔ بابر کی اداس پڑی بندوق ایک طرف کو لڑھک گئی مگر ریچھ نہ آیا۔

دور کہیں کسی جنگلی مرغ نے بانگ دی تب چونکنے بیٹھے ڈاکٹر خاور کی نگاہیں ایک مہیب، کالے سیاہ ہیولے پر جم کر رہ گئیں۔ یہ رینگتا ہوا سیاہ سایہ جنگل کی جھاڑیوں سے برآمد ہوا تھا۔ خاور کا دل زور، زور سے دھڑکنے لگا۔

"بھائی جان...... بھائی جان۔" انہوں نے گھبراہٹ میں بابر کا شانہ جھنجوڑ ڈالا۔ وہ فوراً ہی مستعد ہوگئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر باہر کا منظر دیکھنے لگے۔ بات سمجھ لینے کے بعد انہوں نے بندوق کی نالی سیدھی کرکے نشانہ باندھ لیا۔ اب وہ فائر کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

سیاہ ہیولہ جھاڑیوں سے برآمد ہوکر سیدھا چلتا ہوا بچھڑے کی طرف آیا۔ بچھڑا اسے دیکھتے ہی رسی تڑوانے کے لیے اچھل کود مچانے لگا۔ بابر نے دل میں طے کرلیا تھا کہ بچھڑے کو اس کے حملے سے زندہ بچانا ہے لہٰذا جیسے ہی اس نے جست لگانے کا قصد کیا ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ریچھ لڑکھڑایا اور پیچھے کی طرف گر پڑا لیکن فوراً ہی ایک دم سنبھل گیا اور بھرپور جست لگائی۔ ایک دھماکا مزید ہوا۔ اس دفعہ گولی ریچھ کی کھوپڑی میں لگی۔ وہ چند گز کے فاصلے پر تیورا کر گرا اور تڑپنے لگا۔ آخر تڑپ، تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔

خرم اٹھ کر بے اختیار بھائی سے لپٹ گیا۔ بندوق کی آواز سے دنیا جاگ پڑی۔ جس، جس کو خبر ہوگئی ریچھ کے گرد جمع ہوتے گئے۔ تھوڑی دیر میں بھیڑ لگ گئی۔ بابر بچھڑے کو صاف بچا گیا تھا۔ فقط ریچھ مارا گیا تھا۔

☆☆☆

"دادی اماں آج مونگ کی دال والی کھچڑی بنالیجیے۔" عبداللہ نے بڑی معصومیت سے فرمائش کی۔

"ہاں بیٹے، آج اتفاق سے کھچڑی ہی بنی ہے۔" دادی اماں نے اسے پیار سے جواب دیا۔

کھچڑی کے ساتھ چٹنی اور رائتہ بھی تھا۔ چاروں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور پھر اپنی، اپنی سرگرمیوں میں کھو گئے۔ شرمین نے باورچی خانے میں جا کر برتن دھوئے اور دادی اماں نے شام کے لیے کڑھی چڑھائی۔ کڑھی گھر میں جب بھی پکتی وہ خود ہی تیار کیا کرتی تھیں۔

آج اتوار ہونے کی وجہ سے شرمین شام کو فارغ تھی وہ برآمدے میں بیٹھ کر ایک کتاب پڑھنے لگی۔ بچے آنگن میں کھیلنے نکل گئے تھے۔ دادی اماں باورچی خانے سے فارغ ہوئیں تو وہیں پلنگ پر آلیٹیں۔ جاڑے کا دن کتنا ہی بوند بھرے کا۔ آج کل کوئی دوپہر میں سوتا ہی نہ تھا۔ تھوڑی دیر ہی گزری ہوگی کہ کسی نے باہر کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ دوپہر کے سناٹے میں آواز دور تک پھیل گئی۔

ولی اللہ نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور ساتھ ہی غُل مچا دیا۔

”پیاری دادی آئیں۔ پیاری دادی آئیں۔“ دادی اماں چونک کر اٹھ بیٹھیں۔ دیکھا واقعی پیاری بوا ہانپتی کانپتی چلی آرہی ہیں۔ ایک گٹھڑی اور ایک ٹین کی بکسیا دبوچے ہوئے۔

”سلام بیگم صاحبہ۔“ شرمین کے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے دادی اماں کو سلام کیا۔ کچھ دیر تک ایک دوسرے کی خیر خیریت کا دور چلتا رہا پھر انہوں نے پوچھا۔

”کہو پیاری بوا آج کہاں بھول پڑیں؟“

”اور کہاں جاؤں گی مُلا کی دوڑ مسجد تک۔“ بوا نے آنکھیں رگڑیں۔ ”بیٹوں کو دو بھر بہوئیں بیزار، لڑکیاں پردیس بیاہ گئیں۔ جب تک سانس ہے تب تک آس بیگم۔ ان چار ہڈیوں کو لے کر کہاں جاؤں؟ کس کا در پکڑوں؟ کون سی چھت میرا آسرا بنے گی؟ جب اپنا لال خون ہی سفید پڑ گیا تو پھر غیروں کا ذکر ہی کیا۔ پہلے پہل سوچا اس نامراد زندگی کا خاتمہ ہی کر ڈالوں مگر پھر آپ جیسی دین دار پڑھی لکھی بیگم صاحبہ کی نصیحتیں اور بھولی بسری باتوں کی یاد نے حرام موت کو گلے لگانے سے باز رکھا لیکن زندگی اب بیکار ہو چکی ہے۔“ اپنی بات ختم کرتے، کرتے وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگیں۔ دادی اماں بے چاری ہکا بکا ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگی تھیں۔ شرمین نے بھی کتاب اٹھا کر رکھ دی۔ دکھ اور بے یقینی کے احساس کے زیرِ اثر وہ سن ہو کر رہ گئی۔

”کیا دنیا میں ایسی بے حس اور جہنمی اولاد بھی ہوتی ہے جو ماں جیسی جنت کو یوں ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا چھوڑ دے۔“ وہ دل ہی دل میں سوچے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر روتے رہنے کے بعد بوا دوبارہ بولنے لگیں۔

”بہت دنوں سوچ، سوچ کر میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ساری دنیا کے جھگڑوں کو چھوڑ کر کسی مزار پر جا پڑوں۔ باقی ماندہ زندگی کسی طور گزر ہی جائے گی۔ آج اسی ارادے سے نکلی تھی۔ راستے میں جاتے، جاتے خیال آیا آپ کا۔ بس جی نہ مانا ملنے کے لیے چلی آئی۔“ شرمین ایک دفعہ پھر ساکت رہ گئی۔

دادی اماں کو بھی سخت رنج ہوا۔ پیاری بوا کو دیکھ، دیکھ کر ایک خیال آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔ اپنا پرانا وقت یاد کر کے ان کا دل بھر آیا۔

شرمین کے ابو اسد اللہ کی زندگی میں پیاری بوا اس گھر میں کام کیا کرتی تھیں۔ کیا خوش حالی، سکون اور فراغت کا زمانہ تھا۔ نہ کوئی فکر تھی نہ فاقہ۔ زندگی آرام اور آسودگی سے گزری جا رہی تھی کہ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ 1971ء کی جنگ چھڑ گئی۔ جنگ نے ملک کے حالات تو بدلے ہی بدلے مگر اسد اللہ کے چھوٹے سے گھرانے میں بھی انقلاب آ گیا۔

اسد اللہ جو ایک فوجی تھے اس جنگ میں شہید ہو گئے اور ان کے پسماندگان اس جہانِ رنگ و بو میں تنہا رہ گئے۔ گھر کے اندرونی حالات بد سے

بدترین ہوتے چلے گئے لہٰذا پریشان و مجبور ہو کر دادی اماں نے پیاری بوا کو کام سے... علیحدہ کر ڈالا یوں انہوں نے آنا ترک کر دیا مگر یہ پیاری بوا کی بے اندازہ محبت تھی کہ کبھی کبھار آجایا کرتیں۔ اس طرح یہ لوگ ایک دوسرے کی خیر صلاّ سے آگاہ ہو جاتے۔ اِدھر کچھ عرصے سے بوا کا آنا رک گیا تھا۔ دادی اماں کو بالکل نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ آج بہت دنوں کے بعد وہ اچانک ہی وارد ہوئیں اور ان کے حالات سے آگاہی ہوئی۔

دادی اماں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور بڑھ کر پیاری بوا کو گلے سے لگا کر گویا ہوئیں۔

”بوا اس قدر دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کا وارث اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ کوئی کسی کا نصیب نہیں کھاتا۔ رب کے نزدیک ہر کوئی معتبر ہے۔ تمہیں کہیں کسی مزار پر جا رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ گھر جیسے ہمارا، ایسے ہی تمہارا بھی ہے۔ خدا کے بھروسے یہیں رہ پڑو جو چٹنی روٹی ہمیں میسر ہوگی، تم بھی کھا لینا۔“ بوا ان سے لپٹ گئیں اور بھبک، بھبک کر رونے لگیں۔

☆☆☆

بابر اور ڈاکٹر خاور اپنا شکار کا شوق پورا کر کے آچکے تھے اور اپنی، اپنی مصروفیات میں کھو چکے تھے۔ شرمین اسد اللہ کو اپنے گھر میں بچوں کو پڑھاتے دیکھ کر ڈاکٹر خاور خوشی سے اچھل پڑے تھے مگر موقع کی نزاکت کے خیال سے انہوں نے اپنی بے پایاں مسرت کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی مبادا... اماں جان کو بھنک پڑ جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں بلکہ وہ تو ایسے محتاط ہو گئے کہ اس کی طرف سے خود کو بالکل لاتعلق اور غافل ظاہر کرنے لگے۔ مجال ہے کہ ایک بار بھی پلٹ کر لڑکیوں سے اس کا تذکرہ کیا ہو حالانکہ روبی کو پختہ یقین تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ معصومہ ان کے آنے سے پہلے بے حد پُرجوش تھی اور سمجھتی تھی کہ بھائی آکر شرمین کو موجود پا کر بہت خوش ہوں گے مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا اور خاور نے خلافِ توقع چپ کی چادر اوڑھ لی۔

ان کی بے نیازی دیکھ روبی نے دل ہی دل میں عہد کر لیا تھا کہ شرمین اور خاور پر کڑی نظر رکھے گی پھر خاور کے کان اینٹھے گی کہ ”میاں اب بتاؤ کیا کہتے ہو ہم جھوٹے کہ تم؟“ لیکن معاملہ بالکل ہی برعکس جا رہا تھا۔ خاور بالکل انجان لگ رہے تھے۔ بات چیت کر لینا تو دور کی بات۔ وہ اس کے صورت آشنا تک نہیں لگ رہے تھے۔ ہر وقت ان کی تاک میں رہنے کے باوجود روبی کو ایک ذرہ بھر کامیابی نہ مل سکی بلکہ آج کل وہ سرِ شام ہی گھر سے غائب ہو جاتے۔ اِدھر ٹیوشن کا وقت ہوتا اُدھر خاور ندارد۔

بہت سے دن اسی آنکھ مچولی کی نذر ہو گئے۔ الجھن اور کوفت ہر روز بڑھتی گئی مگر کوئی عقدہ کھل نہ سکا۔ بالآخر ایک شام وہ دونوں ان کو چھاپ ہی بیٹھیں۔

خاور بیڈ کی پٹی پر بیٹھے جلدی، جلدی موزے پہن رہے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں ان دونوں کے عکس دیکھ کر مسکرانے لگے پھر بناوٹی لہجے میں زور سے بولے۔

”یہ چوری، چوری کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟ کچھ کہنا سننا ہے، سامنے آ کر کہیے سنیے۔ شرمانے کی کیا بات ہے؟“ روبی نے دفعتاً سامنے آتے ہوئے کہا۔

”بھئی واہ، تم ساحرفوں کا بنا ہوا انسان بھی کوئی دوسرا نہ ہوگا یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ چور تو تم خود ہو جو روز خبر نہیں دنیا کے کون سے گوشے میں جا چھپتے ہو۔“

”معلوم ہوتا ہے آپ جھوٹ کے کسی انعامی مقابلے میں حصہ لینے کی تیاری میں مصروف ہیں جبھی تو بے پر کی اڑا رہی ہیں۔“ انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"لو، اب بھلا میں نے کیا بے پر کی اڑا دی؟ وضاحت کرو۔" اس نے چڑ کر پوچھا۔

"کوئی ایسی ویسی بے پر کی۔" خاور ایک، ایک لفظ پر زور دے کر بولے۔ "ایسی بے بال و پر کی اڑائی ہے آپ نے کہ جی چاہ رہا ہے اپنا ہی سر پیٹ ڈالوں۔ اجی روبی محترمہ! ایک یہی کام تو ہے جو ہم علی الاعلان کر رہے ہیں۔ تصدیق کر لیجیے معصومہ سے۔ ہر شام جہاں بھی جانا ہوتا ہے، اماں جان سے باقاعدہ اجازت لے کر نہیں جاتا بلکہ بالتفصیل اجازت لیتا ہوں، پورا پروگرام بتا کر۔"

"ارے ہاں روبی آپا، میں آپ کو تو بتانا ہی بھول گئی۔ خاور بھائی سچ کہہ رہے ہیں۔ اماں بھی پھوپی جان سے کہہ رہی تھیں کہ اللہ نظرِ بد سے محفوظ رکھے خاور تو ایسے سعادت مند اور تابعدار ہو گئے ہیں کہ ہر کام میں مرضی اور اجازت کو لازم سمجھتے ہیں......" معصومہ کو جیسے یاد آ گیا۔ جلدی سے روبی کا شانہ ہلا کر کہنے لگی۔

"سنا آپ نے؟" خاور نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا اور ہنستے چلے گئے۔

"لیکن...... آخر کیوں؟ میری عقل میں تو یہ بات ہرگز نہیں آئی۔" روبی نے تعجب سے پوچھا۔ خاور نے اپنے بے ساختہ قسم کے قہقہوں کو بریک لگائے اور بولے۔

"ارے اتنی ذرا سی بات آپ کی اتنی بڑی ساری عقل شریف میں نہ آ سکی؟ اچھا غور سے سنیں۔" انہوں نے لمحہ بھر خاموش رہ کر دلچسپ وضاحت کی۔ "دراصل...... میں نہیں چاہتا کہ میری دلچسپی کی خوبو پا کر اماں جان اس ٹیوٹر غریب کے خلاف ہو جائیں اور اسے قدم جمانے سے پہلے ہی نکال باہر کریں۔ بھئی میں چند لمحوں کی خوشی کے لیے ساری عمر کی مسرتیں قربان کرنے کا قائل نہیں ہوں۔"

"اُفوہ کس قدر چالاک ہو تم!" روبی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"کون چالاک ہے بھئی ہم بھی تو سنیں۔" عین اسی لمحے بابر نے اندر داخل ہوتے ہوئے اس کی بات سن لی تھی۔

"خاور بھائی کو کہہ رہے ہیں ان کے تازہ ترین کارنامے پر۔" روبی یکلخت چپ ہو گئی مگر معصومہ نے لقمہ دیا۔

ایک ہی گھر کا معاملہ ہونے کی وجہ سے روبی کا بابر سے پردہ نہیں کروایا گیا تھا یوں بھی بچپن کا ساتھ تھا۔ اس لیے یہ دونوں بلا جھجک آپس میں بات چیت کر لیتے تھے بلاوجہ کا تکلف روا نہ تھا۔

"ٹھہریں اب میں آپ پر خاور کی پول ہی کھولے دیتی ہوں۔ یہ بظاہر تو بڑے انجان بنتے ہیں لیکن اندر سے بڑے حضرت ہیں۔ میں نے اول روز ہی کہہ دیا تھا کہ دال میں ضرور کالا ہے تب تو بگڑ گئے تھے۔" روبی براہِ راست بابر کو مخاطب کر کے بولی۔

روبی نے خاور کی طرف دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر چبا، چبا کے بتایا اور سمجھتی رہی کہ خاور اودھم کر دیں گے کہ بابر کو حقیقت نہ بتائی جائے مگر خلافِ توقع خاور اطمینان سے بیٹھے مسکراتے رہے۔

"یہ جو ٹیوٹر آئی ہیں ناں ثمرین اسد اللہ انہیں دراصل خاور لائے ہیں۔" روبی ذرا شہ پا کر بولی گویا دھماکا کر رہی ہو۔ بابر نے چونک کر خاور کی طرف دیکھا پھر بے پروائی سے بولے۔

"ایسی کچھ حیرت انگیز بات تو نہیں جسے چالاکی سے منسوب کیا جائے۔" خاور اور معصومہ ہنسنے لگے۔

"اچھا تو پھر صاف، صاف سنیں۔ ہمارے محترم خاور کی ان محترمہ سے جانے کتنے زمانے کی دوستی ہے۔ ڈھونگ رچا کر یہاں ٹیوٹر رکھوا دیا ہے۔ اب کہتے ہیں کہ شادی کریں گے تو انہی کے ساتھ ورنہ کسی سے نہیں۔ اب ہم ان کی مشکل کس طرح حل

کریں؟ ممانی جان تو ان کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی شوٹ کر ڈالیں گی۔"

بابر اور معصومہ اب حیران ہو کر کبھی خاور کو دیکھ رہے تھے کبھی روبی کو...... معصومہ کی حیرانی بجا تھی جبکہ بابر کے لیے تو پورا قصہ ہی نیا تھا۔ روبی نے خاور کو ستانے کے لیے بڑھ چڑھ کر بیان بازی کی تھی لیکن خاور برا ماننے کے بجائے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اطمینان سے بال بنانے لگے۔ احتجاجاً ایک لفظ بھی نہ بولے۔ سب کے سب چپکے بیٹھے تھے۔ سب سے پہلے معصومہ کو ہوش آیا۔ وہ بھاگ کر خاور کے پاس پہنچی اور ان کے شانے سے سر لگا کر خوشی سے بھرپور آواز میں چہکی۔

"اللہ خاور بھائی، آپ کے فیصلے سے سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی ہے۔ سچ بہت ہی اچھی ہیں وہ۔ پہلی دفعہ انہیں دیکھ کر مجھے ایسا ہی خیال آیا تھا۔"

"لیجیے ایک ووٹ تو ہمارا ہوا، اب آپ لوگ اپنے متعلق بتائیں کیا کہتے ہیں؟" خاور نے ہنس کر اسے ہلکی سے چپت رسید کی اور بولے۔

"خیر...... اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ میں تو ویسے بھی شخصی آزادی کا قائل ہوں۔ اگر وہ تم کو پسند ہے تو اس کی عزت و حرمت کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔ ہاں، اماں جان کی پسند ناپسند کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔" بابر نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور بھائی کو بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"میری خاموشی کی سب سے بڑی وجہ اماں ہی ہیں۔ ورنہ باقی بھلا کیا سوچنا۔" ایک لمحے کو خاور کا چہرہ تمتما سا گیا۔ وہ ایک دبی ہوئی سانس لے کر بولے۔ روبی نے ان کو سنجیدہ دیکھا تو آنکھیں نچا کر بولی۔

"ہائے...... تو معاملہ یہاں تک آ پہنچا ہے بڑے چھپے رستم ہو تم۔ ہم تو ابھی تک مذاق ہی سمجھ رہے تھے۔"

"چھپا رستم بھی بنا دیا آپ نے...... چالاک بھی کہہ دیا مگر حقیقت یہی ہے کہ اماں میری رستمی اور چالاکی سب نکال ڈالیں گی۔" خاور اسی موڈ میں گویا ہوئے۔

بابر نے پل بھر میں بھائی کی مایوسی کا اندازہ کر لیا۔ ان کی سنجیدگی، ان کی رنجیدگی بننے لگی۔ انہوں نے روبی کو اشارہ کیا وہ بہانہ کر کے معصومہ کو لے کر کمرے سے نکل گئی اور دونوں بھائی اکیلے رہ گئے۔

بابر کو آج قطعی نئی بات کا علم ہوا تھا ورنہ انہوں نے تو آج تک ثمرین اسد اللہ کو غور سے دیکھا تک نہ تھا۔ ہاں یہ معلوم تھا کہ بچوں کی نئی ٹیوٹر رکھ دی گئی ہے۔ آج روبی سے اصل قصہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ ساری گفتگو خاور کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ وہ بچپن سے چھوٹے بھائی کی نظر اور مزاج آشنا تھے۔ ان کی ضدی طبیعت، ہٹیلے پن اور جذباتی فطرت سے آگاہ تھے۔ دوسری طرف والدہ کا بھی خیال تھا۔ وہ ہرگز بھی رضامند نہیں ہو سکتی تھیں۔ بھلا ایک معمولی ٹیوٹر ان کی بہو کس طرح ہو سکتی تھی وہ تو اس بات کو لے کر ایسا ہنگامہ بپا کر سکتی تھیں جو سب کو زیر و زبر کر دیتا۔

بابر کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ نائمہ بیگم خاور کے ڈاکٹر ہو جانے کے بعد سے اندر ہی اندر اس کے اور خرم کے لیے بھی بہوؤں کی تلاش میں تھیں۔ وہ صرف اعلیٰ ترین اور امیر ترین خاندانوں میں نگاہیں دوڑا رہی تھیں۔ ایسی صورت میں ثمرین غریب کس گنتی میں آتی۔ اگر اس کا تعلق کسی امیر کبیر خاندان سے ہوتا تو وہ ٹیوشنز کیوں پڑھاتی۔

بابر نے خاور کی خاموشی سے اندازہ لگایا کہ وہ ازخود اس معاملے میں کوئی بات کرنا چاہتے ہیں لہٰذا انہوں نے لڑکیوں کو چلے جانے کا اشارہ کر دیا تھا تاکہ سکون اور یکسوئی کے ساتھ بھائی کو کرید سکیں۔ ممکن ہے وہ ان سے کسی مدد کے طلب گار ہوں۔ بابر نے سگریٹ کیس سے دوسرا سگریٹ منتخب

کیا پھر آہستہ سے پوچھا۔

”تم اس معاملے میں کہاں تک سنجیدہ ہو؟ اور اس سے دوستی کب سے ہے؟“

ڈاکٹر خاور تھوڑی دیر تک انہیں خالی، خالی نگاہوں سے تکتے رہے پھر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگے کسی خیال میں کھو گئے۔ یک بیک ان کے سدا بہار ہنستے مسکراتے موڈ پر افسردگی نے حملہ کر دیا تھا اور ان کی طبیعت آپ ہی آپ مکدر ہو گئی تھی۔ حقیقتاً وہ بابر سے اس مسئلے پر بات کرنے کے خواہاں تھے اسی لیے روبی کو ٹوکے بغیر خاموش رہے تھے۔

جس دن سے شرمین کو اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ خوش ہونے سے زیادہ ان کے دل و دماغ پر ایک بے پایاں بوجھ آن پڑا تھا اور اب وہ دماغ کا یہ بوجھ اتار پھینکنا چاہ رہے تھے۔ بھائی کو ہمراز بنا کر ان کا عندیہ لینا چاہ رہے تھے۔ ابھی ابھی انہیں یہ گمان بھی گزرا تھا کہ ان کی خاموشی بابر کو الجھا بھی سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ بے قصور لڑکی کو غلط سمجھ بیٹھیں اور روبی کی غلط بیانی کو سچ سمجھ بیٹھیں کہ وہ دونوں حقیقتاً بہت پرانے دوست ہیں حالانکہ حقیقت جتنی بھی تھی وہ خاور ہی جانتے تھے چنانچہ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ شرمین کی معصومیت کو داغ دار کریں لہٰذا یہ سب سوچ کر انہوں نے رک، رک کر اٹکتے، اٹکتے سارا واقعہ زمانۂ جنگ میں اس بلیک آؤٹ کی رات سے شروع کر کے ڈاکٹر شاکرہ کے ہاں کی برستی ہوئی شام تک کا بلا کم و کاست انہیں سنا ڈالا۔ اپنے محسوسات کی روداد اور اس کے بعد کا ارادہ سب کہہ دیا۔ بابر نے ان کی بات انتہائی غور اور دلجمعی کے ساتھ سنی پھر بولے۔

”جیسا کہ تم نے بیان کیا وہ ایک نہایت شریف اور معزز خاندان کی لڑکی ہے بظاہر تو اس ایک عیب کے سوا اس میں کوئی دوسرا عیب موجود نہیں ہے کہ وہ غریب گھرانے کی فرد ہے اور میرے خیال کے مطابق اماں یہیں ہنگامہ کر ڈالیں گی۔ خیر تم بلاوجہ تردد نہ کرو۔ کوئی سبیل نکالیں گے۔“ وہ بہت دیر تک اسی قسم کی باتیں کر کے خاور کو تسلی دلاسہ دیتے رہے۔ ان کی پُرعزم گفتگو اور حوصلہ مندانہ انداز سے خاور کو حوصلہ ہوا۔

اتنے دنوں کی دبی بھڑاس نکلی تو دماغ سے وہ نامعلوم سا بوجھ خود بخود اتر گیا اور وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے۔

☆☆☆

اس روز ریشم بی بی جنگل سے لکڑیاں چن رہی تھی۔ ایک درخت کے نیچے اچھا خاصا ڈھیر جمع ہو گیا تھا مگر اس کے دونوں ہاتھ برابر مصروف و مشغول تھے۔ کچھ دیر تھم کر اس نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور برساتی نالے کے ساتھ ساتھ قدرتی اگی ہوئی گھاس پھونس اور سبزے پر اس کی بکریاں منہ مارتی پھر رہی تھیں۔ فضاؤں میں سکوت رچا بسا تھا۔

اچانک جنگل کی یہ پُرسکون فضا اثر گن کے دھماکے سے گونج اٹھی۔ درختوں کے پتوں میں پرندے پھڑا مار مار کر اڑے اور اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ ریشم بی بی کی بکریاں بھی گھبرا کر جدھر رخ لگا دوڑ گئیں۔ عین اسی وقت جامن کی بلند شاخوں پر سے ہوتی ہوئی ایک زخمی مرغابی اس کے قدموں میں گر کر پھڑ پھڑانے لگی۔

ریشم بھاگ کر دور جا کھڑی ہوئی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کی اوٹ سے فاریسٹ آفیسر خرم نمودار ہوا اور آگے بڑھ کر مرغابی کے گلے پر شکاری چاقو پھیر دیا۔

ریشم نے بے اختیار اس طرف سے رخ پھیر لیا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور مسکرا کر بولا۔

”رہتی ویران جنگلوں میں ہو اور دل چڑیا سے بھی چھوٹا ہے۔“

وہ جواب دینے کے بجائے ایک مخصوص آواز

نکال کر بکریوں کو جمع کرنے لگی۔ خرم نے جھک کر ایک چھوٹا سا بھیڑ کا بچہ اٹھایا اور گود میں بھر لیا۔ وہ خاموش کھڑا اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ چند لمحات خاموشی کی نذر ہو گئے بیتانے میں بکریوں کے ممیانے کی آوازیں رک، رک کر ابھرتی رہیں۔ ریشم کو الجھن سی ہونے لگی۔ وہ زمین پر بیٹھ کر لکڑیوں کو رسی سے جکڑنے لگی۔ وہ خرم کی موجودگی سے گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ لکڑیاں اچھی طرح باندھ دینے کے بعد اس نے رسی کا ایک سرا پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ لکڑیوں کا گٹھا کھنچتا چلا گیا۔

اب بکریوں کی طرف منہ کر کے اس نے مخصوص آواز میں پکارا۔ سدھی ہوئی بکریاں یکے بعد دیگرے ممیں میں کرتی اس کے پیچھے چل دیں۔ جاتے، جاتے ریشم نے ایک نظر خرم پر ڈالی۔ وہ بھیڑ کے بچے کو گود میں دبائے بدستور شرارتی سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ ”اس... بیچارے کو بھی ساتھ لیتی جاؤ۔“

لیکن مجال ہے کہ ریشم نے بچہ واپس مانگا ہو یا اس کی پروا کی ہو۔ وہ اپنے بابا کی بات پلو میں باندھ چکی تھی جو انہوں نے پہلی بار مٹھن پر کہی تھی۔

”یہاں کی چیزوں پر تم سے زیادہ کس کا حق ہے بیٹا۔“

ظاہر ہے انہوں نے کچھ سوچ کر ہی یہ بات کہی تھی پھر بھلا وہ ایک فاریسٹ آفیسر سے معمولی سا بھیڑ کا بچہ کس طرح واپس مانگ سکتی تھی۔ آخر یہ بھیڑ بکریاں اسی جنگل کی پروردہ تو تھیں۔

گھر پہنچ کر وہ جلدی، جلدی گھرداری کے کاموں میں جت گئی۔ بابا نماز پڑھ کر آئے تو وہ آٹا گوندھ رہی تھی اور چولھے پر چڑھی مٹی کی ہانڈی میں دال پک رہی تھی۔

بابا نے گھڑونچی کے قریب جا کر کٹورا بھر پانی پیا پھر چولھے کے قریب بیٹھ کر حقے کی چلم میں

فرمانِ رسول ﷺ

حضرت وہب بن منبہؒ سے روایت ہے کہ کسی نے ان سے سوال کیا کہ کیا لا الٰہ الا اللہ جنت کی کنجی نہیں ہے؟ وہبؒ نے کہا۔ کیوں نہیں لیکن کوئی کنجی ایسی نہیں ہوتی جس کے دندانے نہ ہوں، اگر تم ایسی کنجی لے کر آؤ گے جس میں دندانے موجود ہوں (مراد نیک اعمال ہے) تو تمہارے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے، ورنہ نہیں کھولے جائیں گے۔“

بخاری، بحوالہ مشکوٰۃ جلد اول

قابلِ غور

حضرت یحییٰ بن معاذؒ اپنے وقت کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ دنیا ایک ویرانہ ہے اور اس سے بھی ویران وہ دل ہے جو دنیا کو آباد کرے، آخرت ایک آبادی ہے اور اس سے زیادہ وہ دل شاداب ہے جو اسے آباد کرے۔ ایک موقع پر انہوں نے فرمایا: تمہارا بھائی وہ ہے جو تمہارے عیوب سے تمہیں مطلع کرے، تمہارا دوست بھی وہ ہے جو گناہوں سے تمہیں باز رکھے۔ آپ کا قول ہے کہ ایک شخص اپنے مال کے ضائع ہونے پر بہت غمگین ہوتا ہے لیکن ہر روز زندگی کم ہوتی جا رہی ہے، اس پر کوئی غم نہیں۔ رات لمبی ہوتی ہے لیکن تم اسے اپنے سونے سے ضائع نہ کرو۔ دن روشن ہوتا ہے، اسے اپنے گناہوں سے تاریک نہ کرو۔

مرسلہ: غزالہ شاہد، کراچی

انگارے جھاڑ، جھاڑ کر بھرنے لگے۔ جھونپڑے کے اندر گہرے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ کھلے دروازے کی راہ نیم اور املتاس کے پھولوں کی دلآویز مہک بھر بھر مٹھیاں چلی آرہی تھی اور سارے میں کسی خوش خبری کے مانند اڑتی پھر رہی تھی۔

آج کل جنگل میں ہر درخت پر بور آرہا تھا۔ نئی کونپلیں اور پتیاں اپنے نوزائدہ مکھڑوں کی بہاریں دکھلا رہی تھیں۔ ننگ دھڑنگ پیڑ پودوں نے ہریالی پوشاک زیب تن کرلی تھی۔ خودرو جھاڑیاں تک نئے سرے سے جی اٹھی تھیں۔ کوئل اور قمریاں خوشی کے نغمے الاپ رہی ہوتیں۔

ریشم نے ہانڈی کا ڈھکن کھولا ہی تھا کہ اچانک سکوت میں دروازہ تھپتھپانے کی آواز ابھری ساتھ ہی بھیڑ کا بچہ منمنایا۔

ریشم نے چونک کر بابا کی طرف دیکھا وہ چلم زمین پر رکھ کر باہر چلے گئے۔ ریشم کے دل میں کسی خدشے نے سر اٹھایا جو فوراً ہی پورا بھی ہوگیا کیونکہ بابا فوراً ہی واپس لوٹ آئے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے خرم اندر داخل ہوا۔ اونچے قد کی وجہ سے اسے خاصا جھک کر آنا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو مرغابیاں لٹکی ہوئی تھیں اور گود میں بھیڑ کا بچہ دبا تھا۔ بابا نے بڑے ادب اور اہتمام کے ساتھ اسے چارپائی پر بٹھایا اور خیر خیریت معلوم کرنے لگے۔

''اور سناؤ بیٹا کیا حال ہے؟ آج بہت دنوں بعد آئے ہو۔ سب ٹھیک ہے ناں؟'' میٹھے لہجے میں پوچھا۔

''بابا جان آپ کی محبت اور اپنائیت کھینچ لائی ہے ویسے آیا تو مطلب سے ہوں۔''

''ہاں، ہاں کہو، ایسی کون سی بات ہے جو میرے بس میں ہو اور میں انکار کردوں۔ تم بلا جھجکے کہو...... اپنائیت کا کوئی مول نہیں ہوتا۔'' بابا نے فوراً حوصلہ افزائی کی۔

''بس بابا جان یہ آپ کی سچائی اور خلوص ہی تو میری سب سے قیمتی دولت ہے۔ میں کبھی آپ کی شفقت بھول نہ پاؤں گا......''

''چلو جلدی بولو۔'' بابا نے جلد بازی سے اس کی بات کاٹی۔ ''اگر اپنا سمجھتے ہو تو بلاوجہ کا تکلف مت کرو۔ ہم سب کا وارث اللہ ہے۔ ایک دوجے سے راضی رہیں گے تو وہ بھی راضی رہے گا۔''

''جی ہاں، یہ تو آپ سچ فرما رہے ہیں۔ جس کا رشتہ اللہ سے استوار ہوگیا اس نے دین و دنیا کے سب خزانے پالیے۔ بابا آپ باتیں اتنی پیاری کرتے ہیں جو از خود دل میں گھر کر جاتی ہیں۔'' خرم حد درجہ متاثر ہوکر بولا۔

''کیا بات ہے بیٹا بس میری ہی تعریفیں کیے جاؤ گے یا کوئی کام کی بات بھی کروگے۔ اچھا چلو جلدی سے بتاؤ اس وقت کیسے آنا ہوا؟'' بابا نے موضوع بدل دیا اور ہلکی سی ڈانٹ لگا کر کہا۔

''عرض کیا ناں کہ اپنے ہی مطلب سے آیا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرا خانساماں کسی ضروری کام سے دو دن کے لیے چھٹی پر گیا ہے۔ میں نے کوشش کی ناشتا بنانے کی مگر...... آگ ہی نہ جل سکی۔'' خرم نے قدرے شرمندگی کے انداز میں سر جھکا کر کہا۔

''کس قدر ستم کر رہے بیٹا تو بھی۔ کس نے کہا تھا ناشتا بنانے کو؟ ہم مر گئے ہیں کیا؟ کسی سے کہلوا دیا ہوتا میں خود ناشتا پہنچا کر آتا۔'' بابا اچھل پڑے اور تڑپ کر بولے۔

''بس بابا غلطی ہوگئی۔ آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ اس لیے اس وقت میں خود ہی حاضر ہوگیا ہوں۔ ناشتا کھلائیں یا کھانا...... آپ کی مرضی۔'' خرم مزید ندامت سے بولا پھر لحہ بھر رک کر خود ہی اضافہ کیا۔ ''بس بابا جان چند دنوں کی تکلیف ہے پھر میرا خانساماں آجائے گا۔''

''ارے بیٹا، جگ جگ جیو۔ غیریت والی باتوں سے دور رہو۔ ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں۔ لگی لپٹی کو جانتے نہیں جو اندر ہے وہی اوپر...... تمہارا اپنا گھر ہے بلاتکلف اپنی پسند کا پکواؤ اور کھاؤ کسی طرح کا تردد مت کرو۔'' وہ محبت سے بچھ بچھ گئے اور پیار سے بولے۔

''اور کچھ نہیں، یہ سوچتا ہوں کہ میری وجہ سے کسی کو بے جا تکلیف... کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ورنہ آپ سے تو میں کبھی غیریت برت ہی نہیں سکتا۔'' وہ افسوس کے لہجے میں کہنے لگا۔ اب بابا نے اس کی طرف سے توجہ ہٹائی اور ریشم کو مخاطب کیا۔

''بٹی کیا پکایا ہے آج؟'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتی، خرم نے تیزی سے جھک کر دونوں مرغابیاں اٹھائیں اور بابا کی طرف بڑھا کر بولا۔

''بابا میں یہ لے کر آیا ہوں۔'' اب بابا نے ذبح کی ہوئی مرغابیوں کو غور سے دیکھا۔

''اچھا تو تم گوشت کے انتظام سمیت آئے ہو۔ خیر کوئی بات نہیں ابھی سب تیار ہوجائے گا۔'' پھر وہ ریشم سے بولے۔

''بٹی میں گوشت تیار کردیتا ہوں، تم فوراً اسے بھوننے کی تیاری کرو جلدی سے اور دیکھو گرم، گرم روٹی بھی پکانا۔''

ریشم پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ سب باتیں اس کے سامنے ہی ہو رہی تھیں۔ آٹے کا کونڈا اس نے ایک طرف سرکایا اور سر جھکا کر گوشت کا مسالا بنانے لگی۔ ویسے اس کی دال بھی تیار ہوچکی تھی۔

بابا اٹھ کر خود ہی طاق تک گئے اور وہاں سے تیز دھار چھری اٹھا لائے اور تیزی سے مرغابی کے پر اُدھیڑنے میں مصروف ہوگئے۔

''بیٹا۔'' ہاتھوں کے ساتھ، ساتھ ان کی زبان بھی مسلسل چل رہی تھی۔ ''تمہاری طرح جوان تھا تو میں نے بھی بہت مرغابیوں، تیتروں اور بٹیروں کا شکار کیا ہے بلکہ میں نے اپنی نوجوانی میں سبزی ترکاری اور دال، دلیہ بہت کم، کم ہی کھایا ہوگا۔ سدا گوشت خور رہا ہوں۔ خود اپنے ہاتھ سے شکار کیا اور کھایا۔ میری ماں اللہ بخشے میری اس حرکت پر بہت ہنسا کرتی تھیں۔ کہا کرتی تھیں رحمت کبھی ساگ، دال بھی چکھ لیا کر کیا معلوم اتنی لمبی زندگی میں کیسے اچھے برے وقت سے پالا پڑے۔ غریب انسان کو ہر ٹھنڈے گرم کے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے۔ وقت بہت بڑا ستمگر دوست ہے......''

''پھر آپ نے زندگی کو کیسا پایا گرم یا سرد؟'' خرم نے یونہی بات بڑھانے کے خیال سے پوچھا۔ انہوں نے ایک دبی ہوئی سانس لے کر جواب دیا۔

''یہ زندگی بڑی ظالم اور کٹھور چیز ہوتی ہے بیٹے۔ بعض اوقات دل جینے کی امنگ سے کھٹا ہوجائے تو یہ تب بھی جان نہیں چھوڑتی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم جھولی پھیلا، پھیلا کر زندگی کی بھیک مانگتے رہ جائیں مگر یہ بڑی بے رحمی اور سنگ دلی سے دامن چھڑا کر چل دیتی ہے۔ بے بسی اور لاچاری مقدر بن کر رہ جاتی ہے۔'' خرم نے قدرے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا جو اپنے کام میں مصروف کتنی گہری دانائی کی باتیں کر رہے تھے۔

جھونپڑے میں کچھ دور جلتے ہوئے چولھے کے قریب اپنے کام میں منہمک ریشم کے کانوں میں بھی ان دونوں کی باتوں کی آواز بخوبی جارہی تھی۔

''ریشم بٹی جنگل بابو پہلی بار اپنے ہاں کھانا کھائے گا۔ کوئی میٹھی چیز بھی پکالو کچھ تو ہوگا گھر میں......'' بابا اس کے نزدیک ایک مرغابی کا گوشت رکھ کر آہستہ سے بولے۔

''میٹھی چیز......؟ بابا ایسی تو کوئی چیز نہیں ہے گھر میں۔'' ریشم نے قدرے پریشان ہوکر جواب دیا۔

''ہوگی...... ضرور ہوگی ذرا ہوش اور غور سے سوچو۔''

''کیا غور سے سوچوں؟'' وہ حیران ہوکر اپنے

بابا کی صورت دیکھنے لگی۔

''رات کے اس سمے جنگل بیابان میں کیا مل پائے گا۔ بیٹھے میں، میں کیا بناؤں؟ بابا کیسی انہونی فرمائش کررہے ہیں۔'' وہ گم صم بیٹھی کھوجتی رہی۔

پھر وہ گوشت بھوننے میں مصروف ہوگئی مگر اندر ہی اندر فکر اور پریشانی سے اس کا برا حال تھا۔ بیٹھے بٹھائے بابا اسے ایک نئی قسم کی آزمائش میں مبتلا کرگئے تھے۔ آخر اس وقت اچانک وہ جنگل بابو کے لیے کیا میٹھا بنائے۔ اسی کشمکش میں ایک خیال آرہا تھا ایک جارہا تھا۔ ''باباجان، آپ نے کبھی کسی بڑے جانور کا شکار کیا ہے؟'' خرم آج معلوم نہیں کس موڈ میں تھا۔ اس نے بصد شوق بابا سے دریافت کیا۔ بابا کے بے حد اصرار پر اب وہ چارپائی پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھا تھا۔ دراصل خانساماں کے جانے سے وہ ریسٹ ہاؤس میں اکیلا رہ گیا تھا اس لیے وقت گزارنے یہاں چلا آیا تھا۔

''ہاں بیٹا ایک دفعہ کیا کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا ہے۔ تم جانو جنگل کی زندگی دشوار تو ہوتی ہی ہے۔ ہزار رنگ کے خطرات زندگی میں لگے رہتے ہیں مگر جوانی میں تو خطرات سے ہی کھیلنے میں مزہ آتا ہے۔ سو ہم نے اپنی جوانی ہنس کھیل کر گزاری۔ کبھی کسی چھوٹے بڑے خطرے سے ڈرے نہ نظر چرائی۔'' بابا نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔ پھر لمحہ بھر رک کر وہ دوبارہ بولنے لگے۔ ''یوں تو میں کوئی پیشہ ور شکاری نہیں تھا کہ بڑے، بڑے شکار کرکے نام پیدا کرتا مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کبھی کوئی جنگلی جانور، پالتو جانوروں پر لاگو ہوجاتا تو مجھے ضرور سر چوٹ ہوجایا کرتی تھی کہ اس سالے پاجی جانور کو ٹھکانے لگا ڈالوں جو گھروں میں پلے پلائے مویشی کو پھاڑ کھائے لہٰذا ایسے کئی جانور میں نے محض اپنی تیز دھار کلہاڑی کے بل بوتے پر مار بھگائے اور کئی ایک کو جان سے مار ڈالا۔ اس لیے لوگوں میں میری دلیری اور بہادری کی بہت دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ بیٹا، بات یہ ہے کہ جنگل کے اریب قریب کے علاقوں میں اگر کوئی ایسا واقعہ ہوجائے تو پھر بڑی دہشت پھیل جاتی ہے۔ لوگ اپنی روزی روزگار کے علاوہ ڈھورڈنگروں کو چرانے، پانی پلانے اور ان کا چارہ گھاس پھوس توڑنے اور لکڑی چننے تک سے معذور ہوکر اپنے گھروں تک محدود ہوجاتے ہیں تو پھر اس صورت میں کسی کو تو ہمت پکڑنی ہی ہوتی ہے ناں۔'' بابا خرم کو اپنے عہدِ جوانی کے کارناموں سے روشناس کروارہے تھے جبکہ ریشم کا دماغ بڑی تیزی سے ان کی فرمائش پوری کرنے کی جستجو میں تانے بانے بن رہا تھا۔

اچانک اس کی بے چین اور متلاشی نگاہیں جھونپڑی کے ایک گوشے میں طاق پر رکھی چند ہری ہری کیریوں پر جاکر اٹک گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خوشی کے ہزار رنگ جھلملائے اور بدن میں گویا بجلی سی کوند گئی۔ ہنڈیا بھونتے، بھونتے ہی وہ لپک کر اٹھی اور کیریاں اٹھا کر جلدی، جلدی چھیلنے لگی۔ قریب رکھی مٹکیا میں سے اس نے گیہوں کا تھوڑا سا آٹا نکال کر چھانا۔ دوسرے مٹکے سے گڑ کی ایک بھیلی نکال کر بیلن سے چور، چور کی۔ اتنی دیر میں گوشت بھُن چکا تھا۔ ہنڈیا چولھے سے اتار کر اس نے چھوٹی سی کڑاہی چڑھادی اور ہلکی آنچ پر آٹا بھوننے لگی۔ ذرا سی دیر میں جھونپڑے کی محدود سی فضا میں آٹے کی سوندھی، سوندھی سی خوشبو پھیل گئی۔ اب اس کے ہاتھ مہارت سے چل رہے تھے۔ رگ وپے میں سکون اتر آیا تھا۔ دل اندر سے بہت خوش اور مطمئن ہوگیا تھا۔

آٹے کو اس نے خالص مکھن میں بھونا تھا۔ تھوڑی دیر کی مسلسل محنت سے وہ آٹا، کیری، مکھن اور گڑ سے ایک مزیدار ڈش بنانے میں کامیاب ہوچکی تھی۔ ایک ایسی ڈش جو خرم کے تو فرشتوں نے بھی کبھی نہ کھائی ہوگی۔ اس تیار ڈش کو وہ لوگ گُڑنبہ کہتے تھے۔

آج ریشم اپنی نگاہوں میں آپ ہی سرخرو ہوگئی تھی۔ اس کے بابا کی جو اس سے اچھی توقعات وابستہ تھیں تو وہ ان کے معیار پر پوری اتری تھی اور ان کے بے شمار اعتبار اور بھروسے کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ گئی تھی۔ گڑنبہ تیار کرنے کے بعد اس نے توا چولھے پر رکھا اور فٹافٹ گرما گرم روٹیاں پکا پکا کر اتارنے لگی۔

اتنے میں بابا بھی گوشت بنا کر فارغ ہوچکے تھے۔ پہلے وہ خود ہاتھ دھو کر آئے اور پھر انہوں نے خرم کے ہاتھ دھلوائے۔ ان کے اشارے پر ریشم نے لا کر کھانا سامنے لگا دیا تھا۔ گڑنبے کی پلیٹ دیکھ کر بابا نے چونک کر بیٹی کی طرف دیکھا۔ اس نے مسکرا کر گردن جھکا دی۔ بابا بھی خوشی کے عالم میں مسکرانے لگے مگر زبان سے کچھ نہ بولے۔

کھانا انہوں نے ترتیب سے خرم کے سامنے رکھا اور بیٹھ کر ہاتھ کی پنکھیا سے ہوا جھلنے لگے۔

”نہ کیجیے بابا جان، آپ تکلیف مت اٹھائیں۔“ خرم نے شرمندہ ہوکر کہا۔

”بس بیٹا یہی محبت اور خلوص ہی تو ہے ہمارے پاس۔“ وہ محبت آمیز لہجے میں بولے۔

”بابا جان خرم کو بھی کبھی آپ قول کا کچا اور نیت کا کھوٹا نہ پائیں گے۔“ خرم نے کھانا شروع کرنے سے پہلے نہایت سچائی کے ساتھ کہا۔ بابا مسکرانے لگے۔ ریشم بھی اندر ہی اندر متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔

☆☆☆

آج دادی اماں کے سر میں درد تھا، وہ عصر کی نماز پڑھ کر وہیں اپنی چوکی پر چادر اوڑھ کر لیٹ رہیں۔ پیاری بوا نے آ کر انہیں آہستہ سے ہلایا اور ادب سے بولیں۔

”اٹھیں بی بی، یہ گرما گرم چائے پی لیجیے۔ مولا نے چاہا تو درد جاتا رہے گا۔“ لیکن پھر فوراً ہی گھبرا کر کہنے لگیں۔ ”اوئی بیگم آپ کا پنڈا تو بھٹے کی طرح بھُن رہا ہے۔ یہ تو اچھا خاصا بخار ہوگیا۔“

”ارے بوا غل مت بچاؤ۔ یونہی نزلے زکام سے ہوگیا ہوگا۔“ دادی اماں بولیں۔

”بیگم، میں تو کہو ہوں ڈاکٹر کو دکھا لیجیے۔ دوا کھالیں گی تو جلدی آرام آجائے گا بلاوجہ کی تکلیف سے بچ جائیں گی۔“

”کچھ ایسی خاص پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ابھی شرمین آجائے تو مجھے جوشاندہ کاڑھ کر پلا دے گی انشاء اللہ فائدہ ہوجائے گا۔“ انہوں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

اتنے میں شرمین گھر میں داخل ہوئی۔ یوں بے وقت انہیں لیٹے دیکھ کر اسی طرف لپک آئی۔

”کیا ہوا اماں، خیریت تو ہے آج آپ.... بے وقت کیسے لیٹی ہوئی ہیں؟“

”کچھ نہیں بیٹی۔“ دادی اماں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ذرا سی کمر سیدھی کرنے کو لیٹ رہو تو تم لوگ اودھم مچا ڈالتے ہو۔ بوا کے بعد اب تم آگئی ہو جرح کرنے۔“

”دیکھو بیٹا، اچھا خاصا بخار ہے مگر ڈاکٹر کے ہاں جانے کو منع کررہی ہیں۔“ بوا نے شرمین سے شکوہ کیا۔

”بخار تو واقعی انہیں ہورہا ہے۔“ وہ بھی پریشان ہوگئی۔ ”دادی اماں چلیں، میں آپ کو ڈاکٹر کے ہاں لے چلوں۔“ اس نے اصرار کرکے کہا۔ ”ورنہ غفلت سے زیادہ طبیعت خراب ہوگئی تو آپ کی کمزوری بڑھ جائے گی۔“

”میری چندا میں بالکل ٹھیک اور تندرست ہوں۔“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ”تم بلاوجہ کا تردد کررہی ہو۔ جاؤ، جا کر میرے لیے جڑی بوٹیوں والا جوشاندہ خوب ابال کر لے آؤ۔ قہوہ نکال کر جوشاندے کو دوبارہ دیگچی میں ڈھانپ کر رکھ آنا۔ رات سوتے میں پھر سے پانی

ڈال کر ابال لینا۔ دیکھنا کل صبح تک انشاء اللہ بھلی چنگی ہو جاؤں گی، جاؤ شاباش۔'' ان کے بشاش لہجے سے شرمین کی جان میں جان آئی۔ وہ بھاگ کر گئی اور ان کی حسبِ ہدایت جوشاندہ تیار کر کے لے آئی۔

وہ جوشاندہ پی رہی تھیں کہ دو ملنے والی آگئیں۔ ان کے ہمراہ دو بچے بھی تھے۔ پیاری بوا ان کی خاطر تواضع کے لیے اٹھ گئیں اور یہاں سب باتیں کرنے لگے۔

ان لوگوں کا تعلق دادی اماں کے بہت پرانے ملنے والوں میں سے تھا۔ شرمین کافی عرصے سے ان کے اکلوتے پوتے کو ٹیوشن پڑھا رہی تھی۔ اس بچے ذیشان کی دادی خاص طور پر آج ان کے پاس آئی تھیں۔ چائے کے دوران انہوں نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

''بہن، جمعے کے دن ذیشان کی سالگرہ ہے۔ آپ شرمین کو ضرور بھیجیے گا۔''

''اللہ ذیشان بیٹے کی ہزاری عمر کرے۔ جگ جگ جیے۔ آپ کو اس کی بہت خوشیاں دیکھنی نصیب کرے لیکن میری طرف سے معذرت ہے۔'' انہوں نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

''یہ کیا جواب ہوا بھلا آپ ہمیشہ ہر سال اسی طرح منع کر دیتی ہیں مگر اس سال تو میں ہرگز آپ کی معذرت قبول نہ کروں گی۔ یہ دیکھیں ذیشان خود اپنی ٹیچر سے اصرار کرنے کے لیے ساتھ آیا ہے۔''

''ذیشان تو سمجھدار بچہ ہے۔ بے جا ضد تھوڑی .... کرتا ہے۔'' دادی اماں نے پیار سے بچے کی پیٹھ تھپک کر کہا۔ ذیشان نے اپنی دادی کے گھٹنے پر سر رکھ دیا اور ٹھنک کر بولا۔

''نہیں، نہیں...... میں ہرگز نہیں مانوں گا۔ میری ٹیچر کو ضرور ضرور میری سالگرہ اٹینڈ کرنی ہے۔ میرے دوست ہر سال میرا مذاق بناتے ہیں۔'' سب نے حیران ہو کر اس کی ضد کی وجہ سنی۔ شرمین مسکرانے لگی تو بچے کی دادی بولیں۔

''سن لیا بہن، اس پاجی کا کہنا اُس کی ضد نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ پریشان ہو کر اس کے ابو نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''بہن شرمین کو کسی تقریب میں جانے کی عادت نہیں ہے۔ مجھے خود بھی یہ سب پسند نہیں اس لیے اسے کہیں بھیجتی نہیں ہوں۔'' دادی اماں نے اصل وجہ بتائی۔

''کبھی انسان کو اپنے اصول میں لچک بھی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ اگر آپ شرمین کو اجازت دے دیں تو آپ کی نوازش ہوگی اور ہماری عزت افزائی۔'' ذیشان کی دادی کی باتوں سے دادی اماں قدرے خاموش سی ہو گئیں۔ انہیں پسیجتے دیکھ کر اب دوسری عورت نے دخل دیا اور نرمی سے کہنے لگی۔

''آپ شرمین کی طرف سے بے فکر رہیے گا۔ جیسی ہماری بیٹیاں ہیں ویسی یہ ہمارے لیے عزیز ہیں۔ ہر طرح ان کا خیال رکھا جائے گا بلکہ میں خود انہیں واپسی میں گھر تک پہنچا کر جاؤں گی۔ آخر پڑھانے بھی تو آتی ہی ہیں۔ ہم ہر طرح خیال رکھتے ہیں۔'' دادی اماں آبدیدہ سی ہو گئیں ان کی بات پر دھیرے سے گویا ہوئیں۔

''بس بہن، بن ماں باپ کے بچے لیے بیٹھی ہوں۔ بہت بڑی ذمے داری ہے مجھ پر اس لیے تمام معاملات پر غور و فکر کرنا پڑتی ہے۔''

''اللہ سب کا وارث ہوتا ہے بہن...... اب تک جس حوصلے اور ہمت سے آپ نے کام لیا ہے وہ بہت قابلِ تعریف ہے۔ آپ ان بچوں کی ماں اور باپ بھی اور نانی، دادی بھی ہیں۔ اللہ آپ کو زندگی اور صحتِ تندرستی عطا فرمائے۔'' ذیشان کی دادی تسلی آمیز انداز میں بولیں۔ ان کی بات پر دوسری والی خاتون نے بھی اظہارِ خیال کیا تھا جبکہ وہ ان تینوں کی باتیں سن رہی تھی۔

''بیٹی تم اپنی دادی اماں سے ہماری سفارش کردو۔ دیکھو کتنی دیر سے آئے بیٹھے ہیں مگر یہ ہاں کرتی نظر نہیں آتیں۔'' اسے حد درجہ خاموش پا کر ذیشان کی دادی اب اس سے مخاطب تھیں۔

''یہ جیسا کہیں گی میں اسی پر عمل کروں گی۔ آپ، مجھے گناہ گار مت کیجیے۔'' شرمین نے آہستہ سے جواب دیا۔

''خوش رہو بیٹی، جیتی رہو، اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ بہت سعادت مند اور خوش بخت بچی ہو۔ اللہ تمہاری دادی کو تم بہن بھائیوں پر قائم رکھے۔'' دادی اماں چپکی بیٹھی سب کی باتیں سن رہی اور جی ہی جی میں کسی نتیجے پر پہنچ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہی تھیں۔ ایک جی چاہتا تھا کہ ہاں کر کے شرمین کو سالگرہ میں جانے کی اجازت دے دیں لیکن دوسرے ہی لمحے کوئی وہم، نامعلوم فکر آڑے آجاتی اور وہ اندر ہی اندر تھرا اٹھتیں۔ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگتیں۔ کافی وقت گزر گیا۔ اچانک ذیشان اپنی جگہ سے اٹھ کر شرمین کے قریب آیا اور بولا۔

''ٹیچر آپ آئیں گی ناں میری سالگرہ پر۔ دیکھیے انکار مت کیجیے گا ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔'' اس کی جرأت اور پیہم اصرار نے شرمین کو بہت متاثر کیا اور وہ بے بس ہو کر دادی اماں کی طرف دیکھنے لگی۔ اچانک وہ جیسے کشمکش کے جال سے نکل آئیں۔ انہیں اپنا مسلسل انکار خود ہی برا معلوم ہونے لگا۔

''تم اس قدر دلگیر مت ہو بیٹا ہم بھیج دیں گے تمہاری ٹیچر کو تمہاری سالگرہ میں۔ بس اب تو خوش ہو؟'' وہ شفقت سے مسکرا کر بولیں۔

''بہت بہت شکریہ دادی اماں، آپ بہت اچھی ہیں۔'' ذیشان خوشی کے عالم میں اچھل کر بولا۔ دونوں خواتین ایک دم کھل اٹھیں ان کا شکریہ ادا کیا اور تسلی آمیز جملے ادا کر کے وہ ہنستی مسکراتی چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد دادی اماں نے شرمین کو اپنے قریب بلایا اور آبدیدہ ہو کر گلے سے لگا لیا۔ وہ بھی کسی معصوم بچے کی طرح ان سے چمٹ گئی۔

''دادی، پوتی کو تو موقع چاہیے جی چھوٹا کرنے کا۔ اب اس میں بھلا رونے کی کیا بات ہوگئی بیگم صاحب آپ کا بھی بس جواب نہیں۔'' پیاری بوا نے مسکرا کر کہا۔ پھر انہوں نے شرمین کو دادی سے علیحدہ کرتے ہوئے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''بیٹی پڑھی لکھی ہو کر تم بھی کم عقلی کی حرکتیں کرنے لگتی ہو۔ انہیں ویسے ہی بخار نے بے حوصلہ کر دیا ہے اور اوپر سے تم بچہ بن جاتی ہو۔ چلو جاؤ فوراً منہ ہاتھ دھو جا کر۔ جب سے ٹیوشن سے آئی ہو یونہی بیٹھی ہول رہی ہو اور اپنی دادی کو بھی.... بے اوسان کیے دیتی ہو۔ بزدلی کی باتیں چھوڑ کر ہر وقت اللہ سے توبہ کرتی رہا کرو۔ جاؤ شاباش غسل خانے کی طرف۔'' شرمین خجالت سے ہنستی ہوئی اٹھ کر وہاں سے چل دی۔

☆☆☆

خرم کی ظاہری شکل صورت کے علاوہ اس میں ایک بہت بڑی خوبی جو تھی وہ یہ تھی کہ وہ جو بات بھی کرتا وہ بہت اعتماد اور بھروسے سے کرتا تھا۔ خاندانی شرافت اس کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی۔ یہی سبب تھا کہ بابا رحمت کے علاوہ بستی کے دیگر لوگ بھی اس کے بے حد حسنِ اخلاق اور مہذب اطوار کے گرویدہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ خصوصاً جب سے اس نے پالتو مویشیوں پر لاگو ہو جانے والے ریچھ کو ہلاک کیا تھا لوگوں میں وہ بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہو گیا تھا حالانکہ اس کارنامے کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ریچھ... درحقیقت بابر کی گولی سے ہلاک ہوا تھا مگر بستی میں دھوم خرم کی بہادری اور دلیری کی مچ گئی تھی۔ اس سے وہ لوگ اپنے جنگل بابو پر نثار ہو گئے تھے۔ ان کی نظر میں وہ ایک ہیرو بن چکا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ جب اس نے بھاری بھرکم ریچھ کی چربی بھی انہی

لوگوں میں بانٹ دی تو اس کی شہرت کو چار کیا آٹھ چاند لگ گئے۔

بابر اور خاور کے جانے کے بعد خرم کے شب و روز دوبارہ اس کی دیگر مصروفیات کی نذر ہونے لگے۔ اکثر و بیشتر وہ نماز پڑھنے مسجد بھی جاتا۔ جنگل کے فاریسٹ آفیسر کی حیثیت سے لوگ اس سے خوف زدہ رہنے کے بجائے اس کا بہت احترام کرتے تھے۔

اس نے بھی کبھی کسی پر بے جا رعب اور دبدبہ نہیں جھاڑا تھا بلکہ ان میں گھل مل گیا تھا اور ان کے دکھ درد میں شریک رہنے کی کوشش کرتا۔ رفتہ رفتہ وہ یہاں کے ماحول، رہن سہن، طور طریقوں اور آتے جاتے موسموں سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر خاور جو یہاں کے لوگوں کو اجڈ، گنوار اور جاہل سمجھ کر بار بار اس ماحول سے ٹرانسفر ہو جانے کا اصرار کر گئے تھے خرم کے نزدیک اس تبصرے کا کوئی مقام نہ تھا۔ کچھ عرصے بعد ہی وہ یہاں کے لوگوں کے... بے لوث خلوص اور سچے پیار کا دل سے معترف ہو گیا تھا۔ یہاں جیسی سچائی اور قدر دانی، شہر کی بناوٹی اور دکھاوے سے بھرپور زندگی میں بھلا کہاں دکھائی دیتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ خرم کا دل اب تو شہر سے زیادہ یہاں کی پاکیزہ، صاف شفاف اور نکھری، نکھری فضاؤں میں لگنے لگا تھا۔ جنگل کے بیچوں بیچ، درختوں کی اوٹ میں بڑا سا پختہ اور خوب صورت بنا ہوا ریسٹ ہاؤس اسے جی جان سے پسند آیا تھا۔ یہاں سے اپنے گھر اس کا جانا بہت کم کم تھا غرض یہ کہ اس کا دل خوب لگ گیا تھا۔

بابا رحمت سے اس کی صاحب سلامت بدستور تھی۔ وہ پہلے دن کی طرح سے ہی محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ اکثر لاٹھی ٹیکتے ہوئے آتے اور مکھن سے بھرا پیالہ زبردستی تھما جاتے۔ خرم ان کے خلوص سے مجبور ہو کر مسکراتے ہوئے رکھ لیتا۔

ایک دن جبکہ بادل خوب گھر گھر آ رہے تھے اور سرمست ہواؤں کے شریر جھونکے جنگل کے سبزے سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔ خرم اپنی رہائش گاہ پر اکیلا تھا۔ خانساماں آج بھی چھٹی پر چلا گیا تھا۔

موسم کی رنگینی اور دلکشی طبیعت پر خوشگوار تاثر چھوڑ رہی تھی۔ خرم نے سیل سے چلنے والا اپنا ریڈیو سیٹ فل آواز میں کھول رکھا تھا۔ ایک خوب صورت سے نغمے کے بول فضاؤں میں رس گھول رہے تھے۔ وہ ٹہلتے ہوئے کھلی کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ درختوں کی اور سبزے کی اپنی ایک مخصوص مہک ہوتی ہے۔ دور تک لہراتے جنگل کی شادابی جی کو بھلی لگ رہی تھی معاً اس کی بھٹکتی ہوئی نگاہیں رنگین لہراتے آنچل پر جا ٹھہریں۔ اسے حیرت کا ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔

یوں تو یہیں سے کھڑے ہو کر اس نے متعدد بار جنگل میں لہراتے، بل کھاتے رنگین آنچل دیکھے تھے کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ اکثر لڑکیاں، بالیاں بھیڑ بکریاں چراتی یا لکڑیاں چنتی دکھائی دیتی تھیں۔ آج سے پہلے اس نے کبھی توجہ نہ دی تھی لیکن آج...... اس کی حیرت کی وجہ جو منظر بنا تھا وہ واقعی کسی کو بھی اچنبھے میں ڈال دینے کے لیے کافی تھا۔

وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی ریسٹ ہاؤس کے گیٹ سے چپکی کھڑی تھی۔ جیسے کچھ دیکھنے، سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی توجہ اور انہماک دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ چند لمحے اسی مصروفیت میں بیت گئے۔ خرم کی حیرت زدہ اور متجسس نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں...... بے اختیار جی مچلنے لگا کہ باہر جا کر حقیقتِ حال دریافت کرے تاکہ اس لڑکی کی بے چینی کا سبب پتا چلے مگر اس ڈر سے کہیں اس کے ہٹتے ہی لڑکی گھنے جنگل میں روپوش نہ ہو جائے وہ اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ وہ اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا کھڑا تھا بھی اس لڑکی نے رخ بدلا

اور پلٹ کر جنگل کی طرف چل دی۔ بس یہ ایک لمحہ ہی کام دکھا گیا۔

خرم کی تیز نظر نے اسے صاف پہچان لیا تھا۔ اگر وہ غلطی پر نہیں تھا تو وہ یقیناً ریشم بی بی ہی تھی۔ وہ بری طرح چونک اٹھا۔ ابھی تک تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا وہ مسلسل سامنے ہی دیکھے جا رہا تھا جہاں ریشم بی بی لمحہ لمحہ بل کھاتی پگڈنڈی پر آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی مخصوص چال ڈھال اور منفرد وضع قطع اسے بیسیوں سے ممتاز کرتی تھی۔ خرم اسے لاکھوں کے مجمع میں بہ آسانی شناخت کر سکتا تھا۔

کھلی کھلی فضاؤں میں اس کا عنابی دوپٹا لہرا رہا تھا۔ اس کے نظروں سے غائب ہوتے ہی اس کا دماغ طرح طرح کے خیالات کا مرکز بن گیا۔ ریشم کا آنا اور پھر ایک دم ہی واپس لوٹ جانا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ عجیب سا قصہ تھا۔

اس کی حیرت اور سوچ میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس نئی الجھن میں گرفتار ہو کر اس نے ریڈیو بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر اس عقدے کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اچانک اسے ایک نیا خیال آ گیا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ بابا رحمت کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہو اور وہ کچھ کہنے سننے آئی ہو۔''

خرم کو معلوم تھا کہ کبھی کبھی انہیں سانس کی تکلیف بڑھ جاتی تھی۔ خرم نے کئی بار ان سے بہت اصرار کیا تھا کہ میرے ساتھ چل کر شہر سے کسی قابل ڈاکٹر سے دوا لے آئیں۔ بابا کبھی ہامی بھر لیتے کبھی ٹال جاتے۔ اس خیال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ریشم کو ان اطراف میں اور خاص طور پر اپنی رہائش کے آس پاس اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

جوں جوں وہ غور کرتا گیا اس کا یقین پختہ اور الجھن میں اضافہ ہوتا گیا۔ شام کے وقت وہ باہر نکلا اور بابا کے جھونپڑے کی طرف چل دیا۔

آسمان پر اب تک کہیں، کہیں بادلوں کے

مکمل ضابطۂ حیات

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور بولا کہ میں عالم بننا چاہتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا:

تقویٰ اختیار کرو، عالم بن جاؤ گے۔

پھر بولا۔ عزت والا بننا چاہتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا۔ لوگوں کی عزت کر۔

پھر بولا۔ اچھا آدمی بننا چاہتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا۔ لوگوں کو نفع پہنچاؤ۔

پھر بولا۔ طاقتور بننا چاہتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا۔ اللہ پر توکل کرو۔

پھر بولا۔ اللہ کا خاص بندہ بننا چاہتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا۔ اللہ کا ذکر کثرت سے کرو۔

پھر بولا۔ رزق کی کشادگی چاہتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا۔ ہمیشہ باوضو رہو۔

پھر بولا۔ دعا کی قبولیت چاہتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا۔ حرام مت کھاؤ۔

پھر بولا۔ گناہوں میں کمی چاہتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا۔ کثرت سے استغفار کرو۔ (سبحان اللہ)

مرسلہ: وجیہہ حسین...... اسلام آباد

سفید، سفید ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ نیلگوں کہرے کا غبار اور گاڑھے سے گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ بپھری ہوئی ہوا کے جھکڑ اونچے بلند و بالا درختوں میں شور مچا رہے تھے۔ ان گھنے درختوں کے نیچے چلتے خرم کو کسی خطرے کا احساس تھا نہ ڈر خوف کیونکہ وہ اس امر سے اچھی طرح آگاہ تھا کہ اس جنگل میں بڑے اور خطرناک جانوروں کا نام و نشان تک نہیں۔ ہاں چھوٹے، چھوٹے جنگلی جانوروں کی کود پھاند اس وقت بھی جاری تھی۔

وہ بستی کے قریب پہنچا تو جھونپڑیوں میں

چراغ جل اٹھے تھے۔ زرد زرد روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ بچے جھونپڑوں کے باہر کھیل رہے تھے۔ مغرب کی اذان ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی اس لیے باہر بیٹھ کر گپ شپ کرنے والے مردوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔

بابا رحمت کا جھونپڑا جنگل سے نسبتاً نزدیک مگر ایک طرف کو ہٹا ہوا تھا۔ اس لیے وہ کسی کی نگاہ میں آئے بغیر دروازے پر جا رکا۔ اندر خاموشی کا راج تھا۔ آہستہ سے دستک دے کر وہ جواب کا انتظار کرنے لگا لیکن انتظار طویل ثابت نہ ہوا۔ ریشم فوراً ہی دروازے پر نمودار ہوئی۔

"بابا تو...... نماز پڑھنے گئے ہیں۔" وہ اسے دیکھ کر بولی۔ خرم ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"گویا...... یہ اپنے ہی کسی کام سے آئی تھی میری طرف۔" اس نے جی ہی جی میں سوچا۔

ریشم کو دیکھ کر اب اس کا خیال یقین میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا کیونکہ ریشم وہی عنابی دوپٹا اوڑھے تھی جس کے ہالے میں اس کے صبیح خدوخال کی رنگت جگمگ، جگمگ کر رہی تھی۔ اب تو اس کے آنے اور ایک دم چلے جانے کی وجہ دریافت کرنا مزید ضروری ہو گیا تھا مگر وہ یوں باہر کھڑے، کھڑے پوچھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

"کیا بابا جان کے آنے تک اندر بیٹھنے بھی نہ دو گی؟" خرم نے بڑے بھروسے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ذرا سی دیر کو وہ چپ کی چپ رہ گئی مگر یہ کشمکش زیادہ دیر قائم نہیں رہی۔ اس نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا اور بہت اعتماد سے ایک طرف ہٹ کر بولی۔

"ہاں جی اندر آکر بیٹھ جائیں۔ بابا آتے ہی ہوں گے۔" خرم نے جھک کر اپنا سر چوکھٹ سے بچایا اور اندر داخل ہو کر بڑے پُرسکون انداز میں بابا کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

ریشم چولھے کے پاس پیڑھی پر جا بیٹھی۔ چولھے میں دھڑا دھڑا سوکھی لکڑیاں جل رہی تھیں اور کچی ہنڈیا میں چنے کا ساگ ابل رہا تھا۔ وہ خود کونڈے میں باجرے کا آٹا مسل رہی تھی۔

جھونپڑے سے باہر بپھری ہوئی ہوا کے جھکڑ شور مچا رہے تھے مگر اندر کی فضا خرم کو بہت آرام دہ اور گرم، گرم سی لگی۔ ایک گہرے سکون اور اچھوتی سی آسودگی کا احساس اس کی رگ، رگ میں اترتا چلا گیا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ نرم روئی کے تکیے پر سر رکھے اور گہری نیند میں مدہوش ہو جائے۔ کوئی خیال، کوئی سوچ، کوئی فکر اور کوئی اندیشہ اس کے قریب سے بھی نہ گزر سکے مگر انسان جو سوچتا ہے وہ ہوتا کب ہے۔

حقیقت بہرکیف یہی تھی کہ اس گھر کے مکینوں سے اس کا کوئی ظاہری رشتہ ناتا قائم نہ تھا۔ سوائے خلوص، مروت اور اخلاق کے رشتے کے۔ اس نے ایک گہری تھکی ہوئی سانس لے کر ادھر اُدھر دیکھا۔

جھونپڑے میں چراغ کی زرد، زرد روشنی ٹمٹما رہی تھی جس کی پھیکی روشنی میں ریشم بدستور ہل، ہل کر آٹا مسلے جا رہی تھی۔ انگاروں کی جھلملاہٹ میں اس کی گلابی رنگت چمک رہی تھی۔ آنکھوں میں جھیلوں کی سی شفاف ٹھنڈک تھی۔ اچانک خرم کو محسوس ہوا کہ اس کے پاس نہایت قلیل وقت ہے اور مرحلہ بہت کٹھن، بابا کسی بھی وقت نماز پڑھ کر آسکتے تھے۔

"آج تمہاری بھیڑ بکریاں تو بڑی دور، دور کی سیر کر رہی تھیں۔" اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اٹک، اٹک کر بولا۔

"دور...... دور کی سیر؟" ریشم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بڑبڑانے والے انداز میں دُہرایا۔

"ہاں، ہاں۔" خرم نے بڑے یقین سے سر ہلا کر کہا۔ "آج میری طبیعت کچھ بہتر نہ تھی سارا دن گھر پر تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔"

"اچھا پھر دور سے ہمارا ریوڑ کیسے پہچان لیا؟" ریشم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیسے پہچان لیا؟" خرم نے مسکرا کر دُہرایا۔ "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ تم ساتھ ہو گی تو کیا میں پہچانوں گا نہیں؟" ریشم کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر ہنستی چلی گئی۔ ہنستے، ہنستے اس کی آنکھوں میں بہت سا پانی بھر آیا مگر اس کی ہنسی نہ تھمی۔ یوں جیسے خرم نے اسے کوئی دلچسپ لطیفہ سنا دیا تھا۔

وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے اس کی صورت تکے جا رہا تھا۔ جب وہ خوب ہنس چکی تو اوڑھنی سے آنکھوں کے گوشے خشک کرتے ہوئے بولی۔

"آپ نے بھی کمال کر دیا وہاں ہمارا ریوڑ کہاں تھا بھلا وہ تو دور...... سکھ نالے کے قریب چر رہا تھا۔" خرم غور سے اس کی صورت تکتا رہا بولا کچھ نہیں۔ وہ خود ہی تفصیل بتانے لگی۔

"ہمارا ایک بکرا ریوڑ سے بچھڑ گیا تھا۔ میں بہت دیر تک اسے اترائی، چڑھائی اور جھاڑیوں میں ڈھونڈتی رہی مگر وہ نہ ملا۔ اسے ہی ڈھونڈتے، ڈھونڈتے میں آپ کے گھر کی طرف جا نکلی......"

خرم کا مقصد حل ہو چکا تھا۔ اس نے موضوع چھیڑ کر عنوان برآمد کر لیا تھا اور اب اس کی اصل الجھن کا حل بھی نکلنے والا تھا چنانچہ اس نے معصوم سی صورت بنا کر پوچھا۔

"اچھا...... اچھا اب سمجھا تم یہ سمجھی ہو گی کہ تمہارا بکرا گیٹ کھول کر میرے پاس نہ آگیا ہو کہیں، ہے ناں؟" ریشم کی بے ساختہ تبسم کی ہنسی اور مسکراہٹ میں فوری طور پر بریک لگ گیا اور چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا۔ خرم نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا مگر احتیاطاً زبان سے اظہار نہ کیا بس منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو اور اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا مگر اعترافِ جرم کرنا بھی ضروری ہو۔

"بکرا تو ایک جگہ بیری کے جھاڑوں میں سے مل گیا تھا بس میں...... خود ہی......" اٹکتے، اٹکتے بالآخر اس کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔

خرم جو ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا پہلو بدل کر رہ گیا۔ اچانک سینے میں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"یہ...... ریشم کیا کہنے والی تھی۔ اپنے کسی جذبے کا اظہار کرتے شرما رہی ہے شاید...... یقیناً مجھے اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اسے کسی حوصلے اور سہارے کی ضرورت ہے۔ یہ بہت معصوم بہت سادہ لوح ہے۔ خود کو سمجھنے سے قاصر ہے...... اسے اپنے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کے لیے موزوں الفاظ نہیں مل پا رہے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ پشیمان سی ہو کر خاموش ہو گئی ہے۔" اس کے ذہن میں ایک خیال آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔ وہ کافی سنجیدہ ہو گیا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی بے زبانیوں کو زبان دے ڈالے۔ جانے وہ ریشم سے کیا، کیا سننے کا متمنی ہو گیا تھا۔ ایک دم ہی اس پر بہت خوب صورت ان کہے، ان سنے اور اچھوتے سے احساسات اور لطیف جذبات نے یلغار کر ڈالی تھی بالآخر جب ضبط نہ ہو سکا تو قدرے جھک کر سرگوشی میں بولا۔

"ہاں...... ہاں بولو، بولو ریشم تم کیا کہہ رہی تھیں۔ کیا بتانے لگی تھیں۔ میں نے تمہیں اپنے گیٹ سے جھانکتے دیکھا تھا اور پہچان لیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں تم تک پہنچ پاتا یا تمہیں اندر بلاتا تم جا چکی تھیں۔ تب سے اب تک مجھے ایک پل چین نہیں ہے۔ ایک بے چینی ہے، بے کلی ہے ایک تکلیف اور بے قراری کا سا عالم ہے۔ رہ، رہ کر اپنی سستی اور غفلت پر غصہ آرہا ہے کہ شاید زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے تھے جو میں اپنے مقام سے ہل بھی نہیں

میں ان کے بارے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آج شام کو کہیں جانا نہیں ہے تو میں آجاؤں؟''

''ارے کیوں نہیں...... تمہارے بھائی صاحب بھی تمہیں کافی دنوں سے یاد کررہے تھے کہ تم نے چکر نہیں لگایا، ہم لوگ شام کو گھر پر ہی ہوں گے۔ ڈنر ہمارے ساتھ ہی کرنا۔'' مسز ملک خوش دلی سے بولیں۔

''چلیں ٹھیک ہے۔ پھر میں شام کو حاضر ہوجاؤں گا۔''

ریسیور رکھ کر مسز ملک سوچ میں پڑ گئیں کہ نعیم آخر شہلا کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتا ہے۔ شہلا ان کے کالج میں لیکچرار تھی۔ جسے یہاں آئے ہوئے صرف چھ ماہ ہوئے تھے۔ خوش لباس، خوش مزاج، زندہ دل سی یہ لڑکی ان کے اسٹاف میں خوب صورت اضافہ تھی۔ ''بہر حال اب شام کو ہی پتا چلے گا۔'' انہوں نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

☆☆☆

''بھابی! شہلا میرے پاس تین چار ماہ سے آرہی ہے اور اتنے عرصے میں ٹریٹمنٹ سے تھوڑی سی بھی پیش رفت نہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑی سی ہیلپ کریں اور اس کے حالات کے بارے میں مجھے بتائیں۔ کیونکہ وہ خود تو یہی کہتی ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

نعیم، ملک صاحب کا چچازاد بھائی تھا جو سول اسپتال میں سائیکاٹرسٹ کے طور پر ملازمت اختیار کیے ہوئے تھا اور شام کے وقت ایک کلینک بھی چلا رہا تھا۔ کافی ہمدرد اور نیک طبیعت کا یہ لڑکا اپنے پیشے سے بے حد مخلص تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ اس کی پیشنٹ مقامی کالج میں لیکچرار ہے تو اسے ایک کلیو ملا اور وہ اپنی بھاوج سے معلومات کرنے چلا آیا۔

''اچھا یہ تو بتاؤ کہ اس کی بیماری کی نوعیت کیا ہے؟'' مسز ملک ساری بات سن کر کشمکش میں پڑ گئیں۔

''بھابی! اُسے مسلسل ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں مڑ جاتے ہیں اور دانت، زبان کے اوپر جم جاتی ہے۔ بے ہوش ہوجاتی ہے۔ میرے خیال میں یا تو اس کی زندگی کا کوئی ایسا حادثہ، شاک یا واقعہ ہے جو اسے یاد آتا ہے تو اس کی ایسی کنڈیشن ہوجاتی ہے۔ میں اس کی اس پرابلم کو اس لیے نہیں سمجھ سکا کہ وہ خود کو کسی کے سامنے ایکسپوز کرنے سے خوف زدہ بھی ہے۔ اگر آپ کچھ معلوم کرنے کی کوشش کریں تو ممکن ہے کچھ کھل سکے۔''

''چلو تم کہتے ہو تو میں کوشش کر دیکھتی ہوں، اصل میں اس کا یہاں جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ ہاسٹل میں رہی ہے۔ اپنے ساتھ ایک نوکرانی کو لے کر آئی ہے۔ جنوبی پنجاب کے سیاسی خاندان سے اس کا تعلق ہے۔ بتا رہی تھی کہ شوقیہ جاب کررہی ہے۔ کافی پڑھے لکھے اور مہذب خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ خود تو شاید مجھے کچھ نہ بتائے پر اس کے ساتھ جو نوکرانی رہ رہی ہے اس سے کچھ پتا کروں گی۔ بہر حال تم بھی اپنی سی کوشش کرو۔ آخر کو سائیکاٹرسٹ ہو۔''

''ارے بھابی آپ کو کوئی شک میری قابلیت ...۔ مگر یہاں تو میں ناکام ہوکر ہی آپ سے کانٹیکٹ کررہا ہوں۔''

''ارے اتنی اچھی لڑکی کے معاملے میں اگر ناکام ہوگئے تو پھر میں ضرور شک کروں گی۔ محنت بھی تو بہت کررہے ہو، اتنی تو کبھی نہیں کی...... یہ کوئی خاص کیس ہے کیا؟'' مسز ملک چھیڑتے ہوئے بولیں۔

''چلیں یونہی سمجھ لیں...... مگر اس خاص کیس میں آپ کی خاص الخاص مدد کی بھی ضرورت ہے۔''

''ضرور، ضرور...... دل وجان سے میرے بھائی ویسے مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا ہے کہ اس پیاری سی لڑکی کو ایسی نفسیاتی بیماری لاحق ہے۔''

☆☆☆

لاری اڈے کے ساتھ بنے ہوئے گراؤنڈ میں قناتیں اور شامیانے لگا کر جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ عشا کی نماز کے بعد تقریب کی کارروائی شروع ہونا تھی۔ سو شام کے بعد ہی وہاں کی رونقوں میں کچھ اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ زہرہ کے ساتھ اردگرد کی گھروں کی چھتوں پر کھڑی عورتوں کی طرح اس رونق کو انجوائے کررہی تھی، ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالتے نوجوان اور ان کے درمیان وہ دشمنِ جاں دولھا کی سی شان سے ایستادہ تھا۔

اقبال کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اسے کون، کون گلے لگا کر مبارک باد دے رہا ہے۔ مختلف گاؤں کے لوگ اکٹھے تھے۔ تبھی موبائل نکال کر اس نے میسج چیک کیے۔

''کیا شان ہے بھئی، مبارک ہو۔'' اس کے بعد بھی اس قسم کے کئی شرارتی سے کمنٹس درج تھے۔

اسے معلوم تھا کہ وہ چھت کی جالیوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر اسے تلاشنا چاہا مگر میدان روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ اور چھتوں پر روشنی بہت کم تھی اس لیے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ تبھی دوسرے گاؤں سے آنے والی پانچ گاڑیوں کا قافلہ آکر رکا اور بھنگڑا ڈالتے جوانوں نے اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا اور وہ بھی ان کی پزیرائی کیوں نہ کرتا کہ آخر انہی کے تعاون سے تو وہ اس علاقے کا ناظم منتخب ہوا تھا۔ آج نائب ناظم ایک بہت بڑے کارواں کے ساتھ اسے مبارک باد دینے آرہا تھا یہ تمام تیاریاں اسی جشن کے سلسلے کی تھیں جو کامیابی پر منایا جارہا تھا تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر سامنے لی قطار میں بنے ہوئے تیسرے بنگلے کی چھت پر کھڑی اس بے وقوف سی لڑکی سے پوچھے، تمہارے قدم میرے گھر میں پڑنے سے پہلے اتنی کامیابیاں نصیب ہورہی ہیں...... ابھی تو تمہارا نام میرے نام سے جڑا ہے صرف، کہاں گئے تمہیں سبز قدم کہنے والے...... دور سے آتی ڈھول کی ڈھم، ڈھم آواز سے پتا چلا کہ مبارک بادی کارواں اب ان کے گاؤں کی سڑک پر چڑھ چکا ہے۔ سو وہ سب بھی جواباً زیادہ جوش سے ڈھول پیٹتے ہوئے ان کے استقبال کے لیے گاؤں سے باہر جانے کو چل دیے۔

☆☆☆

''شادی کی تاریخ......'' اس کے ہونٹ خشک ہوگئے اور اس نے خوف زدہ ہرنی کی طرح اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں پلیز اقبال، ابھی نہیں، ابھی تو تم...... ابھی یہ سب کچھ اتنی جلدی......''

''کیا ابھی تم اور کیا ابھی میں......'' وہ جھنجلا اٹھا۔

''ابھی میں ذہنی طور پر تیار نہیں...... پلیز کچھ وقت کے لیے اس سلسلے کو رہنے دو۔ اس کا دل... پھڑپھڑا کر باہر آنے کو تھا۔ وسوسے اور اندیشے پنجے جھاڑ کر اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ ہر صورت اسے اس اقدام سے باز رکھنا چاہتی تھی۔ اس لمحے کا تصور کرکے کانپ اٹھتی اگر واقعی وہ...... اقبال چپ چاپ اس کی کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا۔

''دیکھو ابھی تو تم نے سیاست میں قدم رکھا ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کے کام کرو...... ان کی خدمت...'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اقبال نے اسے ہاتھ سے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

''تم بالکل پاگل ہو...... میں تمہیں کتنی دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ بکواس کرتے ہیں لوگ، تم میری زندگی ہو، تمہارے نام کے ساتھ نام جڑتے ہی مجھے کتنی بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ زندگی کے سفر میں جب تم میرے ساتھ چلوگی تو بڑی، بڑی کامیابیاں ہمارا مقدر ہوں گی۔ ہم ایک خوب صورت زندگی گزاریں گے۔ اب آیا کچھ سمجھ شریف میں۔'' اسے چپ دیکھ کر دوبارہ استفسار کیا۔ اس نے بے دھیانی سے سر ہلایا۔ وہ قیامت اب بھی یاد

تھی۔ جب سائرن بجاتی ایمبولینس......

''تو پھر میں ماں اور بابا سے بات کروں؟ اسی ہفتے وہ تاریخ لینے آئیں گے اور تم بھی بے وقوفی والی باتیں سوچنا بند کرو۔'' وہ پورچ کی سیڑھیوں تک اسے خدا حافظ کہنے آئی۔ جب گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک وہیں بیٹھ کر وہ جانے کیا کچھ سوچتی رہی...... اقبال اور وہ بچپن سے ہی ایک دوسرے سے منسلک تھے...... ملکوں کی زمین کے تنازعے یوں تو بہت لمبے ہوتے ہی ہیں...... مگر یہاں تو ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ زمین ابا اور خالو کے درمیان تقسیم ہونا تھی کیونکہ ماموں کوئی تھے نہیں...... نہر والی زمین پر بابا نے بہت سا کام کروایا تھا جبکہ خالو برابر کی تقسیم چاہتے تھے۔ جبکہ گاؤں کے باہر کی زمین تقسیم سے پہلے خالو نے سڑک کی طرف سے بیچ کر قبضہ بھی دے دیا تھا۔ یوں زمین کے تنازعے سالوں چلے کہ آپس کے رشتے بھی ختم ہوگئے۔ گھروں کی دیواریں ملی ہوئی اور دل اتنے فاصلوں پر کہ لگتا تھا صدیوں کی مسافت بیچ میں ہے۔ اقبال باہر پڑھنے کے لیے گیا ہوا تھا کہ ابا نے اس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے شہروز خان کے ساتھ کردی۔ جبھی اقبال پڑھ کر واپس آیا تھا مگر یہاں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق وہ شہروز کے سنگ رخصت ہوچکی تھی۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ مگر وقت کو واپس کون لاتا، خالو افضل تو اس رشتے کو کب سے بھلا چکے تھے کہ جائیداد کے بٹوارے نے شدید دشمنی کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ابا نے شاید اس لیے جلدی کی کہ خالو یہ نہ سمجھیں کہ بچپن کی منگنی کے نام پر ان کی بیٹی باپ کی دہلیز پر بیٹھی ہے سو ایف اے کے امتحان کے بعد اس پر ایک پہاڑ ہی ٹوٹا، جب اسے بچپن کے خواب اقبال کو بھول کر شہروز کے سنگ رخصت ہونا پڑا مگر اس سے بھی بڑی قیامت خالو افضل پر پڑی۔ جب انہیں بیٹے کی دیوانگی دیکھ کر پتا چلا... کہ اب بھی اقبال کی نظر میں بچپن کے طے کیے رشتے کی بڑی اہمیت ہے۔ قسمت کو شاید یہی منظور تھا اگر وہ کہتی بھی تو کس سے کہ اقبال کی صورت ہمیشہ سے دل پر نقش تھی مگر حقیقت میں تو سالوں ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا کہ جب سے وہ باہر پڑھنے گیا تھا۔ اب وہ ایک دکھ کو بھول کر ابھی نئی زندگی شروع کرنے والی ہی تھی۔ جب ایک قیامت سے بھی بڑی قیامت ٹوٹی۔ شادی کے چوتھے دن شہروز خان کسی ضروری کام کا کہہ کر نکلا۔ تقریباً دو گھنٹوں کے بعد ایمبولینس چیختی چنگھاڑتی شہلا کی مانگ اجڑنے کا پیغام لائی۔ سامنے سے آنے والے ٹریلر نے کچھ اس طرح اس کی گاڑی کو ٹکر ماری کہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ دم توڑ گیا۔

''یہ میرے ہی مقدر میں ایسا کیوں لکھا تھا۔ شہروز میں نے تمہیں خلوص سے وہ مقام دینے کی کوشش کی تھی جس کے تم حق دار تھے۔'' چوڑیاں ٹوٹیں، مہندی لگے ہاتھ لیے، شہروز خان کے رستے خون کو دیکھتے ہوئے وہ تصور میں اس سے مخاطب تھی۔

''اب میرا اس سے بڑھ کر نقصان کیا ہوگا۔ یہ ڈائن میرے بیٹے کو کھا گئی۔ اب اور کیا ہوگا۔'' اس کی ساس سوئم کے روز کسی برادری کی عورت سے کہہ رہی تھی جو غالباً اسے سمجھا رہی تھی کہ بہو سبز قدم ہے اور پھر اسے عدت گزار کر واپس باپ کی دہلیز پر آنا پڑا۔

☆☆☆

''ناممکن سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ شوہر کو شادی کے چوتھے دن کھا گئی وہ ڈائن عورت، شکر کرتی ہوں خاندانی جھگڑے کی وجہ سے ہم بچ گئے اور اب تم کہہ رہے ہو کہ تم اس سے شادی کرو گے۔ بھول کر بھی یہ بات منہ سے نہ نکالنا اقبال بیٹا۔'' اس کی ماں مسلسل اسے سمجھا رہی تھی۔

''امی موت ایک اٹل حقیقت ہے ہر کسی کو آنی

ہے۔ خاندانی جھگڑا کسی کو بچا نہیں سکتا، نہ ہی شہلا کسی کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ سارے اختیارات اللہ کے پاس ہیں۔ بچانے اور مارنے والی ذات اس کی ہے۔ آپ فضول لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرا کریں۔''

ماں، بیٹا اپنی، اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے...... شہلا کی شادی کا سن کر اقبال کی جو حالت ہوئی وہ اس سے واقف تھی...... مگر بیٹے کی زندگی انہیں بے حد عزیز تھی۔ شہلا کو بہو بنانے کا سوچ کر ہی کلیجا تھام لیتی۔ تین سال کی مسلسل جنگ کے بعد آخر وہ اپنا موقف منوانے میں کامیاب ہوگیا۔

شہلا نے پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیا تھا۔ اور اب جبکہ وہ ایم اے کر کے pcs کا امتحان دے چکی تھی تو خالہ نے اس کا ہاتھ اقبال کے لیے مانگ لیا۔

☆☆☆

''سنو بیٹی سعدیہ...... کپڑوں کی تیاری تو اب تقریباً مکمل ہونے کو ہے۔ جوتے وغیرہ ایک دو دن میں خرید لو۔ اب دن بہت ہی کم رہ گئے ہیں۔'' مختاراں بیگم بری کی تیاری کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''جی امی بس تھوڑی چیزیں باقی ہیں یوں تو شہلا نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ رکھا ہے مگر پھر بھی میں فون کر کے اس کی پسند کے متعلق پوچھ لیتی ہوں۔'' اقبال کے بڑے بھائی کی بیوی سعدیہ کپڑوں کو تہ لگاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اور ہاں بہو......! یہ خالق سے کہو کہ زیورات کی خریداری کے لیے وقت نکالے۔ ہم اکیلی عورتیں تو یہ خریداری نہیں کرسکتی ناں...... شادی سر پر ہے۔ اور ان مردوں کی اپنی مصروفیات ہی نہیں ختم ہو رہیں۔'' وہ گھر میں رکھے کچھ زیورات نکالتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔

''یہ خاندانی کنگن اقبال کی دلہن کے لیے رکھے تھے۔ چھوٹا بیٹا ہے میرا...... اور دو سیٹ بھی ہیں۔ بس ایک اور لینا ہے ساتھ جھومر، نتھ، ٹیکا وغیرہ......'' باہر سے گاڑی رکنے کی آواز پر وہ ابھی اٹھ کر باہر دیکھنے ہی والی تھیں کہ خالق بڑی تیزی سے اندر داخل ہوا۔

''اماں! بابا کہاں ہیں؟'' وہ متوحش سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''دشمنی کو لے کر زمینوں پر گئے ہیں، ٹیوب ویل

پر کام تھا...... پر خیر تو ہے بیٹا تم اتنے پریشان کیوں ہو؟'' وہ ادھوری بات چھوڑ کر پوچھنے لگیں۔ وہ ان کی بات کا جواب دیے بغیر جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سعدیہ علیحدہ پریشان کھڑی تھی۔

''پتا نہیں کچھ بتایا بھی نہیں۔ اچھا خیر تم یہ سنبھالو میں پتا کرتی ہوں۔'' انہوں نے زیور بہو کے ہاتھ میں دیے اور بیٹے کے پیچھے چل دیں۔ ابھی دروازے پر ہی تھیں کہ خالق کی آواز آئی۔ وہ شاید فون پر باپ سے بات کر رہا تھا۔

''وہ اقبال کو گولی لگی ہے اسے اسپتال لے گئے ہیں۔ آپ پہنچیں، میں بھی بس نکل رہا ہوں۔'' مختاراں بیگم دروازے کا سہارا لے کر بیٹھتی چلی گئیں۔ لمحے بھر میں گھر کے اندر چیخ و پکار مچ گئی۔

''پھر میرے وسوسے سچ ثابت ہوئے اور لوگوں کی بکواس بھی درست۔ صرف تمہارے وعدے جھوٹے تھے، زندگی کی شاہراہ پر میرے ہم قدم چلنے کے وعدے۔'' وہ مسلسل آنسو بہاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ الیکشن کی کامیابی کے جشن میں نائب ناظم کو مبارک باد دینے کے لیے وہ لوگ جب جا رہے تھے تو کسی نے پٹاخا پھینکا جو کسی مخالف کے گھر میں جا گرا تھا اور مخالف بھی وہ جس سے الیکشن کے دن اقبال کی تو تکار ہوئی تھی۔ ٹینٹ لگانے پر بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی تھی۔ اس طرف کے لوگوں کا کہنا تھا کہ ٹینٹ غلط جگہ پر لگا ہے۔ یہاں سے عورتیں پولنگ کے لیے گزر کر اندر جائیں گی۔ پٹاخا مخالف کے گھر میں گرا تو انہوں نے دھمکی دی تھی۔

''ہم تمہیں سبق سکھائیں گے۔'' اور پھر جب آج اس واقعے کو دو ماہ ہونے کو آئے تھے۔ دوسری پارٹی کے چند افراد نے چھوٹی سڑک سے گزرتی گاڑی کو نشانہ بنایا تھا۔ بظاہر تو یہ اس بات کا بدلہ لیا گیا مگر حقیقت میں سیاست کے اس چمکتے ستارے کو راستے سے ہٹانا مقصد تھا مگر نہیں یہ تو شہلا تھی...... جو ڈائن منحوس اور سبز قدم جو دو مردوں کو کھا گئی تھی کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے ارد گرد رہنے والے لوگ آئندہ اس کی نحوست سے محفوظ رہ پائیں گے؟

بار بار بھی سوچا جاتا تو ہر دفعہ یہی نتیجہ نکلتا کہ واقعی وہ منحوس تھی۔ شہروز خان اور اقبال ملک کی موت اس پر منحوسیت کی مہر لگا گئی تھی۔

''میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ صرف میرے ساتھ ہی کیوں؟ ہر دفعہ میری ہی خوشی پر قیامت کیوں ٹوٹی؟ ہر مرتبہ میرے بھاگ ہی کالے بھاگ کیوں ہوئے؟'' وہ بھاگ جانا چاہتی تھی یہاں سے۔ ان فضاؤں سے جہاں خوب صورت وعدوں نے دم توڑا تھا۔ جہاں اقبال کی سانسوں نے بے وفائی کی تھی اور اس پر منحوس کا لیبل ثبت کر دیا تھا۔ یہاں آوازوں کی بازگشت اس کا پیچھا کرتی۔ ان وعدوں کی صورت میں جو اس سے ایفا کیے بغیر دم توڑ گئے تھے۔ ان وعدوں کی لاش دوسری دفعہ سائرن بجاتی ایمبولینس پر اس کے گھر کے دروازے سے گزری تھی۔ تب ہی اسے ایک دور دراز کے قصبے میں نوکری کا اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تب اسے لگا اب فرار کا راستہ مل گیا ہے مگر آوازیں اب بھی اس کا تعاقب کرتیں۔ کبھی سوتے میں سائرن کی آواز اسے جگا دیتی۔ وہ آدھی، آدھی رات جاگتی رہتی۔ کبھی اسے لگتا بہت سی آوازیں اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔

''وہ منحوس ہے، منحوس ہے ہاں ہے تو پھر......؟''

تب اسے دورے پڑنے لگتے۔

اس نے اپنے دکھ کو چھپا لیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بہت اونچا میوزک چلاتی۔ وہ بہت خوب صورت ڈریسنگ کرتی۔ کوئی آواز نہ دبتی کوئی دکھ نہ چھپتا کہ یہ دکھ تو ہسٹریا بن کر اسے چمٹ گیا۔ وہ ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر ماضی کو بھلانے کی کوشش کرتی مگر ماضی کہاں بھولتا وہ تو پہلے سے بھی زیادہ زور سے دستک دیتا حال کے دروازے پر۔ لوگوں کا ایکو ساؤنڈ پھر اس کا پیچھا کرنے لگتا۔ سائرن پہلے سے بھی زیادہ زور سے چنگھاڑنے لگتا تب اس کی مٹھیاں بند ہونے لگتیں۔

اس کی سیکڑوں اسٹوڈنٹس اسے بہت زندہ دل قرار دیتی تھیں مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ خوب صورت زندہ دل لڑکی کتنے دکھوں کو قریب سے دیکھ چکی ہے۔

☆☆☆

''مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ کوئی ایسا شاک یا حادثہ اس کی بیماری کی وجہ ہے۔'' آج مسز ملک ہاسٹل کے وزٹ کے بہانے صغریٰ سے مل کر آئی تھیں جب شہلا کالج میں تھی۔ صغریٰ شہلا کی پرانی نوکرانی تھی۔ جو اَب اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ مسز ملک نے صغریٰ کو بیماری کا بتا کر شہلا کے ماضی کے متعلق تفصیل جان لی تھی۔ جو اَب نعیم کے سامنے تھی۔

''تمہارا اندازہ صحیح نکلا، اصل میں آج کل کسی انسان کے ساتھ کوئی حادثہ ہوتا ہے تو معاشرہ اسے مزید ٹارچر کر کے اسے مریض قرار دے دیتا ہے۔ اب اگر دو مردوں کی قسمت میں جوانی میں حادثاتی موت لکھی تھی تو ہم کون ہوتے ہیں یہ فتویٰ لگانے والے کہ یہ موت کسی تیسرے بے گناہ انسان کے سبب ہوئی ہے۔ اتنی پڑھی لکھی اور سمجھ دار بچی ہے مگر کس طرح اپنے ان حادثات پر ری ایکٹ کرتی ہے۔''

''بہر حال بھائی آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ میری کیا مدد کریں گی اس سلسلے میں...... آپ کی خاص الخاص مدد چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ مس شہلا کو یہ یقین دہانی کروانا خاصا مشکل کام ہے۔''

''دیکھو نعیم، پہلی بات تو یہ کہ تم اپنے گھر والوں کو مناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ میں تو شہلا کو کنونس کر لوں مگر تمہارے گھر والے نہ مانیں یہ تو مزید ٹارچ کرنے والی بات ہو گی ناں۔''

''ان کی آپ فکر نہ کریں اگر مس شہلا مان جاتی ہیں تو ممی، پاپا کو منانا میرا کام ہے۔''

''شہلا کے ساتھ پہلے جو حادثات گزرے ہیں۔ وہ اگرچہ مشکل سے ہی مانے گی مگر میرا خیال ہے کہ میں اسے کنونس کر لوں گی اور اگر تم گھر والوں کو راضی کر لو تو یہ بہت بڑی نیکی ہو گی۔''

''ہاں بھابی نیکی کا کام تو ہے مگر اپنے ساتھ۔ اتنی پیاری سی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر کے میں اپنے ساتھ بھی نیکی کروں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے اٹھ گیا۔

''زندگی اور موت انسان کے اختیار میں کب ہوتی ہے جو کسی کی موت کا ذمے دار دوسرے کو ٹھہرایا جائے۔ مجھے یقین ہے بیٹا اب بھی زندگی کی بہت سی خوشیاں تمہاری منتظر ہیں۔ جو جتنی زندگی لکھوا کر لاتا ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی یہ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔'' آج جبکہ نعیم کے گھر والے اسے انگوٹھی پہنانے آ رہے تھے تو اس کا ٹینشن سے بی پی لو ہو رہا تھا۔ اسپتال سے انجکشن لگوا کر وہ واپس آئی تو مسز ملک خاص طور پر اسے سمجھانے لگیں۔

''اٹھو بیٹا، فریش ہو کر اور چینج کر کے آ جاؤ اب مہمان انتظار کر رہے ہیں۔ زندگی دکھ اور سکھ کی گھڑیوں سے عبارت ہے اور اب تمہارے دکھ کی گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔'' مسز ملک اسے ڈھیروں تسلی اور پُر خلوص دعائیں دے کر باہر مہمانوں میں آ بیٹھی تھیں۔

دکھوں کی کانٹوں بھری رہ گزر پر چلتے، چلتے اس کے قدم سکھ کی پھولوں بھری وادی میں جا پڑے تھے۔ جہاں اب اس کے آنگن میں دو حسین پھولوں کی مہک بھی ہے اور ایک اچھا انسان اس کا شریکِ سفر ہے...... تو آج اس نے جانا کہ دکھ کی رات چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو سکھ کا سورج ضرور طلوع ہوتا ہے۔ اب اسے مقدر سے کوئی گلہ نہیں تھا اس نے صرف اور صرف رب کا شکر ادا کرتے رہنا تھا کہ اس کی جھولی خوشیوں سے بھر دی گئی تھی۔

ناولٹ 2

رنگِ خلش

رفاقت جاوید

کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کے حسین لمحے
بھی خلش کی نذر ہو جاتے ہیں اور ہم جوں جوں اس احساس کو من کے
اندر گہرائیوں میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو خلش کے بے حساب رنگوں
کی پردہ کشائی ہمیں مضطرب کرنے لگتی ہے اور مکافاتِ عمل کا کبھی نہ ختم ہونے والا
سلسلہ شروع ہو جاتا ہے... گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا... سزا تو لازم و ملزوم ہے۔ اس
کے باوجود اسیر شجر سے گہرا ربط و تعلق رکھنا دوا بھی ہے اور عبادت
و ریاضت بھی ہے، نشاط وصل بھی اور وجدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں
دستک کو تیرا ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو



"بیٹا دو دن کا ہو گیا ہے، حسنات اسے دیکھنے کیوں نہیں آیا۔ حیرت کی بات ہے، سائرہ کیا تم دونوں کا آپس میں کوئی جھگڑا چل رہا ہے؟" ماں نے نہایت فکرمندی سے اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد رازداری سے پوچھا کیونکہ وہ اپنی بہو کے سامنے اپنی بیٹی کے کسی بھی مسئلے کو ہوا نہیں دینا چاہتی تھیں۔

"امی، میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ وہ وائس چانسلر کے ساتھ آفیشل ٹور پر امریکا گئے ہوئے ہیں، ایک مہینے بعد اُن کی واپسی ہے، آپ خواہ مخواہ فکرمند ہو رہی ہیں۔ آپ کی عمر ایسی سوچوں اور فکروں سے مقابلہ کرنے کی نہیں رہی۔ سب کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ صرف اور صرف اپنی صحت، خوشی اور اطمینان کا خیال رکھنا سیکھیں۔ آپ ہمارے لیے بہت مقدم ہیں۔ اس کا آپ کو اچھی طرح سے اندازہ تو ہے ہی۔" وہ اپنے تئیں ماں کو مطمئن کر رہی تھی مگر ماں بھی بے حد بے یقین اور مضطرب تھیں، دن میں کئی بار اسے کریدنے کی کوشش کرتیں مگر ہر بار سائرہ نہایت دانشمندی سے سوالات کے جوابات دے کر انہیں وقتی طور پر مطمئن کر دیتی۔

دو ہفتے میکے میں گزارنے کے بعد وہ حسنات کے یونیورسٹی جاتے ہی ڈرائیور کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔ اور یوں حسنات کی اس غیر مناسب اور ناقابلِ قبول حرکت پر سب کے سامنے اس کی عزت رہ گئی اور وہ شرمساری سے بچ گئی۔ بے بی بوائے کے کمرے کی حالت دیکھ کر وہ اسے سینے سے بھینچ کر زار و قطار رونے لگی تھی۔ عمر رسیدہ ملازم جلدی سے اس کے لیے باداموں والا دودھ بنا لایا اور اس کے کمرے میں رکھ کر باہر نکل گیا۔ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کچن کی طرف چل دیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی مالکن کو سمجھائے۔ "اپنے میکے واپس چلی جائے اسے یہاں کس تبدیلی کا انتظار ہے۔ جبکہ ان تلوں میں تیل ہے ہی نہیں۔ پھر یہاں گھٹ گھٹ کر اپنی زندگی گزارنے کی اسے ایسی کون سی مجبوری ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کا فائدہ اٹھائے جبکہ چند دنوں میں خود کفیل ہو سکتی ہے۔ اس پتھر سے سر ٹکرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں خود پاگل خانے ضرور پہنچ جائے گی۔ ہماری ان پڑھ اور جاہل بیٹیاں اِن پڑھی لکھی لڑکیوں سے ہزار گنا زیادہ بہتر ہیں۔ وقت کو پہچانتی ہیں، حالات کے مطابق چلتی ہیں، بیگم صاحبہ کی جگہ میری بیٹی کی اگر اس کے خاوند سے بن نہ پاتی تو وہ نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہ لگاتی۔ اور بہت جلد فیصلہ کر کے ہمیں بتائے بغیر اور مشورہ لیے بغیر بوریا بستر اٹھاتی اور دھڑلے سے ہمیشہ کے لیے واپس آ جاتی ہیں۔ مڈل کلاس میں پیدا ہونا تو سراسر عذابِ الٰہی ہے، اٹھتے بیٹھتے عزت و آن چلے جانے کا خطرہ اور بدنامی و رسوائی کا اندیشہ ہر وقت انہیں سولی پر لٹکائے رکھتا ہے۔ میں اس مالکن کو کیا سمجھاؤں کہ دو روٹی، دو جوڑے کپڑے اور ایک کمرے کی چھت کے حصول کی خاطر خود کو اتنا گرا لیا ہے تم نے کہ تمہارا شوہر تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ تم نے تو پڑھ لکھ کر ہی گنوا دیا۔ لگتا ہے سارا دماغ کتابوں کی نذر کر دیا ہے صاحب کی طرح۔" ستر سالہ ملازم اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں بہت دکھ و کرب سے سوچ رہا تھا مگر سائرہ سے بات کرنے کی جرأت تھی نہ ہی اسے مزید بے نشاں و بے ذات ہونے کے احساس سے اسے اذیت پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے اختیارات میں اس کی خدمت گزاری اور بچے کی نگہداشت میں اس کا ساتھ دینا تو تھا ہی۔ وہ یہ سوچ کر قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔ اور ہمت کو یکجا اور زبان کو مقفل کیے گیراج کی طرف نکل گیا اور بڑے پیار اور خلوص و ہمدردی سے گیراج میں پھینکا ہوا تمام سامان صاحب کے یونیورسٹی سے واپس آنے سے پہلے ہی بیگم صاحبہ کے کمرے میں سلیقے و قرینے سے سیٹ کر دیا۔ اس کی اس حرکت کو دیکھ کر سائرہ کی کچھ ہمت بڑھ گئی تھی۔ وہ خود کو اس گھر میں تنہا اور بے بس محسوس کرنے کی تمام اذیتوں اور تکلیفوں سے باہر نکل آئی تھی۔

"چاچا بتائیں، بیٹا باپ پر ہے کہ مجھ پر؟" نہایت اپنائیت اور لگاوٹ سے اس سے پوچھنے لگی۔

"بالکل باپ کا ٹوٹا ہے جی...... آپ کی تو جھلک بھی نہیں اس میں۔ صاحب بھی تو بہت خالص مردانہ حسن کے مالک ہیں۔ خاص لڑکے والے نین نقش ہیں اس کے۔ بیگم صاحبہ وہاں تو پیدا کرنے اور پالنے کی سزاوار ٹھہرائی جاتی

ہے۔ باقی کے تمام اختیارات تو باپ کے پاس ہوتے ہیں۔ وہی اپنے بچوں کی زندگیوں کے فیصلے کرتا ہے، جس میں ماں کی رضامندی کو پانچ فیصد بھی حصہ نہیں دیا جاتا۔ لیکن بیگم صاحبہ آپ کا معاملہ تو الگ ہے۔ آپ تو بہت زیادہ پڑھی لکھی ہیں۔ ایسی عورتیں اپنی بات منوانے کی ہمت بھی رکھتی ہیں۔ اور فیصلہ کرنے کی حقدار بھی مانی جاتی ہیں۔" وہ ذو معنی طریقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گفتگو کا مدعا سمجھنے میں سائرہ کو ایک لمحہ بھی نہ لگا۔ مگر اس سے مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت کہاں تھی۔

وہ اسی کی کتاب کا کتابی کیڑا ابن کر اس کا پسندیدہ ساتھی اور مخلص دوست کہلا سکتی ہے۔ مگر اپنے نسوانی رول میں وہ نہ تو اس کی ہمدرد ہے اور نہ ہی اس کی سچی ہم سفر۔ "مگر اب میں اس بچے کی قربت میں بے انتہا محفوظ ہوں اور ایک دن اپنی ذات کو منوانے میں بھی ضرور کامیاب ہوں گی اور وہ دن دور نہیں جب اپنی تعلیم کو دوبارہ جاری کرنے میں مجھے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ وقت بھی میری زندگی میں ضرور آئے گا جب تم واپس پلٹو گے اور میں اپنی جوانی میں سہنے والی تمام آزمائشوں کو پسِ پشت ڈال کر تمہیں معاف کر کے سینے سے لگا لوں گی۔ حسنات بس مجھے اسی دن کا انتظار ہے۔ جب تم مجھے مکمل عورت تسلیم کرتے ہوئے فخر محسوس کرو گے اور وہ الفاظ جن کی شدت نے مجھے تمہارا گریبان پکڑنے پر مجبور کیا تھا۔ انہیں واپس لے کر معافی کی عرضداشت لے کر حاضر ہو جاؤ گے۔ تم نے مجھے دکھ و کرب دینے کے لیے یہ نازیبا الفاظ بولے تھے۔ حسنات تم نے یہ غصے میں کہا تھا ناں...... ایک بار مان جاؤ، تم کیا جانو عورت اس بہتان کی خاطر جان لے لیتی ہے، میں نے تو صبر کر لیا۔ ہر زوال کے بعد عروج اور ہر عروج کے بعد زوال نہ آئے تو ہم اپنے رب کی ذات کو کیسے پہچان پائیں؟ اگر ہمیں ہر وقت انعامات سے نوازا جائے تو ہم اس کی یاد میں سجدہ ریز ہو کر اس سے کس معجزے کی بھیک مانگیں گے...... اور پھر اس کی رحمتوں اور عنایات کا کیسے شکر ادا کریں گے۔ جب وہ اپنی یاد سے کسی گناہ گار کو پاک کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے ایک سنہری موقع ضرور دیتا ہے راہِ مستقیم پر آنے کا...... شاید حسنات کو میرا رب اِک چانس دے رہا ہے۔" وہ بے تکان سوچے جا رہی تھی کہ بیٹے کے رونے کی آواز پر چونک اٹھی اور اسے اپنی آغوش میں چھپا کر دودھ پلانے لگی۔ اب سائرہ کو ایک لمحے کے لیے بھی ڈپریشن نہ ہوتی تھی اپنے معصوم اور ننھے منے ساتھی کی رفاقت میں زندگی اتنی شاندار ہو جائے گی۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

دن، ہفتوں اور مہینوں کی مسافت طے کرتے گئے۔ عادل ماں کے زیرِ سایہ پروان چڑھتا رہا۔ حسنات کی جب بھی اس گل گوتھنے بچے پر نظر پڑتی تو وہ نخوت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا کرتے۔ جب اس نے چلنا شروع کیا تو وہ اسٹڈی کا دروازہ کھلتے ہی تیزی سے اندر داخل ہو کر فرشتوں جیسی معصوم مسکراہٹ اور اپنی مخصوص زبان کی کلکاریوں سے اپنی خوشی کا اظہار کرتا تو حسنات اسے غور سے دیکھنے کے بعد اٹھتے اور بازو سے گھسیٹتے ہوئے کاریڈور میں پھینکنے کے سے انداز میں چھوڑ کر دروازہ بند کر لیا کرتے۔ اس کے رونے کی آواز پر سائرہ، حسنات کو خونخوار نظروں سے دیکھتی اور عادل رضا کو اٹھا کر چوم ڈالتی اور سینے سے چپکائے وہ اپنے کمرے میں آ کر حسنات کی سنگدلی ...... اور بے رحمی پر بلک اٹھتی تھی۔ عادل کے حسین بچپن کے ناقابلِ فراموش دن اسی عالم میں بیتے جا رہے تھے۔

جب وہ پلے گروپ میں ماں کے ساتھ جانے لگا تو دوسرے بچوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے سائرہ نے محسوس کیا کہ عادل بہت سہما ہوا بچہ ہے۔ دوسرے بچوں کی نسبت ایکٹوٹیز میں حصہ لینے سے بہت گھبراتا ہے اور دوسرے بچوں میں مکس اپ ہونے سے کتراتا بھی ہے۔ سائرہ کا دن اسکول میں عادل کے ساتھ گزرنے لگا۔ وہ اس کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتی اور اس کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کرتی اور وجہ تو باپ کی عدم توجہی کی صورت میں سامنے تھی۔ گھر کی اس کشیدگی کو دور کرنے کی اس کے پاس کوئی سبیل نہیں تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی فضا کو

تبدیل کرنے کی کوشش کی، کمرے کی دیواریں چارٹ پیپرز سے بھر دیں۔ جہاں عادل طرح، طرح کی تصویریں بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہر طرف بے حساب کھلونے جو وہ اپنی پسند کے خرید کر لایا تھا۔ میوزک، قومی ترانے، بچوں کے نغموں سے کمرے میں رونق کا احساس ہونے لگا۔ اس کا گھر میں دل بہل گیا۔ مگر افسوس کہ عادل اسکول میں سیٹل نہ ہوسکا جبکہ آئی کیو لیول باپ سے بھی ہائی تھا۔ توجہ دیے بغیر تمام نرسری رائمز حفظ کر چکا تھا۔ پینٹنگ کرتا تو رنگوں کا مناسب انتخاب حیران کر دیتا۔ اور قرآن شریف کی تمام چھوٹی، چھوٹی آیتیں قرأت سے ایسے پڑھتا کہ دل باغ، باغ ہو جاتا تھا۔ اپنے کمرے کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر جو ایکٹنگ کرتا اور ایکشنز سے وہ کہیں سے بھی نالائق اور نادان نظر نہیں آتا تھا مگر یہ سب تنہائی میں ہوا کرتا تھا۔ سائرہ بیٹے کی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھی۔ ڈاکٹر ہمایوں سے اس نے اتنی تحلیلِ نفسی تو سیکھ ہی لی تھی اس اچیومنٹ پر وہ بہت خوش تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گھر میں باپ کی نفرت بھری نگاہوں کو وہ خوب پہچانتا تھا۔ ان سے خوف زدہ ہو کر ہفتوں ان کے سامنے نہیں آتا تھا۔ مگر ماں کے ساتھ بدتمیزی اور اسکول میں شرارتوں، ضد اور مار کٹائی سے اپنی اہمیت کو منوانا اسے دلی تسکین دیتا۔ سائرہ جانتی تھی کہ اس کا ایسا بھیانک اور روح فرسا ردِعمل باپ کی بے توجہی و بے اعتنائی کی وجہ سے ہے۔ آخر اسے اپنے اندر کے خوف، ڈر اور توہین کے احساس کو کسی طریقے سے مدھم تو کرنا ہی تھا۔ باپ کی شفقت و محبت کی کمی میں پروان چڑھنے والا بچہ نارمل کیسے ہوسکتا تھا۔ کبھی، کبھی چیزوں کی توڑ پھوڑ، کتابوں کو پھاڑنا، رنگوں کو فرش پر رگڑنا اس کے اندر اٹھنے والی شوریدگی کی غمازی کرتی تھی۔ یک لخت اس کے ذہن پر اپنی بدبختی کے ہمراہ بیٹے کے مقدر کی تاریکی اور نا امیدی نے ایسے کچوکے لگائے کہ وہ اس کے مضبوط حال اور روشن مستقبل کے لیے ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار تھی۔ جس کے لیے اس نے ابھی سوچا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اپنا تمام وقت بیٹے کی نذر کرنا چاہتی تھی۔

''کیا میں اپنے رب کی اس وسیع و عریض زمین پر اپنے لیے ایک کمرے کا گھر نہیں لے سکتی۔ جہاں میرا بچہ باپ کی نفرت انگیزی سے بچ کر ایک مکمل انسان بن سکتا ہو، بروکن فیملی کے بچے ذہنی طور پر نارمل کیوں نہیں رہتے؟ ان کی ذہنی ہیجان انگیزی اور جذباتی ردوکد میں ہر پل اضافہ کیوں ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ لوگوں سے آنکھ ملا کر بات کرنے سے کیوں گھبرانے لگتے ہیں۔ ان میں خوشی، فتح مندی کا احساس کم مگر تنہائی اور اکیلے پن کا جان لیوا درد کا لیول اتنا ہائی کیوں ہوتا ہے؟ چاہے انہیں رحم دلانہ طور پر گرد و پیش کے ماحول سے ٹوٹ کر پیار کرنے والے... بے حساب لوگ کیوں نہ مل جائیں۔ وہ بھرپور مطمئن نہیں ہو پاتے۔'' تمام راز وقت نے اس پر وا کر دیے تھے۔ آج اسے یقین ہو چلا تھا کہ ماں اور باپ دونوں کا مل کر بچوں کو پروان چڑھانا کتنا اہم ہے۔ عادل کو باپ کا پیار ماں کی طرف سے دینے کی تگ و دو ناکام ہوتی معلوم ہو رہی ہے۔ ''تو کیا کروں؟ کون سی قربانی دے ڈالوں کہ میرے بچے کے لیے زندگی کی ہر کامیاب راہ کھل جائے اور منزلِ مقصود خوش آمدید کہنے کے لیے بے چین ہو جائے۔'' بچے کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیا جائے۔ آج کے بعد میں اس کے ساتھ اسکول نہیں جاؤں گی...... یا گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا جائے یا نامکمل تعلیم کو مکمل کرنے کا فیصلہ کیا جائے، گھر چھوڑنے کے نقصانات کا پلڑا بہت بھاری تھا۔ وہ اپنے بچے کو خاندان سے الگ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کے فوائد کا پلڑا تو اسے اتنا بھاری لگا کہ فیصلہ کرنا آسان ہو گیا اور اس کے اندر انوکھی سی توانائی بھر گئی۔

سائرہ اپنی پڑھائی میں اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ وہ عادل کی ضد کے باوجود اسے پارک لے جا سکتی تھی نہ ہی چڑیا گھر اور نہ ہی اسے کہانیوں سے بہلانے کا اس کے پاس وقت تھا۔ وہ اسے عام بچے کی طرح ٹریٹ کر کے اسے نارمل کرنا چاہتی تھی۔

ایک دن وہ یونیورسٹی سے واپس آئی تو عادل مع آیا کے غائب تھا۔ پوچھنے پر ملازم نے انکشاف کیا کہ وہ آج

صاحب کے ساتھ کہیں باہر گیا ہے، سائرہ کی حیرت کے ساتھ پریشانی اور فکر مندی کی انتہا نہ تھی کیونکہ یہ معجزہ پانچ سالوں میں پہلی بار رونما ہوا تھا۔ مگر دل کی کچھ مثبت امیدوں میں تجسس و اشتیاق بھی عروج پر تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ عادل اور حسنات ابھی تک واپس نہ آئے تھے۔ دور سے گاڑی کو آتا دیکھ کر اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ گاڑی پورچ میں رکی تو سائرہ تیزی سے عادل کی طرف کا دروازہ کھول کر حسنات کی طرف دیکھ کر بولی۔

''اتنی دیر کہاں لگا دی۔ فکر مند ہو گئی تھی میں...... فون ہی کر دیا ہوتا۔ آپ ماں کے دل کو تو جانتے ہیں، حد ہی کر دی۔''

حسنات نے جواب دیے بغیر گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے۔ لمبے لمبے قدم بھرتے ہوئے گھر کے داخلی دروازے کو کھول کر اندر چلے گئے۔ سائرہ نے بے بسی سے گردن کو جھٹکا دیا اور بالوں کی پونی ٹیل بناتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی۔ ''کبھی تو میری امید و آس بھرے پیمانے کو سلامت رہنے دو، مجھے خوش فہمیوں کا شکار ہونے دو۔ تمہارا کیا جاتا ہے حسنات، تم تو پتھر ہو میں تو موم اور کانچ سے بنی ہوئی عورت ہوں۔ مجھے ہر بار توڑنے کے بجائے اپنی محبت و چاہ کی شدت و حدت سے پگھلا کر اپنے سانچے میں ڈھال لو اب تو زمانے کے نشیب و فراز نے مجھے اس بچے کی خاطر اپنی شیپ بدلنا سکھا دیا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے سوچ جا رہی تھی۔ عادل کو جھک کر پیار کیا اور مری ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟''

''ڈیڈی مجھے گھمانے لے گئے تھے۔ ممی بہت مزہ آیا۔ ڈیڈی کو ہنسنا آتا ہے، آپ کی طرح بولنا بھی آتا ہے۔ مجھے مزہ آیا۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''اور کیا، کیا میری جان نے؟'' وہ اس کی باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

''ڈیڈی نے یہ ایروپلین لے کر دیا تو میں نے انہیں کہا کہ مجھے اصلی جہاز خرید کر دیں۔'' وہ ڈبا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ممی، آپ کو اصلی جہاز میں بٹھا کر یہاں سے بہت دور لے جاؤں گا۔''

''ارے ڈیڈی کو یہاں اکیلا چھوڑ کر مجھے کہاں لے جاؤ گے؟'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو اپنا گھر اور تمہارے ڈیڈی بہت یاد آئیں گے۔''

''میں آپ کو لے جاؤں گا۔ پریوں کے دیس میں ممی، ڈیڈی نے مجھے پریوں کے دیس کی کہانی سنائی ہے۔ وہاں ڈھیر سارے کھلونے بھی ہیں اور مزے کی بات کہ وہاں اسکول نہیں ہے۔ میڈم ہے نہ ہی لڑائی جھگڑا کرنے والے بدتمیز بچے۔'' وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولا۔

''ممی ہم ڈیڈی کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔ وہاں میرا الگ کمرا ہوگا۔ اور آپ اور ڈیڈی کا ایک الگ کمرا۔ ممی یہ بھی تو ہوسکتا ہے وہ حماد تو بتا رہا تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی اور ممی کے درمیان میں کبھی سوتا ہے میں بھی آپ لوگوں کے درمیان میں سوؤں گا، ممی کتنا مزہ آئے گا۔ ایک طرف آپ اور ایک طرف ڈیڈی۔''

''ٹھیک ہے بیٹا ہم جب بھی پریوں کے دیس جائیں گے۔ ایسا ضرور کریں گے۔'' وہ آہ کو دباتے ہوئے بولی اور دروازے کی طرف چل پڑی۔

''پھر ممی میں بھی ایک پری سے شادی کروں گا۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''پری تو بہت خوب صورت ہوتی ہے اور پیار کرتی ہے، گانا سناتی ہے، ڈانس بھی کرتی ہے۔''

''اگر پری نے تم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تو؟'' وہ ذرا سا مسکرائی۔

''تو پھر... پھر کیا کروں گا؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا اور سائرہ کے ساتھ اندر آتے ہی اسٹڈی کی طرف بھاگ گیا۔

حسبِ معمول اسٹڈی کا دروازہ بند دیکھ کر ندامت اور اضطراری کیفیت میں ماں سے بولا۔

''ممی! لگتا ہے ڈیڈی پھر سے پڑھنے لگے ہیں۔ انہیں نہ جانے کیا مسئلہ ہے، کبھی تو ہمارے ساتھ کھانا کھالیں، آپ کو مارکیٹ لے جائیں، مجھے پارک لے جائیں، میرے ساتھ مووی دیکھیں۔''

''سب ایسے ہی ہوگا بیٹا، ابھی وہ بزی ہیں۔'' وہ اسے بازو سے پکڑتے ہوئے بولی۔ ''میں جو تمہارے ساتھ ہر گیم کھیلتی ہوں۔ جو تم چاہتے ہو پھر ڈیڈی کی کمی تو محسوس نہیں ہونی چاہیے ناں۔''

''ممی مجھے کتابیں اچھی نہیں لگتیں۔ انہوں نے ڈیڈی کو ہم سے دور کردیا ہے۔ میرے دوستوں کے ڈیڈی ایسے بورنگ نہیں ہیں۔ ممی وہ مجھے اپنے ڈیڈی اور ممی کی کہانیاں سناتے ہیں۔'' وہ حیرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس آپ کی تو بے شمار کہانیاں ہوتی ہیں مگر ڈیڈی کی کوئی کہانی نہیں ہوتی۔''

''کتابیں تو ہماری دوست ہوتی ہیں، میری جان۔ ان کے بغیر زندگی ادھوری ہے، اس لیے تمہاری ممی نے دوبارہ پڑھنا شروع کردیا ہے۔ بچوں کو بھی اس لیے ہی اسکول بھیجا جاتا ہے کہ ان کی شخصیت میں ان کتابوں کی وجہ سے نکھار آجائے۔ ورنہ انسان اور جانور میں فرق ہی نہ رہے۔ عقل و شعور اور احساسات ہی نہ ہوں۔'' وہ عادل کے خیالات سن کر خوف زدہ سی ہوکر اسے پیار سے سمجھانے لگی۔

''آپ بھی جب سے یونیورسٹی جانے لگی ہیں۔ مجھے کہانی سنانا، لوری سنانا اور میرے ساتھ کھیلنا کودنا سب چھوڑ دیا ہے۔ ممی کتابیں دوست نہیں دشمن ہوتی ہیں۔ مجھے نفرت ہے ان سے ممی۔'' وہ چڑ کر بولا اور اپنے کمرے کی طرف بھاگ گیا۔

''او مائی گاڈ......!'' وہ سر پکڑ کر وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔

اسے پانچ سالہ بچے سے ایسے ری ایکشن کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ اسے بہت معصوم اور بہت نادان اک چھوٹا بچہ تصور کرتی تھی مگر وہ تو اس کا اور اپنے باپ کا بھی باپ نکلا تھا۔ وہ بے دم سی ہوکر وہیں صوفے پر ڈھے گئی۔

☆☆☆

حسنات دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی اسٹڈی میں کتابوں کے انبار میں گھرے بیٹھے تھے۔ چہرے پر تجسس اور آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ کافی غور و خوض کے بعد ڈارون کی تھیوری کو انڈر لائن کرنے کے بعد پہلے مولانا عنایت اللہ مشرقی صاحب کی کتاب ''تکملہ'' اور پھر جی ایم سید صاحب کی کتاب ''جیسا میں نے دیکھا'' کی ورق گردانی کرنے لگے۔ کچھ نہ سمجھنے کے بعد جب ذہن متذبذب ہونے لگا اور دلی کیفیات بھی الٹ پلٹ ہوئیں تو علامہ اقبال کی صوفیانہ شاعری سے خود کو بہلانے لگے۔ دل کو ایسی تقویت پہنچی کہ پھر دیوانِ غالب کی عاشقانہ شاعری پڑھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں ہنستے چلے گئے گویا ایک کے بعد ایک نثر اور پھر اعلیٰ پائے کی شاعری پڑھ کر بھی دماغ اپنی ہی ڈگر پر سوچتا رہا۔ سائرہ ان کے لیے کافی کا مگ اٹھائے اندر داخل ہوئی تو وہ ایک دم سے سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور مگ پکڑتے ہوئے بولے۔

''بیٹھو۔'' لہجہ تحکمانہ تھا۔ وہ ان کے قریب ہی رکھی کرسی پر بیٹھ کر حیرت و اشتیاق سے انہیں دیکھنے لگی۔ ان کے ہاتھ میں غالب کا دیوان دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرائی۔

''سائرہ! یہ غالب صاحب کیسی انہونی اور سطحی شاعری کرتے ہیں۔ بھلا عشق و محبت میں کوئی باہوش انسان ایسی حرکتیں کرسکتا ہے؟'' وہ کافی کا سپ لیتے ہوئے بولے۔ سائرہ خاموش رہی تو ایک دم سے تنک کر بولے۔

''تمہیں میری ایسی باتوں سے کوئی اتفاق نہیں ہوسکتا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔'' لہجہ ایسا تھا کہ تم اَن پڑھ کیا جانو پڑھے لکھوں کی باتیں۔

''میں آپ کے پاس کام کے لیے ہی آئی ہوں۔ تھوڑا سا وقت مجھے بھی عنایت کردیجیے۔'' وہ نہایت نرم لہجے میں بولی۔

''میں تمہارے ہاتھ میں کافی کا مگ دیکھ کر ٹھیک ہی سمجھا تھا...... بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟ ایسا کون سا کام ہے جس میں میری ضرورت محسوس ہوئی ہے؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولے۔

''عادل کی طرف سے پریشانی ہے۔ مسئلہ خود سلجھانے کی کوشش کرتی رہی ہوں مگر اب معاملہ میرے قابو سے باہر ہوچکا ہے۔ آپ کو انفارم کرنا ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ بیٹے کے مستقبل کا سوال ہے۔ باپ کی توجہ اور رفاقت ہمیشہ سے ہی اولاد کے لیے بہترین ٹانک ہے۔ جس سے وہ محروم رہا مگر حسنات اب مجبوری ہے۔''

''مسئلہ بتاؤ، ایک تو عورت پہلے تمہید باندھ کر مرد کو قابو کرنے سے باز نہیں آتی۔ اب بول چکو مجھے اپنا کام کرنا ہے۔'' وہ نخوت سے بولے۔

''عادل کی توجہ پڑھائی کی طرف نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی نالائقی کی وجہ سے اس کے کلاس فیلوز مذاق اُڑاتے ہیں اور ٹیچرز بھی کئی مرتبہ شکایات کرچکے ہیں کہ وہ روز بروز بدتمیز، شرارتی اور جھگڑالو ہوتا جارہا ہے۔ گھر پر بھی ذرا سی ڈانٹ پر توڑ پھوڑ شروع کردیتا ہے، کتابیں پھاڑ دیتا ہے، چیزیں پھینک دیتا ہے۔'' بولتے، بولتے اس کی آواز دکھ و کرب سے بھرّا گئی تھی۔

''اس بارے میں حسنات علی رضا کیا کرسکتا ہے؟'' وہ سر ہلا کر طنزیہ لہجے میں بولے۔

''میں بتاتی ہوں، عادل کے والد صاحب اس بار پیرنٹس ٹیچرز میٹنگ اٹینڈ کرنے جائیں گے شوقیہ نہیں مجبوراً۔'' وہ ایک دم سے سنبھل کر خود اعتمادی سے بولی۔

''اس کا فائدہ؟'' وہ عینک درست کرتے ہوئے بولے۔

''اسے اس وقت باپ کی طرف سے سیکیورٹی کی یقین دہانی چاہیے۔ جب بچے کا کانفیڈنس لیول لو ہوجاتا ہے تو پھر وہ ایسی حرکتیں کرکے لوگوں کی نظروں کا محور بننا چاہتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ حد درجہ مصروف انسان ہیں۔ آپ کے وقت میں عادل اور اس کی ماں کہیں بھی فٹ نہیں ہوسکتے پھر بھی عرض کرتی ہوں کہ اپنی نسل اور اپنے نام و نمود کی خاطر اپنے قیمتی وقت میں سے ایک گھنٹا نکال لیجیے۔ بچے کے مستقبل کے لیے یہ قیمت اتنی بڑی نہیں۔ فقط ایک گھنٹے کا سوال ہے۔'' سائرہ کا لہجہ التجائیہ اور کرب ناک تھا۔ حسنات نے عینک کے موٹے شیشوں سے ناگواری سے دیکھا اور کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے۔ جیسے نہ کچھ سنا ہے نہ ہی آنکھوں نے اس ماں کے دکھ درد کو دیکھا ہے۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔ لہجے میں کچھ بیزاری تھی۔

''حسنات میں یہاں دیواروں سے اپنا مسئلہ ڈسکس کرنے نہیں آئی۔ ورنہ اس گھر میں در و دیوار کی کمی تو نہیں، میں ایک جیتے جاگتے، دانش مند اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان کے حضور اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں جو اس بچے کا حقیقی باپ ہے۔''

''تم بذاتِ خود بے حد عقل مند ہو۔'' وہ بھی طنزیہ مسکراہٹ سے بولے۔

''ہوں...... وہ تو خیر میں ہوں۔ تسلیم کرنے کا شکریہ۔'' وہ نادم ہونے کے بجائے بڑی خود اعتمادی سے بولی۔ ''آپ کو اہمیت دے رہی ہوں باپ ہونے کے ناتے۔'' ایک دفعہ پھر اس نے جتایا۔ حسنات نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

''آپ اب بھی آنکھیں بند اور سوچ پر تالے لگائے بیٹھے ہیں، کیا آپ کو اپنی بے رخی و بے اعتنائی کے نتائج نظر نہیں آرہے مگر شاید آپ کی سوچ وہاں تک پہنچ ہی نہیں پارہی، چلیں میں آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ عادل اگر کسی

بری صحبت میں پڑ گیا تو بدنامی و رسوائی آپ کے خاندان کی ہوگی۔ اس کے نام سے آپ اس کی خاندانی پہچان ہٹا نہیں سکتے۔ خدا کے لیے آنے والے جان لیوا اور بھیانک وقت کا تجزیہ کیجیے اور عادل کا سایہ بن جائیں ورنہ سوائے پچھتاوے اور خلش کے ہمارے پاس اور کوئی دوسرا رنگ نہ ہوگا۔" وہ ان کی عدم توجہی کے بھیانک نتائج ان پر عیاں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ویسے اس کا خاندانی نام تبدیل کرنے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ سنجیدگی سے بولے۔ ان کا واضح اشارہ ڈاکٹر ہمایوں کی طرف تھا۔ سائرہ ڈھیٹ تو ہو ہی چکی تھی ایسی باتیں سننے کی عادت سی ہوگئی تھی سو خاموش ہی رہی۔ "تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔" وہ آہستگی سے بولے اور پھر کتاب میں گم ہوگئے۔

"حسنات، تو کیا آپ کی طرف سے انکار سمجھوں یا؟" حالانکہ حسنات کی گفتگو کا لبِ لباب سمجھنا مشکل نہ تھا پھر بھی وہ امید و بیم کی کیفیت میں تھی۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گا، اب تم سمجھ گئی ہوگی کہ مجھے بچے پسند کیوں نہیں، مجھے ان سے نفرت کیوں ہے؟ زندگی کے ہر، ہر لمحے پر ان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ نہ زندگی اپنی رہتی ہے نہ ہی مشاغل اپنے رہتے ہیں۔ آج کل کے بچے ویسے بھی بہت نرالے ہیں ہمارے وقتوں میں نہ تو یہ فضولیات پیرنٹس ٹیچر میٹنگز ہوتی تھیں نہ ہی کبھی والدین نے ہماری زندگی میں دخل اندازی کی،...... کیا ہم پڑھ لکھ کر اتنے بڑے انسان نہیں بنے؟ آج کل کے دور میں ایک بچہ بھی قیامت ہے۔ عذابِ الٰہی ہے' پارک سے گزرتے ہوئے وہاں بچوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ شیطانی مخلوق کسی شیطان کی نسل سے تعلق رکھتی ہے گلے میں پھنسی ہڈی کے مانند۔" ان کے لہجے میں سخت ناگواری تھی۔

"حسنات ایسے تو مت کہیے۔ میرا تو دل بیٹھنے لگا ہے اللہ اور اس کے رسول پاک بھی خفا ہوں گے۔ آئندہ ایسی ناشکری کی بات زبان پر لانے سے پہلے اپنے پیارے رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کے بارے میں سوچ کر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے گا جنہیں بچوں سے والہانہ محبت تھی اور ان کے جذبات کا خیال رکھنے میں بھی آپؐ بے مثال تھے۔" وہ جزبز سی ہو کر بے اختیاری سے بولی۔

"سائرہ بیگم، مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم مجھے درس دینے آئی ہو۔ بہت کچھ جانتی ہو ناں تم۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولے۔

"حسنات میری یہ مجال کہ اتنے پڑھے لکھے کتابی کیڑے اور کمپیوٹر وائرس کو درس دوں، اٹ از امپاسبل۔" وہ بھی طنز سے بولی تو وہ اس کے جواب پر تڑپ کر رہ گئے۔ جس کتاب کا مطالعہ کیا جا رہا تھا اسے بند کیا اور سامنے ہی ٹیبل پر پٹخ دیا۔ سائرہ قدرے لرزی مگر بظاہر خود اعتمادی سے میٹھی چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ بکھیرے انہیں دیکھ کر یہ محسوس کروانے کی کوشش کرنے لگی کہ "تم اتنی تنہائی، خاموشی اور یکسانیت کے ماحول میں ذہنی مریض بن چکے ہو جو اپنے ہی بیوی اور بچے کو کچوکے لگا کر خود کو مطمئن اور خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہو۔ اجی پاگل پن کب آئے گا کہ ہماری جان چھوڑ دو گے اور اپنے کپڑے پھاڑ کر ویرانوں اور صحراؤں میں سکونِ قلب کی خاطر نکل جاؤ گے۔ تم جیسا ڈھیٹ، سخت جان اور سنگ دل انسان میں نے دیکھا ہی نہیں۔ ذہنی طور پر لاغر اور کمزور انسان دوسروں کے خون سے ہی تو جسمانی قوت لیتا ہے۔" اسے اتنی گہری سوچ میں دیکھ کر حسنات نے ایک اور زہریلا تیر چھوڑا۔

"امید ہے اب تمہیں میری اس ڈیمانڈ کی قدر تو خوب آئی ہوگی کہ میں بچہ...کیوں نہیں چاہتا تھا۔ اگر اب بھی تم اپنی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے کچھ سمجھنے سے قاصر ہو تو میں آخری بار پھر تمہیں تفصیلاً بتائے دیتا ہوں۔ میں بچے کو اپنے انمول اور پرائم ٹائم سے ایک سیکنڈ بھی نہیں دے سکتا تھا اس لیے تم سے بار بار ریکویسٹ کرتا رہا۔ تم نے ایک نہ سنی، مجھے دھوکے اور فریب میں رکھا اور پھر دیدہ دلیری کی انتہا دیکھو کہ مجھ سے ہی اتنا بڑا المیہ چھپایا گیا۔ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ ایسا کون سا احساسِ جرم تھا جو بروقت اظہار کرنے کے درمیان رکاوٹ بن رہا تھا؟"

"مجھے کسی قسم کا احساسِ جرم نہ تو اس وقت تھا نہ ہی آج ہے۔ میں نے اپنے تئیں سو فی صدی درست فیصلہ کیا تھا۔" وہ تنک کر بولی۔

"مجھے اس بات پر نہ تو پہلے بھروسا تھا نہ ہی آج ہے۔ شوہر کا شک تو ایسا پائدار اور زندہ جاوید رہنے والا ہوتا ہے...... رہتی دنیا تک محوِ گردش رہتا ہے۔ مجھے آج بھی یقین کی حد تک شک ہے ورنہ مجھ سے پردہ داری کیونکر ہوتی۔ تمہارا یہ جرم ناقابلِ معافی ہے۔ اس لیے اس بچے کی تمام تر ذمے داری صرف اور صرف تمہاری ہے۔ تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے مجھے اس بچے سے شدید نفرت ہے۔ میں نے اسے قریب کرنے کی کوشش میں خود پر جبر کیا تھا مگر یہ نفرت محبت میں بدل نہ سکی۔ مجھے بچے پسند ہی نہیں ہیں۔ اب سائرہ بانو تم جانو اور تمہارا بچہ جانے۔ میں اس کی خاطر اپنی زندگی خراب نہیں کر سکتا۔ لائف از ٹو شارٹ میں اس کا ہر لمحہ یوزفل بنانا چاہتا ہوں۔" وہ کاٹ دار لہجے میں بولے۔

"آپ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر قسم اٹھائیں کہ سچ مچ آپ کو میرے کیریکٹر پر ابھی تک شک ہے؟ کیا آپ کا دل مانتا ہے کہ عادل آپ کا بچہ نہیں ہے۔ مجھے آپ کی اس الزام تراشی پر یقین نہیں آ رہا۔ سائنس کی ترقی سے فائدہ اٹھائیں آپ تو پڑھے لکھے ہیں سب سامنے آ جائے گا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "آپ کا انتقام کس قدر گھٹیا ہے حسنات۔"

"اس فضول بحث مباحثے کا حاصل کیا ہوگا تم سمجھدار ہو سب جانتی ہو پھر بھی تمہاری یاد دہانی کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ تم میری بات پر غور کرنا کہ سچ کہہ رہا ہوں۔ تم نے دنیا والوں کے سامنے جو میچ بنا رکھا ہے وہ چکنا چور ہو جائے گا اور اس معاشرے میں تمہیں اور تمہارے بچے کو جس نام سے پکارا جائے گا وہ سننا تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ میری زبان کو بند ہی رہنے دو اس میں تمہاری بہتری ہے۔ میرا نہ تو کوئی نقصان ہے نہ ہی فائدہ کیونکہ دنیاداری اور وضع داری کے اصولوں کی تم پجاری ہو میں ہرگز نہیں۔" وہ کرختگی سے بولے۔

"مجھے یہ سب سن کر بھی یقین کیوں نہیں آتا...... شاید مجھے آپ سے اچھے گمان ہیں۔ حسنات اگر میں بدکار اور بدچلن ہوتی تو آپ کو چھوڑ کر کب کی جا چکی ہوتی۔ یہ ایک شریف اور پاک دامن عورت کی نشانی ہے کہ جیسی زندگی آپ نے مجھے سونپی اسی پر صبر و تحمل کیے بیٹھی ہوں۔ آپ سے کبھی گلہ شکوہ نہ کیا کبھی اپنے دل کا دکھڑا نہ رویا، کبھی اپنی حسرت زدہ زندگی کا اظہار نہ کیا اور آپ کی خدمت گزاری، وفاداری اور خاطر جوئی میں کمی نہ آنے دی پھر بھی آپ کو میرے کردار پر شک ہے؟ اللہ سے ڈریں حسنات کہیں ہم کسی بڑے امتحان کا شکار نہ ہو جائیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"جاؤ اس دن کا انتظار کرو۔ تم تاقیامت میرے دل کو بدل نہیں سکتیں۔ اگر بچہ میرا تھا تو مجھ سے پردہ داری کیوں؟ میں نے اس بات کو کبھی دہرایا نہیں تو یہ مت سمجھو کہ میں وہ بھول گیا ہوں۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ خمیازہ معصوم بھگت رہا ہے۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

"اللہ تعالیٰ نے میانہ روی کو کیوں پسند فرمایا ہے؟ آپ کو اس کی سمجھ ہے کہ نہیں۔ ان کتابوں اور ہماری زندگی کو بیلنس کرنا سیکھ لیتے تو یہی آپ کی عبادت و ریاضت تھی۔ اگر یہ بچہ ڈاکٹر ہمایوں کا ہوتا تو میرا اس سے رابطہ استوار ہوتا۔ میں آپ کے چرنوں میں بے وقعت ہو کر نہ پڑی ہوتی۔" وہ جارحانہ انداز میں بولی۔

"پلیز تم یہاں سے چلی جاؤ، مت تنگ کرو۔ آئی ہیں مجھے تبلیغ دینے ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو پھر مجھے میانہ روی کا لیکچر دینا۔ بہتر ہے خاموشی سے ایک کونے میں پڑی رہو ورنہ اس کے اثرات تمہارے بیٹے کو لے ڈوبیں گے۔" وہ گرج دار آواز میں بولے۔ "جاؤ اس بے گناہ کی بہترین اور خوش حال زندگی کی دعائیں مانگو اور اپنی بخشش کی التجا کرو بس میری جان بخش دو۔" وہ زور سے بولے۔

"کسی بھی معاملے میں حد سے تجاوز کرنے والے لوگ آپ جیسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ کے بیٹے پر اسی کے

اثرات ہیں جو پڑھائی سے ہی بھاگ گیا ہے۔ آپ کی ان کتابوں نے آپ کی ہی نسل کو گھن کی طرح چاٹ لیا ہے۔ یہ آپ کا خون ہے، آپ اچھی طرح جانتے ہیں صرف اس کی ذمے داری سے بھاگنے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے آپ نے۔ خدارا اس خول سے باہر نکل کر دیکھیں، اِک دنیا آباد ہے اور اس حسین دنیا میں آپ کا بچہ ہاتھ پھیلائے آپ کی محبت و شفقت کا طلب گار ہے۔ حسنات آپ کی دشمنی مجھ سے ہے ناں، میں اسے اپنے نصیب کا حصہ سمجھ کر قبول کرتی ہوں پر آپ بچے کی زندگی تباہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ حسنات اب بھی وقت ہے سنبھل جائیں اور اسے سینے سے لگا لیجیے۔ آخری بار التجا کر رہی ہوں۔ آج کے بعد یہ بھکارن کشکول اٹھا کر آپ کے سامنے نہیں آئے گی اور میں اسے آپ کی جتنی ڈگری دلانے والا چیلنج قبول کرتی ہوں۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

''جاؤ میرے عبرت ناک انجام کا انتظار کرو۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولے۔ ''اور اس نالائق کو میٹرک بھی کروا لو تو مان جاؤں گا۔ پی ایچ ڈی کرنا مذاق نہیں۔'' انہوں نے طنزیہ نشتر چلانے کے بعد اپنی تمام تر توجہ کتاب کی طرف مبذول کرلی۔ سائرہ تھوڑے توقف کے بعد وہاں سے اٹھ گئی۔ اپنے کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ عادل، حسنات کی پورٹریٹ پر جوتے مار رہا تھا اور ساتھ وہ تمام مغلظات جو اسکول کے بچوں سے سنی تھیں اور ذہن پر نقش تھیں بولے جا رہا تھا۔

''عادل یہ کیا کر رہے ہو بیٹا؟ تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔ مت کرو اتنی فضول باتیں، تم ایک قابلِ عزت باپ کی اولاد ہو، ہوش میں آؤ۔'' وہ اس کے ہاتھوں سے جوتے پکڑتے ہوئے چیخ کر بولی۔ ''بدتمیز کہیں کا میں نے تمہیں یہ تربیت تو نہیں دی تھی۔''

''ہاں، میں پاگل ہوگیا ہوں مجھے پاگل خانے بھیج دیں۔ میں اس گھر میں ایک پل کے لیے بھی رہنا نہیں چاہتا۔'' وہ معصوم غصے میں چیختے ہوئے سسکیاں بھرنے لگا۔ آخر تھا تو بچہ ماں کا مقابلہ زیادہ دیر کرنے سے قاصر رہا۔

''کچھ بتاؤ گے یا ایک تھپڑ رسید کروں۔'' وہ اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر بولی۔ ''ہوش میں آؤ اور رونا بند کرو۔'' وہ کافی دیر اپنا سر پکڑے وہیں کھڑی رہی پھر کچھ توقف کے بعد عادل کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''میرا لعل اتنا ڈسٹرب کیوں ہوگیا ہے؟ بولو میری جان تمہاری ممی تم پر قربان...... کچھ بتاؤ تو کیا ڈیڈی نے کچھ کہا ہے؟'' وہ ماں کے پیار بھرے لہجے کو محسوس کر کے ماں کے گلے لگ کر زور، زور سے رونے لگا۔ اسے ایک دم سے خدشہ ہوا کہ کہیں اس نے آج کی گفتگو تو نہیں سن لی۔ اگر ایسا ہوا ہے تو اس کے نتائج درست نہیں ہوں گے۔ کچھ حقیقتیں عادل پر خود ہی عیاں کر دینی چاہیے تھیں ورنہ اس پردہ داری کو یہ بھی باپ کے جیسا رنگ دے سکتا ہے۔ وہ یہ سوچ کر کرید نے کے انداز میں بولی۔

''ڈیڈی نے کچھ کہا ہے؟ وہ تو بہت اچھے ہیں۔''

''آئی ہیٹ ہم ہی از......'' وہ بے حد غصے میں الٹا سیدھا بولنے لگا۔

''کیوں بھئی، انہوں نے ایسا کیا ظلم کر دیا ہے کچھ بولو تو میرے بچے؟'' وہ بدستور نرمی سے بولی۔

''ہی از نو بڈی وہ مجھ سے کیونکر بات کریں گے۔'' وہ چیخ کر بولا۔

''انہوں نے تمہیں کچھ نہیں کہا پھر ایسی بدتمیزی کیوں...... اگر وہ تمہیں تھپڑ بھی لگا دیں تو تمہیں ان سے آنکھ اٹھا کر سوال کرنے کا حق نہیں۔ اگر آئندہ ایسا کیا تو تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر دور چلی جاؤں گی۔'' وہ اسے جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ''تم نے تو حد ہی کر دی، پریشان ہوگئی ہوں میں...... اپنی عمر دیکھو اور ایسی باتیں۔''

''ممی سب کے ڈیڈی میرے ڈیڈی جیسے نہیں ہیں۔'' وہ قدرے سہم کر بولا۔ ''آپ میری بات کیوں نہیں مانتیں؟ کیا آپ کے ڈیڈی میرے ڈیڈی جیسے تھے؟''

''پر سب کے ڈیڈی تمہارے ڈیڈی کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تو نہیں ہیں ناں۔ ڈیڈی کا ایک نام ہے۔ ڈیڈی ہم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں وہ طبعاً اپنے پیار کا اظہار نہیں کرتے۔ میں نے ان کی اس عادت کو درگزر کر دیا ہے تو تم بھی دل بڑا کرلو۔ ان کے پیار کو سمجھنے کی کوشش کرو، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کی شان میں گستاخی کی جائے۔ بُری، بری باتوں سے نوازا جائے۔ وہ بہت نیک اور بہت پیارے انسان ہیں۔ دیکھو انہوں نے ہمیں کبھی کسی چیز کی کمی نہیں آنے دی۔ ایک، ایک پائی کی میں مالک ہوں۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ ہمیں ان کی عادت، رویے اور سلوک پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ہیڈ آف دی فیملی ہیں بیٹا۔ تمہیں ان کا مقام اور مرتبہ سمجھنا چاہیے۔ آج کے بعد تم محتاط رہنا۔ ورنہ یہ ممی بھی اپنی زندگی میں مصروف ہو جائے گی تمہیں اپنے وقت میں سے ایک لمحہ بھی نہیں دے گی۔'' وہ سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگی اور پھر حسنات کی پورٹریٹ کو اٹھا کر سینے سے لگا کر ایک دم بولی۔

''عادل اپنے ڈیڈی کے یخ بستہ رویے میں ان کی محبت و شفقت کی حدت و تپش کو محسوس کرو۔ تمہارے تمام گلے شکوے ختم ہو جائیں گے۔''

''ممی میں کیا کروں، مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی؟'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''مجھے ڈیڈی اچھے بھی لگتے ہیں اور برے بھی کیونکہ وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔''

''تم ڈیڈی کو اپنی اکیڈمک رپورٹس بہترین کر کے دکھاؤ۔ سب درست ہو جائے گا۔ انہیں حاصل کرنا چاہتے ہو تو ان کی طرح کتابوں کو اپنا دوست بنا لو۔ یہ کون سا مشکل کام ہے تمہارے لیے...... تم تو اپنے ڈیڈی سے ذہانت و لیاقت میں دس ہاتھ آگے ہو۔ بس تھوڑی محنت کی ضرورت ہے۔'' وہ اس کے سر پر پیار سے بوسہ دے کر بولی۔ ''تم تو اپنے دادا اور پردادا کی طرح بہت دور اندیش اور لائق فائق بچے ہو۔ یہ بات سمجھنا تمہارے لیے مشکل نہیں۔ ان کی پختہ عادات کو بدلنا بہت مشکل ہے پھر کڑھنے اور اشتعال انگیزی کا کیا فائدہ ہوا۔ ہمارا اپنا نقصان ہے۔ میری طرح ذہن سے کام لو دل کی ہر بات سننا چھوڑ دو، خوش رہنے لگو گے۔''

''آئی ہیٹ بکس ممی۔ آپ بھی چھوڑیں اپنی تعلیم، اس کا فائدہ ڈیڈی کی پرسنالٹی میں تو نظر نہیں آیا۔ آپ پر اس کے پازیٹو اثرات کیسے ہو سکتے ہیں؟'' وہ تلخی سے کہہ رہا تھا۔

''اس وقت تم کسی پاگل اور دیوانے سے کم نہیں لگ رہے ہو۔ تمہاری بے وقوفانہ اور جاہلانہ باتیں مجھے پریشان کرنے لگی ہیں۔ اٹھو جاؤ لاؤنج میں جا کر موی لگا لو جب تمہارا دماغ درست ہو جائے تو پھر میرے پاس چلے آنا۔ تمہارے اندر جو جذباتی جنگ جاری ہے اسے ٹھنڈا کرنے میں ہی تمہاری بہتری ہے۔'' وہ نہایت تحمل سے بولی تو عادل نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کی آنکھیں بے بسی کے احساس سے ڈبڈبانے لگیں۔ سائرہ بیٹے کی اس کیفیت پر حد درجہ پریشان تھی۔

''بیٹا مجھے مسئلہ کتابوں سے ہٹ کر لگ رہا ہے کیا بات ہے؟ مجھے سچ، سچ بتاؤ دیکھو مرد آنسو بہاتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ میرا عادل چھوٹا تو نہیں ہے اب۔ بہت، بہت بڑا لگنے لگا ہے۔'' وہ اسے پیار سے اپنے ساتھ لگانے لگی مگر وہ دور ہٹ گیا۔ وہ اس کی گرفت سے نکل کر دانتوں کو پیسنے لگا اور ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگا۔ اس کے ایکشنز دیکھ کر وہ مضطرب ہو کر اس کے قریب آگئی۔

''پلیز میری جان، اپنا مسئلہ تو بتاؤ، مجھے کیوں مارنے پر تلے ہو؟'' وہ تڑپ کر بولی تو ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر ناراضی سے اسے دیکھنے لگا۔

''بھئی بتاؤ تو...... کسی لڑکے سے جھگڑا ہوگیا ہے کہ ٹیچر نے کچھ کہہ دیا ہے؟'' وہ اندر سے بے حد مضطرب مگر بظاہر ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

''میرا نہ کسی سے جھگڑا ہوا ہے نہ ہی کسی ٹیچر نے کچھ کہا ہے۔ مجھے آپ سے ایک ہی گلہ ہے، پلیز ممی آپ دونوں اس کتابی افسانوی دنیا سے باہر نکل آئیں۔ میرے لیے بھی تو کچھ وقت ہونا چاہیے۔ جو فی الحال آپ دونوں کے پاس نہیں ہے۔ مجھے ایک سوال ہر وقت بہت تنگ کرتا رہتا ہے۔ آج اس کا جواب چاہیے۔ مجھے آپ دونوں نے پیدا ہی کیوں کیا اور اب مجھے آپ نے اس بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ دیا ہے یہ کیسی زندگی ہے میری۔ آپ نے یونیورسٹی جوائن کر کے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' وہ آنسو صاف کرنے لگا۔ ''بتائیں، میں کس کو اپنے مسائل بتاؤں؟''

''بیٹا پہلے کی طرح اپنے مسائل مجھ سے ڈسکس کرو۔ چلو آج کے بعد میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی۔ میرا تمام وقت آج سے تمہارا ہے۔ جہاں تک ڈیڈی کا مسئلہ ہے وہ حل کرنا میرے اختیار میں نہیں۔ ان کی روح کی غذا یہ کتابیں ہیں۔ ہم نے روح کی غذا پر ڈاکا ڈال دیا تو وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکیں گے کیا آپ ایسا چاہتے ہیں بیٹا؟'' وہ پیار بھرے لہجے میں بولی مگر اس نے جواب نہ دیا اور ماں کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو پانے لگا۔

''ہم ہمیشہ کی طرح آج بھی ایک دوسرے کے دوست اور ہم راز ہیں لیکن ڈیڈی کے بارے میں کوئی غلط بات کی تو یونیورسٹی نہیں چھوڑوں گی، کچھ سمجھداری کا مظاہرہ کرو۔'' وہ پیار بھرے لہجے میں بولی تو اس نے سر جھکا لیا۔ ''تم تو ایک بہادر اور دلیر ماں کی اولاد ہو اور ایک محنتی اور دیانت دار باپ کے اکلوتے بیٹے ہو۔ بزدل لوگ دل برداشتہ ہو کر پاگل پن کا شکار ہوا کرتے ہیں۔ میرا بچہ تو بہت بہادر ہے ناں؟'' اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

''ماشاء اللہ میرا عادل تو اپنی ممی سے بھی لمبا ہو گیا ہے۔ عقل میں بھی خوب بڑا ہو گیا ہے اب اپنے پیارے ڈیڈی کی طرف سے دل صاف کر لو۔ ہم دونوں ہیں ناں ایک دوسرے کے لیے وہ بیچارے ہمارے لیے ہی دن رات محنت کرتے ہیں۔ کالمز، انشائیے اور کتابیں لکھنے کے لیے وقت چاہیے سب ہماری زندگی کو بہتر بنانا مقصد ہے۔ ان کی اپنی حاجات تو بہت کم ہیں۔ نہ کھانے پینے کے شوقین ہیں، نہ پہننے اوڑھنے کے ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی بہت قریب ہوتے ہیں۔ بہت پیارے ہوتے ہیں اسے۔ ہم کون ہوتے ہیں نفرت کرنے والے، ان سے خفا ہونا ان پر زیادتی ہے۔ میرا بچہ آج کے بعد نافرمانی اور بدتمیزی کے زمرے میں نہیں آئے گا مجھ سے وعدہ کرو۔''

''ممی آپ کی یہی باتیں تو درست نہیں ہیں۔ میرے دوستوں کی مائیں آپ جیسی نہیں ہیں۔ آپ سے بہت مختلف ہیں۔ آپ ان جیسی کیوں نہیں بن جاتیں؟'' وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''دوستوں کے گھروں میں جانا چھوڑ دو بیٹا' نہ جانے کس قسم کے لوگوں سے ملتے ہو، اچھا ان کی مائیں کیسی ہیں، بولو؟'' وہ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جانتی، تم ہی بتا دو کہ وہ مجھ سے مختلف کیوں ہیں؟''

''انہیں اپنی ہر بات منوانے کے طریقے آتے ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''بہت عقل مند اور سمجھدار ہیں، آپ کی طرح نہیں ہیں۔''

''مثلاً....'' وہ حیرت سے بولی۔ دل بھی دکھ سا گیا۔

''انہیں بولنا آتا ہے ممی، لڑ جھگڑ کر، رو دھو کر اپنی بات منوانی آتی ہے۔ وہ الگ کمرے میں لاوارثوں کی طرح اپنی زندگی نہیں گزار رہیں۔ ممی آپ ڈیڈی سے دو ٹوک فیصلہ کر لیں۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''کیسا فیصلہ؟'' وہ اچنبھے سے بولی۔

''ایک نارمل زندگی گزارنے کی جائز، درست اور سچی خواہش کے اظہار کا فیصلہ۔ ممی ورنہ میں یہ گھر چھوڑ جاؤں گا۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ ''مجھ سے اس ماحول میں نہیں رہا جاتا، مجھے حماد کے گھر کا ماحول چاہیے۔ جو آپ دونوں ہی نہیں دے سکتے۔''

''کہاں جاؤ گے؟'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

''اپنے اللہ میاں کے پاس۔'' وہ معصومیت سے بولا۔ ''اور کہاں جا سکتا ہوں؟ حماد سے ریکویسٹ کی تھی مگر وہ اپنے گھر رکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوا کیونکہ اس کے دو اور بھائی ہیں۔''

''بیٹے مجھے مزید دکھ نہ دو، میں مر جاؤں گی۔'' وہ تڑپ اٹھی۔ ''مجھے اپنے ساتھ ہی لے جانا...... میں یہاں رہ کر کیا کروں گی؟''

''یہ تو بہت خوب ہے، دونوں وہاں بھی ایک ساتھ ہوں گے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ایسی باتیں مت کرو عادل، میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''ممی یوں روئیں گی تو میرا کلیجا پھٹ گیا تو پھر کیا ہوگا؟'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''میں نے تمہیں کہہ جو دیا ہے کہ اب میری زندگی کا ہر لمحہ تمہارا ہے۔ اس پر صرف تمہارا حق ہے۔ یونیورسٹی بھی نہیں جاؤں گی، کتاب بھی نہیں پڑھوں گی۔ اب تو ایسی فضول باتیں مت کرو۔'' وہ اپنی ہمت کو مجتمع کرتے ہوئے بولی۔

''ڈیڈی کی زندگی کے ہر لمحے پر بھی میرا حق ہونا چاہیے۔'' وہ تنک کر بولا۔

''میں اس کا وعدہ نہیں کر سکتی کیونکہ یہ کام میرے اختیارات سے باہر ہے۔ میں نے جو سمجھایا ہے اسے پلّے باندھ لو۔ ہم انہیں بدل نہیں سکتے، انہیں ان کے حال پر ہی چھوڑ دیں تو بہتر ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''ممی کل جب ڈیڈی یونیورسٹی جائیں گے تو ہم ان کی اسٹڈی کو آگ لگا دیں گے۔ انہیں کہیں گے شارٹ سرکٹ ہو گیا تھا۔'' وہ رازداری کے انداز میں بول رہا تھا۔ ''ممی مجھے نفرت ہے ان کتابوں سے جنہوں نے ڈیڈی کو مجھ سے چھین لیا اور آپ بھی بہت دور ہو گئی ہیں۔ مجھے گھن آتی ہے ان لوگوں سے جن کے ہاتھ میں کتاب ہوتی ہے۔'' سائرہ کافی دیر تک اپنی آشفتہ ہمت کو بحال کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر ملائمت بھرے لہجے میں بولی۔

''او لیول کرنا کون سا مشکل ہے میرے عادل کے لیے۔ تمہیں کتابوں سے نفرت ہے مان گئی، پڑھنے سے الرجک ہو یہ بھی مان لیا۔ ہم ایک نیا راستہ ڈھونڈتے ہیں او لیول اعلیٰ پوزیشن میں کرنے کا۔''

''وہ کون سا راستہ ہے ممی؟'' وہ ایک دم سے قریب ہو کر بولا۔ ''کہ جس میں اسکول نہ جانا پڑے اور نہ ہی پڑھنا پڑے۔ ممی آپ بہت عقل مند ہیں ضرور ایسا طریقہ سوچ لیا ہوگا، بس جلدی بتائیں ناں۔''

''بیٹا ذرا یہ سوچو کہ تمہیں یہ سننا کیسے لگے گا۔ ایک کہانی چاند اور تاروں کی کہکشاں کی۔ اک سرگزشت بیتے ہوئے وقت کی تاریخ کی، اعداد و شمار اور اپنے دینِ اسلام کے وجود میں آنے کی قربانیوں کی ناقابلِ فراموش اَن گنت سچی داستانیں سننا پسند کرو گے؟'' وہ اس کے سر پر بوسہ دے کر بولی۔ ''بہت مزہ آئے گا ناں؟''

''جی ممی...... بہت مزہ آئے گا مگر ان کہانیوں کا او لیول سے کیا تعلق ہے؟'' وہ بے چینی سے بولا۔

''بتاتی ہوں بھئی صبر کرنا سیکھو یار۔'' وہ اسے ہلکی سے تھپکی مارتے ہوئے بولی۔ ''لکھنا ایک آرٹ ہے اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کی تھی حضرتِ جبرائیلؑ کی زبانی **اقرا باسم ربك الذی خلق** پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ یہ سورہ تمہیں یاد ہے کہ بھول گئے ہو؟'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''جس میں پڑھنے، یاد کرنے اور لکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔''

''ممی آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں مجھے اپنے بچپن کے واقعات، حادثات تک یاد ہیں اپنی حرکتیں اور باتیں بھی ابھی تک نہیں بھولا آپ کی باتیں تو تازہ، تازہ ہیں ذہن پر نقش ہیں۔'' وہ اضطراری کیفیت میں بولا۔

''تو پھر میرا بچہ بہترین قلم کار اور آرٹسٹ بن سکتا ہے۔ میں اپنے منے کو انہی کتابوں سے کہانی سناؤں گی اور میرا آرٹسٹ بیٹا اسے... کینوس پر بکھیر کر اس کہانی کو حیات بخش دے گا جس کے نقوش تمہیں امتحانات دینے میں

مددگار ثابت ہوں گے۔'' وہ خوشامدی لہجے میں بولی۔

''کہانیاں سنانے کے لیے وقت چاہیے، ممی وہ آپ کے پاس نہیں ہے۔'' وہ منہ بسورتے ہوئے بولا۔

''میں نے تم سے وعدہ کیا ہے بیٹا اپنے دل سے بے اعتمادی و بے اعتباری کا زہریلا بیج نکال پھینکو ورنہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی کونپلیں نوکدار کانٹوں کی طرح تمہیں ہر وقت زخمی کرتی رہیں گی۔'' وہ اسے گلے لگا کر پیار کرنے لگی۔

''ٹھیک ہے ممی، کل سے آپ یونیورسٹی اور میں اسکول نہیں جاؤں گا۔ شرط منظور ہے کہ نہیں...... ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ معصومیت عود کر آئی تھی۔ سائرہ نے اس کی طرف رحمدلانہ نظروں سے دیکھ کر خود پر قابو پایا۔ اقرار کے بغیر گزارہ نہیں تھا۔

''منظور ہے قبول ہے جناب والا، جاؤ اسٹامپ پیپر مع وکیل کے لے آؤ تاکہ تمہیں تسلی رہے۔ میری جان اور بھی جو چاہیے بلا تکلف بولو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''اور وہ پارٹی ٹائم ہوگا، خوب مزہ کریں گے کون سی کہانی سب سے پہلے ہوگی، ممی کوئی چٹ پٹی کوئی مزے داری ہو جو رات سوتے میں بھی میرے ساتھ ہو۔'' وہ ایسے کھلکھلا رہا تھا جیسے کوئی مسئلہ درپیش ہی نہ تھا۔

''سب سے پہلی کہانی اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں اور انبیا کرام اور آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مضبوط اور قابلِ احترام کردار سے شروع ہوگی۔ اس کے بعد اگلی سیڑھی پر قدم رکھیں گے تو کامیابی ہی کامیابی ہوگی۔ اب ہم وضو کرتے ہیں دو نفل حاجت کے پڑھ کر اپنے رب سے صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی دعا کرتے ہیں۔'' وہ اسے سینے سے لگا کر عقیدت مندانہ انداز میں بولی۔

''ممی، موو ی، میوزک اور ہلا گلا بریک میں کیا کریں گے، کیسا لگا آئیڈیا؟'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''سُپرب آئیڈیا۔'' وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی ظاہر ہے اس وقت تو بیٹے کا دل رکھنا تھا۔

''پھر ہر ویک اینڈ پر ہم دونوں آؤٹنگ پر بھی جائیں گے، مزہ کریں گے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''تم فکر نہ کرو میری جان سب کچھ آرٹسٹ کی پرفارمنس پر ہی ہوگا۔ اس کی مجھے سو فی صد امید ہے۔'' وہ بھی خوشی کا اظہار کر رہی تھی مگر دل افسردہ سا ہو گیا تھا۔ عادل کے لہجے کی خوشی میں حسرت کی جھلک اسے تڑپا گئی تھی۔

''آج کے بعد ڈیڈی کا نام بھی ہم دونوں کے درمیان نہیں آئے گا۔ دیکھتے ہیں کب تک وہ اپنی اسٹڈی میں قید رہیں گے۔'' وہ ایک قہقہہ لگا کر مسخرانہ انداز میں بولا تو سائرہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

''مجھے علم ہے آپ کو میری باتیں بہت ناگوار گزرتی ہیں مگر ہے تو حقیقت۔'' وہ بھی ماں کے تیور دیکھ کر سنجیدہ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''میرے لعل ان تمام فضول باتوں سے ذہن کو آزاد کر دو ورنہ میری کہانیاں تمہارے دماغ میں داخل ہی نہ ہوں گی۔ تمہیں علم ہے ناں کہ ممی تمہاری ہر بات کو اہمیت بھی دیتی ہیں اور مشورہ بھی لیتی ہیں اور اس پر عمل بھی کرتی ہیں کیونکہ تم بہت سمجھدار بچے ہو۔ اب فقط ایک مہربانی اور احسان کر دو، ڈیڈی کے بارے میں مثبت سوچ کے ساتھ زبان کو بھی ہر طرح کی منفی باتوں سے پاک رکھو۔ دل و دماغ میں ابھرنے والی سوچیں پاکیزہ ہوں گی تو روح کو تسکین و طمانیت نصیب ہوگی۔ تم پازیٹو ہو جاؤ، خوش رہنے لگو گے۔ ابدی سکون سے ہمکنار ہونے کے لیے سوچ کا مثبت ہونا بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو لچکدار اسی لیے تو بنایا ہے کہ ہر قسم کی صورتِ حال میں ڈھل سکے۔ یہ جو خاندان اور اپنا گھر دیکھ رہے ہو ناں، ایک سانچہ ہے جس کی ایک شیپ ہے۔ تم اس شیپ کو بدل نہیں سکتے۔ تمہیں خود کو بدلنا ہوگا۔ اسی میں تمہارا ذہنی سکون اور کامیابی ہے۔'' وہ اسے نہایت لگاوٹ سے سمجھا رہی تھی۔

''ممی اٹ از او کے...... لیکن ڈیڈی کو تنہائی اور بے توجہی کی مار دینے کے بارے میں سوچیں۔ آج کے بعد آپ کسی ملازمہ کی طرح دروازہ ناک کر کے ان سے پانچ منٹ کی بھیک مانگنے نہیں جائیں گی۔ ان کے ناشتے اور کھانے کی ٹرالی آپ اسٹڈی میں لے کر نہیں جائیں گی۔ جس انسان میں خودداری اور غیرت کی کمی ہوتی ہے زمانہ انہیں ہر لمحہ ٹھوکریں بھی لگاتا ہے خدمت گاری بھی کرواتا ہے۔ مجھ سے سبق حاصل کریں، میں ان کے قریب نہیں جاتا، عزتِ نفس اسے کہتے ہیں کہ نفرت کا جواب بے جا محبت اور لگاوٹ سے مت دیں۔ آپ ذرا اپنے اندر جھانکیں۔'' وہ کسی دانا انسان کی طرح نصیحت کر رہا تھا۔ سائرہ بدستور اسے دیکھے گئی۔

''بیٹا، یہ مت بھولو کہ وہ تمہارے باپ اور اس گھر کے سربراہ ہیں۔ وارث ہیں ہمارے...... مجھے ان سے مشورے کر ہر قدم اٹھانا چاہیے ان کی لُک آفٹر کرنا میرا فرض ہے۔ چاہے ہمارے ازدواجی حالات کیسے بھی ہوں مجھے بلا تامل ان کی ہر بات پر سرِ تسلیم خم کرنا ہے ورنہ یہ زندگی کی گاڑی نہ چلتی، یہ رشتہ کب کا ٹوٹ چکا ہوتا۔ کچھ میں نے قربانی دی کہیں انہوں نے بھی قربانی دے ڈالی۔ ہم دونوں کے ایثار کی وجہ سے تم پر ان کا سایہ ہے ورنہ تم ننھیال میں ماموں کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہے ہوتے جہاں تمہارا کوئی حق نہ ہوتا الٹا عمر بھر احسان مند رہتے۔ باپ چاہے نام کا ہی ہو بیٹا اس کی سرپرستی کی مضبوطی ہی اور ہے۔'' عادل نے ماں پر یاسیت بھری نگاہ ڈالی۔

''ممی بس آپ نے تھوڑے پر ہی اکتفا کر لیا تو زیادہ کیونکر ملتا...... کون کہتا ہے کہ آپ بہت بہادر اور ہمت والی ہیں۔ جیسا آپ سوچتی ہیں یہ تو بزدلی کی نشانی ہے۔'' وہ طنزیہ مسکرائی۔

''ابھی تم چھوٹے ہو، دور اندیشی سے کوسوں دور...... بڑی، بڑی باتیں کرنے سے عقل مند اور دانش ور نہیں ہو جاتے۔'' سائرہ نے دل ہی دل میں سوچا مگر خاموش رہی۔

''ممی اب مجھ سے ایک وعدہ کریں کہ آج کی باتوں کی انہیں بھنک نہ پڑے کیونکہ وہ آپ کو یونیورسٹی چھوڑنے نہیں دیں گے اور آپ کی مدد کے بغیر میں پڑھ نہیں سکوں گا۔ انہیں میری تعلیم سے بھلا کیا دلچسپی...... اپنے مراق سے باہر نکلیں گے تو میں نظر آؤں گا ناں۔'' وہ نہایت تلخی سے بولا۔

''تم ٹھیک سمجھے ہو، وہ تو ہر لمحے ہر ساعت تم سے گلوخلاصی چاہتے ہیں۔ تمہارے لیے فکر مند کیونکر ہوں گے۔'' سائرہ نے دکھ سے سوچتے ہوئے اسے گلے لگا لیا۔

☆☆☆

سائرہ اپنے کمرے میں لان کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں کھڑی حسین موسم سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اسے شور شرابے کے ہمراہ ساون کی ایسی ہی بے باک بارش پسند تھی اور سرما کی رتوں کی دھیمی، تھم تھم کر برسنے والی بارش بھی دل کو خوب بھاتی تھی۔ ایک طرف دل بلیوں اچھلتا تھا کچھ کرنے کو جی ہمکنے لگتا تھا دوسری طرف دل اتنا پُرسکون ہو جاتا کہ اداسی غلبہ پا جاتی اور اپنی زندگی کے وہ لمحات ذہن پر نقش ہونے لگتے جو کرب ناک تھے اور حسرت زدہ تھے۔ ایک دم سے اس کے دل میں دیرینہ خواہش ابھری۔ اس حسین اور عاشقانہ موسم میں وہ حسنات کے ساتھ لمبی ڈرائیو پر نکل جائے۔ ''موسم اور ہم نشیں کی قربت کے فسوں میں ہم بہت دور نکل جائیں پھر کسی ویرانے میں ایک چھوٹے سے ڈھابے سے چائے پئیں، دال روٹی کھائیں اور دال میں تڑکا ہماری لچھے دار، چٹ پٹی اور مسالے دار باتوں کا ہو تو کیا ہی مزہ دوبالا ہو جائے گا اس پُرلطف کھانے کا۔'' یہ سوچ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ''اور...... اور ہمارے درمیان کوئی دوسرا نہ ہو صرف ہم دونوں......'' یہ سوچ کر اس کے لبوں پر شریری مسکان بکھر گئی۔ ''پھر بارش سے خوب محظوظ ہونے کے بعد ہم اپنی جنت میں واپس آ کر پسندیدہ موسیقی سے لطف اندوز ہوں۔ ایسی موسیقی جس میں پیار و محبت کا اظہار ہو ایک دوسرے کی چاہ ہو۔ سُرور ہو اور ہم اسی پیار کے سُرور میں بہکتے چلے جائیں۔'' ایک دم

سے وہ بارش کی تیز بوچھاڑ سے چونکی اور تلخ حقیقت کے احساس نے اسے اداس و مایوس کردیا۔ ایسے حسین موسم کی دلنشیں بارش کا ایک لمحہ بھی تو حسنات کے ساتھ نہ گزرا تھا۔ ان کے لیے یہ فضول جبکہ سائرہ کے لیے بہت اہم تھا۔

''کاش میرا خواب نہ ٹوٹتا۔'' دل نے سرگوشی کی اور دو موٹے، موٹے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے جنہیں اس نے جلدی سے انگلیوں کی پوروں سے صاف کیا کیونکہ عادل کارپٹ پر بیٹھا اسی کا لیکچر لکھ رہا تھا جو سائرہ نے ابھی ابھی اس کی سماعتوں میں گھول کر ڈالا تھا۔ وہ انہماک سے اسی پر کام کررہا تھا۔ چہرے پر مکمل سکون اور لبوں پر ہلکی سی تسلی بخش مسکان تھی۔ کسی ذہنی ہیجان، اعصابی تناؤ کا نام ونشان نہ تھا کیونکہ سائرہ نے اسے جو رستہ دکھایا تھا اس میں وہ ذہنی طور پر ایک عام بچے سے کہیں زیادہ شارپ نکلا تھا۔ وہ ایک بار لیکچر سنتا اور چند لمحوں میں لکھ کر اس کے سامنے رکھ دیتا۔ شروع میں تو سائرہ اپنی اور اس کی کامیابی کی خوشی میں گویا ہواؤں کے دوش پر پرواز کیا کرتی۔ عادل میں بھی ماں کی پُرستائش باتوں سے روز بروز مثبت تبدیلی رونما ہورہی تھی۔ جب اس نے او لیول کی تیاری ہفتوں میں مکمل کرلی تو سائرہ فکرمند ہوکر سوچ میں پڑگئی۔ اس کا آئی کیو لیول اپنے باپ سے بھی کہیں ہائی تھا۔ ان کا 150 تھا اور اس کا 160 پتا نہیں یہ بات اسے کیوں مضطرب کرگئی۔ اس کے خیال میں ایسے لوگ ذہنی طور پر نارمل نہ ہونے کی وجہ سے اپنی زندگی کو بھی ایب نارمل طریقے سے گزارنے لگتے ہیں۔ حسنات کے علاوہ اور بھی مثالیں اس کے سامنے تھیں۔ اس کا اپنا آئی کیو لیول 120 تھا اس کی سوچ میں تذبذب نہ تھا۔ طبیعت میں ٹھہراؤ اور دھیما پن تھا، مستقل مزاجی تھی، ایک ناول پڑھنا شروع کرتی تو اسے مکمل کرنے کے بعد دوسری کتاب کو ہاتھ لگاتی۔ ایک پروجیکٹ شروع ہوتا تو اسی کے بارے میں دن رات سوچتی اور اسے جب مکمل کرتی تو اِک نکھرا اور صاف شفاف رزلٹ سامنے آتا جبکہ حسنات اس سے بالکل الٹ تھے۔ وہ ایسا بھونرا تھا جو ہر پھول پر بیٹھتا، رس چوستا مگر کسی ایک کے ذائقے سے روشناس نہ ہو پاتا تھا۔ ہمیشہ کے لیے تشنگی اور بھوک کے احساس میں ہاتھ پاؤں مارنا روز کا معمول تھا۔ نگاہیں متلاشی رہتیں اور ذہنی ہیجان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا۔ بُش کا آئی کیو لیول 78 نہ ہوتا تو وہ اپنی پالیسی کو دنیا پر مسلط نہ کرسکتا۔ یہی حال کلنٹن کا تھا فورسز میں بھی سلیکشن کے دوران آئی کیو لیول پر بہت زور دینے کا مقصد اسے سمجھ آگیا تھا۔ جس بچے کا آئی کیو لیول 140 سے اوپر ہوتا ہے اسے ری جیکٹ کردیا جاتا تھا کیونکہ ایسے لوگ نہ بہترین جنگجو ثابت ہوتے ہیں نہ ہی کامیاب حکمران بن پاتے ہیں۔ لیڈرشپ کوالٹیز کے لیے مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ دانش مندی اور دوراندیشی چاہیے ہوتی ہے۔ جذباتی پن تو کامیابیوں کو گھن کی طرح چاٹ جاتا ہے جو حسنات میں اور اب عادل میں نمایاں نظر آتا تھا۔

اس وقت سائرہ ذہنی طور پر اتنی ڈسٹرب سی ہوگئی تھی کہ مسلسل عادل کی طرف دیکھ کر سوچنے لگی۔ موسم کی لطافت کا مزہ کرکرا ہوگیا اور تمام سپنے کسی تعبیر کے بغیر ہی چھناکے سے ٹوٹ گئے۔ بے شک عادل کے ذہن کو پڑھائی کی طرف راغب کرنے میں اس کی جیت ہوئی تھی لیکن وہ اسے ابھی تک دوسرے لوگوں سے میل جول اور تعلقات کے توازن رکھنے کا سلیقہ نہ سکھا سکی تھی۔ وہ اس کی ایک نہ سنتا تھا۔ اس کی شخصیت کی سب سے بڑی خامی جوں کی توں تھی۔ عادل نے ماں کی سوچتی ہوئی آنکھوں میں گہری نظروں سے دیکھا پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

سائرہ اب اسے لکھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ پین سے نہیں لکھ رہا صفحے پر موتی بکھیرے جارہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنا کام سائرہ کے سامنے رکھ دیا اور ایک پُرسکون طویل سانس لے کر بولا۔ ''میں دو منٹ میں تیار ہوکر آیا آپ بھی میری پسند کے رنگ کا ڈریس پہنیں، باہر چلتے ہیں دن بھر کے لیے۔ کیوں ممی ٹھیک ہے ناں؟ اب تو خوش ہوجائیں۔''

''بیٹا تم اپنے دوستوں کے ساتھ پروگرام بناؤ۔ مجھے گھر میں کچھ ضروری کام کرنے ہیں، میرا جانا مشکل

ہے۔'' وہ اس کے رائٹنگ پیڈ کے صفحے الٹتے ہوئے بولی۔

'' آئی ہیٹ دیم ممی۔ ابھی تو آپ دیکھیے گا جب سب کو بیٹ کروں گا تو انہیں کتنی تکلیف ہوگی۔'' وہ اکڑ کر بولا تو سائرہ اس کی خود اعتمادی دیکھ کر جھوم گئی۔ ''ممی بس اٹھ جائیں۔'' اس نے تیزی سے کہا اور بھاگنے کے انداز میں ڈریسنگ روم کی طرف چلا گیا۔ سائرہ نے قالین پر بکھرے ہوئے پیپرز، کتابیں اور لیپ ٹاپ کو اٹھا کر اس کی رائٹنگ ٹیبل پر رکھا اور بے دلی سے وارڈروب کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''بھئی کمال کر دیا ہے تمہارے بیٹے نے...... یہ معجزہ کیسے ہوا سب حیران و پریشان ہیں۔'' عصمت آپا کی آواز میں حیرت و مسرت چھلک رہی تھی۔

''اللہ کا کرم ہے عصمت آپا، میں نے تو محنت کم ہی کی۔ عادل خود ہی بہت شارپ نکلا کہ گھنٹوں کا کام منٹوں میں کر ڈالتا ہے مگر کیا کروں، بہت فکر مند ہوں اسکول جانا نہیں چاہتا۔'' سائرہ کی آواز خوشی اور غمی کے ملے جلے تاثرات سے بھرا گئی اور آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

''اس کی فکر کیوں کرتی ہو؟ کتنی بار تمہیں حسنات کے بارے میں بتا چکی ہوں کہ بالکل ایسے ہی کرتا تھا، اس نے تو اے لیول بھی گھر میں ہی بیٹھ کر کیا تھا اور کامیابی میں سب کو مات دے گیا تھا۔ عادل کے پڑھنے کا اسٹائل بالکل باپ جیسا ہے۔ آج دیکھو کہ حسنات جیسا پائے کا ویل ایجوکیٹڈ انسان شاید ہی یہاں ہو۔ مجھے تو عادل کی نہ تو کل فکر تھی نہ ہی آج ہے اور نہ آنے والے کل میں ہوگی۔ یاد رکھنا دوسرا ہائیلی کوالیفائڈ شہری ہمارا عادل ہوگا۔'' عصمت بے انتہا تکبرانہ لہجے میں بولی تو سائرہ پاؤں تک لرز گئی۔ اپنے جذبات پر قابو پا کر اس بات کو مختصر کیا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

''اللہ نہ کرے کہ عادل، حسنات جیسا انسان بنے۔ مجھے ایسا برینی بچہ نہیں چاہیے بس نارمل ہو، کوشش کرنے والا اور اِک بیلنسڈ لائف گزارنے کا متلاشی۔ عصمت آپا، آپ کو جس ذہانت و فطانت پر مان ہے غرور و تکبر ہے، وہ تو سراسر تباہی ہے۔ ایسے لوگ خود پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ باقی مخلوق تو ان کے پاؤں کی دھول بن جاتی ہے اور معاشرے میں مس فٹ ہونے کے تمام احساسات کی موت لاحق ہونے کی انہیں خبر ہی نہیں ہوتی۔ میرا بچہ بہت بڑا انسان بنے لیکن میری التجا ہے اپنے رب سے کہ وہ ایک عام انسان ہو اور اس کی زندگی بھی عام لوگوں جیسی ہو جس میں توازن ہو ہر لحاظ سے اور ہر طریقے سے اور ہر رنگ سے......''

عصر کی نماز پڑھ کر وہ فارغ ہوئی تھی کہ لاؤنج میں گہما گہمی اور رونق کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ وہ سرعت سے جانماز سے اٹھی اور تیزی سے لاؤنج میں نکل آئی۔ اس کی سسرال کے قریبی رشتے دار مع گیکس، پریزنٹس اور چاکلیٹس کی ورائٹی کے...... وہاں موجود تھے۔

ان سے علیک سلیک کے بعد وہ کچن میں ملازموں کو ہدایات دینے چلی گئی۔ اتنی دیر میں عادل بھی گھر کے اندر داخل ہوا۔ سب کو دیکھ کر اس نے رسماً سلام کیا اور نخوت کے عالم میں گردن تانے ان کے سامنے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ ''یہی وہ لوگ تھے، میرے اپنے خونی رشتے جنہوں نے مجھ سے ہمیشہ نفرت کی۔ اپنے بچوں کو مجھ سے دور رکھا اور ممی کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا۔ آج کیسے بھاگے چلے آئے ہیں۔ واہ میرے مالک کامیابی کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے اس کی تو مجھے آج شناخت ہوئی ہے۔''

''میاں تم نے تو حد ہی کر دی۔ اتنے اے تو آج تک ہمارے خاندان میں کوئی نہ لے سکا سوائے تمہارے ڈیڈی کے اور آج ان کا ریکارڈ تم نے برقرار رکھا۔ بھئی ریکارڈ توڑنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' تایا نے خوش

ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ ریکارڈ اے لیول میں ٹوٹنا چاہیے کیونکہ تمہارے ڈیڈی کا اے دن ان کی حسرتوں اور پچھتاووں کی نذر ہوگیا تھا۔'' عصمت پھپو نے انکشاف کیا تو عادل ایک دم سے کھل اٹھا اور بے اختیاری میں بولا۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' لاؤنج میں اس کی بات سن کر قہقہے گونج اٹھے جو اسٹڈی کے بند دروازے کو چیرتے ہوئے حسنات کی سماعتوں سے ٹکرا گئے۔ وہ نخوت سے بڑبڑائے۔

''بہت وقت ہے ان نکمے اور بیکار لوگوں کے پاس کہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جب حاضری کو ضروری نہ سمجھیں۔ عادل کی کامیابی کون سا انوکھا فعل ہے کہ پورا خاندان برات کی صورت میں آدھمکا ہے۔ سائرہ بانو کو ایسی ہی رونقیں چاہئیں بھلا میں اسے خوش رکھ سکتا ہوں؟ اب بیٹے کی بھی ایسی ہی ٹریننگ کر رہی ہے۔'' وہ خودکلامی کرتے ہوئے چونکے کیونکہ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ انہوں نے کتاب ایک طرف رکھی اور طوعاً کرہاً دروازہ کھول دیا۔ عادل کو سامنے کھڑا دیکھ کر وہ آگ بگولا ہوگئے۔

''ڈیڈی! تایا، چچا، پھپو سب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' وہ قدرے جھجک کر بولا۔

''I am not available, tell them'' انہوں نے بیزاری سے کہا اور دروازہ لاک کر کے کاؤچ پر نیم دراز ہوکر کتاب کا مطالعہ کرنے لگے۔ ملازم نے چائے کی ٹیبل سیٹ کرلی تو سب ہنستے مسکراتے چائے کے لوازمات کو انجوائے کرنے لگے۔ کسی کو حسنات کی کمی کا احساس ہی نہ ہوا۔

☆☆☆

وقت گزر رہا تھا سائرہ اپنے بیٹے کے ساتھ کیے ہوئے وعدے پر مستحکم تھی۔ عادل کی عادات میں بھی خاصی تبدیلی آچکی تھی۔ اب وہ ڈیڈی کے لیے کبھی غلط بیانی سے کام نہ لیتا تھا۔ آمنا سامنا ہوتے ہی آداب بجا لاتا مگر ان کی اسٹڈی کی طرف جانے کی کبھی کوشش نہ کرتا۔

عادل کی اکیڈمک رپورٹس سائرہ کے لیے بہت بڑی خوشی تھی۔ جو ہر وقت اس کے چہرے سے عیاں ہوا کرتی تھی اور اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ عادل کی ہم عمر ہو۔ اسی لیول کی باتیں، حرکتیں اور پسند اس کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھیں۔ سائرہ کو پاپ میوزک سے ہمیشہ نفرت رہی مگر عادل کو کبھی نہ ٹوکتی۔ بیلنس کرنے کے لیے اسے ہر رات سونے سے پہلے جو درس دیتی تھی وہ پیارے نبیؐ کے کردار اور ان کے اعمال کی کہانی کی صورت میں اس کے گوش گزار کرتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد صرف عادل کی تعلیم و تربیت ہی بنا لیا تھا۔ وہ اس کے پسندیدہ مشاغل کی بھی قدر کرتی اور ساتھ ہی اپنی دانش مندی سے دینِ اسلام کے اصولوں اور حدود سے روشناس کراتی رہتی اور یہ بہت ضروری بھی تھا۔

ماڈرن دور کے پروردہ کزنز اور دوست احباب کی ظاہری نمود و نمائش والی اقدار اور ان کے برے اثرات سے دور رکھنے کے لیے سائرہ کو عادل کی تربیت پر ڈبل ٹریل محنت کرنی پڑ رہی تھی اور وہ بھی نہایت عقل مندی سے۔ اے لیول میں سچ مچ اس نے اپنے باپ کا ریکارڈ توڑ ڈالا تھا اور سائرہ نے اسے اسکالرشپ پر یو کے سے بیچلر کی ڈگری حاصل کرنے پر رضامند کرلیا۔ مقصد اسے خود اعتمادی سے دنیا کی دوڑ میں اکیلے بھاگ کر کامیابی حاصل کرنے کا تھا۔ ماں کی انگلی اور اس کے آنچل کے سہارے کو چھوڑنے کا یہ موقع اسے بھلا لگا تھا اور پھر ایک صبح عادل ماں سے جدا ہوکر غیروں کی دنیا کی طرف رخصت ہوگیا۔ وہ دل پر جبر کیے ائرپورٹ سے واپس گھر پہنچی تو حسنات حسبِ معمول اپنی اسٹڈی میں ہی بند تھے۔ انہوں نے اس سے اس کے دل کا حال پوچھا تھا نہ ہی اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔

وہ اپنے گھر کی اسی سیلن زدہ حسرت ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے بیٹے کی جدائی اور دوری کا ہر لمحہ دعاؤں میں گزارنے لگی کیونکہ اسے یوں ایک دم سے اکیلے بھیجنے کے خدشات اور اندیشے بھی تو بے تحاشا تھے۔

وہاں پہنچ کر عادل کو ماں کے بغیر رہنا خاصا دشوار لگا۔ نیا ماحول، نئے لوگ، ہر طرح کے مذہب اور عقائد کے پجاری اور ان میں ایڈجسٹ ہونا اسے مشکل ہوگیا۔ ہاسٹل لائف انجوائے کرنے کے بجائے عذاب معلوم ہوئی اور تعلیم اک کٹھن مہم بن کر اسے مضطرب کرنے لگی۔ اس سے ماں سے دوری، یاد اور تنہائی کا المناک احساس اسے مایوسی و اداسی کی طرف دھکیلنے لگا اور دل انجانے سے احساس سے ہراساں و پریشان رہنے لگا۔ تبھی اس نے قریبی اسلامی سینٹر جانا شروع کردیا۔ ماں نے بنیاد تو رکھ ہی دی تھی یوں نمازوں میں باقاعدگی، قرآن کی تلاوت اور ہر وقت زبان یارحمٰن کے ورد سے ہمکنار ہوکر دلی طمانیت بخشنے لگی۔ حلال و حرام کی تفریق میں کھانا بھی بیلنس نہ رہا اور وہ جسمانی طور پر لاغر دکھائی دینے لگا۔ پڑھائی میں توجہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی اور فرسٹ سمسٹر کے رزلٹ کے بعد اسے یونیورسٹی کو خیرباد کہنا پڑا۔ دل تو خوش ہوگیا مگر کانفیڈنس لیول زیرو ہوگیا تھا۔ سائرہ نے اسے فوراً واپس بلانے میں عافیت جانی اور ماں، بیٹا پھر سے اپنے ہی طریقے سے پڑھنے، پڑھانے لگے اور امتحان کے رزلٹ نے دونوں کو مطمئن بھی کردیا۔ گھر کا ماحول ویسے کا ویسا ہی تھا بلکہ اس کی شدت میں حسنات کی ریٹائرمنٹ اپنا کردار ادا کرنے لگی تھی۔

عادل نے ماسٹرز ماں کے زیرِ سایہ ہنستے کھیلتے ہوئے امتیازی پوزیشن میں مکمل کرلیا۔ وہ دن تو ہزاروں عیدوں پر بھاری تھا۔ حسنات کے سامنے سرخروئی کا احساس دونوں سے چھپانا مشکل ہوگیا۔ عادل نے ڈنر کے لیے سائرہ کو ساتھ لیا اور مارگلہ ہلز میں منال کی جانب چل پڑا۔ وہاں اوپن ائر میں رات کی تاریکی میں جگمگاتے ہوئے اسلام آباد کو دیکھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ آج اسلام آباد پہلے سے کہیں زیادہ تابناک اور حسین لگ رہا ہے۔ ہر طرف خوشیوں کا راج ہے اصل میں یہ حسن اور خوشی ان کے دل میں تھی۔ جس نے نظر کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے سائرہ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''ویسے مجھے لگتا ہے ڈیڈی کو بھی بے پناہ خوشی ہوئی ہوگی۔ آخر کو تم ان کی اولاد ہو، تم سے پیار و انسیت اور لگاؤ تو فطری امر ہے۔ ان کا اپنا ہی اسٹائل ہے جس کی ہمیں عادت تو ہو ہی گئی ہے۔''

''کاش...... کاش ممی! ڈیڈی اس کامیابی کے نشے میں ہمارا ساتھ دے کر مزہ دوبالا کردیتے۔ ممی ہی از آ رنگ پرسن۔ خود مرکزیت (self centred) کے مارے ہوئے انسان سے توقعات وابستہ کرنا سراسر نادانی ہے۔ آپ کا فخر و مسرت کتنی ڈگری بڑھ جاتا اگر ڈیڈی صدقِ دل سے بغیر جھجکے آپ کی پزیرائی کرتے۔ آپ کی محنت اور قربانی کی مدح سرائی کرتے اور آپ کے وہ تمام حقوق جو وہ دھاندلی اور بے باکی سے ہضم کرچکے ہیں آج واپس لوٹا دیتے تو بات بنتی۔ ممی مجھے یہ سوچ کر بے پناہ دکھ اور افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے آپ کی قدر نہ کی۔ وہ آپ کو پہچان نہ سکے۔ آپ کی انتھک محنت، صبر و تحمل کو دیکھ کر بھی انہوں نے اپنا رویّہ نہ بدلا اور آپ ہیں کہ ان کی ہر خامی پر پردہ ڈالنے کی کاوش میں ہر وقت سرگرداں...... آپ نہیں جانتیں ممی! یہ سب سوچ کر مجھے آپ کے دکھ، درد اور حسرتیں چین نہیں لینے دیتیں۔ ڈیڈی سے نفرت اپنی وجہ سے نہیں آپ کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔'' اس کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں جب خوشی برس کر آئے تو پرانے دکھ بھی ہرے ہو جاتے ہیں یہی حال عادل کا تھا۔

''بیٹا ہم یہاں اپنی خوشی اور کامیابی سیلیبریٹ کرنے آئے ہیں۔ اب اتنا مزے دار کھانا کھاتے ہوئے اگلا پروگرام بناتے ہیں کیونکہ میرے چیلنج کا نصف حصہ ابھی باقی ہے۔'' سائرہ کے لہجے میں بے پناہ خوشی برقرار تھی۔

''وہ بھی آپ کروا کر ہی چھوڑیں گی۔ بھگوڑے بچے کو لگام لگانا آپ کو خوب آتا ہے۔ آئی ایم سو لکی مام، احسان ہے آپ کا۔ ڈیڈی کا نہیں۔'' وہ بڑی ممنونیت سے بولا۔

"میری جان فرض کو احسانات کی فہرست میں مت درج کرو۔ بیٹے تم اپنا دل ڈیڈی کی طرف سے صاف رکھو۔"

"ڈیڈی نے ہمیں اپنے وقت میں شامل نہیں کیا۔ اگر دیکھیں تو یہ ایک غلطی نہیں بلکہ اس سے بڑی زیادتی اور ناانصافی ہم پر ہو نہیں سکتی تھی۔"

اب تو بیٹے میری جوانی کی عمر بھی ختم ہونے کو ہے۔ اب ان سے کیا شکوہ کیا شکایت۔ ہم ایسی باتیں ان کے سامنے دُہرا کر انہیں کیوں پشیمان کریں۔ انہیں عمر کے اس حصے میں خوش ہی رہنے دیں تو بہتر ہے کیونکہ ندامت اور شرمندگی کے چند لمحے بھی بہت اذیت ناک ہوتے ہیں اور ایک انا پرست انسان کے لیے ان لمحوں کو سہہ جانا، بھلا دینا اور اس احساس سے کنارہ کشی اختیار کر لینا آسان اور سہل نہیں ہوتا۔" وہ بڑی خوب صورتی سے عادل کو سمجھا رہی تھی۔

"ڈیڈی اپنی انا کے سفر کے تنہا مسافر ہیں۔ جو اکیلے چلتے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اسی خول کے اندر کتنے مضطرب و پریشان رہتے ہوں۔ ہمیں وہ اپنی دنیا میں مگن، خوش و خرم اور پُرتسکین نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ہماری خام خیالی ہو حقیقت دراصل کچھ اور ہو۔ اب وہ واپس آنا بھی چاہیں تو ہم تک رسائی مشکل ہے کیونکہ ہمارے درمیان اک بے حد و بیکراں فاصلہ حائل ہو چکا ہے۔ اک بہت گہری خلیج ہے جسے وہ عبور کرنے کی ہمت ہی کھو چکے ہیں۔ اس لیے اسی انا کے سفر پر مرتے دم تک رواں دواں رہنا ان کی بھی مجبوری بن چکا ہے۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے افسردگی سے نہیں بلکہ تسلی بخش لہجے میں بول رہی تھی۔ عادل ماں کی عظمت اور بڑائی پر دل ہی دل میں واہ، واہ کر اٹھا۔

"ممی...... مجھے بھی ان کا یہی لائف اسٹائل قبول ہے۔ آئندہ کوشش کروں گا کہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہ بولوں۔" وہ مؤدبانہ انداز میں بولا اور دونوں کھانے سے لطف اندوز ہونے لگے۔

وقت گزرتا گیا۔ ماں بیٹے نے قائداعظم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا گو کہ سائرہ کی عمر نکل رہی تھی مگر ہمت بیٹے سے کم نہیں بلکہ بہت بلند تھی۔ حسنات نے سائرہ کے آگے پڑھنے کی شدید مخالفت کی جو تعجب انگیز امر تھا سو گھر میں ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ خاموش رہنے والے لوگ جب بولنے پر آئیں تو دوسروں کی بوٹی، بوٹی نوچ ڈالتے ہیں۔ یہی حال دراصل حسنات کا تھا اِدھر سائرہ کی کیفیت عجیب تھی۔ ایک طرف بیٹے کی جائز خواہش اور دوسری جانب شوہر کا انتقامی رویہ۔ خوب طویل قیل و قال کے بعد عادل کو فتح ہوئی اور حسنات مارے شکست خوردگی کے تڑپ کر رہ گئے۔ کئی دن انہوں نے اسٹڈی کا دروازہ نہ کھولا تھا۔ نہ جانے کس پر زندہ تھے۔ عادل نے پریشانی کے عالم میں ماں سے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"ممی کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا آپ کے لیے ہر قدم پر انجانے میں آزمائش کیوں بنتا رہا۔ اگر ڈیڈی اپنے وقت میں سے ایک پل مجھے دینے کے روادار نہیں تھے تو میری پیدائش کی کیا ضرورت تھی۔" وہ نہ جانے کیا کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر ماں کا احترام آڑے آ گیا۔

"ممی افسوس کہ میں ڈیڈی کو سمجھ نہیں پایا جبکہ میں نے ڈیڈی کو حاصل کرنے کی خاطر تمام ڈگریاں امتیازی پوزیشن میں حاصل کیں حالانکہ میں اس قابل تھا ہی نہیں پھر بھی ان کے مزاج میں وہی کٹھور پن لہجے میں وہی سنگینی اور رویے میں بیگانگی بدستور قائم ہے۔ اس کی وجہ میری تو سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر آپ جانتی ہیں تو پلیز ممی مجھے بھی بتائیں۔"

"بیٹا راضی بہ رضا ہونے میں بہت سکون و طمانیت ہے۔ انسان کے مقدر میں جو لکھ دیا جاتا ہے وہی اس کا حاصل ہے۔ ایمان کی پختگی ہی میری اندرونی قوت و ہمت کو بتدریج بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ تمہاری عصمت پھپھو ہمیشہ کہا کرتی ہیں کہ ہمارے گھر پر بھوت پریت کا سایہ ہے۔ جنہوں نے ہمارے گھر کا چین و سکون نگل لیا ہے۔ میں نے بھی ان کے کہنے پر کیا کچھ نہیں کیا۔ پیروں، درویشوں، صلحا اور علما کے پاس سوالی بن کر گئی۔ بیچاری نے کتنے دم درود کروا ڈالے تعویز اور گنڈے پودوں سے کہیں زیادہ اس لان میں دبا دیے مگر ان کے بھائی کے مزاج میں مثبت

تبدیلی کے بجائے ہمارے شرک کرنے کی سزا غصے اور جلال کی صورت میں سماتی چلی گئی۔ بعض اوقات سوچتی ہوں کہ پریشانی میں عورتوں کا پختہ ایمان اور اس ذات پر یقین رکھنے میں ڈھیل کیوں آ جاتی ہے؟ اور ڈوبتے ہوئے تنکے کا سہارا لے کر وہ دو جہاں کے جہنم کا سودا کیوں کر لیتی ہیں، چپوار کو چھوڑ کر پانی پر تیرتے ہوئے تنکے کی بھلا حیثیت ہی کیا ہے۔ آج تک ڈوبتی ہوں ابھرتی ہوں مگر کنارہ نہیں ملتا۔ کیسی بے وقوفانہ سوچ تھی میری کہ جن، بھوت اور شیطان کو خود سے زور آور سمجھ کر خود پر حاوی کر لیا۔ اشرف المخلوقات ہم ہیں کہ وہ؟"

"اسی لیے تو ممی آپ کے تمام جادو ٹونوں کے اثرات ڈیڈی میں نظر آنے لگے اب بھگتیں۔" وہ ماں کو خوش کرنے کے لیے ہنستے ہوئے بولا۔ "بھوت، پریت مع جاہ و جلال اور شان شوکت کے اسٹڈی میں موجود ہیں، یہ بات مان جائیں۔ ایمان کا مضبوط ہونا بہت ضروری ہے اب سمجھ آئی کہ میں نے ہوش سنبھالا تو آپ کو ڈیڈی کی تصویر پر پھونکیں مارتے ہی کیوں دیکھا۔"

"بدتمیز۔" سائرہ نے اسے پیار سے چپت رسید کر دی۔ "ایسے نہیں کہتے بیٹا جب انسان اس دنیا سے اگلی دنیا کا باسی بن جاتا ہے تو پھر اس کی قدر دانی اور مدح سرائی کا کیا فائدہ؟ جب زندہ تھا تو اس کی معمولی سی خامی بھی پہاڑ جیسی معلوم ہوتی ہے۔ مرتے ہی اس کی بڑی سے بڑی خامی کو نظر انداز کر کے اس کی تمام خوبیوں کو غیر معمولی کا نام دے کر پرچار شروع ہو جاتا ہے۔ شاید یہ بھی اپنے پیاروں کا گلٹ چھپانے کا طریقہ ہوتا ہے۔ ہم کسی قسم کے گلٹ کا شکار نہیں ہوں گے۔ اسے مجبوری سمجھو یا فرض تمہارے ڈیڈی میرے لیے برے ہو سکتے ہیں تمہارے لیے ہرگز غلط نہیں، یہ مت بھولنا۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی تو وہ ہنسنے لگا۔

"لیکن ممی سنا ہے ڈیڈی جوانی میں ایسے تو نہیں تھے ورنہ آپ پر کرش نہ ہوتا۔ آپ کو حاصل کرنے کی تمنا میں جلد باز نہ ہوتے پھپھو بتاتی ہیں کہ ڈیڈی نے جھٹ فیصلہ کیا تھا پٹ میں بیاہ کر لے آئے تھے۔ ممی آپ ذاتیات سے تعلق رکھنے والے اپنے تمام خدشات مجھ سے چھپا جاتی ہیں مانا کہ کچھ ذاتی معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کی پردہ داری میں ہی عظمت ہے مگر کچھ مسائل تو ڈسکس کر ہی سکتے ہیں۔ مجھے اپنی زندگی کے کچھ پہلوؤں سے روشناس تو کروائیں۔ میں جو یہ گوا چا ہوا اور بولایا سا رہتا ہوں کچھ تو ذہن میں کلیئر ہو کہ آپ کے اور ڈیڈی کے تعلقات میں اتنی فریکشن کیوں ہے...... مطلب اتنی دوری کیوں ہے؟ کوئی بھی مسئلہ ہو تو ایک کا منہ مشرق کو دوسرے کا مغرب کو کیوں ہوتا ہے؟" وہ اب بڑا ہو گیا تھا اس لیے ایسے سوال کر سکتا تھا۔

"بیٹے میں نے آپ سے نہ تو پہلے کبھی کچھ چھپایا ہے نہ ہی آج چھپانے کا ارادہ ہے۔ تمہارا اور میرا رشتہ ایسا رشتہ ہے جان کہ مر کر بھی نہ ٹوٹے۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بہ مشکل بول رہی تھی کہ ابھی وہ اگلا سوال کیا کرے گا۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا۔

"ممی جب بیوی، شوہر کی توقعات پر پوری نہ اترے تو کرش اور والہانہ خواہش دم توڑنے میں وقت نہیں لگاتی۔ توقعات، امیدوں اور قربانیوں کا پلڑا اتنا بھاری ہو جاتا ہے کہ محبتیں پسِ پشت جا چھپتی ہیں۔ محبت، چاہ اور لگن کا پلڑا بھاری رکھنے کے لیے خود کو بے نام و نشان کرنا پڑتا ہے۔ کیا آپ نے ڈیڈی کی خواہشات کا احترام کیا تھا یا اپنی ذات کی نفی کرنے کو اپنی ہتک اور توہین تو نہیں سمجھ لیا تھا؟ جبکہ بیوی جب اپنی ذات کی نفی کرتی ہے تو یہی اس کی خانہ آبادی کا پلس پوائنٹ بن جاتا ہے گویا وہ شکست ہو کر فتح پاتی ہے اور اسی جابر شوہر پر وہ حکمرانی کرنے لگتی ہے۔ میں ایک مرد ہونے کے ناتے ڈیڈی کے جذبات کو مدِنظر رکھ کر سوچ رہا ہوں کہ ایسی کون سی غلطی آپ سے سرزد ہو گئی تھی کہ تنہائی آپ کے مقدر کا حصہ بن کر میری پیشانی پر بھی اکیلے پن کی مہر ثبت کر گئی؟" عادل نے لرزتی ہوئی ماں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے اپنی ہمت و حوصلہ اپنی کمزور اور ڈرپوک ماں کے بدن میں اتارنے کا فیصلہ کر چکا ہو۔

''آج تم نے پہلی بار پوچھ ہی لیا ہے تو میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی کیونکہ آج مجھے تمہارے جوان ہونے کا احساس ہونے لگا ہے۔ حقیقت اور سچائی کڑوی اور زہریلی ہوتی ہے بیٹا۔ میں تمہاری خوشی و دلی تسکین کی خاطر کڑواہٹ اور تلخیوں میں گھری زبان پر تالا لگائے اپنی زندگی کے کچھ واقعات کی پردہ پوشی کرتی رہی۔ اس گفتگو کے بعد تم میرے لیے کون سی سزا تجویز کرو گے آئی ڈونٹ نو...... پھر بھی مجھے یقین ہے کہ تم بے انصاف نہیں ہوسکتے۔'' وہ ایک طویل آہ بھر کر بولی۔ اس کی ماتمی صورت، ترس اور ہمدردی کے قابل لگ رہی تھی۔

''آپ تفصیل بتائیں ممی میں سن رہا ہوں۔'' عادل نے ماں کو اپنے ساتھ لگالیا۔

''بیٹا تمہارے ڈیڈی امریکا سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں یونیورسٹی میں جاب کرنے لگے تھے۔ ان کے دماغ میں ایک دم سے حُبّ الوطنی کے جذبے نے سر ابھارا اور ماں کی جدائی نے بھی ستایا تو واپس آگئے۔ ماں سے والہانہ لگاؤ اور حُبّ الوطنی ہی ایسے جذبے تھے جو اُن کی کتابوں میں دخل اندازی کرسکتے تھے۔ انہوں نے یہاں آکر یونیورسٹی جوائن کرلی۔ میں ہمیشہ سے ہی اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ مانی جاتی تھی۔ میڈلز، ٹرافیز اور شیلڈز مجھ پر عاشق تھے۔ تمہارے ڈیڈی نے میری قابلیت اور پڑھائی کی لگن کو پہچان لیا تھا۔ میں اس وقت ایم ایس کے فائنل ائیر میں تھی۔ حسنات کی توجہ نے مجھے ایسا گرویدہ کیا کہ میں یونیورسٹی کا تابناک ستارہ بن گئی۔ جب ڈگری کے قریب پہنچی تھی تو ان کا پروپوزل آگیا۔ اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ انہیں مجھ پر واقعی کرش ہوا تھا یا تمہاری پھپھو نے کہانی بنا رکھی ہے۔ جب تمہارے ڈیڈی نے میرے والدین کی طرف پروپوزل بھیج دیا اور عمروں کے فرق کے باوجود میری امی نے اسے قبول کرلیا کیونکہ میرے ابو بھی نہیں تھے۔ اس لیے مناسب یہی سمجھا۔ یوں چٹکی بجاتے ہی رشتہ طے ہوگیا اور چند دنوں کے بعد ہی ہم ازدواجی رشتے میں منسلک ہوگئے۔'' وہ اپنی داستانِ حیات بڑے محتاط انداز میں ورق، ورق الٹتی رہی اور عادل ہمہ تن گوش بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اس کی پیدائش سے پہلے اور بعد کے واقعات بھی محتاط انداز میں بیٹے کے گوش گزار کردیے۔

''ماں بننے کے نشے نے مجھے بہرہ کردیا تھا اور بینائی بھی سلب کرلی تھی۔ حسنات کے غصے اور... ناراضی کا تمہاری زندگی پر کیا اثر ہوگا اس کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکی تھی یعنی ماں کے عہدے پر فائز ہوچکی تھی۔ اب ان کی دُھتکار و پھٹکار مجھے نہ تو رلاتی تھی نہ ہی ڈپریس کرتی تھی۔ میں ذہنی طور پر نارمل ہوچکی تھی۔ تمہاری آمد کیسی خوشی تھی کیسا پُرسکون احساس تھا میں تمہیں بتا نہیں سکتی جبکہ تمہارے ڈیڈی نے مجھ سے بالکل لاتعلقی اختیار کرلی۔ انہوں نے مجھے بیڈروم سے بے دردی سے نکال دیا۔ اب ان کی زندگی کا ہر لمحہ پہلے سے زیادہ کتابوں کی نذر ہوگیا تھا۔ وہ مجھ سے تم سے اور خود سے بھی بیگانہ ہوتے چلے گئے جس کا انجام تم دیکھ رہے ہو۔ میرے بچے یہ ہے میری مختصر مگر بہت جان لیوا داستان میں نے تمہیں پیدا کرکے غلطی نہیں کی، مجھے کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ تمہاری پیدائش تو بلیسنگ ہے میرے لیے۔ اب تم ہو اور تمہاری موجودگی کا فسوں ہے کہ زندگی میں خزاں نہیں بہاریں ہی بہاریں ہیں ہر موسم میں ہر حال میں۔'' وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے لال ہوگئی تھی۔ اتنے ظلم سہنے کے باوجود وہ اب بھی باحوصلہ اور صابر و شاکر دکھائی دے رہی تھی۔ ''یہ درست ہے کہ... جسمانی اذیت سے زیادہ ذہنی اور روحانی اذیت تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ اگر انہیں مجھ پر رتی بھر شک ہوتا تو آج میں تمام پراپرٹی کی مالک نہ ہوتی۔''

''ممی، ڈیڈی نے آپ سے پیار نہیں کیا تھا وہ اصل میں آپ کی ذہانت پر فریفتہ ہوئے تھے۔ انہیں اپنے جیسا ساتھی چاہیے تھا جس کے لیے کسی رشتے کی اہمیت نہ ہوتی اور صرف کتابیں ہی زندگی ہوتیں، آپ ان کی توقعات پر پوری نہ اتر سکیں۔ قصور ان کا بھی نہیں مگر آپ بھی گناہ گار نہیں ہیں۔ یہ بے جوڑ رشتہ تھا کہ میری موجودگی بھی اس رشتے میں استحکام پیدا نہ کرسکی ویری سیڈ لیکن آپ دونوں نے ایک دوسرے پر بے تحاشا ظلم ڈھایا۔ طلاق انہی حالات کے

پیشِ نظر جائز قرار دی گئی ہے۔ آپ دونوں کو اپنی زندگی اس بندھن سے بہت جلد آزاد کرلینا چاہیے تھی۔ اس زندگی کا بھلا کیا فائدہ کہ ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی دونوں تنہا اور انجان، ناشناسا اور غیر مانوس زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ دونوں نے ہی اپنے لیے جہنم کا انتخاب کرکے میرے لیے اچھا نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیڈی نے آج تک مجھے کبھی پیار سے دیکھا تک نہیں۔ کبھی میری تعلیم تو کیا کسی بات پر توجہ نہیں دی۔ کبھی مجھے سکیورٹی کا احساس نہ دلایا۔ میں آج جو بھی ہوں ممی صرف آپ کی کوششوں سے ہوں۔'' وہ غصے سے لال بھبوکا ہوگیا۔

''ممی کاش آپ میں فیصلہ کرنے کے گٹس ہوتے تو آپ ڈیڈی سے طلاق لے کر اپنی من پسند زندگی گزارتیں اور ڈیڈی اپنے لیے بہترین فیصلہ کرلیتے۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا؟ مجھے سمجھ نہیں آتی ممی کہ آپ دونوں کی خاموش جنگ میں مجھے سزا کیوں سنادی گئی۔ اس میں میرا جرم کیا تھا، بتائیں ممی؟'' اس نے ماں کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ وہ ساکت و جامد اسے دیکھے جارہی تھی۔ اُسے اس سے ایسے ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔

''اَن وانٹڈ چائلڈ کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ ممی آپ نے مجھ پر نہ چاہتے ہوئے بھی زیادتی کر ڈالی۔'' وہ چیخ اٹھا تھا۔ ''کاش میں آپ سے ضد نہ کرتا اور آپ اس راز کی پردہ کشائی نہ کرتیں۔ اب تو میں دکھوں کے پہاڑ کے نیچے ہی دب کر رہ گیا ہوں۔'' سائرہ اٹھی اور اس کے لیے ٹھنڈے پانی کا گلاس لے کر آگئی۔ اس کے قریب بیٹھ کر اسے سہلاتے ہوئے گلاس اس کے لبوں سے لگادیا۔ وہ چھوٹے، چھوٹے گھونٹ لیتا ہوا پورا پانی پی گیا۔

''تم اَن وانٹڈ چائلڈ نہیں ہو میرے بچے تمہارے حصول کے لیے تو میں نے اپنی زندگی کو جس ڈگر پر ڈال لیا ہے مجھے اس کا کوئی پچھتاوا نہیں۔ تم خود کو بے وقعت اور بے حیثیت مت سمجھو۔ تم میرے لیے خزانہ ہو، میں تہی داماں نہیں ہوں۔ تم اپنے ڈیڈی کی شان ہو، ان کا نام تمہاری وجہ سے زندہ و جاوید رہے گا۔ اس کا احساس انہیں بڑھاپے میں ضرور ہوگا۔'' وہ پُرامید لہجے میں بولی۔

''چاہے اس انتظار میں میری جان ہی چلی جائے۔ یہ خوب رہی...... انہوں نے تو مجھے اپنی اولاد تسلیم کرنے سے ہی انکار کردیا کیونکہ ان کی نظر میں آپ نے انہیں فریب دیا۔ وہ مجھے اپنا خون تصور نہیں کرتے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔'' وہ پژمُردہ لہجے میں بولا۔

''ایسی بات نہیں بیٹا، انہیں میرے کردار پر پورا بھروسا ہے انہوں نے اپنی غیر ذمے دارانہ طبیعت کی وجہ سے یہ بہانہ تراش کر خود کو ہم سے الگ کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے انتقام لیا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عورت کے لیے اس سے بڑی سزا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔''

''آئی ڈونٹ نو ممی، یکطرفہ کہانی پر سو فی صد یقین کیسے کرلوں بھلا باپ اپنی اولاد سے کنارہ کشی کیسے اختیار کرسکتا ہے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ یہی مسٹری ہے؟'' وہ جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ سائرہ سکتے کے عالم میں اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔ زبان گنگ ہوگئی تھی۔ ذہن مفلوج ہوچکا تھا۔ دل پارہ، پارہ ہوکر وجود میں ہی بکھر گیا تھا۔ ایک نیا دکھ، نیا درد اور نئی ندامت نے اسے بے دم کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ صوفے پر ہی نیم دراز ہوگئی اور خود کلامی کرنے لگی۔

''میں نے تمہارا نام عادل کیوں رکھا...... کچھ جانتے بھی ہو کبھی ذکر ہی نہیں کیا تو تم کیا جانو؟ میرے بچے تم ہی مجھے انصاف دلاؤ گے۔ تمہیں جنم دینے کی سزا اتنی طویل تو نہیں ہونی چاہیے تھی کہ کاٹے نہیں کٹ رہی۔ اب کہیں تمہیں ہی نہ کھو دوں، مجھ پر یہ ظلم مت کرنا، میرے لختِ جگر تم مجھے معاف کردو۔ اک عورت اس وقت تک پیاسی رہتی ہے۔ خود کو بیکار تصور کرتی ہے جب تک کہ وہ ماں کے مقدس رتبے پر فائز نہیں ہوجاتی۔ اولادِ نرینہ ایسا انمول تحفہ ہے کہ باپ اس کی خاطر اپنی ناپسندیدہ بیوی کو بھی ہنس کر قبول کرلیتا ہے۔ اسے اپنے تاج کا نگینہ بنانے پر مجبور ہوجاتا ہے لیکن افسوس کہ حسنات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی بلکہ اس خوش خبری کے سنتے ہی مجھ سے تمام تعلق

توڑ لیے۔ مجھے تنہائیوں میں دھکیل دیا اور وہ اکیلا پن آج تک بدستور قائم ہے۔'' وہ اندر ہی اندر سسک رہی تھی۔

''ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان سے اس ستم گری کی توقع ہرگز نہیں رکھی جاسکتی حسنات پر تو میرے عادل کی قلقاریوں نے بھی اثر نہ کیا۔ وہ گوشت پوست کے نہیں پتھر اور فولاد سے بنے ہوئے بے حس اور خود غرض انسان میری جوانی تو جیسے تیسے گزر ہی گئی۔ میرا بچہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی سنگل پیرنٹ کی تمام تر مجبوریوں اور کمزوریوں کے زیرِ سایہ پل کر جوان ہوا۔ یہ خدشہ ہمیشہ میرا پیچھا کرتا رہا کہ وہ ایک مکمل اور بھرپور شخصیت کا حامل انسان نہیں ہے۔ اس کی تربیت میں کمی رہ گئی ہے جو خود حسنات کے حصے میں آئی تھی۔ میں نے اپنا فرض اپنا حق تو نبھا دیا۔ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخرو ہوں۔ مجھے رتی بھر شرمندگی نہیں۔ حسنات آپ اپنے رب کو اس بے انصافی اور زیادتی کا کیا جواب دیں گے؟ اس ذات کا کس منہ سے سامنا کریں گے؟ آپ نے نہ تو بیوی کے حقوق نبھائے نہ ہی اپنے بچے کے۔''

☆☆☆

عادل نے اسٹڈی کا دروازہ ناک کیا حالانکہ دروازے کے اوپر ریڈ لائٹ آن تھی یعنی کوئی بندہ بشر اس طرف رخ کرنے کی غلطی نہیں کرسکتا۔ دروازے پر ڈونٹ ڈسٹرب می کی تختی بھی چوبیس گھنٹوں میں سے بائیس گھنٹے ہر آنے جانے والے کا منہ چڑاتی ہوئی نظر آیا کرتی تھی مگر عادل نے تمام رولز کی پروا کیے بغیر اپنی ہمت کو بحال کر کے گستاخی کر ڈالی تھی۔ اندر سے جواب نہ پا کر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ اندر سے لاکڈ تھا۔ اوپر کی لائٹ آن تھی یعنی مطالعہ ہو رہا ہے۔ عادل نے نخوت سے سوچا اور وہاں سے پلٹ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ماں کو کھڑا دیکھ کر اس نے نظریں جھکالیں اور اسے نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''مجھے بزدل اور ڈرپوک ماں نہیں چاہیے۔ میں باپ کی شفقت، توجہ، ہمدردی اور تحفظ کے بغیر پروان چڑھ گیا ہوں تو ماں تمہاری ممتا، دعا اور چاہ کے بغیر باقی ماندہ زندگی گزار سکتا ہوں۔ ایک ان چاہا بچہ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک تنہا ہی رہتا ہے۔'' وہ اپنے آپ سے بول رہا تھا۔ اس کے ماضی کے اکیلے پن کا ایک، ایک لمحہ چیخ کر دہائی دینے لگا تھا۔ جب وہ بیچلر کی ڈگری حاصل کرنے یو کے گیا تھا تو فقط ایک بار ڈیڈی کا فون آیا تھا۔ وہ خوف و حیرت سے کانپ رہا تھا کہ وہ اسے نہ جانے می کے بارے میں کوئی بری خبر سنانے والے ہیں۔ تین منٹ کے دورانیے میں انہوں نے اس کا حال احوال نہیں پوچھا تھا۔ پڑھائی کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا تھا۔ بس یہ مقصد ڈانٹ دیا تھا کہ اگر اس نے ڈرنک کو چھو بھی لیا یا کسی محبت و عشق میں گرفتار ہونے کی غلطی کرلی تو اسے اگلے سمسٹر کی فیس کا انتظام خود کرنا ہوگا اور اس گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔ لہجہ تحکمانہ تھا۔ اسے رتی بھر فکر نہ ہوئی کیونکہ وہ ماں کی گود سے جو ڈر اک لے کر بڑا ہوا تھا وہ اس کے ساتھ تھا۔

جب فرسٹ سمسٹر کے بعد ہی وہ واپس پاکستان آگیا تو ممی، ڈیڈی کے سامنے بہت شرمندہ ہوئی تھیں۔ ڈیڈی نے انہیں خوب طعنوں وتشنوں سے نوازا تھا لیکن ممی نے اسے سینے سے بھینچ کر تسلی دی تھی۔ ممی خوش تھیں لیکن ڈیڈی کو اس کا واپس آنا کس قدر ناگوار گزرا تھا۔ انہوں نے اس سے سیدھے منہ بات ہی نہ کی تھی۔ وہ کتنا نادان تھا کہ سمجھ ہی نہ سکا کہ انہیں تو اس سے بے تحاشا نفرت ہے۔ وہ ان کی بے توجہی و بے اعتنائی کو طبیعت کی سختی کا نام دے کر ہمیشہ خود کو مطمئن کرلیا کرتا تھا۔ سائرہ اپنی اداسیوں اور مایوسیوں کی جس عقل مندی سے پردہ داری رکھتی تھی کہ اسے محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ بیڈروم کے الگ ہونے کے پیچھے کون سا حادثہ کارفرما تھا۔

''ممی نے اپنی تمام جوانی تنہا گزار دی۔ راتوں کی تاریکیوں کو سینے سے لگائے راضی بہ رضا ہوتے ہوئے اتنا کر گئیں۔ کیا ممی کی غلطی ناقابلِ معافی تھی مجھے جنم دے کر بدکردار و بدچلن اور دھوکے باز، فریبی اور مکار بھی کہلائیں۔ کیا ڈیڈی اس حد تک گر سکتے ہیں یا......'' وہ یہ سب سوچتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ اعصابی تناؤ کی وجہ

سے اس کے جبڑے کھنچے ہوئے تھے۔ دانت بھینچے ہوئے تھے۔ بھویں تنی ہوئی تھیں۔ گردن اکڑی ہوئی تھی اور پیشانی پر ناگواری و بیزاری کی شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹ گیا۔ اسی اثنا سائرہ اندر داخل ہوئی۔ عادل بے سُدھ لیٹا رہا۔ وہ بیٹے کے قریب پہنچ کر اسے ملائمت سے ہلانے لگی اور بڑھ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور وہیں اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''کاش تم مجھ سے سوال نہ کرتے۔ بیٹا تم واحد ہستی ہو جس سے میں کچھ نہیں چھپا پاتی میں غلط بیانی سے کام لے کر تمہیں بے وقوف نہیں بنا سکتی۔ زندگی میں ایک ہم سفر ایسا تو ہوتا ہی ہے جس سے دل کی ہر بات کی جاتی ہے۔ میرا ہم سفر وہ ہم راز تم ہو میری جان۔''

''جانتا ہوں ممی، ورنہ کب کا یہاں سے جا چکا ہوتا۔ آپ کا پیار میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا ہے لیکن ممی بدقسمتی سے آپ کا بیٹا ہر لمحے اندر سے ٹوٹ رہا ہے۔ جس وجود کو آپ نے اپنے بے پناہ پیار اور لگن سے جوڑے رکھا تھا۔ اس کا انگ، انگ بکھر رہا ہے۔ ممی نہ ذہن میرے قابو میں ہے نہ دل پر اختیار ہے، نہ سوچ اپنی نہ امنگ اپنی۔ مجھے خود سے گھن آنے لگی ہے۔ میں کس قدر بے وقعت ہوں ممی، میں خود کو ہی بدلا، بدلا لگ رہا ہوں۔'' وہ ماتھے پر بل ڈال کر بیزاری سے بولا۔

''چھوڑو ایسی باتیں، کوشش کرو کہ میری بے وقوفانہ باتوں کو بھول جاؤ۔ مثبت تبدیلی تو خوش آئند مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔ اب ہم ماں بیٹا کولیگ بن کر زندگی انجوائے کریں گے، کیوں جان ٹھیک ہے ناں؟'' وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی تو وہ ماں کو حیرت و تاسف سے دیکھنے لگا۔

''اگر ممی ایسی نہ ہوتیں تو آج ہماری زندگی ہی مختلف ہوتی۔ کمپرومائز کر جانا اپنے ہر حالات سے، عزتِ نفس و خودداری سے سراسر بزدلی ہے بڑائی نہیں۔ ممی نے ایسا کیوں نہ سوچا؟''

☆☆☆

''بیٹا جی ابھی تک جاگ رہے ہو۔ صبح یونیورسٹی جانا مشکل ہو جائے گا۔ اٹھو میری جان ممی کو بھی تمہارے بغیر نیند نہیں آرہی۔'' سائرہ نے لاؤنج میں جھانک کر نہایت ملائمت سے کہا لیکن عادل نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی بدستور موی دیکھتا رہا۔

''میں نے اپنے بیٹے سے کچھ کہا ہے۔'' وہ اس کے قریب آکر پیار بھرے لہجے میں بولی تو عادل نے ٹی وی آف کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بلا کی اداسی تھی، آنکھوں میں شکوہ تھا۔ سائرہ نے تڑپ کر اسے پیار کیا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟ سوچ کی سوئی پھر اٹک گئی ہوگی۔ بہت ضدی ہو اپنے باپ کی طرح۔ وہ بھی کسی بات پر اَڑ جائیں تو کبھی کسی کی سنتے ہی نہیں۔ کیا میرا جوان باپ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا ہے؟'' عادل نے ماں کے لہجے میں اس قدر گھلاوٹ محسوس کرتے ہوئے آنکھیں جھکالیں۔

''میں جانتی ہوں کہ تم باپ جیسے برینی، شارپ، انٹلیکچوئیل اور......'' وہ یہ کہتے ہوئے ہنسنے لگی۔ ''اور بہت اچھے انسان بھی ہو نیک، پرہیزگار اور ماں کے فرمانبردار بالکل اپنے باپ کی طرح۔''

''ان کے تمام اوصاف گنوا دیے ہیں ذرا تصویر کا رخ تو پلٹیں۔'' اس کا دل ماں کی خوشگوار باتیں سن کر ایک دم سے ہی سکون کے ہلکورے لینے لگا۔

''ایسا کرنا مشکل ہے جب دوسروں کے عیبوں کی پردہ داری کی جاتی ہے تو ربّ العزت ہمارے ان گنت عیبوں کو دوسروں سے چھپا کر ہمیں قابلِ ستائش بنا دیتا ہے یہ مت بھولو کہ ہماری حیثیت چیونٹی سے بھی بڑھ کر نہیں لیکن وہ دوسروں کے سامنے قوت اور بالادستی سے نواز دیتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ ڈیڈی کے روشن پہلو ہی مدِنظر رکھنے چاہئیں اور جب تمہاری سوئی کہیں اٹک جائے تو مجھے آواز دے لیا کرو۔'' وہ رات کو دو بجے بھی بڑے شگفتہ لہجے میں

بول رہی تھی صرف بیٹے کو بہلانے کی خاطر اور عادل ماں کی اس حرکت کو بخوبی جانتا تھا۔

''ممی آپ بھی کیا چیز ہیں، آپ اپنی زبان کی تاب وطاقت کا کیا صحیح استعمال کرتی ہیں اور ڈیڈی قلم کو زبان بخش دیتے ہیں اور آپ دونوں لاحاصل ولایعنی کو ممکن بنا ڈالتے ہیں۔ ممی آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ میں نے درمیان میں آکر گڑبڑ کردی۔'' وہ بات صلح جویانہ انداز میں کررہا تھا مگر دل آزردگی کی طرف مائل تھا۔

''مطلب یہ ہوا کہ سوئی پھر اٹک گئی۔'' وہ مسکرا کر بولی اور اس کا بازو پکڑ کر کمرے میں آگئی۔ وسیع وعریض بیڈ پر اس کی طرف کا کمبل کھول کر تکیے کو درست کیا اور نہایت لگاوٹ سے بولی۔ ''آج میں اپنے جوان کو وہ لوری سناؤں گی جو تمہیں بچپن میں سناتی تھی۔''

''ممی مجھے لوری رٹ گئی ہے، آج میں وہ لوری آپ کو سناؤں گا۔'' اس نے اتنے پیار سے کہا کہ مسکراتی ہوئی سائرہ اس سے لپٹ کر رودی۔

''ممی میں سوچ رہا ہوں کہ ہم کسی فارن کنٹری کیوں نہ نکل جائیں۔ وہیں سے اپنی نئی زندگی کی شروعات کریں گے یہاں ہر صبح احساسِ کم مائیگی کے ساتھ طلوع ہوتی ہے اور ہر شام احساسِ زیاں پر ختم ہوتی ہے اب یہاں سے دل اچاٹ ہوگیا ہے۔'' کافی دیر سے وہ ماں سے کچھ کہنے کی کوشش میں منہ بنا رہا تھا۔

''بیٹا یہاں دل لگانے کی کوشش کرو سب کچھ بہت حسین لگنے لگے گا پہلے کی طرح دراصل تم یہاں رہنا جو نہیں چاہتے پھر خوشی کہاں سے آئیگی۔'' وہ اسے پچکارتے ہوئے بولی۔

''میں نے یہ ڈگریاں آپ کی مدد سے حاصل کی ہیں۔ جاب کے لیے یہ جگہ ٹھیک نہیں یہاں ہر قدم پر فیورٹزم سے کام نکلتے ہیں۔ ڈیڈی خود پروفیسر رہ چکے ہیں، وہ آگاہ ہیں، انہی کے کولیگز جنہوں نے اپنے فیوچر کے بارے میں دانش مندی اور دور اندیشی سے سوچا، وہ وائس چانسلر بھی بنے اور ایجوکیشن منسٹر کے عہدے پر فائز بھی ہوئے حالانکہ وہ لوگ ذہانت ولیاقت میں ڈیڈی سے بہت دور تھے مگر کامیاب زندگی گزار گئے اور ڈیڈی وہیں کے وہیں رہ گئے۔ مجھے یہاں رہنے کے لیے ڈیڈی کے تمام تر اصولوں سے کنارہ کشی اختیار کرنی ہوگی۔ ورنہ انہی کی طرح اس جان لیوا ناکامی کو خود پر مسلط کرکے اِک خبطی انسان ہی کہلاؤں گا اور ڈیڈی ہی کی طرح دنیا کو فیس کرنے کی مجھ میں بھی ہمت نہ ہوگی۔ ممی اب میں نے اپنے بارے میں سوچنا شروع کردیا ہے۔ اس لیے مجھے روکنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ آپ یہاں جاب کرلیں، دل کا کیا ہے آپ کو اسے بہلانا خوب آتا ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اب یہ جیتا جاگتا کھلونا تو آپ کے لیے بیکار ہوگیا ہے۔ مزید کھیلنے کی کوشش کی تو اس کی کرچیں بکھر جائیں گی۔''

''مجھے دہلانے والی دھمکیاں مت دو بیٹا، تم اپنی پیار کرنے والی اور تنہا ماں کو چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہو۔ تمہارا ضمیر ہی ایسا فعل کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ بیٹا خاندان چاہے کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو، وہ بڑھاپے میں ساتھ نہیں دیتا۔ میں حسنات کو ان لوگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہوں۔ صحت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہ گئی...... کون ان کی خبر گیری کرے گا؟'' سائرہ کی آواز بھرا گئی۔

''آپ ان پر جان نثار کرنے کے منصوبے بنائیں، میں آپ کو روکوں گا نہیں بس مجھے آپ مت روکیں۔ دنیا بہت بڑی ہے یہاں پر نہیں تو کہیں تو میری ضرورت ہوگی۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''حالانکہ یہ فیصلہ کرنا میرے لیے آسان ہرگز نہیں تھا کیونکہ آپ نے مجھے محتاج ومطیع بنا کر پالا ہے۔ ممی میں اب آپ کی ہر طرح کی محتاجی سے نکل کر اکیلا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔'' وہ بھویں چڑھا کر بولا۔ ''مجھے اب مارل سپورٹ بھی نہیں چاہیے۔ مجھے زندگی گزارنے کا سلیقہ خود آنا چاہیے۔''

''یہ تو بہت بڑی خبر ہے۔'' وہ مسرت آگیں لہجے میں بولی۔ ''ہر کام کا اِک وقت مقرر کیا گیا ہے۔ پہلے آپ

کے ساتھ دم قدم چلنے کی میری مجبوری تھی۔ دیکھو یہی وجہ تھی کہ کتنے سال پہلے میں نے اپنے تعلیمی پروگرام کو خیرباد کہہ دیا تھا کیونکہ اس وقت تمہیں میری توجہ وپیار کی اشد ضرورت تھی اور میں نے دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ میری ادھوری تعلیم اپنے بیٹے کے ساتھ ہی مکمل ہوگی، میرا وہ خواب تو پورا ہوگیا۔''

''تو اب مجھے ساتھ جڑے رکھنے کا خواب دیکھنا چھوڑ دیں۔ مجھے اِن ڈیپینڈ ہونے دیں، آخر کو ایک دن تو ایسا ہونا ہی ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''میں نے اس سے تمہیں منع نہیں کیا میری جان بلکہ میں تو تمہاری طرف سے بےفکر اور پُرسکون ہو جاؤں گی۔ میں کب تک تمہاری زندگی کو لیڈ کرسکتی ہوں تم اپنے فیوچر پلانز بناؤ، خود فیصلے کرو یہی میری ٹریننگ کی کامیابی ہے۔'' وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔

''تو اجازت سمجھوں آپ کو خفا بھی تو نہیں کرسکتا ناں۔ آپ کے مجھ پر بہت احسانات ہیں ان کو مرتے دم تک بھول نہیں پاؤں گا۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔

''پگلا کہیں کا ماں باپ کوئی احسان کرتے ہیں، وہ تمام میرے فرائض تھے۔ بیٹا اگر تم مجھے اکیلا چھوڑ کر امریکا جانا چاہتے ہو تو تمہاری خوشی کی خاطر ایک اور ایثار سہی۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ وہ نظریں جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کھرچتا رہا اور سائرہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں بار، بار فریج کھولتی اور بوتل سے چند گھونٹ پانی پی کر پھر اس کے قریب صوفے پر بیٹھ جاتی لیکن عادل کی سوچوں کے تار نہ ٹوٹے۔

☆☆☆

''ممی خوشخبری سننے کے لیے تیار ہوجائیں۔'' وہ لاؤنج میں چہرے پر مسکراہٹ سجائے سرعت سے داخل ہوا۔ سائرہ کاؤچ پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ ٹی وی چل رہا تھا مگر میوٹ پر تھا۔ وہ قریب ہی قالین پر دوزانو بیٹھ کر ماں کو بوسہ دے کر بولا۔

''ممی یہ سونے کا ٹائم نہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''جی بیٹا۔'' وہ سوگوار آنکھوں سے اسے دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی مگر اٹھ نہ سکی۔ وہیں لاغری ہو کر ڈھے گئی۔

''تمام دن بیکار لیٹی الٹی سیدھی سوچوں میں کھوئی رہیں گی تو آپ کے ساتھ یہی کچھ ہوگا۔ بہتر ہے آپ بھی جاب کرنے کا سوچیں۔ لگتا ہے میری ممی کے گھر کا آرام وسکون جاب کرنے میں رکاوٹ بننے والا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ایک بار مرد کو بھی گھر کے سکون کا چسکا پڑ جائے تو وہ بھی ''گھر گرہستہ'' بن جاتا ہے۔ ڈیڈی کی مثال آپ کے سامنے ہے۔'' وہ خوشگوار سے لہجے میں بولا۔

''فی الحال ایسا کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ اتنی مشکل پڑھائی کے بعد سچ ہے کہ آرام کرنا چاہتی ہوں میرے بچے میں تو اب بونس پر زندہ ہوں، تمہارے سامنے راہیں کھلی ہیں فائدہ اٹھاؤ۔'' وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولی۔

''ممی ایسا لب ولہجہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔ آپ بہت بیزار سی لگ رہی ہیں۔ چلیں، آپ تیار ہوجائیں کوماں بٹاڈز کے لیے چلتے ہیں۔'' وہ ماں کے پاؤں دبانے لگا۔

''خوشخبری کا کیا ہوا؟ جو سنانے چلے تھے؟'' وہ ذرا سا مسکرائی۔

''میں لندن جارہا ہوں، مجھے جاب آفر ہوئی ہے ممی اگرچہ ایسا کچھ تو میں ہرگز نہیں ہوں۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''تمہیں اپنی قسمت، اپنے خوش آئند مستقبل کا اندازہ ہی نہیں۔ اتنا پڑھ لکھ کر بھی نادان اور انجان ہی رہے۔'' وہ آہ دباتے ہوئے بولی۔

''تو پھر خوشی، خوشی تیار کریں۔ اس بار کپڑے میں خود خریدوں گا۔ آئی ہیو ٹو ڈو اٹ۔ مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے ممی۔'' وہ اشتیاق بھرے لہجے میں بولا۔

''ڈونٹ وری، جب سر پر پڑے گی تو سب کچھ مینیج کرنا سیکھ جاؤ گے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''خود کو سمندر کی موجوں کے حوالے کروں گا تو مگرمچھ کا نوالہ بننے سے پہلے بچنے کا طریقہ کیسے سیکھوں گا ممی...... یہ دنیا ایک گہرے سمندر کے مانند ہے۔ یہاں وہی سروائیو کرسکتا ہے جو حفظِ ماتقدم کے اصولوں کو اپنا لے۔ ممی بس میرے لیے دعا کیجیے گا کہ میں آپ کے بغیر اس کٹھن امتحان میں کامیاب ہوسکوں۔'' وہ امید وبیم کی کیفیت میں بولا تو سائرہ جواب دیے بغیر ہی وہاں سے اٹھی اور اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گئی۔ عادل وجہ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔

☆☆☆

سائرہ کو بیٹے کی جدائی کا سوچ کر ہی ایسی پریشانی لاحق ہوئی کہ کھانا پینا چھوٹ گیا اور آخر ایک دن وہ باتھ روم کے دروازے پر ہی بے ہوش ہوکر گر گئی۔ کسی کو اس کے گرنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ عادل اپنے پاسپورٹ کو ری نیو کروانے گیا ہوا تھا۔ حسنات حسبِ معمول اپنی اسٹڈی میں اور ملازمین کو دستک دیے بغیر اس کے کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ بے سدھ و بے ہوش وہیں پڑی ہوئی تھی کہ عصمت آپا اپنی سب سے چھوٹی بیٹی ڈاکٹر وردہ کے ساتھ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر آئیں تو سائرہ کو اس حالت میں دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وردہ نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے سائرہ کی نبض کو ٹٹولا اور سکون بھری سانس لی۔ عصمت چیختی چلاتی اسٹڈی کی طرف بھاگیں۔ حسنات نے گھر میں غیر معمولی اور غیر متوقع شور سنا تو وہ بھی اپنی اسٹڈی سے ننگے پاؤں باہر نکل آئے۔

''آپا کیا ہوا؟''

''بڑے افسوس کا مقام ہے کہ گھر کی ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے تمہیں بیوی کی خبر ہی نہیں۔ نہ جانے بیچاری کب سے بے ہوش پڑی ہے۔''

''مجھے الہام تو ہونے سے رہا۔ اسٹڈی اور سائرہ کے کمرے کے درمیانی فاصلے پر غور کرنے کے بعد گلہ کیجیے۔ ایمبولینس کے لیے فون کرتا ہوں۔ اس کا بیٹا کہاں ہے اس وقت، اسے اسپتال ہی لے جاتا۔'' وہ بے پروائی سے بولے۔ ''کہیں لور لور پھر رہا ہوگا اس کا اور کام ہی کیا ہے۔ حیران ہوں کہ ڈگریاں کیسے حاصل کرلیں جعلی ہی ہوں گی۔''

''پلیز حسنات اس وقت ان کڑوی کسیلی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ تمہیں تو بتانا ہی بیکار ہے۔ وردہ نے ایمبولینس کے لیے فون بھی کردیا ہے اور عادل کو بھی انفارم کردیا ہے۔ وہ بھی پہنچنے والا ہوگا۔ تم بے فکری سے اپنی کتیا میں اپنے کام سے مطلب رکھو۔ بیوی مرے یا جیے تمہیں سروکار کیوں ہوگا۔ کوئی تعلق اس سے رکھا ہوتا تو درد محسوس ہوتا ناں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولیں اور سائرہ کی طرف بڑھ گئیں۔

ماں، بیٹی نے مل کر اسے باتھ روم کے دروازے سے اٹھا کر کمرے میں قالین پر لٹایا تو اس کی آنکھوں نے جنبش کی۔

''سائرہ آنٹی کا شوگر لیول ڈاؤن لگ رہا ہے۔'' وردہ نے فریج سے جوس کا ٹن نکالا اور سائرہ کے منہ میں چمچ سے جوس ڈالنے لگی۔ آہستہ، آہستہ سائرہ نے نیم غنودگی میں ہی عادل کو ٹوٹتے لفظوں سے پکارا تو عادل اس کے سامنے آکر رک گیا۔ وہ ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔

''ممی کو کیا ہوا ہے؟'' وہ حیرت سے وردہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''انہیں فوراً اسپتال لے چلتے ہیں۔ ابھی ممی فٹ، فاٹ ہوں جائیں گی۔'' وہ ماں کو پیار کرتے ہوئے بولا تو سائرہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

تمام چیک اپس کے بعد اسپتال سے گھر آنے پر وردہ ان کے گھر پر ہی رک گئی۔ عادل جو ابھی تک ماں کے ساتھ ہی سویا کرتا تھا وہ ملحقہ دوسرے بیڈ روم میں چلا گیا اور وردہ، سائرہ کی نگہداشت کے لیے اسی کے کمرے میں

رک گئی۔ حیرت کی بات کہ ہفتے بعد حسنات نے بھی سرسری طور پر کمرے میں جھانک کر وردہ سے نہایت مختصر سی رپورٹ لی اور واپس اسٹڈی میں چلے گئے۔ سائرہ کے لیے ان کا یہ سرد رویّہ انہونا نہیں تھا پھر بھی سینے میں کہیں کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ضرور ہوا تھا۔ باپ کی بے حسی دیکھ کر عادل تلملا گیا تھا۔

''کیا ماں کو اس بے حس، مردہ ضمیر انسان کے رحم وکرم پر چھوڑنا زیادتی و بے انصافی نہیں؟'' یہ سوچتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کی حالت عجیب ہورہی تھی سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ بے حد مضطرب تھا۔

☆☆☆

''سائرہ آنٹی، آپ کی ہر رپورٹ بہترین ہے پھر مسئلہ کہاں پر ہے؟ کہ نہ تو بخار ٹوٹ رہا ہے، کمزوری بھی حد درجے کی، بھوک بھی مرچکی ہے، نیند روٹھ کر نہ جانے کہاں جا چھپی ہے۔ مسئلہ کیا ہے آنٹی؟ مجھے نہیں بتانا چاہتیں؟'' وردہ نے تھرمامیٹر سے ٹمپریچر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ایسا کریں عادل بھائی کو ہی بتادیں۔''

''بیٹا موسم بدل رہا ہے، سردی کی آمد بھی قیامت اور اس کی رخصتی بھی عذاب۔ نیند کیوں نہیں آتی عمر کا تقاضا ہے بھئی۔'' وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔

''آنٹی آپ کی عمر میں نیند جاتی نہیں بلکہ خوب، خوب آتی ہے کیونکہ تمام فرائض سے سبکدوشی ہی طمانیت و سکون ہے اور سکون ایسا ٹرانکلائزر ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ہوں...... تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو سویٹ ہارٹ، میں نے تمہاری چھٹیوں پر بھی کس بے دردی سے ڈاکا ڈالا۔ آئی ام ریئلی ویری سوری۔'' سائرہ نے کھسیاتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری اینول لیو...... کا تو مزہ ہی کرکرا کردیا میری بیماری نے۔''

''آنٹی گھر کے ڈاکٹر کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے۔ ویسے میں سوچ رہی ہوں کسی ماہرِ نفسیات سے نہ کنسلٹ کرلیا جائے؟'' وہ اسے دوا کھلاتے ہوئے نہایت فکرمندی سے بولی۔

''میرا ورکنگ ویزا آگیا ممی۔'' اسی اثنا عادل کمرے میں داخل ہوتے ہی چہکتے ہوئے بولا تو یہ سن کر سائرہ ٹھنڈے پسینے میں بھیگ گئی اور خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ممی یہ وہ کامیابی ہے جس کا آپ نے سپنا دیکھا تھا...... بیڈ کو الوداع کہہ کر ذرا تیزی پکڑیں اب جاکر اپنے شوہر کو بھی اطلاع دے دیجیے گا۔'' وہ نخوت سے بولا۔ ''انہیں میرا پیغام دے دیجیے گا کہ میں پانچ نہیں سات زبانیں سیکھوں گا اور میری ڈگریوں کی تعداد بھی ان سے زیادہ ہی ہوگی۔ جسٹ ویٹ اینڈ سی۔'' وردہ نے سائرہ کی خاموشی میں ہی اس کے مرض کو بھانپ لیا تھا۔

''میری جان بہت پڑھ لیا ہے، ڈیڈی سے مقابلہ کا ہے کا...... وہ تمہارے آئیڈیل نہیں ہیں تو پھر اُن جیسا کیوں بننا چاہتے ہو۔'' وہ بہ مشکل بولی تو عادل اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وردہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔

''آپ جیسا ذہین انسان ماں کے مرض کو سمجھ نہیں سکا، ویری سیڈ۔'' وہ اس کے پاس بیٹھ کر افسردگی سے بولی۔ ''آنٹی بہت اکیلی ہوجائیں گی۔ وہ آپ کو دیکھ کر جیتی ہیں آپ کے جانے کے بعد وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکیں گی۔ میں آؤٹ سائڈر ہونے کے باوجود سمجھ گئی۔''

''تنہائی اور اولاد سے جدائی ماں کا نصیب ہے مگر تمہاری موجودگی میں وہ اکیلی نہیں ہوں گی۔'' وہ بولا۔

''میں چند دنوں بعد اپنے گھر چلی جاؤں گی۔'' آپ کے ہوتے ہوئے چکر ضرور لگاتی رہتی کیونکہ اسکریبل کا جو مزہ آپ کے ساتھ آتا ہے وہ کسی اور سے کھیلنے میں کہاں پھر آنٹی سے میری اتنی فرینک نیس بھی نہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور پرس کندھے پر ڈال کر کھڑی ہوگئی۔

''بیٹھو یار کہاں جارہی ہو؟'' عادل نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اتنی اہمیت اور عزت افزائی بخش

کر کہاں جانا چاہتی ہو...... چلو ممی کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں اور ایسی گیم کھیلتے ہیں جس میں ممی بھی دلچسپی سے شامل ہو جائیں شاید ان کی طبیعت بہل جائے۔"

"بات تو ٹھیک ہے لیکن آنٹی کی طبیعت سنبھل نہیں رہی۔ انہیں آرام کی اشد ضرورت ہے، بیلنس ڈائٹ چاہیے انہیں، جب تک میرا قیام یہاں پر ہے میں ان کا پورا خیال رکھوں گی لیکن میرے جانے کے بعد یہ ذمے داری آپ کو اٹھانا ہوگی۔ ماموں سے یہ توقع رکھنا ہی نادانی ہے۔" وہ کوفت بھرے انداز میں بولی۔

"تم یہاں ہی رہ جاؤ ہمیشہ کے لیے۔" وہ بڑی معصومیت سے بولا۔

"ہمیشہ کے لیے؟" اس کی بات پر وہ تھوڑا حیران ہوئی۔ "آپ ہی سوچیں کہ یہ کیسے ممکن ہے؟" اس نے عادل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"مثلاً کیا سوچوں؟" وہ حیرت و تجسس سے بولا۔

"عادل بھائی کھانا آپ کے سامنے رکھا ہے نوالہ تو آپ کو ہی بنانا پڑے گا، چبانے کا کام بھی آپ کا ہے اسے زود ہضم بنانے کا نسخہ آپ ممی سے پوچھیں۔" وہ ذو معنی بات کرتے ہوئے ہنسنے لگی تھی۔

"ہیں...... لیکن ڈاکٹر تم ہو ممی نہیں۔" وہ حیرت سے بولا تو وردہ کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

کس بے وقوف سے پالا پڑا ہے۔ سنا ہے ماموں جان بھی ایسے ہی ٹھنڈے ٹھار تھے۔ ان پر کسی انچ نے بھی کام نہیں کیا اور اس نادان اور احمق کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آنٹی کو اسی چکر میں بوڑھا کر دیا ہے اس نے۔ وہ سوچتی رہی اور تلملا کر بولی۔

"عادل بھائی آپ نے زندگی کے اتنے سال کہاں گزار دیے؟"

"وردہ تم نے بات پتے کی، کی ہے۔ میں نے آنکھ کھولی تو ماں کی آغوش دیکھی اور پھر بچپن سے لڑکپن اور جوانی کا سفر اسی گود میں ممی کی بانہوں کے ہالے میں گزرا پھر بھی دین و دنیا اور حالات سے بیگانہ نہیں ہوں۔ سب جانتا ہوں ایسا بھی نادان اور احمق نہ سمجھو اور نہ ہی ایسا گھسیارا ہوں۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا تو وہ ہنستے ہوئے سائرہ آنٹی کے کمرے میں آ گئی۔ عادل وہیں بیٹھا اس کے منفرد اندازِ گفتگو کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی شرارت اور پُرشوق ذو معنی اشاروں میں پسندیدگی کی جھلک کو محسوس کرتے ہوئے اس نے سر جھٹک دیا اور اٹھ کر ماں کے کمرے میں آ گیا۔ وہ اب بھی بخار میں تپ رہی تھی۔ نیم غنودگی میں عادل کو سرگوشی کے انداز میں پکار رہی تھی۔ عادل نے ماں کے لبوں کے قریب اپنا کان لگایا تاکہ اس کے ہلتے ہونٹوں کی دبی ہوئی صدا سن سکے۔ اپنے نام کا وردسن کر وہ اچنبھے سے ماں کو دیکھنے لگا۔ دل نے خوب ملامت کی۔ وہ ماں کی اداسی و مایوسی سے باخبر تو تھا۔ آج اس نے ماں کے اصل مرض کو پکڑ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہانے کو تھیں لیکن عادل نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور ماں کے کان میں نرم آواز میں سرگوشی کی۔

"ممی آئی ایم ناٹ گوئنگ اینی ویر پلیز گیٹ ویل سون۔" عادل کی تاسف بھری آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ وہ پھر فیصلہ کن لہجے میں گویا ہوا۔ "ممی میرا آپ سے وعدہ ہے، میں آپ کو تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا آنکھیں کھولیں پلیز۔" سائرہ نے نیم وا آنکھوں سے اپنے اوپر جھکے ہوئے عادل کو دیکھا۔

"ہاں ممی، میرے انکار کے سوا اور کوئی آپشن آپ نے چھوڑا ہی نہیں۔" وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"عادل بھائی آنٹی کو آرام کرنے دیجیے۔" وردہ نے قریب آ کر نہایت اپنائیت سے کہا۔

"وردہ دیکھنا اب ممی بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی جونہی تمہاری چھٹیوں نے دغا دی ممی کی صحت وفا کا ثبوت دے گی۔" وہ خوش کن لہجے میں بولا۔

"یہ پیش گوئی اللہ کرے درست ثابت ہو لیکن عادل بھائی میں پھر بھی آنٹی کو اکیلا نہیں چھوڑوں گی، جاب شروع کرنا بہت ضروری ہے ان کے لیے، بزی ہو جائیں گی اور پھر ایک بار اپنی جاب میں مشغول ہو گئیں تو سب درست ہو جائے گا۔ مسئلہ زیادہ گمبھیر نہیں، آپ فکر نہ کریں۔ آپ اپنے باہر جانے کا انتظام کریں۔" وہ تسلی دینے کے انداز میں بولی۔

"میں کہیں نہیں جا رہا وردہ۔ مجھے اپنی ماں ہر شے سے بڑھ کر عزیز ہے حتیٰ کہ اپنی زندگی سے بھی، ممی کو مجھ سے بے پناہ پیار ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں بھی انہیں اپنی زندگی سے بڑھ کر مقدم سمجھتا ہوں۔ ایسے دو ہم سفر اور ہم راز ایک دوسرے سے جدا رہ کر زندہ کیسے رہ سکتے ہیں۔" اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ سائرہ کی سماعتوں میں عادل کی آواز میٹھا رس گھولتی چلی گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بیڈ کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہے اور اپنے پیارے بیٹے کے سنگ دنیا کی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کا حصہ بن جائے مگر نقاہت تو آنکھ کھولنے کی اجازت نہ دے رہی تھی۔ ہاتھوں کو جنبش دینا محال لگ رہا تھا۔ وہ اسی حالت میں لیٹی رہی اور ان دونوں کی باتیں سنتی رہی۔

"میں تو بالکل اکیلی نہیں ہوں، عادل کی ہمراہی میں زمانہ میرے ساتھ ہے اور جسے میرا اصل جیون ساتھی ہونا چاہیے تھا جو میرا سائبان ہوتا میرا سہارا اور وارث کہلاتا وہ خود ہی اکیلا رہ گیا۔ کبھی تو اسے تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑے گی تو وہ میری طرف مڑ کر ضرور دیکھے گا۔ مجھے آواز دے گا تو میں اس وقت بھی اس کی بانہوں میں سمٹ جانے میں خوشی اور فخر محسوس کروں گی.... کاش ایسا ہو جائے۔" اس کے کانوں میں عادل کے بچپن کی معصوم اور حسرت زدہ آواز گونج گئی۔

"ممی میرا آپ اور ڈیڈی کے درمیان سونے کو جی چاہتا ہے۔ ڈیڈی کو اپنے کمرے میں لے آتے ہیں۔ خوب مزہ آئے گا۔" عادل کی آواز پر اس کی سوچوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا اور اس نے ایک دم سے آنکھیں کھول کر سر پھیر کر ماحول اور جگہ کا اندازہ لگایا کہ وہ کہاں ہے؟

"ممی آپ بیٹھنے کی کوشش کریں، وردہ آپ کے لیے سوپ بنا رہی ہے۔ آپ کی وجہ سے مجھے بھی مل جائے گا۔" وہ ماں کے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا تو سائرہ نے ہلکی سی مسکان سے اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا اور اس کے ہاتھوں پر پیار کرنے لگی۔

☆☆☆

"آنٹی سائرہ، آپ بہت خوش نصیب ماں ہیں جن کی اولاد عادل جیسی فرمانبردار اور پیار کرنے والی ہو ان کی زندگی تو اتنی دراز ہونی چاہیے جب تک یہ جہاں قائم ہے۔" وردہ نے سائرہ کو دوا کھلاتے ہوئے رشک و مسرت سے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں اور تم جیسی جس کی بیٹی ہو تو اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" سائرہ دوا لینے کے بعد پیار بھرے لہجے میں بولی تو وردہ ہنسنے لگی۔

"میں بیمار نہ پڑتی تو تمہیں کیسے جان پاتی جس گھر جاؤ گی وہاں چار چاند لگا دو گی۔" سائرہ نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"آنٹی آج آپ کی جگہ تبدیل کرتے ہیں اس سے بھی تو مریض کے مزاج میں بہت خوش آئند تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ آج آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں گی، ماما بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ میں بھی اپنے کچھ ضروری کام نپٹا لوں گی اور عادل بھائی کو بھی آپ کی مزید قدر آ جائے گی۔" وردہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میری جان میں تمہارے گھر تو اب لڈو ہی لے کر جاؤں گی۔ تمہاری تیمارداری اور

"میری صحت یابی کی خوشی میں اور تمہیں شناخت کرنے کے شکرانے میں اور......اور......" وہ بات ذومعنی اور نامکمل چھوڑ کر خاموش ہوگئی اور کسی گہری سوچ میں چلی گئی۔

"میرا خیال ہے دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں، ان کے تیور تو اسی خوش خبری کی غمازی کرتے ہیں۔ ہر رات مل کر مووی دیکھنا، کبھی کیرم تو کبھی اسکریبل انجوائے کرنا، مل کر کھانا کھانا، گھومنا پھرنا، چھیڑ خانیاں اور شرارتیں کرنا، یہ سب پسندیدگی اور پیار کی نشانیاں ہی تو ہیں۔ میرے عادل کے لیے وردہ جیسی اسٹرانگ پارٹنر کسی نعمت سے کم نہیں ہوگی۔ میرے بچے کی پرسنالٹی میں جن خوبیوں کی کمی رہ گئی ہے، وہ تمام خوبیاں وردہ میں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب آسمان پر جوڑے بنائے تو اسی فارمولے کو مدِنظر رکھ کر رشتوں کو یکجا کردیا تھا۔ مجھے ان کے رشتے میں بے جوڑی نہیں لگتی۔ بہت مناسب، موزوں اور بھلا جوڑ لگتا ہے۔"

☆☆☆

سردیوں کی تمازت وحدت سے بھرپور دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وردہ کے اصرار پر سائرہ عقبی لان میں پودوں کا جائزہ لینے لگی۔ وردہ نے ملازمین کو بلا کر عقبی برآمدے سے کرسیاں اور دیوان نکلوا کر دھوپ میں بچھوایا اس پر گاؤتکیہ لگا کر سائرہ کا ہاتھ پکڑ کر بڑی ملائمت وانسیت سے بولی۔

"آنٹی سائرہ، آپ دھوپ سے محظوظ ہونے کے ساتھ سوپ بھی نوش فرمائیں اور اپنی تمام فرینڈز کو اپنی صحت یابی کا بھی بتائیں۔"

"وردہ جانی، میری عادات بگاڑ کر تم تو اپنے گھر چلی جاؤ گی۔" وہ آہ بھر کر بولی۔ "میں اپنی اس بیماری سے یہ جان پائی ہوں کہ دوسروں کی توجہ، ہمدردی اور لگاؤ کا مزہ ہی اور ہے، یہ ایسا سرور ہے کہ انسان کے اندر محتاجی غالب کردیتا ہے۔ انسان بے بس، لاچار اور مجبور ہوکر غیر ارادی طور پر اس میٹھے زہر کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ اس قدر اندر دھنس چکا ہوتا ہے کہ پھر چھٹکارا مشکل ہوجاتا ہے۔ تمہارے ماموں حسنات کی یہ تھیوری مجھے اب سمجھ آنے لگی ہے کیونکہ میں آج تک اس دلفریب دھوکے سے کوسوں دور رہی ہوں جبکہ حسنات بہت ہوشیار نکلے جو محتاجی کے بھنور میں پھنسے ہی نہیں۔" وہ اپنی بیماری اور پھر تیمارداری سے کیسا نتیجہ اخذ کررہی تھی۔

"آنٹی فار گاڈ سیک آپ کی سوچ اتنی نیگیٹو کیسے ہوگئی؟ اپنی اولاد کی محتاجی تو اولاد کی عزت افزائی ہے۔ اولاد پر رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ دعاؤں سے دامن بھر جاتے ہیں اور دوجہاں کی خوشیاں اولاد کی باندی بن جاتی ہیں۔ میں بھی تو آپ کی بیٹی ہوں ناں آنٹی اس لیے ایسا مت سوچیں مجھے یہ سن کر بہت اذیت پہنچی ہے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"آئی ایم سوری بیٹا...... بس نہ جانے تمہاری اس قدر خدمت ومحبت کے بعد یہ ذہن پلٹا سا کھا گیا ہے۔ شاید عادل کی شکایتوں میں سچائی ہے۔ اسے میری بے لوث محبت میں گھٹن محسوس ہونے لگی ہے۔ وہ میری عمر بھر کی توجہ اور لگاوٹ کو محتاجی کا نام دینے لگا ہے لمحۂ فکریہ ہے وردہ...... کہتا تو وہ درست ہے محتاجی، خوداعتمادی کی قینچی ہے۔" وہ گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بولی اور اخبار کو الٹ پلٹ کر ہیڈ لائنز پڑھنے لگی۔ وردہ مسکرا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مزیدار گرما گرم تھائی سوپ لے کر چلی آئی اور ٹرے سائرہ کے سامنے دیوان پر رکھ کر شیریں لہجے میں بولی۔

"آنٹی آج آپ کو میرے ہاتھ کا تھائی کھانا تناول کرنا پڑے گا ایک بات کا دھیان رکھیے گا اچھا ہو یا برا تعریف ضرور کردیجیے گا تالیوں میں بھی کمی نہیں آنی چاہیے۔" وہ خوش مزاجی سے بولی۔ "کھانے کے بعد اگر اچھا ہے تو دل کھول کر اور اگر پسند نہیں آیا تو بھی میرا دل رکھنے کے لیے مروتاً ہی سہی تالی ضرور بجا دیجیے گا۔" وہ آنکھیں مٹکاتی ہوئی مزاحیہ لہجے میں بولی۔

"تمہیں دیکھ کر فقط ڈاکٹر ہونے کا یقین ہوتا ہے مگر تمہارے اندر بے حساب ٹیلنٹ کی کسی کو خبر ہی نہیں، ہر فن مولا ہو یہ سب کچھ سیکھنے کا تمہارے پاس وقت کہاں سے آیا؟ مجھے دیکھو بٹن لگانا تو آتا نہیں باقی کاموں کو تو بھول ہی جاؤ۔ ہاں، ملازموں سے کام لینے کو آرٹ سمجھ کر خوب حکومت کی ہے ان بیچاروں پر اس کے سوا اور کچھ نہیں سیکھا۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"آنٹی آپ کو خدا کی دین پر تو مکمل بھروسا ہے ناں بس یہی سمجھیں اپنا تو کوئی کمال نہیں، اسی کی احسان مند ہوں کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے۔" وہ عقیدت مندانہ لہجے میں بولی۔

"پھر بھی ٹیلنٹ کو سامنے لانے اور نکھارنے کے لیے تگ ودو تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ تم نے وہ تمام وقت کہاں سے چرایا، میرے پاس تو سر کھجانے کا وقت نہیں ہوتا تھا۔" سائرہ حیرت سے بولی۔

"وہ وقت میں نے اپنی تمام تر چھٹیوں سے حاصل کیا تھا آنٹی.... ڈاکٹر، پروفیسر اور انجینئر بننے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنا اصل رول جو بہت عظیم اور اعلیٰ ہے اسے فراموش کردیں۔ آپ کا مسئلہ قابلِ غور ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے بچے کی تربیت اور ایجوکیشن دینے میں گزارا ہے۔ آپ کے پاس گھریلو کاموں کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔ ماموں کو انٹرسٹ ہوتا تو آپ نے امورِ خانہ داری میں بھی ماسٹرز کرلیا ہوتا۔ اصل میں آپ کو اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ آپ نے اپنے بیٹے کو باپ اور ماں کے روپ کو اپنا کر پروان چڑھایا ہے۔ اس لیے آپ کا اور میرا کہیں بھی مقابلہ نہیں۔ یو آر گریٹ آنٹی، ایسی وفادار اور بالحاظ بیوی میں نے آج تک اپنے خاندان میں تو کیا ارد گرد بھی کہیں نہیں دیکھی اور آپ جیسی ماں...... بائی گاڈ اس کائنات میں صرف ایک ہی ہے جس نے اپنے ذہنی انتشار میں مقید بیٹے کو جس طریقے سے ایجوکیٹ کیا ہے کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ آپ جیسی ماں ہی کرسکتی تھی۔ آنٹی میری وش ہے کہ میں آپ کی شخصیت کی تمام خوبیاں چرا کر آپ کی طرح قابلِ عزت وقابلِ فخر عورت کہلاؤں۔"

سائرہ سوپ پیتے ہوئے اپنی اس مداح سرائی پر رک کر وردہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی اور وہ اپنے ہی فسوں میں گم دلی جذبات ومحسوسات کا اظہار کررہی تھی۔ جس میں خوشامد نہیں سراسر سچائی اور بس سچائی ہی تھی۔

"میں تو آج تک خود کو بہت کمتر اور حقیر تصور کرتی رہی شاید تمہارے ماموں کی ری جیکشن کی وجہ ہے۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے وہ سوپ پینے لگی اور آنسوؤں کو اندر ہی اندر گرانے لگی۔ وردہ نے اس کے درد کو محسوس کرلیا سو خاموش ہوگئی۔

"بیٹا تم سے اپنی ایک خواہش شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ وردہ، عادل بہت نیک اور شریف النفس لڑکا ہے لیکن اس کی شخصیت میں اب بھی اتاؤلا پن اور بے قراری پرلے درجے کی ہے۔ باپ اپنے بچے کو بھرپور اعتماد دینے میں کمال کا کام کرتا ہے۔ بس اسی کی کمی رہ گئی میرے بچے میں۔ یہ سوچ کر میرا دل کٹ کر رہ جاتا ہے ابھی کی مثال تمہارے سامنے ہے کہ کہاں مجھ سے مشورہ لیے بغیر باہر جانے کا فیصلہ کیا اور کہاں سب کچھ ملنے اور ہوجانے کے باوجود میری خراب طبیعت نے اس کے تمام کانفیڈنس کو ہڑپ کرلیا۔ اب اس کی منتیں کرڈالی ہیں کہ وہ پہلا فیصلہ جو اس نے زندگی میں پہلی دفعہ خود کیا تھا اس پر قائم رہے۔ میں بہت خوش تھی میری بیماری تو ایسی جان لیوا نہیں تھی۔ وقتی اور عارضی دکھ تھا بیٹے کی جدائی اور دوری کا جو ہر ماں کو بے اختیاری طور پر ہوتا ہے پھر وہی ماں، بچے کے مستقبل کے لیے سنبھل بھی جاتی ہے۔ تمام باتیں اسے سمجھائی ہیں مگر ایک نہیں سن رہا، تم اسے منانے کی کوشش کرو شاید اس کے ذہن میں تمہاری بات بیٹھ جائے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا بچہ ایک ہی نقطے پر منجمد ہوکر رہ جائے۔ وہ اس ماحول سے باہر نکل کر سروائیو کرنا سیکھے گا اس کا فیصلہ سو فی صدی درست تھا۔ میں نے بہت سوچا ہے اب وہ وقت آگیا ہے جب مرغی اپنے چوزوں کو پروں سے زبردستی نکال دیتی ہے۔" وہ سوپ پیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”آنٹی میں عادل بھائی کو سمجھا چکی ہوں وہ اپنی زندگی میں کیے جانے والے اس پہلے فیصلے کو سراسر نادانی اور حماقت سمجھتے ہیں۔ آنٹی آپ بھی ریلیکس ہو جائیں۔ انہیں یہاں ہی بہت بہترین جاب مل سکتی ہے۔ آپ جانتی تو ہیں کہ یہاں پی ایچ ڈی کرنے والوں کا ریشو کیا ہے؟“ وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔ ”آٹے میں نمک کے برابر، اپنے ملک کے بچوں کو عادل بھائی کی ضرورت ہے۔“

”ہاں بیٹا، میں سب جانتی ہوں اسی فیلڈ سے میرا تعلق جو ہے۔ درحقیقت میں چاہتی ہوں کہ عادل اپنے فیصلے پر ہر حال میں ڈٹا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کامیابی دے ڈالی تو اس کی شخصیت نہایت مضبوط اور بااعتماد ہوگی جس کی اس وقت اسے ضرورت ہے۔ آخر کو مرد ہے زندگی پڑی ہے اس کے آگے، اس کا اعتماد اور پُرعزم رویہ ہی اس کا مددگار ہوگا۔ اس ملک کا بہترین شہری، اپنے خاندان اور گھر کا سربراہ بننے کا شرف اسے ہی تو حاصل ہوگا۔ وردہ میری تم سے ایک التجا ہے اسے میں نے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھا دیا ہے۔ اس کی انگلی پکڑ کر قدم اٹھانا تم سکھا دو، تم یہ سب کچھ کر سکتی ہو تم میں ایسی ایسی خوبیاں پنہاں ہیں جنہیں کوئی نہیں جانتا صرف میں ہی تمہاری رگ، رگ کی شناخت کر پائی ہوں۔“ وہ التجائیہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”میرا عادل تمہاری رفاقت میں مکمل ہو جائے گا مجھے اس کا پورا یقین ہے۔“

”آنٹی بھلا میں اس قابل کہاں ہوں، آپ کی ذرہ نوازی ہے۔“ وہ ایک دم سے گھبرا کر بولی۔

”بیٹا زور زبردستی نہیں تمہاری رضامندی پر ہی میں عصمت آپا سے بات کروں گی۔ اگر میں باہر سے کوئی اجنبی ناشناسا خاندان کی بچی لے آئی تو وہ ہمارے گھر کے ماحول کی ہسٹری سے بے خبر ہوگی۔ عادل کی شخصیت کے خلا کو جان نہیں پائے گی۔ ان میں بہت جلد فریکشن اسٹارٹ ہو جائے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ عادل کو ازدواجی میدان میں ناکامی ہو۔ وہ سنبھل نہیں پائے گا۔ اتنا بڑا دکھ سہنے کی اس میں تاب ہی نہیں لیکن اس کے باوجود مجھے تمہیں پریشرائز کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگر اس چیلنج کو بخوشی قبول کرنے کی ہمت اور حوصلہ رکھتی ہو تو یہ عمل قابلِ ستائش و قابلِ آفرین ہوگا اور مجھ پر احسانِ عظیم۔ اگر تم نے انکار کر دیا تو یہ خیال کبھی دل میں نہ لانا کہ میں خفا ہو جاؤں گی۔ ہاں دل دکھوں کی آماجگاہ میں ضرور جا چھپے گا۔“ وہ اس کا ہاتھ پیار سے پکڑ کر بولی۔ ”میرے دل میں جو تمہاری قدرو قیمت ہے اس میں رتی بھر فرق نہیں آئے گا۔ تم بھی فیصلہ سوچ بچار کے بعد کرو ویسے میری جان سوپ بہت مزے کا ہے۔ اب تالیاں بجانا ہی اصلی تعریف ہے۔ یقین جانو رتی بھر نہ تو تمہاری خوشامد کر رہی ہوں اور نہ ہی تعریف میں مبالغہ آرائی۔“ وہ موضوع بدلنے کے بہانے تالی بجاتے ہوئے بولی۔

”وردہ تم سدا خوش و خرم رہو، میرا رُواں، رُواں تمہارے لیے دعا گو ہے۔ عصمت آپا کتنی خوش قسمت ہیں۔ مجھے یاد ہے جب تم اپنے بڑے، بہن بھائیوں سے خاصے گیپ کے بعد پیدا ہونے والی تھیں تو گھر میں قیامت سی برپا ہو گئی تھی کہ یہ بچہ عمر کے اس حصے میں سوائے شرمندگی کے اور کچھ بھی لے کر آنے والا نہیں۔ جب تم پیدا ہوئیں تو میں نے آپا کی فیلنگز میں پل بھر میں تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔ اولاد شے ہی ایسی ہوتی کہ اس کا معصوم چہرہ اور لاغر سا وجود دیکھ کر ہی پیار کا سمندر امڈ آتا ہے۔“ وہ شگفتہ لہجے میں بولے جا رہی تھی اور وردہ، سائرہ کے عقل مندانہ اقدام پر اسے حیرت سے تکے اور سوچے جا رہی تھی۔ پیغام بھی پہنچا دیا اور فیصلہ بھی اسی پر چھوڑ دیا اور کس دوراندیشی سے خود کو تمام سچویشن سے نکال بھی لیا۔

”مجھے آپ جیسی عظیم، دانش مند اور بے لوث محبتیں نچھاور کرنے والی عورت بننا ہے۔“ اس کے منہ سے بے اختیار ہی یہ الفاظ سرگوشی کے انداز میں نکلے۔ وہ سوچتی ہوئی دیوان سے اٹھی اور عالمِ تذبذب میں ٹرے اٹھا کر کچن کی جانب چل دی۔

جاری ہے

دوسرا رخ

قرۃ العین ہاشمی



”ایک بار پھر اچھی طرح سے سوچ لو۔ تم اب اکیلا نہیں ہو...... تمہارے ساتھ ایک اور زندگی بھی اب منسلک ہے۔“ فروا نے فون پہ اپنی دوست سے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہوں...... اچھا!“ اُس نے دوسری طرف سے آتی آواز سنتے ہوئے ایک نظر سامنے لگی وال کلاک پر ڈالی جو دن کے بارہ بجا رہی تھی۔

”ایسا کرو...... پرسوں اتوار ہے...... تم سارا

دن میرے ساتھ، میرے گھر پر گزارو...... پھر ہم اس مسئلے پر آرام سے بات کریں گے۔ ابھی مجھے امی (ساس) کو کھانا دینا ہے پھر بات ہوگی۔'' اس کے ذہن نے جلدی سے آگے کا لائحہ عمل طے کیا اور سیمی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر فون رکھ کر کچن کی طرف بھاگی۔ اس کی ساس ساڑھے بارہ بجے تک دوپہر کا کھانا کھا لیتی تھیں۔ اور اس میں دیر سویر ان کے مزاج پہ بہت گراں گزرتی تھی۔

''ضرور ان کے اندر کسی آرمی آفیسر کی روح سرایت کرگئی ہوگی جو مزاج میں اتنا رعب اور فطرت میں حاکمیت ہے، ہر کام گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ کرنا ہوتا ہے انہیں۔'' فروا نے روٹی بیلتے ہوئے بے ساختہ سوچا تو ایک نرم سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کرلیا۔

☆☆☆

فروا اور سیمی کا ساتھ کالج کے زمانے سے تھا۔ دونوں کی دوستی بہت گہری ہونے کے ساتھ، ساتھ مضبوط بھی تھی۔ بی اے کرنے کے فوراً بعد فروا کی شادی ہوگئی تھی جبکہ سیمی نے پرائیویٹ ایم اے اردو کیا تھا۔ اس دوران ایک مناسب رشتہ آنے پر اس کی شادی بھی ہوگئی۔ یوں دونوں سہیلیاں ایک ہی شہر میں بیاہی گئیں تو ملنا جلنا رکا نہیں۔ ابھی سیمی کی شادی کو مشکل سے سات مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ سیمی اپنے شوہر حمید سے ناراض ہوکر میکے آبیٹھی اور اب اس نے اپنے شوہر سے علیحدگی کا مطالبہ کردیا تھا باوجود اس کے کہ وہ چار مہینے کی پریگنینٹ تھی۔ مگر ضد اور غصے کی وجہ سے وہ ہر چیز بھلائے بیٹھی تھی۔ فروا اس کے تمام حالات سے بہت اچھی طرح سے واقف تھی۔ اسے لگتا تھا کہ سیمی زندگی کا صرف ایک رخ دیکھ رہی ہے اور اس طرح جلد بازی میں اتنا بڑا فیصلہ کرنا بے وقوفی ہے۔

زندگی میں کبھی کوئی فیصلہ کرتے وقت صرف اس کے ظاہری رخ کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ بعض دفعہ ہمارے مسئلوں کا حل باطنی رخ میں ہوتا ہے جس سے ہم آگاہ ہونے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور فروا اپنی پیاری سہیلی کو اسی دوسرے رخ سے روشناس کروانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''تم نہیں جانتیں وہ لوگ کس، کس طرح مجھے ذہنی اذیت پہنچاتے ہیں۔'' سیمی نے تھکے تھکے انداز میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا کر ابھی فارغ ہوئے تھے۔ فروا کا شوہر عمران اور اس کا دو سالہ بیٹا عبدالہادی اندر کمرے میں ٹی وی دیکھ رہے تھے اور ان سہیلیوں کو تخلیہ مل گیا تھا۔

ساس کھانا کھانے کے بعد آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں جاچکی تھیں۔ اب انہوں نے عصر کے وقت ہی اٹھنا تھا۔ اسی لیے فروا، سیمی کو اپنے ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔ سیمی صبح ہی اس سے ملنے آگئی تھی۔ وہ خود بھی بہت پریشان تھی۔ اسی لیے فروا سے باتیں کرکے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

''حمید اپنی پانچ بہنوں میں سب سے چھوٹے اور اکلوتے بھائی ہیں۔ ماں، باپ کے مرنے کے بعد بہنوں کا میکا حمید کے دم سے ہی قائم ہے۔'' سیمی نے آہستہ، آہستہ اسے حالات بتانے شروع کیے۔

''بس کیا بتاؤں...... ہر وقت کوئی نہ کوئی بہن میکے آئی ہوتی ہے مع اپنے شوہر اور بچوں کے...... اور ان کی جتنی بھی آؤ بھگت کرلو مگر انہیں تو کوئی نہ کوئی اعتراض، کسی نہ کسی بات پر ضرور ہوتا ہے۔ جس سے حمید کا موڈ فوراً آف ہوجاتا ہے اور انہی چھوٹی، چھوٹی باتوں کو لے کر آئے روز ہم دونوں کے جھگڑے ہونے لگے۔ پتا نہیں کیسے لوگ ہیں۔ کوئی بات ہو، کوئی چھوٹی سے لے کر بڑی خوشی کی خبر ہو، سب مل کر اکھٹے ہوجاتے ہیں اور خوب گپیں لگتی ہیں،

قہقہے لگتے ہیں اور میں......'' وہ روہانسی ہورہی تھی۔

''میں کسی نوکرانی کی طرح صرف ان کی خدمت پہ مامور میزیں سجانے کے لیے ہر وقت حاضر...... بس مجھ سے نہیں ایسے رہا جاتا اسی لیے میں امی کے گھر آگئی۔'' سیمی نے اپنی رُوداد فروا کو سنائی۔

''بھئی اس روز، روز کی اذیت اور تکلیف سے بہتر ہے کہ ابھی ہی کوئی مناسب قدم اٹھالیا جائے۔ میں نے حمید کے آگے اپنے دو مطالبے رکھے ہیں یا تو ساری زندگی اپنی بہنوں سے نہیں ملیں یا پھر مجھے ہی چھوڑ دیں۔ بھئی میں کسی کی غلامی نہیں برداشت کرسکتی اور نہ کسی کی بے جا باتیں سن سکتی ہوں۔'' سیمی نے تنفر سے کہا۔ اسی وقت اس کا موبائل بجنے لگا...... اس نے ایک نظر موبائل اسکرین پر ڈالی اور ''ہونہہ'' کہہ کر کال رد کردی۔

''جس دن سے آئی ہوں روز کسی نہ کسی نند کا فون آجاتا ہے مجھے منانے کے لیے۔ حمید بھی دن میں کئی بار فون کرتے ہیں مگر میں بھی اپنی بات پر اوّل روز کی طرح قائم ہوں۔'' اس نے بڑے فخر اور غرور سے فروا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو بہت خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سیمی اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال دے۔

اکثر آندھی چلنے کے بعد موسم بہت اچھا ہوجاتا ہے۔ جب تک گرد اڑ، اڑ کے بیٹھ نہیں جاتی، سانس گھٹتی ہوئی سی لگتی ہے اور ہر چیز گرد آلود...... مگر بارش کے صرف چند چھینٹے ہی اس گرد کو ختم کرنے کے لیے بہت ہوتے ہیں... اور بعد کے سارے موسم اور منظر روشن اور واضح ہوجاتے ہیں۔

فروا بھی ''گرد'' کو اُڑتے دیکھ رہی تھی۔ جس نے سیمی کی زندگی کے سب سے خوب صورت رشتوں اور احساس کو مٹی، مٹی کردیا تھا۔

☆☆☆

''فروا......'' سیمی کے ساتھ باتوں میں مگن فروا کے کانوں میں جب ساس کی چیختی آواز پہنچی تو گھبرا کر اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ جو شام کے پانچ بجنے کا اعلان کررہی تھی۔

''او مائی گاڈ...... امی کو چائے دینا بھول گئی۔'' فروا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور سیمی کو ابھی آئی کہہ کر باہر بھاگی۔

''سوری امی...... سیمی کے ساتھ باتوں میں پتا ہی نہیں چلا کہ ٹائم اتنا ہوگیا ہے۔ آپ اپنے کمرے میں چلیں، میں پانچ منٹ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

سیمی دھیرے، دھیرے چلتی ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ دروازے پر پردہ ہونے کی وجہ سے اس کا نظر آنا ممکن نہیں تھا...... مگر وہ ٹی وی لاؤنج کا منظر پردے کی اوٹ سے... بہ آسانی دیکھ سکتی تھی۔ جہاں فروا گھبرائے ہوئے لہجے میں اپنی ساس کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

ایک طرف تو اسے اپنی اور ساس کی باتیں سیمی کے سن لینے کا ڈر تھا اور دوسری طرف عمران اندر کمرے میں ٹی وی دیکھنے میں محو تھا اگر وہ اپنی ماں کو اس طرح غصے میں بولتے دیکھ لیتا تو فروا کی خیر نہیں تھی۔ عمران کا موڈ پھر کئی دن خراب رہتا تھا۔ اپنی ماں کے لیے اسے فروا کی ذرا سی بھی بے پروائی بہت کھٹکتی تھی۔

مگر کبھی کبھی ہوتا وہی ہے جس بات سے ہم ڈر رہے ہوتے ہیں وہ ہو کر رہتی ہے۔

''کیا ہوا امی......؟'' عمران اسی وقت کمرے سے باہر نکل آیا۔ اور ماں اور بیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اپنی بیوی سے خود ہی پوچھ لو...... میں نے کچھ کہا تو یہ کہے گی کہ ماں نے بیٹے کے کان بھرے ہیں۔'' فروا کی ساس ناگواری سے کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ فروا نے ڈرتے،

ڈرتے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھا جو غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

”تم بھی میری ماں کو خوش نہیں رکھ سکتیں۔ حالانکہ دوسری ساسوں کی طرح انہوں نے کبھی تمہیں کچھ نہیں کہا اور نہ ہی مجھ سے تمہاری شکایت کی...... مگر تم......“ عمران نے درشتگی سے کہا اور غصے سے پاؤں پٹختا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

فروا نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ پلٹی تو سیمی کو ڈرائنگ روم کے دروازے پر حیرت زدہ سا کھڑا دیکھ کر زبردستی مسکرا دی۔

کبھی کبھی کسی دوسرے کی زندگی کا کوئی رخ ہمیں آئینے دکھا جاتا ہے اور اس میں نظر آنے والا منظر وہی ہوتا ہے۔ جس سے ہم نظریں چرا رہے ہوتے ہیں۔

”تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تمہاری ساس اتنی سخت ہیں اور عمران بھائی......“ عمران اور امی کو چائے ان کے کمروں میں پہنچا کر فروا اور سیمی اپنے، اپنے کپ اٹھا کر لان میں چلی آئیں۔ موسم کافی خوشگوار تھا۔ شام کے وقت چلتی ہوا ذہن کو بہت سکون پہنچا رہی تھی۔ لان چیئر پر بیٹھتے ہوئے سیمی نے جھجکتے ہوئے فروا سے وہ سوال پوچھ لیا جو کافی دیر سے اس کے ذہن میں اٹھ رہا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے سیمی......! میری ساس اپنی بڑھتی عمر اور بیماری کی وجہ سے کچھ چڑچڑی ضرور ہو گئی ہیں مگر دل کی بری نہیں ہیں۔“ فروا نے آہستگی سے وضاحت کی مگر اس کا لہجہ بہت افسردہ اور دکھی سا تھا۔

”وہ دیکھنے میں تو بہت فٹ اور صحت مند لگتی ہیں اور عمران بھائی! ان کو کیسے کور کرو گی تم......؟“ سیمی نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تو فروا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”سیمی! زندگی کسی کے لیے بھی بہت سہل نہیں ہوتی ہے اور خاص کر شادی کے بعد...... سسرال میں ہر لڑکی کو بہت ہمت اور حوصلے سے کام لینا پڑتا ہے۔ گھر قربانی کے بغیر نہیں بنتے ہیں۔ اور چاہے کچھ بھی ہو یہ قربانی ہمیشہ عورت کو ہی دینی پڑتی ہے۔“ فروا نے دکھے تھکے، تھکے لہجے میں کہا تو سیمی اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”بس یہی بات میں تمہیں کافی دنوں سے سمجھا رہی ہوں مگر تم اپنی ضد، انا اور غصے کی وجہ سے کچھ سن اور سمجھ ہی نہیں رہیں اور دیکھو قدرت نے خود ہی تمہیں وہ موقع فراہم کر دیا......“ فروا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر فروا، تمہارے اور میرے حالات میں کافی فرق ہے۔“ سیمی نے کمزور سے لہجے میں اپنا دفاع کرنا چاہا۔

”نہیں سیمی! فرق تمہارے اور میرے حالات میں نہیں، تمہارے اور میرے مزاج میں ہے۔“ فروا نے مسکراتے ہوئے اس کی تصحیح کی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ سیمی نے الجھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”مطلب بہت آسان ہے، رویّوں کی مار سہنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا اور وہ بھی خاص کر سسرال میں...... جہاں آپ کی ”خوبی“ بھی دوسروں کی نظر میں ”خامی“ بن جاتی ہے۔“ فروا نے اِک گہری سانس لے کر کہا۔

”پتا نہیں مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“

سیمی نے بے چارگی سے اس کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے خود اپنے آپ کو الجھا لیا ہے سیمی......! اگر تمہیں ایک طرف اپنی نندوں کی، تمہارے گھر اور شوہر پہ اجارہ داری نظر آتی ہے پر دوسری طرف سب کی محبت اور فکر تمہیں نظر نہیں آتی۔“ فروا نے سنجیدگی سے کہا تو سیمی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”محبت اور فکر...... کیا مطلب......؟“ سیمی نے حیرانی سے دُہرایا۔

”ہاں بھئی محبت اور فکر...... ہو سکتا ہے کہ جہاں تم کھڑی ہو، تمہیں منفی پہلوؤں کے سوا کچھ نہیں نظر آ رہا ہو مگر جہاں سے میں دیکھ رہی ہوں۔ غیر جانبدار ہو کر تو مجھے ان سب میں بہت سی مثبت باتیں بھی نظر آ رہی ہیں اور تم غلط......“

”میں اور غلط......“ سیمی نے حیرت زدہ ہو کر اس کی بات کاٹی۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، میں کیوں غلط ہوں، اتنا تو ان سب کا خیال کرتی ہوں۔“ وہ اپنی بات پر مُصر تھی۔

”ہاں تم غلط ہو، بہت سی باتوں میں...... تم بہت اچھی طرح سے جانتی اور سمجھتی ہو کہ تم ان کی اکلوتی بھابی ہو...... ان کے اکلوتے بھائی کی بیوی...... عام سی بات ہے کہ ان کی سب امیدیں تم لوگوں سے ہی وابستہ ہوں گی ناں...... میکے کا مان بھی اور امید بھی...... اپنی ہر چھوٹی بڑی خوشی یا دکھ وہ تم ہی دونوں سے تو شیئر کریں گی اور اگر تم یہ سوچو یا مطالبہ کرو کہ تمہارا شوہر اپنی بہنوں سے ملنا چھوڑ دے، انہیں اپنے گھر بلانا چھوڑ دے وہ بھی صرف تمہاری خاطر، تمہارے کہنے پر تو ایسا کس طرح ممکن ہے۔“ فروا سے بہت اچھے طریقے سے سمجھا رہی تھی۔

”دیکھو وہ جن کے ساتھ اس کا عمر بھر کا ساتھ رہا ہے انہیں چھوڑ دے اور تمہاری بات مان لے، جس سے آشنائی یا رشتہ بنے ابھی سال بھی پورا نہیں ہوا تم کبھی ایمانداری سے سوچو، کیا تم اپنے گھر میں، اپنے بھائی، بھابی کے لیے بھی یہی پسند کرو گی، نہیں ناں...... تو پھر دوسروں سے یہ مطالبہ کیوں......؟“ فروا نے حالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا تو اس کی باتوں پر سیمی کا رنگ اڑ چکا تھا۔

”دیکھو! میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ مگر کبھی کبھی کسی اپنے کو تباہی سے بچانے کے لیے اُسے کڑوی گولی بھی دینی پڑتی ہے۔“ فروا اس کی اڑتی رنگت سے اس کے دل کی بدلتی کیفیت جان رہی تھی جبھی اس کا ہاتھ تھام کر بہت رسانیت سے اسے سمجھا رہی تھی۔

”میں صبح سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تمہاری سسرال سے بار بار تمہیں کوئی نہ کوئی فون کر کے منانے کی کوشش کر رہا ہے باوجود اس کے کہ تم ان کا فون کاٹ دیتی ہو یا ریسیو ہی نہیں کرتی ہو مگر پھر بھی وہ اس رشتے کو بنانا چاہتے ہیں پھر تم خود کیوں۔ اپنی ضد میں خود کو ہی نقصان پہنچانا چاہتی ہو؟“

”کیسے ممکن ہے؟ اور کس طرح میں یہ صبر اور برداشت کا گھونٹ بھر لوں! جب زبانوں کے نشتر لگتے ہیں تو روح تک زخمی ہو جاتی ہے۔ صبر کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا فروا......“ سیمی نے اس کی باتوں پر خود سے ہار مانتے ہوئے تھکے، تھکے لہجے میں کہا۔

”مما......“ اسی وقت دو سالہ عبدالہادی ماں کو

قابلِ غور

نماز کو چھوڑنا اللہ کو ناراض کرنا ہے۔

فجر کی ادائیگی...... چھ منٹ

ظہر کی ادائیگی...... پندرہ منٹ

عصر کی ادائیگی...... آٹھ منٹ

مغرب کی ادائیگی...... دس منٹ

عشا کی ادائیگی...... اٹھارہ منٹ

ٹوٹل ستاون منٹ ہیں...... کیا آپ کے پاس اپنے رب کے لیے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف ایک گھنٹا نہیں۔

مرسلہ: کائنات عبدالحلیم، میرپور خاص

خوب صورت بات

☆ احسان جتلانا سخاوت کی فضیلت کو تباہ کر دیتا ہے۔

☆ زبان کا وزن بہت ہی ہلکا ہوتا ہے مگر کم لوگ اسے سنبھال پاتے ہیں۔

اقوالِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

مرسلہ: ایلیا مہدی...... کراچی

پکارتا ہوا اس کی طرف بھاگتا ہوا آیا۔

''جی مما کی جان......'' فروا نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھرلیا اور محبت سے چومنے لگی۔

وہ اپنی توتلی زبان میں ماں سے باتیں کرنے لگا۔ سیمی مسکراتے ہوئے اس خوب صورت منظر کو دیکھ رہی تھی پھر عبدالہادی ماں کی گود سے اترا اور پاس پڑی گیند سے کھیلنے لگا۔ فروا نے اسے گیند کے ساتھ کھیلتے دیکھا اور رخ موڑ کر سیمی کے چہرے پر نگاہ ڈالی جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''سیمی! تم ابھی پوچھ رہی تھی ناں کہ یہ کیسے ممکن ہوتا ہے؟ اتنا صبر کہاں سے آجاتا ہے۔ تو جان لو یہ سب ممکن ہوتا ہے...... اس کی وجہ سے......'' فروا نے پاس کھیلتے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنے بچے کے لیے ہر ماں کو صبر کے یہ گھونٹ خوشی سے پینے پڑتے ہیں۔ انہیں اچھا مستقبل دینے کے لیے، انہیں ذہنی توڑ پھوڑ اور نامکمل شخصیت بننے سے بچانے کے لیے ایک ماں کو سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔'' فروا نے سیمی کے پاس آکر کہا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''تم خود سوچو...... تم بھی تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی ہو۔ اپنے بچے کو اس کے حقیقی رشتوں سے دور کرکے تم اس کے ساتھ زیادتی کروگی اور بالفرض اگر تم علیحدگی کا راستہ اختیار کر بھی لیتی ہو تو اس کے بعد کہیں نہ کہیں اور تمہاری شادی ضرور ہوگی، تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ تمہیں اس وقت فرشتے مل جائیں گے۔ کیا کوئی اور تمہارے ساتھ، ساتھ تمہارے بچے کی بھی ذمے داری اٹھائے گا؟ یہ نہ ہو کہ کل کو تم اپنی اولاد کے سامنے مجرم بن جاؤ جو صبر اور برداشت کا مظاہرہ تم کسی نئے رشتے کو بنانے میں کروگی ہی تم اپنے اسی رشتے کو بچانے میں لگادو۔ کچھ صبر اور ہمت سے کام لو...... وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ حالات ایک جیسے نہیں رہتے۔ ابھی نئی، نئی بات ہے اسی لیے سب بہنیں آتی ہیں۔ آہستہ، آہستہ یہ روٹین بھی بدل جائے گی۔'' فروا نے اسے اچھی طرح سمجھایا تو سیمی اس کے ہاتھ کو تھام کر رو دی۔ فروا کو اسی بارش کا انتظار تھا۔ جس نے رشتوں پر پڑی ساری ''گرد'' کو صاف کردینا تھا اور بعد کے سب ہی منظر آنکھوں کو بھلے معلوم ہوتے۔

☆☆☆

فروا اپنے بیٹے اور شوہر عمران کے ساتھ جب وہاں پہنچی تو ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ فروا نے نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں تو اسے وہ نظر آگئی۔ اس نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

''شکر ہے تم آگئیں۔'' سیمی نے پیار سے فروا کو گلے لگاتے ہوئے کہا اور پھر.... ساتھ کھڑے اپنے شوہر حمید کو بتانے لگی۔

''آج اسی کی وجہ سے ہمارا گھر آباد ہے اگر اس دن فروا مجھے زندگی کا دوسرا رخ نہ دکھاتی تو شاید آج ہم اس خوشی کو ساتھ منانے سے محروم رہ جاتے۔'' سیمی نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا تو فروا نے اسے گلے لگالیا پھر سیمی اسے اپنی نندوں سے ملوانے لگی۔ سب بہت پیار سے مل رہی تھیں پھر فروا نے آگے بڑھ کر گلابی فراک میں ملبوس، سیمی کی بیٹی کو اپنی گود میں لے لیا۔ جس کے عقیقے کی خوشی کی تقریب آج منائی جارہی تھی۔

اس کے نرم و نازک گال پر پیار کرتے ہوئے اس نے ڈھیروں دعائیں دیں۔

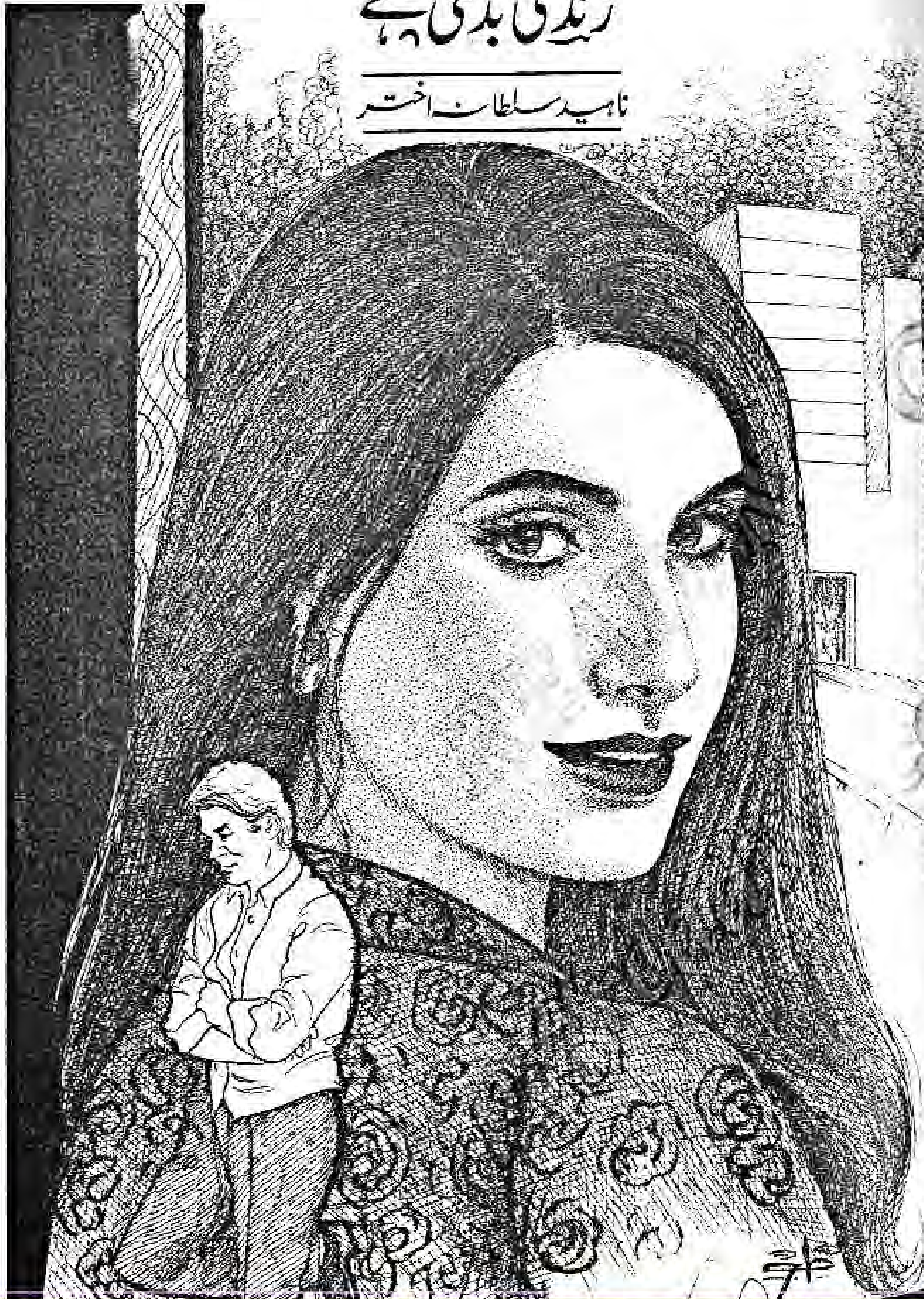
''زندگی اتنی ہی مکمل اور خوب صورت ہے اگر ہم صبر اور برداشت سے کام لیں تو...... بہترین صلہ ملتا ہے اور اگر صلے میں عزت بھری زندگی مل جائے تو یہ تو کوئی نقصان کا سودا نہیں ہوا ناں......'' ننھی سی گڑیا کو سیمی کی گود میں دیتے ہوئے فروا نے اس سے سرگوشیانہ انداز میں کہا اور دونوں مسکرادیں۔

حادثہ چشم زدن میں ہوا تھا...... حادثہ اچانک ہی ہوتا ہے۔

صبح آٹھ سوا آٹھ کا وقت تھا۔ مونس حسب معمول اپنی موٹر سائیکل پر یونیورسٹی جارہا تھا۔ موٹر سائیکل کی رفتار معمول کے مطابق تھی۔ بہت آہستہ نہ بہت تیز۔ وہ عادت کے مطابق گھر سے ایسے وقت نکلا تھا کہ بہت اطمینان سے اپنا پہلا پیریڈ شروع ہونے سے قبل یونیورسٹی پہنچ سکتا تھا۔ پہلی کلاس نو بج

زندگی بدلتی ہے

ناہید سلطانہ اختر



کردس منٹ پر لیتا ہوتی تھی۔ یوں گویا ایک گھنٹے کے لگ بھگ وقت تھا اور اس کے گھر سے یونیورسٹی کی مسافت کوئی چالیس منٹ لیتی تھی۔ سو اسے کوئی جلدی نہ تھی۔ وہی معمول کی سُبک رفتاری...... ویسے بھی یونیورسٹی میں ملازمت ملنے کے بعد باعزت طریقے سے یونیورسٹی آنے جانے کے لیے موٹر سائیکل خریدتے وقت اس نے ماں کو زبان دی تھی کہ موٹر سائیکل ہمیشہ احتیاط سے چلائے گا۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں، میں ہمیشہ موٹر سائیکل ہی چلاؤں گا۔ ارے امی آپ کا بیٹا لائق فائق ہے۔'' ڈگری ہاتھ میں آتے ہی اسی یونیورسٹی نے جہاں کل تک وہ خود اسٹوڈنٹ ہوا کرتا تھا اب جاب آفر کردی۔ ''آپ دیکھیے گا امی انشاء اللہ بہت جلد چار پہیوں والی گاڑی لے لوں گا۔'' اس نے ماں سے کہا۔

''انشاء اللہ!'' ماں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس کا باپ اسی یونیورسٹی کے ایڈمن سیکشن میں سینئر کلرک تھا۔ باپ کی اس حیثیت پر اسے اپنے یونیورسٹی فیلوز کے سامنے کبھی خفت نہیں ہوئی تھی۔ رزقِ حلال میں کیا خفت۔ اسے اور اس کی تینوں بہنوں کو تعلیم دلوانے کے لیے اس کے باپ نے برسوں یونیورسٹی کی ملازمت کے علاوہ ایک پرائیویٹ دفتر میں جز وقتی ملازمت بھی کی تھی۔ بہنوں میں دو اس سے بڑی تھیں ایک چھوٹی۔ سب سے بڑی بہن نے بی اے، بی ایڈ کیا تھا۔ ایک سرکاری اسکول میں نوکری مل گئی تھی اور اپنے ہی ایک ہم پیشہ سے شادی کے بعد وہ اپنی سسرال میں باعزت زندگی بسر کررہی تھی۔ منجھلی بہن نے تعمیرات میں ڈپلوما لیا تھا اور ایک تعمیراتی فرم میں ملازمت کررہی تھی۔ کچھ عرصہ قبل ہی اس کی شادی اپنے پھوپی زاد سے ہوئی تھی جو ایک کوچنگ سینٹر چلا رہا تھا۔ سب سے چھوٹی بہن انجینئرنگ یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ خود وہ انگریزی ادب میں اعزاز کے ساتھ ماسٹرز ڈگری حاصل کرچکا تھا۔ دورانِ طالبعلمی اس کی ذہانت اور فطانت سے زیادہ اس کی حیرت انگیز یادداشت نے اسکول سے یونیورسٹی تک اس کے اساتذہ، ہم مکتبوں اور دیگر کو انگشت بدنداں رکھا تھا۔ انگریزی ادب اس کا پسندیدہ مضمون تھا اور اس مضمون سے اس کی خصوصی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اسے یہ تک ازبر ہوتا کہ کس نصابی کتاب کے کس صفحے پر کس نثر نگار یا شاعر کی تحریر موجود تھی۔ تعلیم ... مکمل ہوتے ہی یونیورسٹی میں اس کے اپنے ہی شعبے کی جانب سے جاب آفر ہوگئی جو اس نے اپنے باپ کی خواہش اور بہی خواہوں کے مشورے پر فوراً ہی قبول کرلی تھی۔ بے روزگاری کے اس دور میں یہ باعزت ملازمت خدا کی طرف سے اس محنت کا انعام تھی جو اس نے اپنے زمانۂ اسکول سے یونیورسٹی میں تحصیلِ علم کے دوران کی تھی۔ ماں اور باپ دونوں خوش تھے کہ ان کا فرمانبردار اور چہیتا بیٹا اپنی منزل پر جا پہنچا تھا۔ دونوں اب اس کی شادی کرنے کے آرزومند تھے مگر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک جانے کا متمنی تھا۔

یونیورسٹی میں ملازمت کرتے ہوئے اسے تیسرا برس تھا۔ ملازمت شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد ہی اس نے قسطوں پر ایک نئی موٹر سائیکل خرید لی تھی جس کی وہ تمام اقساط بھی مقررہ مدت سے قبل ہی ادا کرچکا تھا۔ موٹر سائیکل نے اس کی زندگی میں سہولت ہی نہیں رومانویت بھی پیدا کردی تھی۔ یونیورسٹی بس کے بجائے وہ اپنی موٹر سائیکل پر یونیورسٹی آتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی باپ بھی بہ ضرورت اس کے پیچھے بیٹھ جاتا ... ویسے اس کے باپ کو یونیورسٹی بس میں اپنے ساتھیوں سے گپ شپ کرتے ہوئے یونیورسٹی آنا جانا زیادہ پسند تھا مگر کبھی

اسے بہ ضرورت بیٹے کی موٹر سائیکل پر بھی آنا جانا پڑ جاتا۔ باپ کو اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر اسے خوشی بھی ہوتی اور فخر بھی۔ خوشی اس بات کی کہ جس باپ نے اس کے اور اس کی بہنوں کے لیے انتھک محنت کی تھی وہ اب اس کی خدمت کے لائق ہوچکا تھا اور فخر اس بات پر کہ باپ کی محنت نے ایک باعزت مقام پر پہنچا دیا تھا۔ باپ کی ریٹائرمنٹ میں اب کچھ زیادہ دن نہیں تھے۔ تین کمروں کا مکان انہوں نے دورانِ ملازمت ہی بنالیا تھا۔ دو بیٹیاں بیاہ دی تھیں۔ تیسری کا مستقبل بھی روشن دکھائی دیتا تھا۔ بیٹے کا گھر بسانے، اس کے بچے اپنی گود میں کھلانے اور ایک پُرسکون ریٹائرڈ زندگی گزارنے کا خیال صرف اس کے باپ کو ہی نہیں ماں کو بھی شاد رکھتا مگر اس حادثے نے ان کی ساری آرزوئیں، سارے خواب تلپٹ کرکے رکھ دیے۔

وہ تو معمول کی رفتار سے موٹر سائیکل پر جارہا تھا۔ عقب سے ایک تیز رفتار کار پُرشور ہارن دیتی لہراتی ہوئی آگے آئی اور وہ اپنی موٹر سائیکل کو اس کار سے ٹکرانے سے بچانے کی کوشش میں سڑک کے کنارے، کنارے پہلو بہ پہلو کھڑے سیمنٹ کے بھاری بلاکس سے ٹکرایا تھا۔ موٹر سائیکل زور سے اچھلی۔ اس کی گرفت سے نکلی اور خود اس سمیت زور سے سڑک پر آگری۔ حادثہ ہوگیا تھا اس کی موٹر سائیکل جسے وہ روزانہ فلالین کے نرم و ملائم مستطیل جھاڑن سے خوب رگڑ رگڑ کر چمکایا کرتا تھا۔ لاوارث لاشے کی طرح ایک طرف پڑی تھی اور وہ خود چاروں خانے چت بے حس و حرکت کولتار کی گہری سرمئی سڑک پر پڑا تھا اس کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ سڑک پر رواں دواں ٹریفک میں رخنہ پیدا ہوا۔ چند گاڑیاں رک گئیں اور جن گاڑی نشینوں نے رکنا ضروری یا مناسب خیال نہ کیا وہ سڑک پر پڑی موٹر سائیکل اور اس کے مضروب سوار پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے مقام حادثہ پر اکٹھے ہوجانے والے افراد سے بچ بچا کر گزرنے لگے۔ وہ کار جس کی تیز رفتاری سے اپنی موٹر سائیکل کو کوئی نقصان نہ پہنچنے دینے کی خاطر وہ حادثے سے دوچار ہوگیا تھا جو ایک لمحے کو رکے بنا نہ جانے کتنی آگے جاچکی تھی۔ اس کی اپنی زندگی سہم کر ٹھٹک گئی تھی۔

اس کے اردگرد جمع ہوجانے والے افراد میں سے بعض اپنے موبائل فون نکال کر اس کی اور اس کی موٹر سائیکل کی تصویریں کھینچنے لگے۔ کسی نے ایمرجنسی اسکواڈ کو کال کرنے کی صدا لگائی۔ ایک انسان دوست نے اپنے سیلولر فون سے ایمرجنسی نمبر کو کال دی۔

ایمبولینس کے پہنچنے تک اس کے زخمی جسم سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ چہرے کے نقوش ہی بدل گئے تھے۔ نیلاہٹ اور سوجن نے اس کی وجاہت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ حادثے کی شدت نے اسے گردو مافیہا سے بے خبر کردیا تھا۔ لوگ موبائل فون کو کوستے، اس کی برائیاں کرتے اور اس کے غیر اخلاقی نقصانات گنواتے نہیں تھکتے لیکن اس وقت اگر اس کا موبائل اس کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید اس کے متعلقین کو اسے پیش آنے والے حادثے کی خبر دینا اتنا آسان نہ ہوتا۔

اس کا باپ یونیورسٹی اسٹاف بس میں یونیورسٹی جارہا تھا جب اسے اس کے موبائل پر اس حادثے کی خبر ملی۔

''زخمی ہوش میں نہیں تھا۔ ایمبولینس اسے اسپتال لے گئی ہے۔ موٹر سائیکل قریبی چوکی پر جمع ہے آپ فوراً سول اسپتال پہنچیں۔'' اطلاع دینے والے نے کہا۔ باپ دم بخود رہ گیا۔ اس کا جوان اور وجیہہ بیٹا جس کا نام اس نے بہت پیار سے مونس رکھا تھا۔ مونس سے یک لخت ''زخمی'' کیسے بن گیا تھا وہ اس کی جان، دوست، یار، امید، خوشی، جینے کی امنگ تھا۔

☆☆☆

اس اندوہ ناک حادثے کی خبر اس کے باپ سے

ماں اور بہنوں تک اور یونیورسٹی میں بھی پہنچ گئی تھی۔

''سر مونس......ایکسیڈنٹ؟'' شعبۂ انگریزی میں اس کے اسٹوڈنٹس شاکڈ تھے۔

''وہ تو بہت احتیاط سے موٹر سائیکل چلاتا ہے۔'' شعبے میں اس کے سینئرز کہہ رہے تھے۔

''مونس...... ایکسیڈنٹ...... غلطی کسی اور کی ہوگی۔'' ساتھیوں کو یقین تھا اور ان کا یہ یقین غلط بھی نہ تھا۔ غلطی اس تیز رفتار کار کے ڈرائیور کی تھی جو اس کے عقب سے اپنی کار کو لہراتا بل دیتا اچانک اس کی موٹر سائیکل کے سامنے آیا اور چشم زدن میں اس سے اس کی زندگی کے وہ تمام حسین خواب چھین کر چلتا بنا جو وہ اپنے مستقبل کے بارے میں دیکھا کرتا تھا۔ بیرونِ ملک، اسکالرشپ، اعلیٰ تعلیم، عمدہ ملازمت، اچھا گھر، گاڑی، والدین کی خدمت، کسی اچھی سی لڑکی سے شادی، خوش حال فیملی اور پُرسکون زندگی...... لمحے بھر کا حادثہ کیا... کچھ چھین کر لے گیا تھا اس سے۔

وہ اسپتال کے شعبۂ انتہائی نگہداشت میں اللہ کے رحم و کرم اور اپنے معالجین کی نگہداشت میں پڑا تھا۔

''دعا کریں۔'' اس کی مسیحائی کرنے والے اس کے گھر والوں سے کہہ رہے تھے۔ حادثہ شدید تھا۔ اسکین رپورٹ کے مطابق اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز مایوسی سے کہہ رہے تھے وہ اس حادثے کی شدت کو سہہ بھی جاتا تو معذور رہے گا۔

''معذور ہی سہی وہ زندہ تو رہے۔'' ماں دل ہی دل میں اپنے رب کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔

شعبہ انتہائی نگہداشت کے باہر راہ داری میں اس کے والدین، بہنیں، بہنوئی، دیگر رشتے دار، باپ کے چند دوست، اس کے اپنے دو تین ساتھی اور متعدد اسٹوڈنٹس دلگیر کھڑے اس کی زندگی اور صحت یابی کی دعائیں کر رہے تھے۔ رب چاہے تو تنکے میں جان ڈال سکتا ہے۔ اس کی سانس کی لے تو ابھی چل رہی تھی۔

☆☆☆

دعاؤں نے کام دکھایا۔ اسے ہوش آ گیا مگر اس کے دوبارہ اپنے پیروں پر اٹھ کر چلنے پھرنے کے امکانات معدوم تھے۔ اس کے خواب بکھر گئے تھے۔ ماں باپ کی آرزوئیں دم توڑ گئی تھیں۔ بہنیں دل برداشتہ تھیں۔ اکلوتے بھائی کی شادی کا انہیں کتنا ارمان تھا۔ دل میں کیسی، کیسی تمنائیں تھیں۔ ہر اچھی لڑکی پر ان کی نظریں اسے اپنی بھابی بنانے کے لیے ٹھہر جاتی تھیں۔ بھائی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے کی خواہش نہ ہوتی تو شاید اب تک کوئی لڑکی ان کی بھابی بن کر گھر بھی آ چکی ہوتی۔ اب کون آمادہ ہوگی؟ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اب ان کے بھائی کو باقی ساری زندگی جسمانی معذوری کے ساتھ گزارنی ہوگی۔ وہ کبھی اپنے قدموں پر نہیں چل پائے گا۔ اسے اپنی باقی زندگی بستر پر پڑے رہ کر بسر کرنا ہوگی۔

صدمہ کتنا ہی گہرا ہو زندگی پر اس کے اثرات آہستہ، آہستہ مندمل ہوتے چلے جاتے ہیں اور جتنا بڑا صدمہ ہو خدا انسان کو اتنی ہی جلدی اس پر صبر کرنے کا حوصلہ بھی دے دیتا ہے سو اس کے چاہنے والوں کو بھی اللہ نے اس سانحے پر صبر کرنے کی قوت دی۔ وہ بھاگتی دوڑتی زندگی سے بستر پر آ گیا تھا اور اس کی زندگی کی احتیاجات بستر پر ہی پوری کی جانے لگی تھیں۔

یونیورسٹی میں اس کے شاگرد اسے بری طرح مس کر رہے تھے۔ اس کا پڑھانے کا دل نشیں انداز، قابلِ رشک حافظہ، دوستانہ اور بہی خواہانہ رویہ انہیں رہ، رہ کر اس کی کمی کا احساس دلاتا گو اس کی جگہ ایک نئے استاد کو مامور کر دیا گیا تھا مگر اس کی بات ہی اور تھی۔ شاگرد اس کی علمیت، غیر معمولی یادداشت اور متاثر کن طریقۂ تدریس سے مرعوب رہتے۔ اس کی کلاس میں کسی کو عدم توجہی اور کسی بدتمیزی کی جرأت نہ ہوتی۔ مسحور و مبہوت وہ اس کا لیکچر سنے جاتے۔ ان

کی تدریس کے دوران ان کی نظریں اس کے چہرے یا تختۂ سیاہ پر مرکوز رہتیں۔ نئے استاد کی کلاس میں تو جی بھر کر بدتمیزیاں کی جاتیں۔ نئے استاد کا رخ تختۂ سیاہ کی جانب ہوتے ہی کبھی کوئی طالب علم سیٹی بجانے لگتا، کوئی گنگنانے لگتا...... کبھی باجماعت فرش پر جوتے رگڑنے کی آوازیں شور سا بپا کر دیتیں۔ لڑکیاں چپکے، چپکے موبائل پر لگی رہتیں۔ مونس واقعی کمال کا ٹیچر تھا جو اچھے، برے، لائق، نالائق ہر شاگرد کو ہمہ تن اپنی جانب رہنے پر مجبور رکھتا۔ سربراہِ شعبہ اسے ''بورن ٹیچر'' کہا کرتے تھے۔ ماں کے خیال میں اسے نظر لگ گئی تھی۔

وہ دن بھر بستر پر پڑا رہتا۔ اس حادثے نے اسے حوائجِ ضروریہ کے لیے بھی دوسروں کا محتاج بنا دیا تھا۔ ماں باپ سے اپنے رشتے کی قوت کا اصل اندازہ اسے اس حادثے کے بعد ہی ہوا۔ وہ نہ ہوتے تو کون اس کا اتنا خیال رکھتا، دو بہنیں اپنی ذمے داریوں میں گھری ہوئی تھیں تیسری اس کا بھلا کس حد تک خیال رکھ سکتی تھی۔ اسے ابھی ایک دن اپنے گھر چلے جانا تھا۔ اس کی معذوری تو اب زندگی بھر کا روگ تھا۔ ماں باپ جب تک حیات تھے غنیمت تھا۔ ایک حادثے نے اس کی زندگی کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ دن بھر اپنی سوچوں میں گم رہتا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی اتر آئی تھی۔ کمرے کی چھت پر آنکھیں لگائے وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچے جاتا۔ ماں اور باپ دونوں ہی اپنی زندگی کا بیشتر سفر طے کر چکے تھے۔ ان کے بعد......؟ ایک سوالیہ نشان اسے مضطرب کر دیتا۔ ماں اس کی آنکھوں میں اتری اداسی چننے بیٹھ جاتی۔

''پریشان نہ ہوا کر میرے بچے...... اللہ سب ٹھیک کرے گا۔'' اس کے بالوں میں دھیرے، دھیرے اپنی انگلیاں گھماتے ہوئے وہ اسے تسلی دیتی۔

''اللہ کو ٹھیک کرنا ہوتا تو وہ......'' شیطان مردود اسے ورغلانے کی کوشش کرتا۔

''بیٹا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ تمہاری زندگی بچ گئی۔'' باپ اس کا مورال بلند رکھنے کی کوشش کرتا۔

''اس زندگی سے تو مر جانا بہتر تھا۔'' شیطان اسے خدا کی ناشکری پر اکساتا۔ ''یہ بھی کوئی زندگی ہے بے مقصد، بے یار و مددگار۔ دن بھر عضوِ معطل بنے بستر پر پڑے رہنا اور اپنے قدموں پر چلتے پھرتے لوگوں کو بے بسی سے دیکھے جانا۔''

گھر والوں نے اس کے سرہانے رکھی میز پر کچھ کتابیں چُن دی تھیں مگر اس کی طبیعت ہی ان کی طرف مائل نہ ہوتی پھر ایک روز سربراہِ شعبہ نے اسے فون کیا اور مزاج پرسی کے بعد کہا۔

''مونس صاحب آپ کے کچھ اسٹوڈنٹس پڑھنے کے لیے آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں۔''

''سر! میں پڑھانے کے قابل کہاں رہا۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''ہمت کیجیے مونس صاحب، ماشاء اللہ اپنے سبجیکٹ پر تو آپ کو دسترس ہے ہی۔ پڑھائیں گے تو اسٹوڈنٹس کو بھی فائدہ ہوگا۔ آپ کو بھی مصروفیت کے ساتھ کچھ انکم بھی ہو جایا کرے گی۔ وہائٹ بورڈ اپنے پلنگ کے نزدیک رکھ لیجیے گا۔ سلسلہ ایک بار بن گیا تو پھر چلتا ہی رہے گا۔''

''دیکھ لیں سر۔''

''دیکھنا کیا ہے بس بسم اللہ کرنی ہے۔ آپ ہاں کریں تو اسٹوڈنٹس کو روانہ کروں آپ کے پاس۔''

''ٹھیک ہے سر۔''

پہلے دن دو اسٹوڈنٹس تھے۔ دونوں نوجوان لڑکے، تیسرے دن ایک اور طالب علم آ گیا۔ ہفتہ بھر گزرا تو سات ہو گئے۔ چھ لڑکے اور ایک لڑکی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا کمرا شاگردوں سے بھر گیا۔

زیادہ تعداد لڑکوں کی تھی مگر چند لڑکیاں بھی تھیں۔ باپ نے گھر کے بڑے کمرے میں فولڈنگ چیئرز رجما کر اس کا بستر بھی وہیں لگا دیا۔ گھر میں مکتب لگ گیا۔ زندگی کے بگڑے نین نقش پھر سے سنورنے لگے۔ کتابوں سے اس کا ٹوٹا رشتہ پھر جڑنے لگا تھا۔ وہ اپنے بستر پر نیم درازی کی حالت میں شاگردوں کو پڑھاتا اور وہ جذب کی کیفیت میں اس کی طرف متوجہ رہتے مگر وہ ایک لڑکی...... جس کا نام فلزا طاہر تھا اس کی توجہ کہاں بھٹکی رہتی تھی کیوں وہ اسے گاہے گاہے ٹوکنے پر مجبور ہو جاتا۔

''فلزا!'' وہ چونک کر سنبھل بیٹھتی۔ کچھ محجوب سے ہو جاتی۔ باقی لڑکے، لڑکیاں اسے دیکھنے لگتے۔ وہ نظریں چرا کر ان سب سے انجان بن جاتی۔ ویسے بھی وہ عام حالات میں بھی اپنے ہم جماعتوں سے اسی طرح انجان بنی رہتی تھی۔ باقی لڑکیاں اسے مغرور گردانتیں، لڑکے اس میں دلچسپی لیتے مگر وہ کسی کو لفٹ نہ کرواتی مگر اس کے لیے دیے رہنے کے باوجود ہم جماعت لڑکوں نے اس کا تاریخ، جغرافیہ کھنگال ڈالا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کا باپ ایک بسکٹ فیکٹری کا مالک تھا۔ وہ شہر کے ایک پوش علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے گھر کے پورچ میں تین گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ ڈرائیور اسے یونیورسٹی چھوڑنے اور لینے کے لیے آتا اور مونس کے گھر بھی وہ اپنی گاڑی ہی میں آتی جاتی۔ جب تک کلاس لگی رہتی، ڈرائیور گھر کے باہر گاڑی کے ساتھ اس کا انتظار کرتا۔ کبھی کبھار وہ خود بھی گاڑی ڈرائیو کر کے لے آتی۔

مونس کے گھر والے اس کی اس نئی مصروفیت پر قدرے مطمئن تھے۔ زندگی میں کوئی مصروفیت، کوئی مقصد ہونا ضروری ہے ورنہ تو زندگی افکارِ پریشاں بن جاتی ہے۔ گھر میں تدریس کا سلسلہ شروع ہو جانے سے مونس کا دھیان بھی کچھ بٹ گیا تھا۔ اپنے شاگردوں کے جانے کے بعد وہ اگلے دن کے لیکچر کی تیاری میں لگ جاتا۔ جسمانی معذوری سے اس نے اور اس کے گھر والوں نے مفاہمت کر لی تھی کہ اس کے بنا چارہ بھی نہ تھا۔ تاہم مستقبل کے بارے میں اپنی، اپنی جگہ ان سب کو فکر رہنے لگی تھی۔ جب تک والدین حیات تھے اس کی زندگی کی ضرورتیں بستر پر پڑے، پڑے بھی پوری ہو رہی تھیں۔ ماں وقت پر ناشتا، کھانا ٹرے میں لگا کر اس کے بستر پر پہنچا دیتی۔ اس کا ہاتھ منہ دھلانے میں مدد دیتی۔ اس کے کپڑے دھوتی، استری کرتی، اس کے بستر کی چادر ہر دوسرے دن بدلنا نہ بھولتی۔ باپ اسے حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے اور اسے نہانے دھونے میں مدد دیتا۔ بازار سے اس کی ضروریات کی چیزیں اسے لا کر دیتا مگر ماں باپ دونوں ہی عمر کے اس حصے میں تھے جہاں کسی بھی وقت حکمِ ربی آسکتا تھا۔ ان کے بعد......؟ ان کے بعد کیا ہوگا یہ فکر خود مونس کو بھی ستاتی اور اس کے والدین کو بھی۔ جن کے سارے ارمان ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ بستر پر دوسروں کی محتاجی کی زندگی گزارتے بھائی کو اب کون اپنی بیٹی دے گا... اس بیچارے کا تو یہ حال تھا کہ بستر پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے بھی اسے کسی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

☆☆☆

کلاس ختم ہونے کے بعد اسٹوڈنٹس حسبِ معمول اپنی، اپنی کرسیاں کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ لگا کر رکھنے کے بعد اس کے کمرے سے جانے لگے تو اس نے فلزا کو مخاطب کیا۔

''فلزا!''

''جی سر۔'' وہ چونک کر ٹھٹک گئی۔

''ٹیسٹ میں آپ کی پرفارمنس خاصی الارمنگ رہی۔''

''آئی نو سر۔''

''کیوں......؟ کیوں ہوا ایسا؟''

''پتا نہیں سر۔'' اس نے بڑی بے نیازی سے شانے اچکائے۔

''پتا ہونا چاہیے ورنہ فائنلز میں......''

''کوئی بات نہیں سر...... ری پیٹ کر لوں گی۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ مونس نے اسے تعجب سے دیکھا۔

''سر...... سر لگا لوں گی۔ فیل ہونے والوں کے لیے سمر کیمپ تو لگے گا ناں؟''

''لیکن فیل کیوں ہوا جائے۔ سمر لگانے کی ضرورت کیوں پڑے۔ یو کین ڈو...... آپ کر سکتی ہیں، میں جانتا ہوں آپ میں پوٹینشل ہے۔ آپ کر سکتی ہیں۔''

''لیکن میں نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیوں؟'' مونس نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

''بس۔'' مونس کی نگاہوں میں ڈولتی حیرانی گہری پڑ گئی۔

''کرنا نہیں چاہتیں تو کیوں اپنے پیرنٹس کا پیسہ اور اپنا وقت ضائع کر رہی ہو؟'' وہ اسے دیکھنے لگی۔ ''بولو...... جواب دو۔''

''میں جا سکتی ہوں سر؟'' اس نے شانے اچکائے۔

''میں دیکھتا ہوں کلاس کے دوران بھی تم... اٹینٹو نہیں ہوتی ہو... پتا نہیں کہاں توجہ بھٹکی رہتی ہے تمہاری۔''

''کہیں نہیں سر...... میں ہوتی ہوں پوری توجہ کے ساتھ۔ اب جا سکتی ہوں؟''

اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دروازے کی طرف مڑ گئی۔

''عجیب لڑکی ہے۔'' اس کے جانے کے بعد مونس نے سوچا۔ ''امیروں کے یہی نخرے ہوتے ہیں...... میں کرنا نہیں چاہتی۔'' اس نے جی ہی جی میں اس کے الفاظ دُہرائے۔ ''ہوتی کوئی ضرورت

علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی

☆ خودی کے ذریعے تسخیرِ کائنات ممکن ہے۔

☆ انسان کی خودی اگر معرفتِ عشق اور محبت کے ذریعے قوی، مضبوط اور مستحکم ہو جائے تو اس کا اثر تسخیرِ جہاں ہے اور اگر انسان کی خودی مستحکم اور قوی نہ ہو تو اس کا نتیجہ محکومی و غلامی ہے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

☆ اگر انسان کی خودی مستحکم و محکم ہو جائے تو اس وقت انسان کا ہاتھ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بن جاتا ہے اور فقط اس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

پنجہ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشتِ اُو شق می شود

☆ خودی کا محکم ہونا یعنی انسان کا کمال تک پہنچنا ہے۔ جب انسان کمال تک پہنچتا ہے تو قربِ الٰہی حاصل کر لیتا ہے اور پھر اس قربِ الٰہی میں ایک مقام تک جا پہنچتا ہے جس سے انسان خداوند تعالیٰ کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہی انسان اگر خواہشات اور ہوا و ہوس کا تابع ہو جائے تو پھر وہ جانوروں سے بھی پست تر مخلوق بن جاتا ہے۔ انسان دوسری مخلوقات کا فرمان ماننے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ انسان فرمان دینے والا پیدا ہوا ہے مگر وہ اپنے ہی جیسے انسان کو اپنی فرعونیت کے ذریعے اپنا تابع نہیں بنا سکتا...... لیکن کمزور خودی والے انسان اپنے جیسوں کے تابع بہ آسانی بن جاتے ہیں۔ انسان کو فقط خدا کے سامنے یعنی صرف اپنے رب کے حضور جھکنا ہے جبکہ باقی تمام کائنات اس کے سامنے مسخر ہونی چاہیے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اقتباس از لیکچر سید جواد نقوی

مرسلہ: فضہ بتول، بہارہ کہو

مند جسے جلد سے جلد تعلیم مکمل کرکے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی خواہش ہوتی تو کہتی...... میرا بس چلے تو ایک سمسٹر میں دو پاس کروں۔"

☆☆☆

فلزا خود بھی متعجب تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ وہ مونس سے پڑھنے کے لیے اس کے گھر جاتی تو اس کا دھیان تمام وقت بھٹکا رہتا۔ اسے مونس سے غیر معمولی ہمدردی محسوس ہوتی۔ ایکسیڈنٹ سے پہلے اپنے دوسرے ہم جماعتوں کی طرح وہ مونس کی غیر معمولی یادداشت اور اپنے تدریسی مضمون پر اس کے مکمل عبور کی وجہ سے مرعوب و متاثر رہا کرتی تھی مگر اب کچھ اور بات تھی۔ پڑھانے کے دوران جب بھی وہ پانی پینے کو گلاس میں پانی انڈیلتا تو اس کا جی چاہتا اٹھے اور اسے اپنے ہاتھوں سے گلاس میں پانی انڈیل کر دے۔ جب وہ آن ایزی فیل کرنے لگتا تو اس کا دل چاہتا ہے اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر ایزی فیل کرنے میں مدد دے۔ کلاس کے دوران بیشتر وقت یہی سوچتی رہتی کہ وہ اس معذوری کے ساتھ اپنی ضروریاتِ زندگی سے کیونکر نبرد آزما رہتا ہوگا۔ بڑی تکلیف دہ زندگی تھی مگر اسے تشویش کیوں؟ شہر کے اندیشے میں قاضی جی دبلے! اسے تو بس اتنا سروکار ہونا چاہیے تھا کہ لیکچر میں کوئی ابہام محسوس کرے تو سوال کرے۔ جواب پائے اللہ اللہ خیر صلا مگر وہ تو اس سے یوں ہمدردی محسوس کرتی تھی جیسے کوئی بہت قریبی اپنا...... وہ تو بڑی مغرور اور اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لانے والی لڑکی تھی۔ یہ اسے کیا ہوگیا تھا۔ ایک آرام دہ گھر کی باسی اور پرتعیش زندگی کی عادی ہوکر وہ کیوں ایک چھوٹے سے گھر کے محبوس سے کمرے میں پڑے معذور استاد کے لیے اپنے دل کو عجیب سی کیفیت میں گھرا پانے لگی تھی؟ کیوں اسے یونیورسٹی سے زیادہ مونس کے گھر میں اس کے بیڈ کے اطراف ہونے والی کلاس کا انتظار رہنے لگا تھا۔ اس کے نا آراستہ بالوں اور بڑھی شیو کو دیکھ کر کیوں وہ اپنے دل کو دھیمی، دھیمی آنچ میں پگھلتا محسوس کرتی تھی۔ اسے اپنے دل کی حالت پر حیرت تھی کہ یہ دل تو پہلے کبھی کسی کے لیے اتنی ہمدردی اور تشویش میں گرفتار نہ ہوا تھا مگر احتیاط ضروری تھی کہ اس کے اور مونس کے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔

☆☆☆

سمسٹر میں وہ بڑے تشویش انگیز انداز میں فیل ہوئی اور یہ وہی جانتی تھی کہ قصداً......

"کیوں اتنا برا رزلٹ آیا؟" مونس نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"آپ کو نہیں تو پھر کس کو پتا ہوگا؟"

"ری پیٹ کرلوں گی۔"

"وہ تو ظاہر ہے...... مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟"

اس سوال کا جواب اس کے پاس تھا مگر وہ دینا نہیں چاہتی تھی۔ پاس یا فیل ہونا اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اسے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے اب سب سے قیمتی اور بامعنی وہی وقت لگتا جو وہ اس کے چھوٹے سے کمرے میں جہاں اس کے شاگرد کرسی سے کرسی ملائے ٹھس ٹھنسا کر بیٹھے ہوتے تھے۔ بظاہر اس کا لیکچر سنتے ہوئے مگر بباطن اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارتی تھی۔ اس کے استغراق کو توڑنے کے لیے وہ کبھی کبھار اچانک ہی اس سے کوئی سوال پوچھ لیتا۔

"سوری سر!" اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

"بی اٹینٹو۔" وہ تنبیہ کرتا۔

اس کی پکڑ پر اس کے ساتھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگتے۔ وہ ان سے نظریں چرا لیتی۔ انہیں کیا پتا اس کا دل کہاں بھٹکا رہنے لگا تھا اور اس عدم توجہی میں کیا سُرور تھا۔

☆☆☆

سمسٹر ری پیٹ کرنے پر بھی نتیجہ کچھ مختلف نہیں رہا۔ مونس نے اسے اوروں کے سامنے شرمندگی سے بچانے کے لیے علیحدگی میں بات کی۔

"فلزا آپ کو یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے یہ وقت کا بھی زیاں ہے پیسے کا بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اب یہاں نہیں آنا چاہیے۔"

"سر میں صرف آپ ہی کے سبجیکٹ میں تو فیل نہیں ہوئی ہوں۔"

"ہاں مگر میں اپنے سبجیکٹ کے لیے جواب دہ ہوں۔"

"کوئی جواب دہی نہیں سر...... میں ساری زندگی بھی آپ کے سبجیکٹ میں فیل ہوتی رہوں تو نہ مجھے کوئی فرق پڑتا ہے نہ میرے پیرنٹس کو۔"

"مگر مجھے تو پڑتا ہے...... کمزور سے کمزور اسٹوڈنٹ بھی نکل گیا اور آپ......"

"نو پرابلم سر۔" وہ بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے مسکرائی۔

"کوائٹ اسٹرینج۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

فلزا کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

☆☆☆

"او گاڈ پھر......" مونس نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے مسکرائی۔

"فلزا!"

"یس سر۔"

"آپ کو کچھ احساس ہے؟" مونس نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

"جی سر۔"

"وہاٹ ڈو یو مین بائے جی سر؟" اس کے لہجے میں کرختگی تھی۔

"سر میں پاس ہونا ہی نہیں چاہتی۔"

"کیا مطلب؟" چونکا۔

"مجھے پاس ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"وہاٹ......؟"

کمرے میں وہی دونوں تھے بس۔ وہ کلاس کا وقت شروع ہونے سے خاصا پہلے آگئی تھی۔ اسے اپنا رزلٹ بتانے کے لیے۔

"پاس ہونے سے دلچسپی نہیں تو یونیورسٹی اور یہاں آکر کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہو؟"

"میں تو یہاں آنے کا انتظار کرتی ہوں سر۔ آپ کی کلاس میں گزارا ہوا وقت مجھے دن کے چوبیس گھنٹوں میں سب سے اچھا اور کارآمد لگتا ہے۔"

مونس کو نادانی بہتی محسوس ہوئی۔ فلزا کی گہری نگاہوں کی تاب نہ لا کر اسے خود اپنی نظریں چرا لینا پڑیں۔

"میں بیٹھ سکتی ہوں سر؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کرسی کھینچ کر اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے...... رحم آتا ہے مجھے آپ پر۔" مونس نے بلبلا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی تھی، ناگواری تھی۔

"آئی ہیٹ دیز ورڈز۔" اس نے اسے ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھا۔ "مجھے نفرت ہے اس بات سے کہ کوئی مجھ پر رحم کھائے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ ٹپٹا کر شرمندگی سے بولی۔

"آپ کا جو بھی مطلب تھا۔" اس کے لہجے میں ہنوز ناگواری تھی۔

"سر اب جب میں آپ کو دیکھتی ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے...... افسوس کا لفظ تو برا نہیں لگا آپ کو؟"

"افسوس کیوں ہوتا ہے آپ کو؟"

"کیونکہ...... کیونکہ میں نے ایکسیڈنٹ سے پہلے والے سر مونس کو بھی دیکھ رکھا ہے۔ آپ کتنے ایکٹیو ہوا کرتے تھے۔"

"زندگی میں کبھی کچھ بھی ہوسکتا ہے...... کوئی

بھی حادثہ۔"

"آئی فیل سوری فاریو۔"

"پھر وہی بات۔" اس نے سرزنش کی۔

"سوری سر۔"

"میرے لیے سوری فیل کرنے کے بجائے آپ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ آپ کو فیل نہیں ہونا چاہیے۔"

"اوکے۔"

"پرامس؟"

"یس۔"

"گڈ۔"

☆☆☆

نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سمسٹر پاس کرلیا۔ اسے زبان جو دی تھی۔ اگلے سمسٹرز میں نئے اساتذہ سے پڑھنا تھا۔ اسے مونس کے گھر آ کر کلاس لینے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

"سر آپ کے کہنے پر پاس تو ہوگئی ہوں مگر اب یہاں کیسے آؤں گی؟" اس نے مونس کے سامنے بڑی گمبھیرتا سے اپنا سوال رکھ دیا۔

"تمہیں اب آنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"آئی ول مس یو۔" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

"جب ہم کچھ عرصہ ایک معمول کے ساتھ گزارتے ہیں تو اس کے عادی ہو جاتے ہیں لیکن جونہی ہمارا دوسرا معمول شروع ہوتا ہے ہم اپنے سابقہ معمول کو بھول جاتے ہیں۔" مونس نے رسانیت سے کہا۔

"یہ معمول کی بات نہیں ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔

"تو پھر کاہے کی بات ہے؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بن گیا۔

"آئی لو یو۔"

وہ دم بخود رہ گیا۔

"آپ نے سنا میں نے کیا کہا؟"

وہ چپ رہا۔

"بولیں۔" اس نے تقاضا کیا۔

"ہاں...... سن لیا ہے۔" مونس کو اپنی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"آئی لو یو۔" اس نے یک گونہ بے تابی سے دوبارہ کہا۔

"اگلے سمسٹر کی تیاری کرو۔"

"نہیں کرنی مجھے اگلے سمسٹر کی تیاری۔ آئی ایم لیسٹ انٹرسٹڈ۔" اس کے لہجے میں کسی ضدی بچے کی طرح ایڑیاں رگڑنے والی کیفیت تھی۔

"آہستہ۔" اس نے ٹوکا۔ "اندر آواز جائے گی۔"

"جائے...... مجھے پروا نہیں۔"

"مگر مجھے ہے۔"

"یہ تو کرتے رہیں۔" وہ بپھر کر بولی۔

"فلزا!"

"آئی لو یو۔" وہ گڑگڑائی۔

"لوگ سمجھیں گے میں اپنی معذوری کی آڑ میں لڑکیوں کو ورغلا تا رہا ہوں۔ خود پر نہیں تو مجھ پر رحم کرو۔"

"آپ کو لوگوں کی پروا ہے' مجھ پر رحم نہیں آتا...... مری جا رہی ہوں میں آپ کی محبت میں۔"

"او گاڈ۔" اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"آئی لو یو...... لو یو۔"

"میرا خیال ہے تمہیں اب جانا چاہیے۔"

"نو۔" وہ اس کی ڈھٹائی پر اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی پھر ایک، ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "مجھے آپ سے محبت ہے...... اوکے!"

وہ پھر چپ رہا۔ ماں اور باپ کا مشترکہ کمرا اور اس کا اپنا کمرا ساتھ، ساتھ تھے۔ آوازیں اس کمرے تک پہنچ کر خود اس کے اپنی قریبی رشتوں کے

دلوں میں اس کے لیے بدگمانی کے در کھول سکتی تھیں۔ کون یقین کرے گا اس انہونی کا۔ ایک خوبرو امیر زادی کو جو اپنی بیش قیمت گاڑی اس کے گھر کی تنگ سی گلی میں لا کھڑی کرتی تھی کیا پڑی تھی کہ بستر پر پڑے معذور ٹیچر کو لفٹ کروائے۔ جو سنے گا یہی کہے گا کہ معصوم لڑکی کو اسی نے اپنی معذوری کی آڑ میں اپنے دام میں پھنسایا ہوگا۔ کیسی افتاد آ پڑی تھی اس پر انجانے میں۔

"میں اسی طرح یہاں آتی رہوں گی۔"

"کیوں...... اب کس لیے؟"

"بس میری مرضی۔"

"لوگ یہ نہیں پوچھیں گے کہ اب کیوں؟"

"آئی ڈیم کیئر۔"

وہ چپ رہا۔

"اوکے؟" وہ مشروط انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"اوکے۔" بحث کا موقع نہ تھا۔

"آپ مجھے منع نہیں کریں گے۔"

"رائٹ...... مگر روزانہ نہیں...... کبھی کبھی۔"

"روزانہ یا...... یہ میری مرضی ہوگی۔"

"اوکے۔" اس نے سپر ڈال دی۔ نک چڑھی، خود سر، امیر زادی کا کیا اعتبار کوئی سیاپا ڈال دیتی۔ "مگر اسٹڈیز پہلے۔" اس نے سر آئی بلا کو قدرے ٹالنے کے لیے دبی زبان سے کہا۔

"میری اسٹڈیز میرا مسئلہ ہے آپ کا نہیں...... آپ کے سبجیکٹ میں میرا پاس ہونا آپ کا مسئلہ تھا وہ میں نے حل کر دیا۔"

"پڑھائی لازم ہے فلزا۔" اس نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کرلوں گی بابا پڑھائی بھی کرلوں گی، آپ اس کی فکر نہ کریں۔"

"ماسٹرز کم از کم تھری پلس جی پی اے کے ساتھ۔"

"نو رکھیں گے فور بھی دے دوں گی۔"

"یہ تو کمال ہوگا۔"

"ویسے آپ کا عشق مجھے یہ کمال دکھانے نہیں دے گا۔"

وہ چاروں خانے چت ہوگیا کہ اس کی سوئی تو مسلسل اسی انہونی پر انتہائی مستقل مزاجی سے اٹکی ہوئی تھی۔

"آئی لو یو۔" اس نے پھر کہا۔

مونس کو اپنی عزت اور نیک نامی کی ناؤ بے رحم موجوں کے دوش پر محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆

عشق اور مشک چھپائے نہ چھپ سکنے والا مقولہ خود کو ثابت کرکے رہا۔ فلزا نے نہ صرف مونس کے پاس آنا نہیں چھوڑا بلکہ اس کے منع کرنے کے باوجود اس کے گھر والوں سے بھی پینگیں بڑھانا شروع کردیں۔ کبھی اپنی سالگرہ کا کیک کھلانے کے بہانے۔ کبھی مونس کی سالگرہ کا کیک پہنچانے کے بہانے، کبھی اپنے آبائی علاقے سے آئی سوغات پہنچانے کے بہانے... تو کبھی مونس کی چھوٹی بہن کو اپنے ساتھ اپنی کسی دوست، ٹیلر یا شاپنگ کے لیے ساتھ لے جانے کے بہانے۔ کبھی وہ مونس کے والد کے لیے انگلستان میں اپنے چچا کی جانب سے بھجوایا گیا پنیر لے آجاتی کبھی مونس کی والدہ کے لیے اسپین سے درآمد شدہ زیتون کے خالص تیل کا ڈبا۔ مونس کی بہن کو گاہے گاہے تحائف دینا تو اس نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ مونس کے گھر والے اس کی اس عنایات کو شروع، شروع تو مونس سے اس کی ہمدردی پر محمول کرتے رہے مگر پھر کھٹک گئے ہمدردی کے یہ انداز نہیں ہوتے۔

"مونس بیٹے یہ لڑکی ہر دوسرے دن آجاتی ہے اکثر کچھ لے کر۔ آخر کیوں؟" ماں نے ایک دن مونس سے کہا۔

"مجھے کیا معلوم۔" وہ بولا۔

"تمہیں نہیں تو پھر کسے معلوم ہوگا؟"

"تعلقات میں نے بڑھائے یا آپ لوگوں نے؟" معذوری کے احساس اور دواؤں کے سائڈ ایفیکٹس نے مونس کے مزاج کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔

"کوئی خود سے آپ کے گھر میں آجائے تو آپ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر تو نہیں نکال سکتے ناں۔" ماں نے نرمی سے کہا۔

"تو مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں؟"

"میں تو ایک بات کہہ رہی تھی۔ طبیعت کی تو بڑی اچھی، بڑی ہمدرد لڑکی ہے۔" وہ خاموش رہا۔

"وہ تو بستر پر پڑے رہنے اور دواؤں کے مسلسل استعمال سے ہوگیا ہے بدمزاج۔ تم اس لڑکی کو سمجھاؤ کہ روزانہ نہ آیا کرے۔ بہانہ کردو کہ محلے والے روزانہ دروازے کے سامنے اس کی گاڑی کھڑی دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ یہ کون ہے۔" مونس کے باپ نے بیوی سے کہا۔

"برا مان گئی تو؟"

"بھلے سے مانے، یہ بھی تو مناسب نہیں کہ کبھی بلاناغہ اور کبھی ایک آدھ دن کے ناغے سے وہ اپنی گاڑی ہمارے گھر کے باہر لا کھڑی کرتی ہے جبکہ اس سے ہمارا دور پار کا بھی کوئی رشتہ نہیں۔"

"مونس سے تو اس کا استاد شاگرد کا رشتہ ہے ناں۔"

"اب وہ بھی نہیں ہے۔ مونس کو اسے جتنا اور جب تک پڑھانا تھا پڑھا چکا۔"

"وہ اتنے پیار اور اپنے پن سے آتی ہے۔ مجھے اسے منع کرتے اچھا نہیں لگے گا۔"

"تو پھر مجھ سے آئندہ یہ مت کہنا کہ یہ لڑکی روز، روز کیوں آجاتی ہے۔"

"نہیں کہوں گی۔"

پھر ایک روز بڑی عجیب بات ہوئی۔ مونس کی چھوٹی بہن نائلہ اور اس کی دوستوں کے مابین موبائل پر ایک دوسرے سے ایک سوال پوچھ کر اس کا جواب طلب کیا جا رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟

نائلہ نے یہ سوال اپنے موبائل فون سے فلزا کو بھی فارورڈ کردیا۔ فلزا کے جواب نے نائلہ کو چونکایا ہی اس کی ماں کو بھی متعجب کردیا۔ فلزا نے اس کے سوال کے جواب میں لکھ بھیجا۔

"ہمیشہ کے لیے تمہارے گھر آجانا۔"

ماں نے باپ کو بتایا۔ باپ نے بیوی کو عجیب نظر سے دیکھا۔ "اور گھساؤ کسی کی جوان لڑکی کو گھر میں، اس عمر میں لڑکیاں ایسی ہی بے وقوف ہوتی ہیں...... اور بے وقوف امیر زادی...... استغفراللہ۔"

"لے اب وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں ہے۔" ماں نے کہا۔

"تو پھر بھلا کتنی بے وقوف ہے۔" باپ نے پھر اسے گھورا۔

"بیٹا بھلا چنگا، صحتمند ہوتا اور آپ ایسی بات کرتے تو دل کو لگتی بھی...... ارے ایک معذور آدمی کے لیے ایسی لڑکی بھلا اس طرح کب سوچے گی۔ اس بےچاری کا مطلب تو شاید یہ ہوگا کہ میرے لیے مال و دولت کی کوئی اہمیت نہیں، سادہ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ نائلہ کا دل رکھنے کو دیا ہوگا اس نے ایسا جواب۔" باپ نے پھر ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

"سچ کہا ہے کسی نے عورت کی عقل اس کے ٹخنوں میں ہوتی ہے۔"

"ہوتی تو ہے ناں...... عقل سے پیدل تو نہیں ہوتی، آپ مردوں کی طرح...... غضب خدا کا ایک لڑکی پر شک کر رہے ہیں۔ اس بیٹے کے لیے جو خود اپنے سہارے بستر پر بھی اٹھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔" ماں روہانسی ہوگئی۔

☆☆☆

"کیا......؟" فلزا کے امیر باپ نے پوچھا، بھنچی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ انگلستان میں مقیم اپنے ایک دوست کے بیٹے سے فلزا کا رشتہ طے کرنا چاہتا تھا۔ فلزا اور اس کے ماں باپ کے درمیان کوئی حجاب یا تکلف نہ تھا۔ سو باپ نے اس سے اپنے دوست کے بیٹے کے بارے میں براہِ راست بات کی تھی مگر فلزا نے جو کچھ کہا وہ اس کے ماں باپ کے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

"تم ہوش میں تو ہو؟" فلزا کی ماں نے اسے معترض نگاہوں سے دیکھا۔

"میں چاہتا ہوں نکاح کردیا جائے اور جب تک یہ یونیورسٹی سے فارغ ہو وہ لوگ ویزا کی کارروائی پوری کرلیں......" باپ نے کہا۔

"ڈیڈی میری طرف سے انکار ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" باپ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھے جو کہنا تھا میں کہہ چکی ہوں۔"

"سن رہی ہو اس کی بات۔" فلزا کے باپ نے اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بیوی پر آنکھیں نکالیں۔

"آپ اسے بکنے دیں، وہ کریں جو ہم بہتر سمجھتے ہیں اس کے لیے۔"

"زندگی مجھے گزارنی ہے ممی۔"

"بکواس مت کرو۔"

"آپ لوگ میری مرضی کے خلاف جو کریں گے اپنے رسک پر کریں گے۔"

"تیرا دماغ چل گیا ہے۔" فلزا کا باپ تُو تڑاخ پر آگیا۔ "اس دو ٹکے کے اپاہج استاد کے چکر میں آگئی ہے۔ اس لیے جاتی تھی وہاں۔"

"ان کا کوئی قصور نہیں، یہ صرف میرا فیصلہ ہے۔"

"میں بھی اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں۔ کرتا ہوں مصطفیٰ کو آج ہی فون کہ نکاح کی تیاری کرے۔"

"ہاں یا نہ تو میں نے ہی کرنی ہے ڈیڈی۔ خواہ مخواہ آپ کی بے عزتی ہوگی میرے انکار کرنے سے۔"

"فلزا......!" باپ نے دانت بھینچے۔

"ڈیڈی۔" وہ مجسم التجا بن گئی۔

باپ امیر ہو یا غریب اس کی عزت پر بنتی ہے تو ردِعمل یکساں ہوتا ہے۔

"دفع ہوجا میری نظروں کے سامنے سے۔" باپ نے فلزا کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آئی لو ہم ڈیڈی۔" وہ گڑگڑائی۔

"شٹ اپ۔" باپ دھاڑا۔

"پلیز۔" وہ آنکھوں میں آنسو لیے ہاتھ جوڑے باپ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ باپ نے اسے گھورتے ہوئے زور سے دبیز قالین پر اپنا پاؤں مارا۔

ماں موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے فلزا کا بازو پکڑ کر اسے اس کے کمرے میں کھینچ لے گئی۔ فلزا کی ماں اسے دنوں سمجھاتی رہی۔ باپ خفا رہا مگر وہ بھی ڈٹی رہی۔

☆☆☆

بات مونس کے گھر والوں تک آپہنچی۔ فلزا کے باپ نے مونس کے باپ سے آکر کہا۔

"اپنے بیٹے کو سمجھاؤ...... معذوری کی آڑ میں شاگرد لڑکیوں کے جذبات سے کھیل کر انہیں پھانس لینا کہاں کی شرافت ہے۔ وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ پیسے والے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے، اسے پھنسا کر عیش کرے گا۔ ایک پیسہ نہیں دوں گا میں فلزا کو جس پر تمہارا بیٹا عیش کرسکے بلکہ وہ بھی چھین لوں گا فلزا سے جو اسے دے رکھا ہے۔"

مونس کے باپ نے بیٹے سے بات کرنے سے پہلے بیوی کو اعتماد میں لینا ضروری سمجھا۔ مونس کی ماں کے ذریعے بات اس کی بہنوں کے کانوں تک بھی پہنچی۔ شادی شدہ بہنوں کو فکر لاحق ہوئی کہ یہ بات ان کے شوہروں اور سسرال والوں تک پہنچے گی تو وہ کیا سوچیں گے۔ چھوٹی بہن نائلہ جس سے فلزا کی گاڑھی چھن رہی تھی خوش ہوکر بولی۔

”امی آپ پریشان ہوتی تھیں کہ بھائی سے اب کون لڑکی شادی کرے گی۔ دیکھیں اللہ نے گھر بیٹھے کیسی اچھی لڑکی دلوادی بھائی کے لیے۔“

”بے وقوفی کی بات مت کرو۔“ باپ نے اس کی نادانی پر اسے ملامت کی۔

”کیوں ابو، اس میں بے وقوفی کی کیا بات ہے، اتنی اچھی لڑکی تو ہے وہ۔“

”ایسی لڑکیاں شادی کو بھی کھیل تماشا سمجھتی ہیں۔ اِدھر رشتہ جوڑا اُدھر توڑا۔“

”وہ ایسی نہیں ہے۔“

”باپ کی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔“ ماں نے نائلہ کو گھورا۔ ”ایسے بحث کررہی ہو جیسے تم تو اسے پنگوڑے سے جانتی ہو۔“

نائلہ انجینئرنگ یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ یونیورسٹی میں فارغ اوقات کے دوران وہ اور اس کے ہم مکتب ایک دوسرے کو اپنی زباندانی اور شعلہ بیانی سے مرعوب کرنے کی کوششوں ہی میں تو رہا کرتے تھے سو اس نے ماں کی بات پر ترکی بہ ترکی کہا۔

”کسی کو سمجھنے کے لیے اسے پنگوڑے سے جاننا ضروری نہیں ہوتا امی۔“

”چپ رہو۔“ باپ نے ڈانٹا۔

”یونیورسٹی جاکر بہت علامہ سمجھنے لگی ہے خود کو۔“ ماں نے ناگواری سے کہا۔

”بے وقوف۔“ باپ نے ایک مرتبہ پھر اسے اسی خطاب سے نوازا۔ نائلہ چپ ہوگئی۔ ماں باپ کے سامنے زیادہ بولنا گستاخی ہوتی۔ باپ نے مونس سے بات کی اس نے سر جھکالیا۔

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ باپ نے کہا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ مونس نے سر جھکائے، جھکائے کہا۔

”تو پھر ایسا کیسے ہوا...... بات یہاں تک کیسے پہنچی؟“ باپ کا لہجہ کرخت تھا۔

”وہ پاگل لڑکی ہے۔“

”تم تو پاگل نہیں تھے اپنے اور اس کے درمیان موجود فرق کو تو دیکھتے۔ تمہارا اور اس کا بھلا کیا جوڑ۔“

”آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کررہے۔ یہ صرف اس کے دماغ کا فتور ہے۔“ مونس نے صفائی پیش کی۔

”تالی کبھی ایک ہاتھ سے بجتی ہے؟“ باپ نے اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔

”آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟“

”مجھے یقین دلانے کی ضرورت نہیں، اسے یقین دلاؤ کہ تم اس کے قابل نہیں ہو۔ سمجھاؤ اسے کہ جو شخص اپنے وجود کا بوجھ نہیں سہار سکتا وہ کسی اور کا بوجھ کیونکر اٹھائے گا۔“ باپ بے رحمی کی حد تک کرخت ہوگیا۔

اپنی بے بسی کے احساس سے مونس کا سینہ بھاری ہوگیا۔ وہ باپ جس نے اس کے زخموں کی ٹکور کی تھی وہی باپ اپنی زبان سے نشتر کا کام لیتے ہوئے اسے زخم لگا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ آئی تو مونس نے اپنے باپ کی اس بے رحمی کا بدلہ اس سے چکانے کی کوشش کی۔

”چلی جاؤ اور آئندہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ چند ثانیے دم بخود اسے دیکھتی رہی پھر یکا یک مسکرادی۔

”کیوں چلی جاؤں؟“

”کیونکہ تمہارے والدِ محترم کا خیال ہے کہ میں نے تمہیں اپنے دام میں پھنسایا ہے اور میرے گھر والے بدقسمتی سے اس بات کا یقین کر بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے میں بھی انوالو ہوں۔“

”گڈ، یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“

”آپ مجھے گالیاں بھی دیں گے ناں تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“ مونس اس کی ڈھٹائی پر اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

”فار گاڈ سیک۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے اور بیزاری سے بولا۔ ”مت آیا کرو یہاں۔“ فلزا کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”آپ سمجھتے کیوں نہیں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا نہیں سمجھتا؟“ وہ بھنّا اٹھا۔

”یہی کہ...... مجھے آپ سے محبت ہے۔ آئی لو یو...... آئی لو یو میں...... میں آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔“

”زہر لادو مجھے...... ابو نے آج جتنی ذلت کی ہے میری اس کے بعد تو مجھے مر ہی جانا چاہیے۔“

”نہیں...... نہیں پلیز ایسا مت کہیں...... میں آپ کا ساتھ چاہتی ہوں۔ آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے چھوٹے چھوٹے کام، آپ کی چھوٹی بڑی ضرورتیں پوری کرنا چاہتی ہوں جو میں آپ سے شادی کیے بنا نہیں کرسکتی۔“

”واٹ......؟“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

”یس۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔ ”آئی وانٹ ٹو میری یو...... میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں، پلیز انکار نہ کیجیے گا۔“ وہ ساکت و صامت رہ گیا۔ بات کہاں سے کہاں آپہنچی تھی۔

☆☆☆

فلزا اور اس کے والدین کے درمیان بری طرح ٹھن گئی تھی۔ اس کے باپ کو اپنے دوست کو جواب دینا تھا۔ بیٹے کے لیے فلزا کا رشتے کے بارے میں اس کا اصرار بڑھتا جارہا تھا اور فلزا تھے سے بالکل اکھڑی ہوئی تھی۔

”میں اس اپاہج عاشق کو اٹھوالوں گا...... گولی ماردوں گا اسے۔“ باپ نے فلزا کو دھمکی دی۔

بھول

اتنے چہرے دیکھے ہم نے
تو ہی من کو بھایا تھا
ہم نے تم سے پیار کیا تھا
ساری بھول ہماری تھی
دل کو تجھ پر وار دیا تھا
ساری بھول ہماری تھی
یوں تم نظریں پھیرو گے
ہم نے کب یہ سوچا تھا
تم پہ اعتبار کیا تھا
ساری بھول ہماری تھی
تجھ کو کھو دینے کا دکھ ہے
اس کو بھی ہم سہہ لیں گے
دل کے سنگھاسن پر تجھ کو
ہم نے تو شاہکار کیا تھا
ساری بھولی ہماری تھی
صورت پیاری تجھ پہ واری
آنکھوں میں پھلجڑیاں سی
عشق دھما کے وار کیا تھا
ساری بھول ہماری تھی
تیری بی ایم ڈبلیو دیکھی
اپنے ہوش ہی کھو بیٹھے تھے
تکر ماری جان سے ہارے
ساری بھول ہماری تھی

شاعرہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

''آپ ان کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتے۔'' اس نے اپنے ڈیڈی کی دھمکی کے جواب میں کہا۔

''میں اس کے گھر کو آگ لگوا دوں گا۔''

''خود اس آگ میں جلنے سے بچ جائیں گے؟''

''بدتمیز۔''

''آپ جو مرضی آئے کہہ لیں۔''

''اس نے اسے ہپناٹائز کر دیا ہے۔'' باپ نے اب ماں سے کہا تھا۔

''انہوں نے کچھ نہیں کیا...... جو کیا ہے میں نے......''

''پتا ہے کیا، کیا ہے تو نے؟'' باپ نے فلزا پر آنکھیں نکالیں۔

''کیا، کیا ہے؟ زندگی کی بھیڑ میں اچانک گر پڑنے والے شخص کو سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کوئی جرم ہے؟ کل تک وہ ایک نارمل انسان تھے ڈیڈی، ایک حادثے نے انہیں معذور کر دیا۔ میں ان کا سہارا بننا چاہتی ہوں۔''

''ایسے ڈائیلاگ اب پاکستانی فلموں میں بھی نہیں چلتے۔'' باپ نے اسے حقارت سے دیکھا۔

''ڈیڈی پلیز، ایسی باتیں کر کے میرا دل نہ دکھائیں۔''

''تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے ایک پھوٹی کوڑی نہیں دوں گا تجھے۔''

''مجھے کچھ چاہیے بھی نہیں۔''

''دنیا کو ہم پر ہنسانا چاہتی ہے۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم دنیا کے لیے مثال ہی بن جائیں۔''

''ہونہہ۔'' باپ نے سر کو جھٹکا دیا۔ ''سر سے بھوت اترے گا تو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔''

''فیصلہ میرا ہے کسی اور کو دوش نہیں دوں گی۔''

''دوش تو تب دے گی ناں جب اس کا موقع آنے دوں گا۔''

فلزا کا باپ بنفسِ نفیس مونس اور اس کے گھر والوں کے سامنے جا پہنچا۔

''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میرا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں۔'' مونس نے اپنے آپ کو اس معاملے سے بری الذمہ ہونے کے لیے خدا کو گواہ بنایا۔

''تو پھر بات اتنی آگے کیسے بڑھی؟'' فلزا کے باپ نے آنکھیں نکالیں۔

''مجھے نہیں معلوم۔''

''تمہیں میری مدد کرنی ہوگی۔'' فلزا کے باپ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''وہ یہاں آئے تو اسے آنے نہ دو، دروازہ نہ کھولو، دھکے دے کر نکلوا دو یہاں سے۔ خود ٹھیک ہو جائے گی۔'' مونس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

''آپ فکر نہ کریں، اب ایسا ہی ہوگا۔'' مونس کے باپ نے فلزا کے باپ کو یقین دہانی کروائی۔

''یہاں مت آیا کرو۔ تمہارے یہاں آنے سے ہماری بے عزتی ہو رہی ہے۔'' فلزا آئی تو مونس کے باپ نے کہا۔

مونس کے باپ کا خیال تھا کہ وہ شاکڈ رہ جائے گی شاید اس توہین پر اس کی آنکھیں بھر آئیں...... شاید وہ رو رو کر اپنے صنفِ نازک ہونے کا ثبوت دے مگر اس کی توقعات کے برعکس اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''سوچ لیں انکل، اس طرح زیادہ بدنامی ہو رہی ہے یا میرے آپ کے گھر کے سامنے ٹینٹ لگا لینے سے زیادہ بدنامی ہوگی؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اگر آپ نے مجھے اپنے گھر میں آنے سے روکا تو میں آپ کے گھر کے سامنے ٹینٹ لگا لوں گی۔''

''کیوں ذلیل کرنا چاہتی ہو ہمیں اور خود کو؟''

''آپ کو کیا پتا ذلیل کرنا چاہتی ہوں یا سرخرو ہونا چاہتی ہوں۔''

''مونس خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہے کہ اسے تم سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''میں خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ مجھے سر مونس سے انتہائی دلچسپی ہے۔''

''اندر آجاؤ۔'' گویا انہوں نے ہتھیار ڈالے۔ وہ اندر آگئی۔ ''کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟'' مونس کے باپ نے اس سے پوچھا۔

''مجھے ان سے ہمدردی ہے۔''

''کتنے دن چلے گی تمہاری ہمدردی کے بل بوتے پر زندگی کی گاڑی؟''

''آئی لو ہِم۔'' اس نے نظریں جھکا کر اعتراف کیا۔

''جذباتی باتوں پر زندگی نہیں گزار دی جاتی۔ تمہارے لیے وہی فیصلہ درست ہوگا جو تمہارے بڑے کریں گے۔''

''میں کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔''

''اور اگر مونس تیار نہ ہو؟''

''تو میں ساری زندگی انتظار کروں گی۔''

''تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ ساری زندگی شادی نہیں کرو گی؟''

''کیونکہ مجھے اپنے جذبے کی صداقت پر یقین ہے۔''

''اس عمر میں اتنی پختہ باتیں کیسے کر لیتی ہو؟''

''آپ نے سر مونس سے لٹریچر پڑھا ہوتا تو ایسا نہ کہتے۔ ہی از این ایکسیلنٹ ٹیچر...... ان کے الفاظ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔''

''اس معاملے میں اس کے الفاظ تمہارے دل میں کیوں نہیں اترتے، وہ کہتا ہے اس نے ہمیشہ تمہاری حوصلہ شکنی کی۔''

''انہی کے الفاظ ہیں۔ ایک نظم پڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا محبت اندھی، بہری اور گونگی ہوتی ہے۔''

''گونگی تو کم از کم نہیں ہوتی۔'' مونس کے باپ نے فلزا پر وار کیا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

''سنو لڑکی محبت کا بھوت اپنے سر سے اتارو اور آرام سے گھر جاؤ۔ خود بھی چین سے رہو اور ہمارا سکون بھی ہمیں لوٹا دو۔ جب سے یہ قصہ چھڑا ہے ہمارے گھر کا تو چین و سکون ہی جاتا رہا۔''

''مجھے ناخوش کر کے آپ چین سے کیسے رہ سکتے ہیں؟''

''زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں یہ......''

''کیا؟''

''کہ ایک لڑکی کسی نوجوان اور اس کے گھر والوں کی جان کو آئی ہوئی ہے اور نوجوان بھی بے چارہ وہ جو ہلنے جلنے تک سے قاصر ہے۔''

''میں ان کا سہارا بننا چاہتی ہوں۔ ان کا دکھ بانٹنا چاہتی ہوں۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب سر مونس صبح کو تازہ دم لمبے، لمبے قدم بھرتے یونیورسٹی آیا کرتے تھے۔ اب جب میں انہیں بستر پر پڑے دیکھتی ہوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ میں ان کی زندگی میں شریک ہو کر ان کی زندگی کو آسان بنانا چاہتی ہوں۔ آپ بھی میرے گھر والوں کی طرح میرا راستہ روکنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟''

''کیونکہ تم جس راستے پر چلنا چاہتی ہو وہ آسان نہیں۔''

''مجھے خود کو آزما لینے دیں۔''

''تم وہ پتھر ہو جس سے سر ہی پھوڑا جا سکتا ہے۔'' مونس کا باپ زچ ہو گیا۔

''شکر ہے آپ نے میری کسی خوبی کا تو اعتراف کیا۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''بالفرض میں تم سے اپنا سر پھوڑ بھی لوں تو تمہارے اپنے گھر والوں کو کون سمجھائے گا؟''

''میں خود کافی ہوں۔''

مونس کے باپ کو ہار ماننی پڑی اور ساتھ ہی اسے بیٹے کی بے گناہی کا یقین بھی آگیا۔ وہ لڑکی تو ناقابلِ تسخیر چٹان تھی۔

''مونس بیٹے! میں تو اس لڑکی سے ہار گیا۔ کسی صورت سمجھنے پر آمادہ نہیں۔ اب تم خود ہی اسے سمجھاؤ۔''

اپنے ساتھ باپ کا بدلا ہوا لہجہ دیکھ کر مونس کو قدرے تسلی ہوئی۔

☆☆☆

''کیوں ضد باندھ لی ہے تم نے؟'' مونس نے اس سے کہا۔

''کاش آپ نے کسی سے محبت کی ہوتی۔''

''محبت کی ہوتی تو کیا ہوتا؟''

''ایسا نہ کہتے۔''

''ایسا نہ کہتا تو پھر کیا کہتا؟''

''آپ کہتے...... تم سمندر ہو، میں ساحل کی ہوا بن کر تمہارے ساتھ‘ ساتھ چلنا چاہتا ہوں، تمہارے ہر دکھ سکھ، خوشی اور غم میں تمہارا شریک بننا چاہتا ہوں۔ میں اپنے ہاتھوں سے تمہارے الجھے بالوں کو سلجھاؤں گا۔ میں اور تم اکٹھے بیٹھ کر موسیقی سنا کریں گے۔ ٹی وی دیکھا کریں گے۔ اخبار کی خبروں پر تبصرے کیا کریں گے۔ ہم اکٹھے چائے پیتے ہوئے باہر برسنے والی بارش سے لطف اندوز ہوا کریں گے۔ ہم زندگی کو زندوں کی طرح ہنستے، مسکراتے اور باتیں کرتے ہوئے گزاریں گے۔'' وہ جذب کی کیفیت میں بولتی رہی۔

''اچھا سنو...... پہلے ماسٹرز تو مکمل کرلو۔''

''ماسٹرز مکمل کرلوں تو؟''

''تو پھر سوچیں گے۔''

''کیا؟''

''جو تم چاہتی ہو وہ۔''

''پرامس؟''

''پرامس۔''

''اوکے۔''

فلزا کے باپ سے رازداری سے کہہ دیا گیا۔

وقت کی گرد بہت سی چیزوں کو دھندلا دیتی ہے۔ انگلستان میں مقیم دوست کے بیٹے کا رشتہ فلزا کے لیے کوئی آخری رشتہ تو نہیں اور مل جائیں گے۔ کچھ وقت گزرے گا تو مونس کے بارے میں اس کی جذباتیت صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی۔ آنکھوں کو دھوئیں اور سوزش سے بچانے کے لیے کبھی کبھی آگ کو ہوا بھی دینی پڑتی ہے۔ سو مونس کی حکمتِ عملی کو یہی سمجھا جائے۔

☆☆☆

اگلے دو سیمسٹر کے دوران فلزا نے بڑی تندہی سے پڑھائی کی۔ مونس اس کے عمدہ نتائج کا متقاضی جو تھا مگر اس دوران اس نے مونس، اس کے گھر والوں اور گھر سے اپنا رابطہ نہیں توڑا۔ اس کا ماسٹرز مکمل ہوگیا۔

مونس، اس کے گھر والوں اور خود فلزا کے والدین کی یہ توقع کہ وقت کے ساتھ مونس کے بارے میں اس کی جذباتیت دم توڑ دے گی اور وہ مونس سے شادی کے خیال سے دستبردار ہوجائے گی خام خیالی ثابت ہوئی۔ وہ اپنی خواہش، اپنے فیصلے پر اسی طرح ڈٹی ہوئی تھی۔

''اب تو آپ کی شرط پوری ہوگئی۔'' اس نے مونس سے کہا۔

حقیقت یہ تھی کہ اس کی استقامت دیکھ کر اب خود مونس کے اپنے دل میں بھی اس کے لیے لطیف جذبات پیدا ہوچکے تھے مگر اپنی بے بضاعتی کے سبب وہ ان جذبات کو ہوا دینے سے ڈرتا تھا۔ وہ جانتا تھا فلزا اور اس کا کوئی میل نہیں تھا۔ کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ وہ آسائشوں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ اسے دینے کے لیے کیا تھا اس کے پاس...... اور تو اور خوشی بھی نہیں۔ ہمہ وقت بستر پر پڑے رہنے والے ایک

معذور شخص سے شادی کر کے کون لڑکی خوش رہ سکتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جلد یا بدیر فلزا کی جذباتیت اپنے منطقی انجام سے دوچار ہوگی اور تب وہ شکر ادا کرے گی کہ مونس نے اس کی جذباتیت پر لبیک نہیں کہا تھا۔ اس کی حوصلہ شکنی کی تھی اور تب ہی وہ زبان سے کہے نہ کہے دل میں اس کی شکر گزار اور عظمتِ کردار کی معترف ضرور ہوگی چنانچہ ماسٹرز مکمل کرلینے کے بعد اسے دوبارہ اسی استقامت سے اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر مونس کو زیادہ نہ سہی تھوڑی بہت حیرت ضرور ہوئی۔ تقریباً ایک سال کا عرصہ بھی اس کی استقامت، اس کے ارادے کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔

''لگے ہاتھوں ایم فل کرلو۔'' دوبارہ راہِ فرار کے لیے مونس نے پھر ایک راہ نکالی۔

''ایم فل کرلوں؟'' فلزا نے اسے مشکوک انداز میں دیکھا۔ ''کیوں؟''

''بعد میں بندہ اتنا گھر جاتا ہے کہ آگے پڑھنے کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوجاتا ہے۔'' مونس نے نظریں چراتے ہوئے سمجھایا۔

''مجھے ضرورت کیا ہے آگے پڑھنے کی بس جتنا پڑھ لیا کافی ہے۔ ایم اے کوئی کم تعلیم تو نہیں ہوتی۔''

''آج کل ایم اے کی کوئی قدر نہیں...... کوئی نہیں پوچھتا ماسٹرز ڈگری کو۔''

''نہ پوچھے...... مجھے کون سا کوئی جاب کرنی ہے۔'' فلزا نے خود ہی اسے بہانہ فراہم کردیا۔

''جاب تو کرنی پڑے گی۔ مجھ سے شادی کروگی تو جاب تمہیں لازماً کرنا ہوگی۔ میری آمدنی میں گزارہ کہاں ہوگا۔ ایم فل کرلوگی تو کسی کالج میں لیکچرر شپ کے امکانات ہوں گے۔ ماسٹرز کے مقابلے میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کو ظاہر ہے ترجیح دی جاتی ہے۔'' وہ سوچ میں پڑگئی۔ بات تھی تو درست اس کے دل کو بھی لگی تھی مگر مزید انتظار نہیں۔

''ایم فل شادی کے بعد بھی تو کرسکتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں...... بہت پڑھنا پڑتا ہے گھر دیکھوگی، مجھے سنبھالوگی یا پڑھائی کروگی۔ پہلے یکسوئی سے پڑھائی کرو۔''

''ہوجائے گا سب ہوجائے گا۔ آئی پرامس۔''

''نہیں...... پہلے ایم فل۔''

''عجیب منطق ہے۔''

''مستقبل کی ضرورت ہے۔''

وہ پہلے شادی کی رٹ لگائے رہی، مونس ایم فل پر اٹکا رہا بالآخر اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔ ایم فل میں داخلہ لے لیا۔

فلزا کے والدین حیران، پریشان اور متفکر...... اب تو مونس کو بھی قصوروار دینے کی جا نہ تھی۔ اس نے تو اپنی طرف سے کام کر ہی دکھایا تھا۔ غلطی ان کی اپنی بیٹی کی ہی تھی جو سوچے سمجھے بنا ایک غیر یقینی راستے کی طرف جارہی تھی۔ انہوں نے اسے اب سختی کے بجائے محبت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے اپنے ہی ہم پلہ کسی نوجوان سے شادی پر آمادہ کرنا چاہا مگر مرغ کی وہی ایک ٹانگ۔ اس کی وہی ضد کہ شادی کرے گی تو صرف مونس سے۔

باپ پھر بھنا گیا مگر فلزا کی ماں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور مصلحت سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اسے امید دلائی۔

''ہوسکتا ہے ایم فل کے دوران اس کا دھیان اس کی طرف سے ہٹ جائے۔''

''یہ اس کے گھر کا راستہ چھوڑے گی تب ناں۔'' باپ نے غصے سے کہا۔

''اب پڑھائی کو زیادہ وقت دو یہاں زیادہ آنے کی ضرورت نہیں۔'' فلزا کے والدین کی ایما پر مونس نے اس سے کہا۔ فلزا نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

''ارے بھئی صرف اس لیے کہ تم یکسوئی سے پڑھائی کرسکو۔''

"آپ کو میری پڑھائی کے لیے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں...... سمجھے آپ۔" فلزا نے اسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سمجھ گیا استانی صاحبہ۔" مونس نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرادی۔

مونس کا دل قسمت کی ستم ظریفی پر دُکھنے لگا۔ افسوس کہ اب وہ اس کی چاہ رکھنے کے باوجود چاہت کا اظہار کرنے سے قاصر تھا۔ اپنے اور اس کے درمیان فاصلے اور فرق کا اسے بخوبی احساس تھا۔ فلزا نے ایم فل بھی کرلیا۔

مقطع میں آپڑی تھی سخن گسترانہ بات

اب!

اب مونس کی اور اس کی شادی میں کیا قباحت تھی۔

قباحت تو تھی فلزا کے والدین کسی صورت اس کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار نہ تھے۔ سوال پوری شدّومد کے ساتھ وہی تھا کہ ایک معذور شخص سے اس کا مقدر کیسے پھوڑا جاسکتا تھا۔ ایک دو دن کی بات نہیں پوری زندگی کا سوال تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد مونس نے ایک نئی شرط فلزا کے سامنے رکھ دی اور یہ شرط فلزا کے حسابوں سے خاصی کڑی تھی۔ باہر سے پی ایچ ڈی کر کے آنے کی شرط! انگریزی ادب میں ماسٹرز اور ایم فل کے بعد اگر کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرلیا جائے تو کیا کہنے... وطن واپسی پر کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے میں ملازمت یقینی اور بہتر مشاہرہ اور مراعات پر نہ صرف اپنا بلکہ اپنے سے وابستہ متعلقین کا مستقبل بھی محفوظ۔

"مجھے اَوائڈ کرنا چاہتے ہیں؟" فلزا نے اب کی بار اسے شک سے نہیں یقین سے دیکھا۔

"نہیں، نہیں۔" مونس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد کوئی اور شرط ہے تو وہ بھی ابھی بتادیں؟"

"اس کے بعد کیا شرط ہوسکتی ہے۔" وہ کافی دن تذبذب میں رہی پھر اس نے آمادگی ظاہر کردی۔

مونس کو احساس ہوا محض چند برسوں کے سفر نے اسے اپنی عمر کی لڑکیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ سنجیدہ بنادیا تھا۔

پی ایچ ڈی کے لیے فلزا کو بیرونِ ملک کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے میں داخلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس کا باپ امیر آدمی تھا بہ آسانی اسے باہر بھجوا کر اس کے تعلیمی اور دیگر مصارف ادا کرسکتا تھا۔ یہ اطمینان اس پر دوچند تھا کہ بیرونِ ملک رہ کر فلزا مونس سے بے معنی ہمدردی کے چکر سے نکل سکے گی۔ کسی ہم مکتب سے اس کی ذہنی ہم آہنگی کی خوش امیدی بھی تھی۔ اسے چلا ہی جانا چاہیے۔ فلزا پی ایچ ڈی کے لیے بیرونِ ملک چلی گئی اور اس کے والدین نے چین کی سانس لی۔

☆☆☆

دیارِ غیر میں رہتے ہوئے بھی فلزا کا مونس سے رابطہ برقرار رہا۔ وہ اسے بلاناغہ فون کرتی۔ اس کا اور اس کے اہلِ خانہ کا حال چال پوچھتی۔ اپنی مصروفیات سے اسے آگاہ کرتی اور آخر میں یہ کہنا نہ بھولتی۔

"آئی مس یو!"

"آئی لو یو۔" سے اس کا "آئی مس یو" پر آجانا مونس سے اس کی محبت کی بلوغت کی دلیل تھی۔ جب دل کسی کے بغیر اداس رہنے لگے۔ جب تنہائی میں کسی کا خیال دل کو مٹھی میں جکڑ لے۔ جب اٹھتے بیٹھتے کسی کا تصور آپ کے ساتھ رہے تو یہ سچی محبت کی دلیل ہوتی ہے۔ مغرب کی سحر انگیز فضاؤں میں بھی مونس کا خیال سانس کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ ایک دو ہم مکتبوں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر وہ ٹال گئی۔ اس کے دل میں تو مونس کے نام کی لے تھی۔ ہمدردی کے احساس سے شروع ہونے والا تعلق عشق بن گیا تھا۔

مونس بھی اسے مس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے فلزا کے بغیر اس کی روکھی پھیکی زندگی اور بے مزہ ہوگئی تھی۔ فلزا کا خیال اس کے دل میں پسار نے لگا مگر نہیں...... فلزا اس کے لیے نہیں بنی تھی۔ اس کی منزل تو کہیں اور تھی۔ اس کا مقسوم تو اس کے والدین کی پسند کے کسی آدمی سے جڑا تھا۔ وہ اس کے لائق کہاں تھا۔ وہ جانتا تھا دنیا اِدھر سے اُدھر ہوجائے فلزا کا باپ وہ ہونے نہیں دے گا جو وہ چاہتی تھی۔ اس نے مونس کو دھمکی دے رکھی تھی کہ وہ فلزا کو شوٹ کردے گا مگر وہ نہیں ہونے دے گا جو وہ چاہتی تھی۔

"بیٹے یہ پیسے والے لوگ ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ کوئی بھی کھیل، کھیل سکتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے ساتھ تمہارے بوڑھے باپ بھی کسی پریشانی میں گرفتار ہوجائیں۔" ماں نے سہم کر مونس سے کہا تھا۔

مونس کو فلزا پر بھروسا تھا مگر وہ اس کے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ پیسے والے لوگ اپنی دولت کے بل بوتے پر کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ آئے دن میڈیا پر پیسے والوں کی کارستانیاں منظرِ عام پر آکر بھی بڑی خوبی اور صفائی سے رفع دفع ہوجاتی ہیں... ابھی پچھلے دنوں ہی تو ایک بڑے گھرانے نے اپنے بہو کو قتل کر کے اسے ڈکیتی کا رنگ دے دیا تھا۔ پیسے والوں کا خون اکثر سفید ہوتا ہے۔ رشتوں کی ان کے نزدیک وہ اہمیت نہیں ہوتی جو متوسط اور نچلے متوسط گھرانوں میں ہوتی ہے۔

مونس... دن بھر بستر پر پڑا فلزا کے بارے میں ہی سوچتا رہتا۔ اسے فکر لاحق تھی کہ جب فلزا واپس آئے گی تو کیا ہوگا۔

☆☆☆

تھیسس کے دوران فلزا نے تین مرتبہ وطنِ عزیز کا چکر لگایا اور ہر بار وہ مونس کے بارے میں پہلے سے زیادہ پُرجوش دکھائی دی۔ وہ مونس کی میڈیکل رپورٹس بھی اپنے ہمراہ لے گئی۔

"باہر میڈیکل کی دنیا میں ایسے، ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ ڈاکٹرز نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ میں آپ کی میڈیکل رپورٹس پر بھی وہاں مشورہ لوں گی۔"

"کچھ نہیں ہوسکتا۔" مونس نے مایوسی سے کہا۔

"اللہ کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ وہ کہتا ہے کُن اور بس وہ ہوجاتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اگر وہ اپنے پیغمبرؑ کے مانوس شدہ پرندوں کی ٹکڑے، ٹکڑے بوٹیوں کو از سرِ نو جوڑ کر انہیں زندہ کرسکتا ہے۔ مسیحؑ کے ہاتھوں مُردوں کو جلاسکتا ہے تو آپ کو شفا کیوں نہیں دے سکتا؟" وہ بحث پر اتر آئی۔

"یہ ریڑھ کی ہڈی کا معاملہ ہے۔ تمہیں معلوم ہے جب قیامت ہوگی تو ہر انسان اپنی ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے سے ہی تشکیلِ نو پائے گا۔ یہ گویا انسان کی دوسری زندگی کے لیے تخم ہے۔ جیسے بیج سے پودا نکلتا ہے، درخت بنتا ہے ویسے ہی ہم انسان اپنی ریڑھ کی ہڈی کے آخری سرے سے دوبارہ نمو پائیں گے۔"

"محبت معجزوں کو جنم دیتی ہے۔ کیا عجب خدا کی مہربانی سے کوئی امید نکل آئے۔" فلزا نے کہا۔

"فی الحال تم اپنی توجہ تھیسس پر رکھو۔"

"تھیسس کے ساتھ اگر ڈاکٹرز سے مشورہ بھی کرلیا جائے تو کیا قباحت ہے؟"

"میرا خیال چھوڑ دو فلزا۔"

"کیا......؟" وہ چونکی۔ "خیال چھوڑ دوں آپ کا...... اتنی دور نکل آنے کے بعد کوئی اور شرط ہے تو ابھی بتادیں میں آپ کو بار، بار عہد شکنی کرتے نہیں دیکھنا چاہتی۔" اس کی استقامت اور اپنی بے بضاعتی پر اس کے پاس کچھ کہنے کو نہ تھا۔

☆☆☆

فلزا نے اس کی معذوری سے لڑنے کے لیے امید کی کرن نکال ہی لی۔ جراحی مشکل اور نازک تھی اور صحت یابی دقت طلب اور صبر آزما اور اس دوران

مونس کو تمام وقت وہاں رہنے کے ساتھ ایک کُل وقتی تیمار دار کی ضرورت بھی تھی جو اس وقت طلب اور صبر آزما علاج کے دوران اس کی دیکھ بھال کرسکے اور اس کی جملہ ضروریات کا خیال رکھ سکے۔

فلزا نے واشگاف الفاظ میں اپنے والدین سے کہہ دیا کہ اگر انہوں نے اسے مونس سے شادی کی بخوشی اجازت نہ دی تو وہ کورٹ میرج کرلے گی۔

''سمجھاؤ...... سمجھاؤ اُسے اس کے دماغ سے اب تک اس کے عشق کا خناس نہیں اترا ہے۔''

''کیوں اپنی راہ کھوٹی کرتی ہو۔'' ماں نے دل سوزی سے کہا۔

''بس ممی بہت ہوچکا... میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ مجھے مونس کے علاج کے لیے انہیں باہر لے جانا ہے اور ظاہر ہے یہ کام میں ان سے ایک اجنبی حیثیت میں نہیں کرسکتی۔ مجھ سے ان کا کوئی رشتہ کوئی مضبوط تعلق ہونا ضروری ہے۔''

''سوچ لو۔'' ماں نے کہا۔

''ضرورت نہیں۔'' اس نے دوٹوک جواب دیا۔

فلزا کی ہٹ دھرمی نے اس کے والدین کو بالآخر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔

☆☆☆

مونس نے فلزا کی نسبت اپنے قلبی جذبات کے برعکس شادی سے انکار کرنے کی کوشش کی مگر اس کے والدین نے جو اسے فلزا کی حوصلہ شکنی کی تلقین میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھا کرتے تھے اسے فلزا سے شادی پر آمادہ کرنے کی بیسیوں تاویلیں پیش کیں۔ جن کا نچوڑ یہ تھا کہ قدرت اس پر مہربان تھی جو اس نے فلزا جیسی لڑکی کے دل میں کہ جسے اچھے سے اچھا بر مل سکتا تھا اس کے لیے غیر معمولی محبت کو پروان چڑھا دیا تھا۔

''جب اس نے تمہاری خاطر اپنے ماں باپ کے سامنے اتنی استقامت دکھائی ہے تو اب تمہیں بھی ہمت کرنی چاہیے مونس۔'' مونس کی بڑی بہن نے اس سے کہا۔

''تم کیوں مجھ جیسے آدمی کے لیے اپنی زندگی برباد کرنا چاہتی ہو...... کچھ نہیں دے سکوں گا میں تمہیں۔'' مونس نے فلزا کو سمجھایا۔

''محبت کچھ لینے کی محتاج نہیں ہوتی۔'' اس نے اسی استقامت سے کہا۔

''اچھی طرح سوچ لو فلزا...... بعد میں پچھتاوا نہ ہو۔''

''رونے کے لیے آپ کا شانہ نہیں مانگوں گی۔''

''تم پاگل ہو۔'' فلزا کے بارے میں مونس کے قلبی جذبات پہلی بار مگر پوری شدت سے اس کی آنکھوں سے جھانکتے دکھائی دیے۔

''وہ تو میں ہوں۔'' وہ مسکرائی۔ ''بی کاز آئی لو یو۔''

''میں تو فلزا لیکن ڈرتا ہوں کہ آج جو شخص تمہاری محبت کی خوشی کو سہارنے کا حوصلہ نہیں رکھتا وہ کل تمہاری بے رخی کا صدمہ کیونکر سہہ پائے گا۔'' بالآخر مونس نے بھی اس سے اپنی محبت کا اعتراف کر ہی لیا۔

''محبت میں اندیشے نہیں ہوتے۔'' فلزا نے اسے لاجواب کردیا۔

☆☆☆

فلزا اور مونس ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔ فلزا، مونس کو علاج کے لیے اپنے ہمراہ انگلستان لے گئی۔ علاج دقت طلب تھا اور صبر آزما بھی۔

فلزا کا تھیسس مکمل ہوگیا۔ دوران علاج اس نے مونس کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس نے جز وقتی ملازمت بھی کرلی تھی۔ مونس کی معذوری مکمل طور پر تو نہیں دور ہوسکی تاہم وہ بیساکھیوں کے سہارے اپنے پیروں پر چلنے کے لائق ہوگیا۔ یہ بھی بہت تھا۔ کم از کم وہ بستر سے تو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

فلزا کی خواہش پر مونس نے بھی انگلستان کی اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی جہاں سے

فلزا نے اس کی خواہش پر پی ایچ ڈی کیا تھا۔ اس دوران ان کا وقتاً فوقتاً وطن آنا جانا رہا۔ مونس کے ڈاکٹریٹ کرلینے کے بعد جب دونوں مستقل قیام کی غرض سے وطن واپس لوٹے تو دونوں کو ایک ہی یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔

☆☆☆

برسوں گزر گئے۔ مونس اور فلزا نے طویل اور خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کی۔ اولاد کوئی نہیں ہوئی مگر فلزا نے اس محرومی سے کبھی اپنے اور مونس کے رشتے کی خوب صورتی کو متاثر نہیں ہونے دیا۔

''پروفیسر صاحب، اس میں بھی خدا کی مصلحت ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ سے میری محبت کے بیچ کوئی اور آئے۔''

''ایک بات بتاؤ گی؟'' شادی کے بہت عرصے بعد ایک روز مونس نے فلزا سے کہا۔

''پوچھیں۔''

''سچ، سچ بتانا۔''

''آپ سے جھوٹ بول سکتی ہوں بھلا۔''

''تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟''

''کیونکہ مجھے آپ سے محبت تھی۔''

''محبت کیوں تھی؟''

''بس تھی۔''

''ٹالو مت...... ایک معذور آدمی سے محبت کے لیے کوئی جواز تو ہونا چاہیے تھا تم جیسی لڑکی کے پاس۔''

''سچ بتاؤں؟''

''ہاں، میں سچ ہی سننا چاہتا ہوں۔''

''میں نے آپ کو ایکسیڈنٹ سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ صبح جب آپ تیار ہوکر تیز، تیز قدموں سے ڈیپارٹمنٹ میں آتے تھے تو آپ کی چال سے یوں لگتا تھا جیسے آپ دنیا کو اپنی جیب میں ڈالے پھرتے ہیں۔ آپ کے چہرے پر اور چال ڈھال میں رعونت ہوا کرتی تھی لیکن...... ایکسیڈنٹ کے بعد سب کچھ بدل گیا آپ کے چہرے پر رعونت کی جگہ بے بسی نے لے لی اور آنکھوں میں اداسی اور بے یقینی نے ڈیرا ڈال دیا۔ جب آپ بستر پر لیٹے پڑھا رہے ہوتے تھے تو میں آپ کے چہرے پر بکھری بے بسی اور آنکھوں میں ڈولتی اداسی کو دیکھ کر یہی سوچتی رہتی تھی کہ زندگی اچانک کیسے بدل جاتی ہے...... جو آپ کے ساتھ ہوا وہ میرے ساتھ بھی تو ہوسکتا تھا۔ میں اپنے اردگرد لوگوں سے کیا توقعات رکھتی... یہ کہ مجھے اندھیروں میں بھٹکنے کو چھوڑ دیا جائے یا یہ کہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے سہارا دیا جائے۔ میں نے وہی کیا جو میں دوسروں سے اپنے لیے چاہتی۔'' فلزا نے توقف کیا اور مونس کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''انجانے میں مجھے آپ سے محبت ہوگئی۔''

''انجانے میں؟'' مونس نے فلزا کو اور بھی محبت سے دیکھا۔

''چلیں جانتے بوجھتے سہی...... ویسے آپ نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کو شرطیں تو کڑی لگائیں۔''

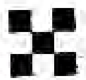
''مگر تم نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔''

''میں اب بھی نہیں چھوڑوں گی۔ آپ کو کوئی اعتراض؟''

''نو کمنٹس۔'' مونس کی نظروں میں فلزا کے لیے گہری محبت تھی۔ ناقابلِ بیان ممنونیت تھی۔ ''آئی جسٹ لو یو ڈارلنگ۔'' اس نے فلزا کو وارفتہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

فلزا اور مونس کی محبت کی یہ داستان کوئی فرضی کہانی نہیں، اس سچی داستان کے حقیقی کردار اب اس دنیا میں نہیں مگر ان کی محبت کی بوباس اب بھی یاد بن کر ان سے ذاتی طور پر واقف لوگوں کے دلوں میں مہکتی ہے۔



ع عورت کم مجبور ہے

نسرحسین اظفر

اچھا خاصا کیس عین وقت پر بگڑ کر پیچیدہ ہوگیا۔ آپریشن تھیٹر کی سرخ بتی جل اٹھی اور لیڈی ڈاکٹر ایک فارم لے کر دائیں ہاتھ میں پکڑا پین ہلا، ہلا کر اسے سمجھانے لگی۔ اس کے اپنے حواس سلب ہو چکے تھے۔ آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کا شوہر جمال ہدانی سر جھکائے کاؤنٹر کے پاس کھڑا تھا۔ پریشان، فکرمند لیکن بہت دور...... اسے اصولی طور پر اس وقت اس کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کچھ کہہ دیتا، کچھ کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر دیتا۔ محبت کے دو بول، تسلی کے دو حرف مگر پتا نہیں وہ اس کی وجہ سے پریشان تھا بھی یا عین وقت پر آ پڑنے والی اس مشکل کی وجہ سے کوئی بزنس ڈیل ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس تھا۔ نادیہ کی آنکھیں بلاوجہ نم ہوگئیں۔ کسی نے اس کے چہرے پر آکسیجن ماسک چڑھایا اور اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

رجو بڑی بے توجہی سے بیگم صاحبہ کے پیر دبا رہی تھی۔ اس کی متفکر نظریں بے قراری سے کبھی گھڑی کی طرف اٹھتیں کبھی بیگم زرتاج بخش کی طرف جو پوری طرح میگزین میں مستغرق تھیں۔

''یا اللہ، ناجی اب تک آئی کیوں نہیں ہے'' اس کے ہولتے، پھڑ پھڑاتے دل سے لحہ بہ لحہ قرار رخصت ہوتا جا رہا تھا۔ دوسری فکر اسے اپنی بیگم صاب کی بھی تھی۔ اس نے ان سے جو کام کہا تھا وہ اس کے لیے بہت خاص جبکہ بیگم صاب کے لیے بہت معمولی نوعیت کا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ یہ معمولی نوعیت کا کام ان کے خوشگوار موڈ کے مرہون منت تھا۔

ناجی کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور دن تیز رفتار ٹرین کی طرح چھکا چھک دوڑ رہے تھے۔ ناجی کے جہیز کے لیے جمع کی گئی اشیا بے حد مختصر چند جوڑے کپڑوں اور گنتی کے برتنوں تک محدود تھیں۔

اس نے ایک بار پہلے بھی اپنی درخواست بیگم صاب کے گوش گزار کی تھی۔ تب وہ بے حد خوش تھیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی نے سات سمندر پار سے انہیں ایک عدد نواسی کی نانی بن جانے کی خوشخبری سنائی تھی۔ موقع اچھا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنا مدعا ان کے سامنے بیان کر دیا۔

''ناجی کی تریخ دے دی ہے جی...... پرواج کے نام پر کچھ دی نہیں ہے پلے۔ باجی آپ سے

بڑی امید ہے میرے کو۔'' وہ ان کے پیر دباتے ہوئے کھکھیا رہی تھی۔

''ہاں، ہاں بے فکر ہو جا۔ اچھا سارا انتظام کر دوں گی۔ بے بی کے کپڑے پڑے ہیں پرانے، وہ لے جانا۔ تیری ناجی کے لیے تو نئے ہی ہوں گے۔''

''اور جی...... باجی وہ...... تھوڑے سے پیسے اگر مل جاتے۔'' ان کے پیروں پر رجو کی ہتھیلیوں کا دباؤ ذرا کی ذرا سست پڑا۔ یہ بڑے لوگ بھی بڑے من موجی ہوتے ہیں۔

ابھی وہ اپنے جن پیروں کو اس سے دبوا کر سکون حاصل کر رہی تھیں۔ وہی پیر ایک لات کی صورت رسید کر کے اس کا سکون چھین بھی سکتی تھیں۔

''تیرے صاحب باہر سے آجائیں تو بات کرتی ہوں اور سن باہر والے اسٹور میں ایک ڈنر سیٹ پڑا ہے ہلکے سبز رنگ والا پرانا ہو گیا ہے، ایک آدھ پلیٹ ٹوٹ بھی گئی تھی وہ لیتی جانا۔''

رجو کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اس کے ہاتھ میکانکی انداز میں بیگم صاب کے پیروں پر مہارت سے چلنے لگے تھے۔ اس وقت بھی خیالوں سے چونکی تو اس کے دل میں امید و بیم کی وہی کیفیت جنم لینے لگی۔

''کیا بات ہے رجو، دھیان کہاں ہے تیرا؟'' مسز زرتاج بخش نے میگزین کا صفحہ پلٹتے ہوئے رجو کو ایک نظر دیکھا۔

''وہ...... بیگم صاب ایک بات کہنی تھی آپ سے۔'' رجو نے تھوک نگلا۔

''ہوں...... بول۔''

''وہ بڑے صاب آئے نہیں اب تک...... آپ نے کہا تھا کہ......'' اس کی دھیمی آواز۔

''جب کام ختم ہوگا تب ہی تو آئیں گے۔ ہو سکتا ہے تھوڑے دن لگ جائیں۔ اب وہ بے بی کے پاس سے اس کی بیٹی کو دیکھتے ہوئے آئیں گے۔'' انہوں نے بیزاری سے بات مکمل کی پھر جیسے



انہیں کچھ یاد آ گیا۔

"اور یہ ناجی نہیں آئی اب تک۔ کپڑے تمہارا باپ آئے گا دھونے۔" ان کا لہجہ اور انداز یکا یک بدلا، رجو ہڑبڑا گئی۔

"نہیں، نہیں باجی بس آتی ہوگی۔ میں نے خاص طور سے کہہ دیا تھا۔" انہوں نے اسے گھور کے دیکھا پھر سر جھٹک کر اٹھ گئیں۔ اب رجو کو ڈسٹنگ کرنی تھی۔ ناجی کو نہیں آنا تھا نہ آئی۔ مسز بنگش کا پارہ سوا نیزے پر پہنچ گیا۔

"ہڈحرامی عروج پر ہے اور نت نئی فرمائشیں سن لو روز، روز کام کرنے میں موت آتی ہے۔ ہاتھ پیر ٹوٹتے ہیں۔" رجو مرے، مرے ہاتھوں سے ڈسٹنگ کرتی ان کی عزت افزائی پر آنسو پیتی رہی۔

☆☆☆

"اماں...... ہائے اللہ اماں...... اُف۔" وہ تکلیف کے مارے حلق کے بل چلا رہی تھی مگر رجو پر آج بھوت سوار تھا۔

"کیوں...... کیوں نہیں آئی تو آج بول، صفیہ نے بتایا ہے مجھے تو کہیں گئی تھی۔ بول...... بول کہاں گئی تھی وہاں نہیں آئی تو گئی کہاں تھی...... بول !"

"ارے اس منحوس صفیہ کو دوسروں کی ٹوہ لینے کے سوا کیا کام۔"

"فضول کی بکواس نہ کر۔ میں تیرے ٹوٹے کروں گی آج...... میں نے ہی بولا تھا اسے تجھ پر نظر رکھنے کے لیے۔ بتا کہاں مری تھی جا کے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی پلاسٹک کی چپل سے اس کی کمر پر ٹھپا لگایا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

"ہائے میں مر گئی چھوڑ دے اماں۔" اس کے واویلے چار دیواری پھلانگ رہے تھے۔

"نہیں پہلے بتا کہ گئی کہاں تھی؟"

"زاہد کی دکان سے مٹی کا تیل لینے۔ قسم لے لے اماں جو دس منٹ سے زیادہ دیر لگی ہو۔ خدا کی قسم اماں اب تو چھوڑ دے۔" رجو نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بیٹی کا محلے یا محلے سے باہر کسی نامراد ناس پیٹے عاشق کے ساتھ چکر ہے۔ وہ چاہنے کے باوجود اسے رنگے ہاتھوں پکڑ نہیں سکی تھی۔

کوئی مرد گھر میں نہ ہونے کی مجبوری اور گھر کے اخراجات چلانے کے لیے اسے باہر نکلنا پڑ رہا تھا۔ ورنہ وہ ایک منٹ کے لیے بھی نجمہ عرف ناجی کو گھر میں اکیلا نہ چھوڑتی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ شام سے پہلے اسے رخصت کر ڈالتی۔ ناجی کم بخت نے بھی اس لیے اپنا رشتہ طے ہونے پر سیاپا ڈالا تھا کیونکہ وہ اپنے منگیتر سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

رجو اسے چھوڑ کر پلنگ پر گر کر ہانپنے لگی۔ ناجی بھی زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھی اپنی کمر سہلا رہی تھی۔

"دیکھ ناجی!" رجو نے ایک بار پھر اسے کینہ توز نظروں سے گھورا۔ "ویاہ میں تیرا طے کر چکی۔ ہن رولے پا کے میرے سفید چونڈے میں مٹی نہ پا۔ چپکی ہو جا شادی کے ویلے تک۔ فرد فع کر کے میں بھی سکھ دا ساہ لوں۔ ہن میں تیری کوئی اک وی حرکت ویکھی ناں تے، میں تیرا بوتھا ساڑ دوں گی۔" اس کی آواز میں بڑی دبنگ سی چنگھاڑ تھی۔ ناجی بھی دب گئی۔ بدلے میں چیخنے کے بجائے سستی سے اٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

ادھ کھلے دروازے سے اندر آتی روشنی کی لکیر اس کی زندگی میں جلتے امید کے دیے کے مانند تھی۔ نہ اتنی تیز کہ پوری زندگی روشن کر ڈالے نہ بالکل بجھی ہوئی کہ مکمل اندھیرے کا گمان ہو۔

سائڈ ٹیبل پر رکھی اس کی رپورٹس نائٹ بلب کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں لیکن ان کی چمک خیرہ کن نہ تھی کہ آنکھیں چندھیا جاتیں بلکہ وہ تو بینائی چھین لینے کے درپے تھی۔

اس کے برابر میں لیٹا چند دن کا معصوم وجود مکمل بے خبری اوڑھے محو خواب تھا۔ اس نے ممتا کے گہرے احساس سے مجبور ہو کر اس کی پیشانی چومی۔

"تمہیں تو خبر بھی نہیں میری جان، تم نے دنیا میں آ کر اپنی ماں کو خوشی کے ساتھ، ساتھ کیسی مشکل سے دوچار کیا ہے۔" ادھ کھلے دروازے کو کھول کر جمال اندر داخل ہوا۔ اس کے تھکے، تھکے چہرے سے جھلکتی بیزاری گواہ تھی کہ وہ ماں سے ایک لمبی لاحاصل بحث کے بعد ناکام ہو کر اٹھ آیا ہے۔

اس کی ساس پوتی کی پیدائش سے زیادہ ان رپورٹس اور نادیہ سے خفا تھیں۔ جن میں لکھا تھا کہ وہ آئندہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہے۔

"مجھے پوتا چاہیے ہر حال میں...... بھئی میں اکلوتے بیٹے کی ماں ہوں۔ مجھے بھی ارمان ہے کہ میرے بیٹے کی نسل آگے بڑھے اس میں آخر برائی کیا ہے اور اگر نادیہ دوبارہ ماں بننے کے قابل ہوتی تو میں ایسی بات کرتی ہی کیوں۔"

وہ مکمل طور پر اپر کلاس کا چلتا پھرتا اسٹیٹس سمبل تھیں۔ نادیہ کو انہوں نے اول دن سے دبا کر اور جمال فاخر ہمدانی کو اپنی مٹھی میں کر کے رکھا تھا۔ ان چند ہی دنوں میں انہوں نے اپنے ملنے جلنے والوں میں دبئی سے لے کر پاکستان تک جمال کی دوسری شادی کے ارادے نشر کر دیے تھے۔ نادیہ چپ چاپ سب دیکھ اور سن رہی تھی۔

پاپا آج ہی اس سے مل کر گئے تھے اور اس نے ان کے سامنے وہی سب ٹھیک ہے، سب خوش ہیں۔ والا مثالی تاثر بھی دے دیا تھا لیکن کب تک......

جمال جیسا بھی تھا اس کا شوہر تھا۔ حتی المقدور اس کا خیال رکھتا تھا۔ وقت بھی دیتا تھا۔ بیٹی کی پیدائش پر خوش بھی تھا لیکن اپنی والدہ سے ہمیشہ کی طرح متفق بھی نظر آ رہا تھا حالانکہ نادیہ نے اسے، اس مسئلے پر بہت بار اپنی ماں سے بحث کرتے دیکھا تھا مگر وہ جانتی تھی۔ ہو گا وہی جو اس کی ساس چاہتی تھیں۔

"کیا ہوا؟" اس نے جانے کیوں جمال سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہونا کیا ہے، امی نہیں مان رہیں۔" اس نے بے حد اکتا کر بیزاری سے کروٹ بدل لی۔ نادیہ اس کی چوڑی پشت کو دیکھتی آنسو بہانے لگی۔

☆☆☆

بیگم زرتاج کے حواسوں پر بجلی گری تھی۔ ان کے شوہر سلطان بنگش کا پارٹنر لاکھوں کا ہیر پھیر کر کے غائب ہو گیا تھا۔ اس نے سلطان صاحب کو زبردست دھوکا دیا تھا۔ ان کے مستقل کلائنٹس، ڈیلرز اور ڈسٹری بیوٹرز سے طرح، طرح کے جھوٹ بول رکھے تھے۔

سلطان بنگش کا کام صرف کاغذی دیکھ بھال اور آفس ٹیبل تک محدود تھا۔ باہر کے تمام معاملات اور ڈیلنگ ان کے پارٹنر کے ہاتھوں میں تھیں۔ وہ پچاس فی صد حصے کا مالک نہیں تھا لیکن اپنی محنت کے عوض منافع میں خود کو پچاس فی صد کا ہی حصے دار سمجھتا تھا اور وصول بھی کرتا تھا۔ سلطان بنگش نے کبھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے پارٹنر پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتے تھے اور اس نے ان کے بھروسے کا یہ صلہ دیا تھا، یہ بدلہ دیا تھا ان کے اندھے اعتبار کا لیکن بیگم زرتاج کی پریشانی کی وجہ صرف یہ خبر نہیں تھی۔ ان کے اوپر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا کیونکہ ان کے کسی ایمپلائی نے سلطان صاحب کو یہ خبر ائرپورٹ سے گھر واپسی کے دوران سنائی تھی اور انہیں راستے میں ہی ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

ڈرائیور اور ان کے ساتھ موجود ان کا سیکریٹری انہیں راستے سے اسپتال لے گئے تھے۔ وہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھے اور ڈاکٹرز ان کے بارے میں کچھ خاص پُرامید نہیں تھے۔ بیگم زرتاج حال سے بے حال ہو گئیں۔ فوراً ہی ڈرائیور کے ساتھ اسپتال

پہنچیں اوراب پچھلے چوبیں گھنٹوں سے وہیں تھیں۔

رجو سمیت گھر کے بھی ملازمین دکھ اور تاسف کی لپیٹ میں اپنے صاحب کے لیے دعاگو تھے۔ چھتیس گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد انہیں ہوش آیا تو سب نے جان پکڑی۔

انہوں نے یہ بات اپنی بیرونِ ملک مقیم بیٹی سے فی الحال چھپالی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اسے کوئی ذہنی دباؤ اس حالت میں برداشت کرنا پڑے جبکہ وہ ابھی زچگی کے مرحلوں سے مکمل طور پر نکلی نہیں تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ اتنی دور بیٹھی ان کی بیٹی ان سے کہیں زیادہ ذہنی دباؤ برداشت کررہی تھی۔

☆☆☆

جیسے، جیسے ناجی کی رخصتی کے دن نزدیک آرہے تھے۔ رجو کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ بڑی مشکل سے اور بہت ہمت کرکے صاحب کی طبیعت اور بیگم صاب کی حدت مزاجی کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی سمدھن سے تاریخ آگے بڑھانے کی بات کی تھی حالانکہ ناجی کے پچھن اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ تو جیسے رجو کی سکون بھری نیند گھول کر پی گئی تھی۔

آنے بہانے، رجو کی غیر موجودگی میں گھر سے نکل پڑتی۔ بعد میں رجو پوچھ تاچھ کرتی تو اس کے پاس گھڑے گھڑائے بہانے موجود ہوتے۔ کبھی کبھی محلے کا کریانے والا زاہد بھی رجو کے سوال جواب پر گواہی دے دیتا۔ ناجی چوڑی ہوجاتی مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سمدھن سے تاریخ آگے بڑھانے کی بات کی جائے۔ اس کے اپنے پاس جمع جتھے کے نام پر بہت قلیل رقم تھی۔ جب تک بیگم صاب...... مدد نہ کرتیں وہ ناجی کی بارات تو دور کسی کو شام کی چائے پلانے کے بھی قابل نہ تھی۔

بیٹی کو جہیز میں سونا چڑھانا تو خیر خواب ہی تھا مگر چار برتن اور ڈھنگ کے جوڑے، چادریں تو دے

سکتی تھی۔ اسی دن کے لیے صاب کی واپسی کا انتظار تھا مگر اب یہ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا چلا جارہا تھا۔

سمدھن مان تو گئی مگر چار باتیں سنانے سے باز نہ آئی۔ اس وقت رجو کا جی چاہا کہ جہیز پر چار حرف بھیج کر تین کپڑوں میں ناجی کو ابھی اس کے ساتھ دفع دور کردے۔

”مجھے کون سا اس مصیبت کو گھر بٹھانے کا شوک ہے۔“ وہ کڑھ کڑھ کر سوچتی رہی۔ ”خاندان برادری میں چار لوگوں کو منہ دکھانا ہوتا ہے۔“

☆☆☆

”تو یوں کہیں ناں اس میں آپ کی اپنی مرضی بھی شامل ہے۔“

”بات کو اپنی مرضی سے جو چاہے رنگ دے دو، حقیقت نہیں بدلے گی۔“ جمال ہمدانی تلخ لہجے میں نادیہ سے بات کررہا تھا۔

”کیا ہے حقیقت...... یہی ناں کہ میں اور بچے پیدا نہیں کرسکتی لیکن بے اولاد تو نہیں ہیں آپ۔ یہ آپ ہی کی بیٹی ہے جس پر ہفتے بھر سے آپ نے ایک نظر تک نہیں ڈالی۔“ وہ آنے والے وقت سے خوف زدہ تھی۔ یونہی صبح شام جمال سے الجھ رہی تھی حالانکہ جانتی تھی کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

”حقیقت یہ نہیں ہے نادیہ بیگم۔“ جمال نے لیپ ٹاپ بند کرکے غصے سے اسے دیکھا۔

”حقیقت یہ ہے کہ تم مجھے میرا وارث نہیں دے سکتیں۔ لڑکیوں کا کیا ہے وہ تو ویسے بھی اپنی نہیں ہوتیں۔“ نادیہ کے دل کو دھکا سا لگا۔ ان کی اپنی بیٹی ابھی مہینہ بھر کی بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ کتنے آرام سے اسے پرایا کہہ رہا تھا۔ ایسے بے حس شخص سے وہ امید کرتی بھی تو کیا۔

”آپ صرف ماما کے کہنے پر میرے ساتھ کتنی زیادتی کرنے جارہے ہیں۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو

خدانہ کرے اگر کوئی یہی سب آپ کی بیٹی کے ساتھ......“ اس کا گلا رندھ گیا بات مکمل نہیں کی گئی۔ درمیان میں ہی جیسے کسی نے کلیجا مسل کررکھ دیا۔

”کوئی زیادتی نہیں کررہا تمہارے ساتھ نہ میں نہ ماما...... تم آخر ٹھنڈے دماغ سے سوچتی کیوں نہیں۔ ان کو بھی اپنی زندگی کی خوشیاں حاصل کرنے کا پورا حق ہے اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ ان کی زندگی میں میرے علاوہ اور ہے کون۔“ جمال کا انداز مصالحت آمیز تھا۔

”اور میں...... میری خوشیاں جمال...... میری خوشیاں بھی تو آپ سے جڑی ہیں۔ میری زندگی میں بھی آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں پھر وہ کیوں آپ کو مجھ سے چھین رہی ہیں...... کیوں؟“ وہ پھٹ پڑی۔

”کوئی مجھے تم سے نہیں چھین رہا نادیہ۔ ٹرائی تو انڈراسٹینڈ جتنا حق اس گھر اور مجھ پر تمہارا ہے اتنا ہی اس کا بھی ہوگا۔ اس سے زیادہ نہیں، تم اس گھر کی بڑی بہو ہو اور ہمیشہ رہوگی۔ کوئی تم سے تمہارا مقام اور تمہاری حیثیت نہیں چھین سکتا۔“ وہ اسے تھام کر محبت سے سمجھا رہا تھا۔ اسے نادیہ کی دگرگوں حالت پر ترس تو آرہا تھا لیکن اس ترس اور ہمدردی میں وہ اتنا آگے نہیں نکل سکتا تھا جتنی وہ امید کررہی تھی۔

”دوسری شادی میری خوشی نہیں مجبوری ہے۔ میرے بعد میرا بزنس، یہ گھر، جائداد، بینک بیلنس اور سب کی دیکھ بھال کرنے والا سب چلانے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔ تو پھر وہ کوئی میرا ... خون میری اولاد سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے۔“ نادیہ نے اپنی سرخ سوجن زدہ آنکھیں اس پر گاڑ دیں۔

پچھلے ایک مہینے سے اس شخص کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے اس نے اتنے آنسو بہائے تھے جتنے اپنی پوری زندگی میں نہیں بہائے ہوں گے مگر اس پر تو گویا قطرہ برابر اثر نہیں ہوا تھا۔

”آپ ضرورت مند نہیں بے حس ہیں۔“ وہ تڑخ گئی جمال کو ایک دم غصہ چڑھا۔

”جو چاہے سمجھو۔“ وہ رخ موڑ گیا۔

”ٹھیک ہے، جو آپ کا جی چاہے کریں۔ جو میرا جی چاہے گا میں کروں گی۔ چلی جاؤں گی یہاں سے...... آپ کو چھوڑ کر اور اپنی بیٹی کو لے کر۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولتی ہوئی اٹھی اور اپنی وارڈروب کھول کر کھڑی ہوگئی۔ جمال اسے اپنی چیزیں اور کپڑے بیڈ پر ڈھیر کرتا دیکھنے لگا۔

”میں بالکل برداشت نہیں کرسکتی کہ میرے گھر میں میری زندگی میں کوئی عورت آپ کی بیوی کی حیثیت سے یہاں قدم رکھے۔“ وہ روتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی یہ دیکھے بغیر کہ وہ اس کی بات سننے کے لیے کمرے میں موجود ہے یا نہیں۔

☆☆☆

کاروبار میں ہونے والے نقصان سے نمٹنے کے لیے جس اعصابی طاقت کی ضرورت تھی وہ سلطان بخش میں بالکل نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

”کاش ہمارا کوئی بیٹا ہوتا۔“ بیگم سلطان دن میں کئی بار حسرت سے سوچتی تھیں۔ ”آج اگر سلطان کا بازو بن جاتا تو کسی کی ہمت تھی یوں صفائی سے آنکھوں میں دھول جھونک سکتا۔“

سلطان بخش کی صحت بہت سست روی سے بہتر ہورہی تھی۔ جہاں انہیں پچھتر فی صدری کوری کرنا چاہیے تھا وہاں تیس فی صد سے بھی کم امکانات تھے۔

اپنے بزنس پارٹنر پر انہیں سالوں کا اندھا اعتماد تھا۔ اسی اعتماد اور اعتبار کے ساتھ کیے گئے دھوکے کے سبب لاکھوں کا نقصان کروڑوں تک جا پہنچا تھا اور انہیں کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔

فیصل آباد میں شروع کی جانے والی ٹیکسٹائل مل کے تمام ملکیت کے کاغذات جعلی تھی اور وہ فریقین بھی جن سے زمین خریدی گئی تھی اور سلطان بخش سے زمین کی آدھی قیمت کی جگہ پوری قیمت وصول کی گئی

تھی۔اس کے باوجود مل ان کے نام نہ تھی بلکہ اس میں شراکت داری میں ان کا ایک فی صد بھی نہ تھا۔

کراچی والی گارمنٹس فیکٹری کی کتنی ہی مشنری راتوں رات بک گئی تھی۔ جس گارمنٹس فیکٹری کے لیے انہوں نے ٹیکسٹائل مل خریدی تھی کہ تیار ہونے والے ملبوسات کا فیبرک بھی ان کی اپنی ٹیکسٹائل مل سے تیار ہو کر آئے گا اسی گارمنٹس فیکٹری کی مشینوں کے بارے میں کسی کو پتا نہیں تھا کہ وہ گئیں کہاں، کس نے خریدیں، کیوں بیچی گئیں اور ان سے حاصل ہونے والا سرمایا کدھر تھا۔ ملازمین صرف یہ جانتے تھے کہ یہ سب کام سلطان صاحب کی مرضی سے ہو رہا ہے کیونکہ مشینیں خراب اور پرانی ہو گئی تھیں اور ان سے اب پہلے کی طرح کام لینا ممکن نہیں رہا تھا۔

''ہاں ایک بار سلیم نے ذکر کیا تھا کہ وہ کچھ سامان سیل کر کے نیا لینا چاہتا ہے اس نے مجھ سے تحریری اجازت بھی لی تھی لیکن......'' سلطان صاحب اب تک بے یقینی کی ولدل میں غوطہ زن تھے اور دلدل میں پھنسنے والا ابھرتا نہیں، ڈوبتا ہی جاتا ہے۔

''لعنت بھیج دیں اس پر اور اس کی حرکت پر۔ خدا آپ کو صحت اور زندگی دے تو ہم پھر پہلے والی پوزیشن میں آجائیں گے۔'' بیگم زرتاج ان کے ساتھ، ساتھ خود کو بھی تسلی دے رہی تھیں۔ سلطان بخش نے گہری سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

دو مہینے پہلے اسی سلیم چوہدری نے ان کو سال کا سب سے بڑا آرڈر کینسل ہونے کی خبر دی تھی اور وہ ایک سکتے کے عالم میں بیٹھے رہ گئے تھے۔

''سارا میٹریل بوگس ہے، سیمپل نکلتے ہی ریجیکٹ ہو گئے۔'' اس وقت تو وہ خود بھی بہت صدمے میں لگ رہا تھا۔

میٹریل میں کوئی فالٹ نہیں تھا۔ سلیم چوہدری نے سارا مال ایکسپورٹ کر دیا تھا۔ اپنی جیب بھر کر ان کو رپورٹ دی کہ ''چھوٹی مارکیٹوں میں ہول سیل ریٹ پر سپلائی کر دی گئی ہے۔''

سلطان بخش کی گارمنٹ فیکٹری سے نکلنے والی گڈز کا ایک نام تھا۔ وہ برانڈڈ بھی، خریدی اور بیچی جاتی تھی۔ لوگ بخش اینڈ کو، بی سی گارمنٹس کا نام پڑھ کر پرائز ٹیگ کو بھول جاتے تھے۔

سلطان بخش سمجھ سکتے تھے کہ جب دو ہزار روپے پر بیس کنزیومر پرائز پر بکنے والی چیز چند سو روپے ریجیکٹڈ اور فالٹڈ کہہ کر چند سو میں بیچی گئی ہوگی تو بھلا کیا منافع ہوا ہوگا الٹا ان کی فیکٹری کو نقصان ہوا۔

سلیم چوہدری نے مطلوبہ کنٹریکٹ پورا نہ کر کے خریدار کمپنیز اور کلائنٹس کے ساتھ جو بدعنوانی کی اس سے سلطان بخش کی جو ساکھ خراب ہوئی وہ الگ...... اس جعلی نقصان اور آرڈر کی واپسی کا سہارا لے کر مزدور طبقے کو تین مہینے کی تنخواہیں بھی نہیں دی گئی تھیں۔

سلطان بخش کی حیرانی اور ملال کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ سارا کام بے حد صفائی اور مہارت سے کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے سلیم چوہدری یہ فراڈ کرنے والا اکیلا نہ تھا اور بھی کئی کالی بھیڑیں موجود تھیں۔

تین مہینے سے صبر کر کے بیٹھے غریب مزدوروں میں سلطان بخش کی واپسی کی خبر نے غم و غصے کی لہر دوڑا دی تھی۔ انہیں اپنے مالک کی خراب حالت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مزدور یونین کا صدر دیگر باا ثر ارکان کے ہمراہ صبح شام فیکٹری کے چکر کاٹ رہا تھا۔ کام بند کرنے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔

سلطان بخش کے سیکریٹری اور دیگر اعلیٰ درجے کے وفادار ملازمین نے انہیں بہ مشکل سلطان تک پہنچنے سے روک رکھا تھا لیکن کب تک کبھی نہ کبھی تو انہیں صورتِ حال سے تفصیلاً آگاہ کرنا ہی تھا۔ جس روز وہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئے تمام ملازمین خصوصاً رجو کے دل میں خوشی اور طمانیت کی الگ ہی کیفیت تھی۔

وہ اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کر رہے تھے۔ اسی لیے سیکریٹری کو گھر بلا کر تمام معاملات کی تفصیل جانی اور نقصانات کا تخمینہ لگایا۔

''میرے ذاتی اکاؤنٹ میں اتنی رقم تو ہوگی کہ فوری طور پر تمام ورکرز کو ایک مہینے کی سیلری دے دی جائے۔ اس سے ان کے اشتعال میں بھی کمی آجائے گی۔'' وہ پُرسوچ انداز میں اپنے سیکریٹری سے مخاطب تھے۔ ''اور شاید کھویا ہوا اعتماد بھی بحال ہو جائے۔''

بیگم زرتاج قریب ہی بیٹھی متفکر سی ان کا چہرہ دیکھ رہی تھیں لیکن سلطان صاحب پہلے دھچکے کے بعد سنبھل کر پُرسکون ہو چکے تھے۔

''سر آپ کے لیے ایک گڈ نیوز ہے۔ اسلام آباد والی پارٹی سروہ رفیق آفریدی اینڈ کو ان کو آپ کے ساتھ ہونے والے فراڈ کا علم ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر ایک مہینے میں آپ ان کا آرڈر پورا کر دیں تو وہ ہاف پے منٹ، ایڈوانس دے دیں گے۔''

''ہوں......'' وہ اپنے ہاتھ دیکھتے رہے۔

''سر ایک مہینے میں ڈلیوری دی جا سکتی ہے۔ اگر صرف مشینیں......'' وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ ایک دم فیصلہ کن انداز میں بولے۔ ''عباس مشینیں آجائیں گی۔ کسی اچھے قابلِ بھروسا اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کریں۔ میں یہ گھر سیل کرنا چاہتا ہوں۔'' بیگم زرتاج پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ منہ کھولے دکھ اور حیرت سے انہیں دیکھتی رہ گئیں جو رخ موڑے اپنے سیکریٹری سے دوسرے معاملات طے کر رہے تھے۔

☆☆☆

رات کے جانے کون سا پہر رجو کی آنکھ کھلی تھی۔ کوئی عجیب سا احساس اسے جگا گیا تھا یا کوئی نامانوس آواز تھی جو باہر صحن کی طرف سے آئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔

ناجی اپنے بستر پر نہیں تھی۔ رجو کی نیند بھک سے اڑ گئی۔ وہ ننگے سر، دبے پاؤں دروازے کی چوکھٹ تک آئی اور بغور دو قدم کے صحن کے کونے میں بنے غسل خانے میں جلتی بتی کو دیکھا۔ اندھیرے صحن کے کونے میں اتنی روشنی ضرور تھی کہ بہ آسانی جھک کر بیٹھی ناجی نظر آگئی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی آگے بڑھی۔

''ناجی۔'' اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔ ''تو اس ویلے......'' دل میں کوئی اور ہی دھڑکے اپنی لمبی ناگ جیسی زبانیں کھولے اسے ڈسنے کو تیار کھڑے تھے۔ اس سے بات مکمل نہیں کی گئی۔

ناجی اس سرگوشی پر یوں ہڑبڑا کر پلٹی جیسے کسی نے اس کے سر پر بم پھوڑ دیا ہو اور بم تو پھٹا تھا مگر رجو کے اعصاب پر۔ گاڑھا تعفن زدہ سیال پانی کے ساتھ بہتا نالی میں جا رہا تھا۔ ناجی کی حالت ابتر تھی۔ چڑھی ہوئی سانسیں، بھری ہوئی آنکھیں اور بِن پانی کی مچھلی کی طرح ہانپتی شہ رگ...... اس کا کانپتا ہوا ہاتھ نل پر جما تھا اور دوسرا اپنے سینے پر۔

''منحوس...... ڈائن...... کتیا۔'' اگلے ہی لمحے اس کے منہ سے گالیوں اور مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ آتش فشاں پھٹ پڑا۔ رجو نے بے طرح اپنی موٹی ہتھیلیوں کے دو ہتڑوں سے اسے پیٹ ڈالا۔ ناجی پہلی بار گھٹ، گھٹ کر رو رہی تھی۔ رجو جانوروں کی طرح اسے پیٹ رہی تھی۔ یہ سمجھے بغیر کہ اس طرح ناجی کو کم اور اس کے ہاتھوں کو زیادہ چوٹ لگ رہی ہے۔ اس وقت اس نے اپنی آواز کو نیچا رکھنے میں کتنی دقت اٹھائی تھی یہ وہی جانتی تھی۔

''کیڑے پڑیں گے تیری قبر میں...... حرام خور۔'' ناجی پٹتے، پٹتے منہ کے بل گر گئی۔ جبھی رجو کو چکر سا آگیا۔ اس نے تھوڑا رک کر چند لمحے کے لیے ناجی کو دیکھا اور دیوار کا سہارا لیا پھر ہانپتی ہوئی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

نادیہ کو پاکستان آئے کئی دن گزر چکے تھے۔ وہ تو اپنے اوپر بیتنے والی زیادتی ماں کو بتانے آئی تھی لیکن یہاں بھی کچھ کم مشکلیں نہیں تھیں۔

''کمال ہے، اتنا کچھ ہو گیا امی اور آپ نے مجھے خبر تک نہیں دی۔''

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔''

''اور اگر خدانخواستہ ابو کو کچھ ہو جاتا تو......''

''نادیہ منہ سنبھال کر بات کرو۔'' بیگم زرتاج نے بے اختیار اسے ٹوک دیا۔

نادیہ کو ان کا رویہ عجیب ٹھس سا لگ رہا تھا۔۔۔ بےحس اور جامد چپ چاپ سا اُسے گھر کی فروخت والے معاملے سے لاعلم ہی رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی واپسی کے بعد فون پر کوئی بھی کہانی سنا کر اسے گھر کی تبدیلی سے آگاہ کر دیا جائے گا لیکن وہ خود بھی تو اس بات سے لاعلم تھیں کہ نادیہ یہاں سے جانے کے ارادے سے نہیں آئی تھی۔

''تمہارا واپسی کا ارادہ کب کا ہے نادیہ؟''

بیس پچیس دن اسے یہاں آئے ہوئے گزر چکے تھے اور انہوں نے اسے ایک بار بھی جمال یا اپنی ساس سے فون پر بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کا چونکنا بڑا فطری تھا۔ نواسی کو دیکھنے کی محبت پر داماد کو نہ دیکھنے کی فکر غالب آ رہی تھی۔

''میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی امی۔''

نادیہ نے انہیں حقیقتِ حال سے باخبر کرنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ جلد یا بدیر انہیں پتا چلنا ہی تھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ دہل سی گئیں۔

''امی......امی......'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دم رو پڑی۔

''کیا ہوا نادیہ، خدارا جلدی بتاؤ، ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔''

''آپ کو پتا ہے ناں میں دوبارہ ماں نہیں بن سکتی اس بات کو ایشو بنا کر جمال دوسری شادی کر رہے ہیں۔'' اس نے یہ مشکل بات مکمل کی۔

''کیا......؟'' مسز بخش کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

''ہاں اور وہ یہ سب میری ساس کے کہنے پر کر رہے ہیں۔'' وہ اب زور شور سے رو رہی تھی۔ اس کے آنسو بیگم زرتاج کے دل پر گر رہے تھے۔ بہت دن بعد دل میں جمع غبار کو نکلنے کی راہ ملی تھی اور وہ بھی ضبط کرتے، کرتے تھک چکی تھی۔

''اسی لیے میں ان کا گھر چھوڑ کر آ گئی ہوں۔ میں کیسے رہ سکتی ہوں سوتن کے ساتھ...... میں بھلا جمال کے ساتھ کسی اور عورت کو کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟'' بیگم زرتاج نے ایک گہری سانس لے کر اپنی پیشانی مسلی۔

''تو یہ بات ہے، تم خود آ گئیں میں سمجھی جمال نے تمہیں گھر سے نکال دیا۔'' ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''امی آپ کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ دوسری شادی کر رہے ہیں۔ آپ کو اس بات کا دکھ نہیں؟''

''دکھ کیوں نہیں...... دکھ تو بہت ہے بیٹا مگر......'' وہ کچھ اٹک سی گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا نقطۂ نظر کیسے واضح کریں۔

''اگر اس نے تمہیں وہاں سے جانے کے لیے نہیں کہا تھا تو تمہیں یوں گھر چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟'' وہ مارے دکھ کے ٹھیک سے بول بھی نہیں پائی۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں میں۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے تم پر...... پاکستان آنے کے بعد دو گھنٹے کے اندر تمہیں اپنے باپ کی حالت اور اس کی وجہ کا علم ہو گیا تھا پھر بھی تم ایک مہینے سے یہاں رہ رہی ہو۔ جانتی ہو کتنی مشکل سے طبیعت سنبھلی ہے ان کی۔ ابھی تک وہ آفس جانے کے قابل نہیں ہوئے اور تم چاہتی ہو کہ پھر انہیں بسترِ مرگ پر پہنچا دوں۔''

بیگم زرتاج پھٹ پڑیں۔

''تو کیا کرتی میں وہاں بیٹھ کر اپنی بربادی کا تماشا دیکھتی؟''

''بربادی کیسی وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔ تمہیں گھر سے نکال تو نہیں رہا ناں!'' وہ بے مروتی سے بولیں۔ اس وقت نادیہ ان کے لیے صرف نادیہ جمال تھی اور وہ خود مکمل طور پر بیگم سلطان بخش۔

''کیا ان دونوں باتوں میں کوئی فرق ہے؟''

''ہاں بہت فرق ہے۔''

''اچھا...... بھلا کیا فرق ہے؟''

''تم بے آسرا ہونے سے بچ گئی ہو شکر کرو۔''

''امی!'' حیرت کی زیادتی سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ''یہ آپ کہہ رہی ہیں...... آپ؟''

''ہاں، یہ میں کہہ رہی ہوں۔'' وہ کچھ لاتعلقی سے بولیں۔

''کیوں...... کیا ایک شخص کے چھوڑ دینے سے میں بے آسرا ہو جاؤں گی تو پھر آپ اور پاپا کے رشتے کی حقیقت ہی کیا ہے؟ یہ اتنا بڑا کاروبار، گھر اور روپیہ پیسہ یہ سب میرا ہی تو ہے۔ آپ نے ہی کہا تھا...... یاد کریں۔''

''ہاں کہا تھا، ہمیں یاد ہے۔''

''تو پھر میں بے آسرا کیوں ہوں گی۔ یہاں رہ کر پاپا کے بزنس میں ان کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری ہے میرے پاس۔ کس دن کام آئے گی۔''

''پہلی بات تو یہ کہ بزنس سنبھالنے کے لیے ڈگری کے ساتھ ساتھ تجربے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور دوسری اور آخری بات کہ کاروبار رہے گا تو سنبھالو گی ناں۔'' بات کے آخر میں وہ کچھ دکھی سی ہو گئیں۔

''کیا...... کیا پوزیشن اتنی ڈاؤن ہو چکی ہے؟'' وہ اپنی پریشانی لمحے بھر کو بھول گئی۔

حمد

جو ملے حیاتِ خضر مجھے
اور اسے میں صرفِ ثنا کروں
ترا شکر پھر بھی ادا نہ ہو
تیرا شکر کیسے ادا کروں
نہیں کوئی تیرے سوا مرا
جسے یاد تیرے سوا کروں
میں بہت ہی عاجز و بے نوا
ترے آگے میری بساط کیا
میں کہا کروں تو سنا کرے
تو دیا کرے، میں لیا کروں
تیرے در پہ خم رہے سر مرا
تیری رحمتوں میں گزر مرا
کوئی بھول ہو تو معاف کر
مجھے بخش دے جو خطا کروں

کاوش: نزہت جبیں ضیا، کراچی

''اس سے بھی کہیں زیادہ...... جبھی کہتی ہوں جن قدموں پر آئی ہو ان ہی پر واپس لوٹ جاؤ ہم اب تمہیں کچھ نہیں دے سکتے۔ ایک چھت کا آسرا بھی نہیں کیونکہ ہمیں خود نہیں پتا کہ ہمارا اگلا ٹھکانا کہاں ہوگا۔''

''جی!'' اس نے حد درجہ تعجب اور الجھن سے انہیں دیکھا۔

''ہاں۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔ ''کاروباری خسارے اور دھوکے سے چڑھنے والے قرض کو چکانے کے لیے تمہارے پاپا یہ گھر سیل کر رہے ہیں۔''

نادیہ کے منہ سے چیخ نکلتے، نکلتے رہ گئی۔ بیگم زرتاج بوجھل قدموں سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل

گئیں۔ نادیہ گنگ سی انہیں جاتا دیکھتی رہ گئی۔ درودیوار اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے اور تصویر میں جمال اور اس کی ماں کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ برہم تیور، طنزیہ مسکراہٹ والا چہرہ۔ وہ بے ساختہ اپنی بیٹی کو سینے میں بھینچ کر رو دی۔

☆☆☆

اس کے قدم آڑھے ترچھے کھردری زمین پر پڑ رہے تھے۔ گھسی ہوئی دو پٹی کی چپل زمین کی تپش کو روکنے میں ناکام تھی۔ اس کے تلوے جل رہے تھے مگر دل کی جلن اور آنکھوں کی تپش کے آگے اسے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ اس کے تو اپنے اندر بھانبھڑ جل رہے تھے۔ یہ ذرا سی جلتی زمین بھلا کیا بگاڑ پاتی۔ اس کی سمدھن اپنے گھر پر اسی کی منتظر تھی۔

”تو سنا اپنی ناجی کو کیا ہو گیا؟“

”نہیں بس وہ...... ہیضے کا اثر ہو گیا ہے۔“

”اے ہے...... وہ تو بڑی بری بیماری ہے۔“ سمدھن اچھل پڑی۔ ”کسی ڈاکٹر واکٹر کو دکھایا یا بس گھر پر ہی ٹوٹکے کر رہی ہے۔“

”ہاں دکھایا تو ہے بس تم دعا کرو۔“

”اچھی طرح پتا کر لینا تھا ہیضہ ہی ہے ناں!“ سمدھن کا لہجہ سرسری تھا۔ رجو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

”میں نے تجھ سے ایک ضروری گل کرنی ہے۔“ وہ فوراً ہی مطلب پر آ گئی۔

”گل تو میں نے بھی تجھ سے کرنی ہے پر پہلے تو بول۔“

”وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ......“ رجو نے تھوک نگل کر خشک گلے کو تر کرنے کی کوشش کی۔ ”ناجی کی رخصتی لے لے اسی مہینے سادگی سے۔“ وہ اسی مقصد کے لیے آئی تھی پر اس کی سمدھن کے لیے یہ کایا پلٹ ہضم کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ رجو نے خود شادی کی تاریخ آگے بڑھانے کی درخواست کی تھی۔

رجو جانتی تھی وہ اچھل پڑے گی۔ ممکن ہے کوئی الٹی سیدھی بکواس بھی کرے پر وہ اس کے تمام ممکنہ اور متوقع سوالات کی تیاری کر کے آئی تھی لیکن اس کی سمدھن کے پاس رجو سے بڑا پٹاخا تھا اور اس نے جب وہ پٹاخا پھوڑا تو رجو کو لگا اس کی نظروں کے سامنے اس کی عزت کی چادر کے پرخچے اُڑ گئے ہوں اور دھجیاں فضا میں بکھر کر دھیرے، دھیرے اس کے بے جان وجود کو ڈھانپنے اس کے اوپر آن گریں۔

”اب ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں رجو۔“ وہ بڑی پُرسکون تھی۔

”ک...... کیوں؟“ رجو کی زندگی میں آج تک اس ایک کیوں سے زیادہ مشکل سوال نہ آیا تھا۔ نہ اتنا مشکل نہ اتنا بڑا نہ اتنا بھید بھرا۔

”شوکے نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ مجھے تجھ سے یہی بات کرنا تھی۔“ رجو کو پیروں کے نیچے سے زمین سرکنے کا محاورہ آج سمجھ میں آیا تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی اس عورت کو دیکھ رہی تھی۔ جس سے سمدھن بننے سے پہلے اس کا محلے داری کا رشتہ تھا اور جو اس وقت بڑی بے مروتی سے شوکے کا بیان من وعن جاری کر رہی تھی۔

”وہ کہتا ہے اسے ناجی بڑے ہلکے کردار کی لگی ہے۔ میرے نندوئی کے بڑے بھائی کے بیٹے نے ناجی کو دیکھا تھا کسی کے ساتھ۔ اس نے شوکے سے جڑ دیا آ کے۔ تو بھی ناجی کو کسی ڈھنگ کی زنانی ڈاکٹر کو دکھا۔ میں نے سنا ہے اسے الٹیاں لگی ہیں۔“ وہ رازداری سے رجو کی سمت جھک کر بولی۔

”صفیہ آئی تھی تیری پڑوسن اس نے بتایا ہے۔ دیکھ میں نہیں کہہ رہی پورے محلے کی زبانیں ہیں تو کس، کس کی زبان پکڑے گی۔ اگر اسے واقعی ہیضہ ہوا ہے تو جتنی جلدی چنگی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“ اس نے ہمدردانہ انداز میں رجو کا ہاتھ دبایا۔

رجو کی اب سمجھ میں آیا۔ اس کی عزت کی جو

دھجیاں بکھر چکی تھیں انہیں رک، رک کے سمیٹنا ناممکن تھا اور دھجیاں بھلا کب کسی کا کچھ ڈھانپ سکی ہیں۔ نہ عیب، نہ جسم، نہ راز، نہ غلطی۔

☆☆☆

نادیہ خاموشی سے ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھی سلائس کتر رہی تھی۔ پاپا ایک طویل عرصہ بستر پر گزارنے کے بعد خود سے چل کر ڈائننگ ٹیبل تک آئے تھے۔ خوشی تو اس کو بھی تھی مگر امی کی حالت دیدنی تھی بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا، بنا کر ان کے منہ میں ڈالیں۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ بھی اپنی ماں کی محبت کے یہ مظاہرے دیکھتی رہی پھر چند دن پہلے کا اپنا اور امی کا مکالمہ یاد کر کے اداس ہو گئی۔

”تمہاری فلائٹ کب کی ہے؟“ پاپا نے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر اس سے پوچھا۔

”بارہ بجے۔“ پاس ہی اس کا کلیجہ پڑا تھا بیٹی سو رہی تھی۔

”ہماری بیٹی اداس ہو گئی گھر جانے کے خیال سے۔“

”جی۔“ اس کے گلے میں پھندا اٹکنے لگا۔ ”جی پاپا۔“ بے اختیار اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔

”ارے، ارے۔“ امی نے ایک دم اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ دل ہی دل میں ماں سے خفا تھی اور فی الحال یہ خفگی قائم تھی۔

”آپ کی بیٹی تو جانا ہی نہیں چاہتی پاپا! وہ اداس نہیں مجبور ہے، بے حد مجبور۔ اسی مجبوری کے سہارے اس نے جمال ہمدانی کو فون کر کے اپنے آنے کا بتا دیا تھا اور یہ جان کر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آئی تھی کہ جمال نے اس کی اور بیٹی کی واپسی پر خوشی کا اظہار کیا تھا یا پھر وہ اپنی سوتن پر راضی تھی شاید یہ خوشی کی بات تھی جمال ہمدانی کے لیے۔“ پاپا کو ناشتا ختم کر کے دھیرے دھیرے کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر وہ دل میں بولی۔

بیگم زرتاج سلطان بخش بہت دیر بعد کمرے سے باہر آئیں۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی چینل بدل رہی تھی اور یقیناً اپنی فلائٹ کا انتظار کر رہی تھی ان کے دل میں دکھ اور تاسف کی گہری لہر نے سر اٹھایا۔

اس کا گھر ٹوٹا نہیں تھا تو بچا بھی نہیں تھا۔ شوہر، ایک محبت کرنے والی بیوی کی وہ جاگیر ہوتی ہے جس میں بٹوارا وہ کبھی مر کر بھی گوارا نہیں کر سکتی ..... وہ بے ساختہ اس کے سامنے آ ئیں انہیں دھچکا لگا۔ نادیہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”میں جانتی ہوں تم مجھ سے ناراض ہو۔“ اس نے جواب دیے بغیر آنسو صاف کیے۔ ”لیکن جمال کی مجبوری کو تم نہیں میں سمجھ سکتی ہوں۔“ وہ چونک کر امی کو دیکھنے لگی۔

”ہاں بیٹا، وہ آج سے ہی اس احساسِ محرومی کو محسوس کر رہا ہے جسے میں نے اور تمہارے پاپا نے اب بڑھاپے میں کہیں جا کر محسوس کیا اور بہت بری طرح محسوس کیا۔ ہم جس فیز سے اب گزر رہے ہیں وہ اس کی آہٹ سن چکا ہے۔ ہم نے بیٹے کی کمی کو اب محسوس کیا ہے وہ بھی ساری عمر گزرنے کے بعد اور میں نہیں چاہتی کہ خدانخواستہ تمہیں یا جمال کو بھی اس کمی کا احساس ہو یا تمہارے اوپر بھی یہ وقت آئے کہ تم اور جمال بولو کاش ہمارا ایک بیٹا بھی ہوتا۔ جمال کی دوسری شادی کا فیصلہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ دکھ، جلد بازی، جذباتیت یا ماں کی حد سے بڑھی ہوئی فرمانبرداری کا نتیجہ مگر بیٹا...... یہ فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا۔ ہاں تمہارے لیے تکلیف دہ ضرور ہوگا۔ میں جانتی ہوں اور تمہاری وجہ سے میرے لیے بھی اگر تم غور کرو تو اس میں بھی تمہارا فائدہ ہی ہے۔ تم اور تمہاری بیٹی اس کی جائداد میں حصے دار ہو گی اور تمہاری بیٹی سمجھ دار ہونے کے بعد بھی تمہاری طرف وہ سوال نہیں بڑھائے گی جس کا جواب تمہارے پاس ہو ہی نہ یا اگر ہو بھی تو تمہیں جواب دیتے ہوئے شرمندگی ہو۔“ نادیہ کا سر جھکا ہوا تھا انہوں

نے گھڑی دیکھی۔

"مجھے تم سے اور کچھ نہیں کہنا۔" اس کی روانگی کا وقت بھی ہو رہا تھا اور سلطان کی میڈیسن کا بھی۔

بیگم زرتاج اس کے ساتھ ائرپورٹ تک نہیں جاسکتی تھیں۔ وہ اسے سی آف کرنے بیرونی دروازے تک ہی آئیں۔ اسے چھوڑنے ڈرائیور جا رہا تھا۔

"تمہارے دل پر ٹوٹے غم کے پہاڑ کو میں سمجھتی ہوں لیکن مجھے اپنے شوہر کا ساتھ دینا ہے اور ان کی اور اپنے گھر کی بہتری کے لیے انہیں مزید کسی صدمے سے بچانا ہے۔ اس گھر کی سلامتی کے لیے مجھے معاف کرنا میری بچی، میں مجبور ہوں۔" وہ دور جاتی اور نقطے کی طرح معدوم ہوتی گاڑی کو دیکھتے ہوئے سوچے گئیں۔ انہیں احساس تک نہ تھا کہ آنسو پلکوں سے سفر کرتے ہوئے رخساروں سے نیچے ٹپک رہے تھے۔

☆☆☆

پیلے بلب کی مدقوق روشنی میں چارپائی پر پڑا ناجی کا نڈھال وجود آج سے پہلے کبھی اتنا قابلِ نفرین نہیں لگا تھا۔ وہ اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی ناجی تک آئی۔

"کتنی نڈھال ہوگئی ہے میری بچی۔" اس نے ناجی کی پیشانی پر محبت سے ہاتھ رکھا اور پسینے سے چپکے ہوئے بال سمیٹے۔ ناجی کے لیے ماں کا رویّہ کل شام سے ہی خاصا حیران کن تھا۔ جب سے وہ شوکت کے گھر سے واپس آئی تھی۔ اس کے خیال میں تو اماں کو اسے جان سے مار دینا چاہیے تھا۔

"تیری پسند کی دال بنائی ہے ماش کی کھٹی والی۔ ہوں...... میں کھانا لاتی ہوں تیرے لیے۔" وہ پیار سے اسے دیکھتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔

☆☆☆

تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگتے مناظر کو.... بے بسی سے دیکھتی نادیہ چونک گئی۔ اس کی بیٹی نیند میں ڈر کر اٹھ گئی تھی اور اب رونے لگی تھی۔ اس نے جلدی سے اٹھا کر اسے سینے سے لگا لیا۔

"یا اللہ میری بیٹی کو کسی ایسی مجبوری کے سامنے مت جھکانا۔" اس کے دل سے بے ساختہ دعا نکل رہی تھی۔

☆☆☆

اس نے کھانا ٹرے میں لگایا اور ایک نظر کمرے میں جھانکا۔ دروازے کی چوکھٹ میں سے پلنگ پر پڑے وجود کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ٹرے اٹھانے سے پہلے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک پڑیا برآمد کی اور اسے کھول کر مٹیالے رنگ کا سفوف دال پر چھڑک دیا۔ اس کے چہرے پر برف سی ٹھنڈی کیفیت طاری تھی۔ ناجی نے اس کی زندگی بھر کی سینت، سینت کر رکھی عزت کو اپنی بے غیرتی اور بے حیائی کی انگیٹھی میں ڈال دیا تھا۔

اس کے ہیضے کی کہانی محلے والوں کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ انہیں یقین دلانے کے لیے وہ یہ قدم اٹھانے پر مجبور تھی۔ اپنی عزت بچانے کے لیے وہ مجبور تھی۔ اس نے ٹرے اٹھا کر قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔

اسے روز کی طرح نہ سونے کی جلدی تھی نہ صبح اٹھنے کی فکر تھی۔ اسے اچھی طرح ازبر تھا اپنا جواب۔ جو تین دن بعد بغیر بتائے اتنے دن غائب کرنے پر بیگم زرتاج کے حوالے کرنا تھا۔

"ناجی کو ہیضہ ہوگیا تھا جی، تین دن پہلے میری بیٹی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔" وہ ناجی کو لقمے بنا، بنا کر منہ میں دے رہی تھی اور آنے والے کل کا دن اس کی یادداشت میں تازہ ہو رہا تھا۔

بال نوچتی، بین کرتی اپنی بیٹی کے بے جان وجود سے لپٹ کر دھاڑیں مارتی رجو۔

"ہائے میری بیٹی...... ہاتھوں میں مہندی لگنے سے پہلے ہی چلی گئی۔ میری بیٹی۔"

ڈور بیل کی آواز پر میں تیزی سے آگے بڑھا۔ میم بھی اپنی دوست کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں دروازے تک آنے میں دیر کیا ہوئی کہ جھٹ میں نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کیا کھولا مجھے لگا روشنی کا تیز جھماکا تیزی سے تیرتا اندر داخل ہو کر میرے پورے وجود میں پھیل گیا۔ میرے سامنے بارہ، تیرہ سالہ پری کھڑی تھی۔

بارہ تیرہ...... تیرہ، بارہ...... گیارہ، بارہ...... نہیں، نہیں تیرہ۔ اوفوہ چھوڑیں بس یہ طے ہے کہ وہ چودہ، پندرہ کی نہیں تھی بلکہ وہ چودہ سال کی تو تھی ہی نہیں۔ بڑی، بڑی بہت خوب صورت آنکھیں، گھنیری پلکیں جن کا پہرہ دے رہی تھیں۔ شولڈر کٹ



کٹے سیاہ سلکی اسٹریٹ بال، ماتھے پر جان بوجھ کر اٹھکیلیاں کرنے کے لیے چھوڑے گئے شریر ٹیگو جو اِدھراُدھر ماتھے پر پھرنے کے بعد واپس اپنی جگہ پر خود ہی لوٹ آتے تھے۔ وہ واقعی پری تھی میں محو ہو گیا۔

اس کی روشن چمکدار بڑی، بڑی آنکھوں میں حیرت در آئی پھر وہ کچھ اور بڑی ہو کر انتہائی نمایاں ہو گئیں مگر مجھے تو کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا بجز اسے پلکیں جھپکائے بنا دیکھنے کے۔ سر کی پشت پر چپت پڑی تو میں چونکا۔ گردن پھر بھی نہ موڑی، گردن موڑ کر مارنے والے کو کب وہ پری مجھے دیکھنے دے رہی تھی کہ میم کی چاق و چوبند آواز سنائی دی۔

”میکال راستہ دو ہٹو، یہ میری دوست ہیں۔“ میں چونکا۔

”نہیں، نہیں...... یہ آپ کی دوست کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کی اور میری دوستی میچ کرتی ہے۔“ میں دل ہی دل میں میم سے مخاطب تھا کہ اچانک اس پری پر سے نظر سرسراتی پیچھے گئی جہاں کوئی آنٹی کھڑی تھیں میں تو اپنے ہی شرمندگی کے پسینے میں ڈوب، ڈوب گیا۔

”اوہ آئیں آنٹی...... السلام علیکم۔“ میں نے اپنی نظروں کو خوب قابو کر کے کہا۔

”تم ہٹو گے تو وہ اندر آئیں گی ناں۔“ میم نے شاید یہ طے کر لیا تھا کہ پری کے سامنے آج مجھے بھرپور ذلیل کرنا ہے۔ میں خفت سے راستہ دیتے ہوئے ایک طرف کو ہو گیا۔ گیا پھر بھی نہیں۔ آنٹی اور میم بہت خلوص سے گلے ملیں۔ پری کو پیار کیا۔ میرا دل تو باغ، باغ ہو گیا۔

میم انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں چلیں میں بھی گویا ان کے پیچھے اڑتا ہوا پہنچا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو رہا تھا۔ میں اس جذبے، اس احساس سے قطعاً ناآشنا تھا مگر میرے ساتھ جو بھی واردات ہو رہی تھی وہ سب مجھے اچھا لگ رہا تھا۔

وہ سب بیٹھ چکی تھیں اور میں کسی اَن وانٹڈ پرسن کی طرح دروازے میں لٹکا ہوا تھا۔ جیسے گھر والے گھر کا تالا کھول کر اندر چلے جائیں اور کھلے تالے کو دروازے ہی میں لگا چھوڑ جائیں۔ اس لمحے میرا کس قدر دل چاہ رہا تھا کہ میم اخلاقاً ہی مجھے بیٹھنے کے لیے کہہ دیں۔ وگرنہ وہ اپنی کتنی ہی دوستوں سے میرا تعارف کرواتی تھیں اور میں سلام دعا کے فوراً بعد چمپت ہو جایا کرتا تھا۔ یہاں معاملہ الٹ ہو گیا تھا۔ میں بنا کسی شرم و جھجک اس پری کو براہِ راست تک رہا تھا۔ وہ اتنی معصوم تھی جیسے میری نظروں کی چبھن محسوس ہی نہیں ہو رہی ہو یا شاید وہ ابھی اس جذبے سے قطعاً ناآشنا تھی۔ انتہائی معصومیت سے بھری توجہ سے اپنی ممی اور میم کی باتیں سن رہی تھی گویا بہت بڑی فلاسفر ہو یا مشورہ دینے والی یا عقلِ کل...... خیر جو بھی...... میں اس پری وش پر ٹکٹکی باندھے تھا۔ مجھے یاد ہے مجھے نظروں کی چوری پکڑے جانے کا ذرا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ پتا نہیں اس پری نے کون سا اسمِ اعظم پڑھ کر مجھے قابو کر لیا تھا کہ میں اس کے حصار سے نکل نہیں پا رہا تھا۔

”بٹو...... بٹو...... بٹ...... میکال...... می...... کال!“ میم کی زوردار آواز نے مجھے گویا کرکرا کر دیا۔ نہ جانے وہ مجھے کب سے پکار رہی تھیں کہ اب وہ چیخ پڑی تھیں۔ یہ تیسری ذلت تھی جو مجھے منجانب میم پری کے سامنے ملی۔ پہلی ذلت چپت مار کر، دوسری راستہ دو کے حوالے سے اور تیسری اور تازہ، تازہ یہ چیخ پکار کر کے۔

”جی۔“ میں بہت مؤدب ہو کر ان کی سمت گھوما۔

”اندر جاؤ، دیکھو وجی اب تک ڈرنک کیوں نہیں لائی؟“

”جی اچھا۔“ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا مگر اس وقت مجھے میم کا بولنا ذرا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”اور ہاں تم اپنے روم میں جا کر پڑھو۔ تم پڑھ رہے تھے ناں؟“ انہوں نے میری واپسی کا راستہ مسدود کرتے ہوئے کہا۔

آج ایک ہی دن میں اس ”پری“ کے سامنے انہوں نے یہ میری چوتھی ذلت کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مجھے چار ہی ذلتوں پر اکتفا کرتے ہوئے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

ایک اچٹتی نظر میم پر ڈالتے ہوئے میں اپنی ایڑیوں پر گھوما وہ مجھے ابھی تک سرزنش بھری نگاہ سے تک رہی تھیں۔

”ہونہہ۔“ دل ہی دل میں ہنکارا بھر کر میں نے اپنی پری پر الوداعی نگاہ ڈالی۔ ”ہائے ہائے۔“ وہ معصوم تو میری ہر ذلت پر بے خبر بیٹھی تھی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اس کا رخ ابھی تک میری اور اپنی مام کی سمت تھا۔ میرا حلق تک کڑوا ہو چکا تھا مگر پری کو دیکھ کر مجھے لگا جیسے میں نے پی لی ہو۔ میں تیزی سے نکلنے کے چکر میں گلاس ڈور سے ٹکراتے، ٹکراتے بچا۔ جاتے، جاتے میم کی آواز سنائی دی۔

”پتا نہیں آج میکال کو کیا ہو گیا ہے؟ کس قدر بدحواس نظر آ رہا ہے۔“ لو جی یہ ذلت بھی جاتے، جاتے مقدر ہوئی۔ جی چاہا مڑ کر چلا کر کہوں۔

"stop mam Its enough"

مگر اب ہمت نہ تھی کچھ کہنے اور اس کے بدلے میں بہت کچھ سننے کی۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا چشمِ تصور سے سب کو ڈرنک اور لوازمات پر ہاتھ صاف کرتے دیکھ رہا تھا۔ بے شک میرے ہاتھ میں کورس کی کتاب تھی لیکن نگاہیں حروف کی جگہ پری کا دیدار کر رہی تھیں۔ گلاسوں اور چمچوں کی مترنم کھنک مجھے اپنی جانب کھینچ، کھینچ کر کمرے میں بلا رہی تھی۔ میں کسی ”معمول“ کی طرح اٹھا اور ڈرائنگ روم کے عین سامنے کاریڈور تک آیا۔ جہاں فریج بڑی آن بان شان سے ایستادہ تھا۔ میں نے فریج کے ہینڈل پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے سوچ لیا تھا اگر میم نے اب بے عزتی کی تو میں بھی غصیلی آواز میں پوچھوں گا۔

”کیا مجھے پیاس نہیں لگ سکتی؟“ ہاتھ فریج کے ہینڈل پر مضبوطی سے جمے تھے مگر نگاہ شرارت سے باز نہیں آئی میں نے کن انکھیوں سے پری کو دیکھا۔

”اُف یہ کیا؟“ وہ تو کچھ لے ہی نہیں رہی۔ اس وقت مجھے اپنی میم پر روایتی ساس ہونے کا گمان ہوا جنہیں قطعاً اس بات سے کوئی سروکار ہی نہ تھا کہ پری کچھ نہیں کھا پی رہی۔ میں نے فریج کے دروازے کو انتہائی عالمِ جنون میں دے مارا۔ حسبِ معمول میم نے گردن موڑی۔ میرا خیال تھا کہ آج انہوں نے ایک ظالم سماج اور بے درد ساس کا رول بخوبی نبھانا ہے۔

”بٹو۔“ میں چونکا۔ ان کی آواز میں زمانے بھر کی چاشنی تھی گویا اب تک انہوں نے میری کوئی عزت افزائی کی ہی نہ ہو۔

”جی۔“ میں خوشی سے بلیوں اچھلا۔ اپنے تاثرات چھپاتا فریج کو چھوڑ کر سیدھا گلاس ڈور کراس کرتا انتہائی مؤدب ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ایک پیار بھری نگاہ اپنی پری پر ڈالی۔

وہ تو ایسے صوفے پر اکھڑی، اکھڑی بیٹھی تھی جیسے صوفے میں کیل کانٹے اگ آئے ہوں جو اسے بے چین کیے ہوئے ہیں۔ کسی بھی طرح کے جذبات سے عاری چہرہ مگر بلا کا معصوم۔

”بٹو ایسی کوئی ڈرنک لا دو جو ٹھنڈی نہ ہو۔ ایش کو تھروٹ انفیکشن ہے۔“ اوہ میری پری کا نام ایش ہے میں جی ہی جی میں اس معلومات پر خوش ہوا۔ کس قدر خوب صورت نام مگر اسی لمحے میرے دل کو شدید دھچکا سا لگا۔ میں نے ایک غصیلی نگاہ اس کی ممی پر ڈالی کس قدر سفاک ماں ہے پری کو انفیکشن ہے اور یہ یہاں بیٹھی دوستیاں نبھا رہی ہیں بجائے پری کو ڈاکٹر کو دکھانے کے۔

”ابھی لایا۔“ غصیلی نگاہ ہٹا کر میں نے میم کو

فرمانبرداری سے جواب دیا۔ میں کچن سے ملحق اسٹور روم سے ایک ہی ہاتھ میں چار پانچ ٹن نکال لایا۔ میم کو کراس کرتا سیدھا پری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے پہلی بار گردن میری جانب موڑی تو لگا ایک بار پھر روشنیوں کا جھماکا سا ہوگیا۔

"No thanks I don't need"

واہ کیا آواز تھی جس کے سحر میں، میں مبتلا ہوگیا۔ جیسے پازیب بجی ہو یا جیسے کہیں جھرنے بہہ رہے ہوں اور ریشمی تو اتنی کہ اگر میں اس پر ہاتھ پھیر سکتا یا اس کی آواز مٹھی میں قید کرسکتا تو وہ پھسل جاتی۔ میں اسے تکے چلا گیا آگے کچھ کہہ نہ سکا۔

"لے لو بے بی ڈارلنگ۔" میم نے پہلی بار ایک اچھی ساس ہونے کا ثبوت دیا۔

"نہیں آنٹی۔" پھر وہی جھرنا۔

میرا تو ہٹنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

"اچھا رہنے دو میکال، تم جا کر پڑھو۔" لہجہ ایک دم بدل کر ذلت آمیز ہوگیا اور زندگی میں پہلی بار پڑھائی سے بے انتہا نفرت محسوس ہوئی۔ میں تھکے تھکے وجود سے آگے بڑھا۔ آخری سرے پر پہنچ کر میں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا ایک بڑی میٹھی smile pass کی۔ اس نے بھی اسی لمحے مجھے دیکھا اور جواباً مسکرائی مگر اس طرح جیسے جبراً مسکرائی ہو اور لمحے بھر میں سپاٹ ہو کر پھر اپنی ماں کی طرف نگاہ کرلی تھی مگر میں جان گیا تھا۔ پری کا کتنا دل ہوگا کہ مجھے مسکرا کر دیکھے مگر سماج کی بھاری بھرکم دیواروں کے بیچ وہ ایسا کرنے سے قاصر تھی۔

میں بھی مرے، مرے قدموں سے اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے اپنی پوری زندگی پر لعنت اور لاحول ایک ساتھ بھیجی بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے پھر وہ چلی گئی۔ مجھے اداس کر گئی بلکہ جیسے میرے شب و روز، میرا چین، قرار سب کچھ اپنے ہینڈ بیگ میں لپیٹ کے لے گئی۔ میں دنوں بولایا، بولایا پھرا۔

یہ جذبات تو خود میں نے پہلی بار محسوس کیے تھے۔ ان آنٹی کو اپنے گھر میں پہلی بار دیکھا تھا یوں تو میری میم کا فرینڈ سرکل بہت وسیع تھا اس میں آئے دن کمی اور اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ کمی کم مگر اضافہ آئے دن کا کام تھا۔ میری میم (یعنی میری مما) کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ میم آرٹیفیشل جیولری، برائیڈل ڈریسز اور فارن میک اپ کا بزنس کرتی تھیں، وہ ایک بے پناہ کامیاب بزنس لیڈی تھیں۔ آنے والے کسٹمرز ان کو میم کہتے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہمارے کانوں نے ان کے لیے میم کا لفظ سنا تو ہم بھی انہیں میم کہنے لگے۔ بابا دمام میں بہت اچھی آئل فرم میں تھے اور زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ میم اپنے ویل سیٹلڈ بزنس کی وجہ سے باہر جانے کا سوچتی ہی نہیں تھیں اور پھر ہم دو بھائیوں کی تعلیم بھی اس کا ایک سبب تھا۔

ہمارے گھر میں لڑکی کوئی نہ تھی اور ہم لڑکی کو ترسے ہوئے تھے۔ وہ لڑکی کچھ بھی ہو چاہے بہن یا دوست مگر ہوتی...... ہمارے دل میں یہ خانہ ہمیشہ خالی رہا۔

میم کی اکثر دوستیں اگر اپنے ساتھ اپنی بیٹیوں کو لاتیں تو وہ جوان لڑکیاں ہمیں لفٹ ہی نہ کرواتیں، ہاں جاتے وقت ہمارے بال بگاڑتے ہوئے اپنی محبت ظاہر کردیتیں مگر ہمیں لگتا وہ جاتے جاتے ہمیں بے وقوف سمجھتے ہوئے ٹلو (tillo) کا خطاب دے گئی ہیں۔ پھپھو ہمارے گھر آتیں ان کے دو بیٹے، ایک خالہ کے ایک بیٹا ایک خالہ کی دو شادی شدہ بیٹیاں، ایک مامی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی مگر وہ بیٹی بھی ہمیں لفٹ نہیں کرواتی تھی حالانکہ مجھ سے دو سال بڑی تھی۔ میں اور بھائی اس کے بہت آگے پیچھے پھرتے مگر وہ عجیب نک چڑھی تھی۔ تو بس ہمارے لیے کسی بھی لڑکی کی آمد اسی طرح پرکشش ہوتی جیسے شجرِ ممنوعہ آدم کے لیے......اس تمام سیناریو

میں پری کا آنا اور میرا دل لوٹ، لوٹ جانا فطری تھا۔ یہ آنٹی اپنی پری نمائش کے ساتھ آنے والی پہلی خاتون تھیں مگر یہاں بھی معاملہ یہ تھا کہ پری سے میں بات نہیں کرسکا تھا مگر میرا دل کہتا تھا کہ پری مجھ سے بات کرنے کی خواہاں ہوگی میم اور اپنی ماں کی موجودگی میں وہ ایسا کرنے سے قاصر تھی۔

میں نے لاکھ شکر ادا کیا کہ اس دن بھائی گھر پر نہ تھا۔ بھائی جو مجھ سے صرف ایک سال سات ماہ بڑا تھا مگر رعب ایسے رکھتا جیسے سات ماہ نہیں سات سال بڑا ہو۔ پری کے آنے کے ساتھ ہی وہ اپنی فٹ بال کی پریکٹس کے لیے نکل رہا تھا اس نے بھی پری پر بھرپور نگاہ ڈالی تھی جانا اس کی مجبوری تھی ورنہ بھائی کی للچائی نظر مجھ سے مخفی نہ تھی۔ وہ اگر رک جاتا تو مجھے یقین ہے میم اور آنٹی کے پہروں کے باوجود وہ پری سے سیٹنگ کرلیتا اور میں ہاتھ ملتا رہ جاتا۔ بھائی کے اندر یہ گٹس تھے۔

میں پری کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر میم سے پوچھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا یا یوں کہہ لیں کہ الفاظ کی جمع، ضرب، تقسیم سیٹ نہیں ہو پا رہی تھی۔

"مہمان چلے گئے؟" بھائی نے واپس آکر صرف یہ پوچھا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا وہ کسی کے عشق کا روگ پالنے والا نہ تھا بڑا ہرجائی طبیعت تھا...... تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی کی مکمل تفسیر...... البتہ مجھے خود کو کمپوز کرنے میں کافی وقت لگا۔

اس روز میم کو تنہا پا کر ساری ہمتیں مجتمع کر کے پری کے بارے میں معلومات لینے کی غرض سے میں نے کھنکھار کر ان سے بات کرنا چاہی۔ تبھی کمرے میں بھائی آگیا۔ اب میں کیا پوچھتا اور جو پوچھ بھی لیتا تو بھائی نے دیدے گھما، گھما کر میرا مذاق ہی اڑانا تھا اور پھر میم کو شک ہو جانا تھا اور میں اپنی زندگی کی پہلی اور آخری محبت...... (ہاں، ہاں مجھے اسے دیکھتے ہی اس کی محبت کا جن چمٹ گیا تھا) کو بھلا کیسے

سب پر آشکار کر دیتا کیا اپنی پری کو بدنام کرتا تھا؟

اس روز بھائی فٹ بال کی پریکٹس کے لیے گیا تو مجھے موقع مل گیا۔ اس روز میم بھی بڑے موڈ میں میرے پاس لیٹی تھیں ساتھ بالوں میں ہاتھ پھیرتی جا رہی تھیں۔

"اس دن جو آپ کی دوست آئی تھیں کیا نام تھا ان کا؟" میم نے میرے بالوں سے انگلیاں نکال کر کروٹ ہی لی تھی کہ میرا سوال تیر کی طرح ان کے کانوں تک پہنچا۔

"کس دن؟" میم نے بنا مڑے پوچھا۔

"بھئی وہ جن کے ساتھ ان کی بیٹی پری آئی تھی۔" میں خجل ہوا کہ وہ مڑی کیوں نہیں۔

"پری......کون پری؟" وہ مڑ کر میری طرف کروٹ کر کے چونکیں۔ میں نے گھبرا کر زبان دانتوں تلے دبالی۔

"پ......پری نہیں...... ایش۔"

"بڑی پیاری بچی ہے۔" وہ ہنس پڑیں۔

"جی۔" میں نے ایسے تشکر سے کہا جیسے وہ میری بچی ہو۔ "اب سے پہلے تو میں نے انہیں نہیں دیکھا۔"

"ہاں۔" میم نے کروٹ لیتے ہوئے ایک ہاتھ سر کے نیچے کرلیا۔ "ان سے ابھی دوستی ہوئی ہے۔ یہ میری بہت بڑی کلائنٹ ہیں جو اپنے ساتھ ایک بڑا سرکل لے کر آئی ہیں۔ پرسوں ان کے ہاں گرینڈ پارٹی ہے۔"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے میم۔" میری باچھیں دور تک چر گئیں۔ "ضرور چلیں گے۔" میں نے خود کو خود ہی پیش کر دیا۔ میں نے دیکھا میم کی مسکراہٹ ایک دم معدوم ہوگئی۔

"تمہیں پڑھنا نہیں ہے؟" ان کی تیوری کے بل اتنے زیادہ تھے کہ میں گن بھی نہ پایا تھا۔

"ایک دن سے کیا ہوتا ہے میم۔" میں ان کی تیوری کے بے شمار ابھرے بل نظر انداز کر کے ٹھنکا۔

تبھی بھائی وقت سے قبل ہی لوٹ آیا میرا منہ اندر تک کڑوا کسیلا ہوگیا، میں اپنے منہ میں آئی تمام کڑکڑاہٹ کو بنا چبائے نگل گیا۔ بھائی تو میرا سب سے بڑا دشمن تھا۔ کوئی موقع کبھی ضائع نہ کرتا میرا مذاق اڑانے کا۔

''کیا نہیں ہوتا ایک دن سے؟'' اس نے میرا جملہ سن لیا تھا یوں بھی اس کے کان آدم زاد کے کان نہ تھے کسی جن کے کان تھے جو دور دراز سے میری ہر بات سن لیتے۔

''کچھ نہیں۔'' میں تیزی سے کہتا ہوا باہر کو لپکا۔ مبادا میم میرا راز کھول دیں اور بھائی کو دشمنی نکالنے کا موقع ہاتھ لگے۔

☆☆☆

تمام دن اداس دن تمام شب اداسیاں
وہ مجھ سے کیا بچھڑ گیا کہ جیسے کچھ بچا نہیں

پری کے گھر گرینڈ پارٹی بھی ہوئی اور میم اکیلی وہاں چلی بھی گئیں۔ آخر ایک دن پڑھائی نہ کرنے سے میں کون سا جاہل رہ جاتا یہ بات آج تک مجھے سمجھ میں نہ آسکی۔ میرا جانے کے لیے کتنا دل تھا مگر میرے دل کی کس نے سننا تھی پھر وہ مجھے کبھی نظر نہ آئی۔ دل کسی معصوم بچے کی طرح کتنا کتنا مچلا تھا، رویا تھا مگر بے بس تھا کر کیا سکتا تھا۔ میم سے تو میں کہہ نہیں سکتا تھا مجھے اس کے گھر لے چلیں۔ یاد آرہی ہے اس پری کی، دیدار کروا دیں۔ اس کے ملنے کا کوئی آسرا بھی نہ تھا۔ کئی مرتبہ ہمارے گھر پارٹیز ہوئیں آنٹی تنہا چلی آئیں بہانہ یہ تھا کہ وہ پڑھ رہی ہے، اُدھر وہ پڑھ رہی ہے ادھر مجھے پڑھایا جا رہا ہے۔ دل چاہا آگ ہی لگا دوں دونوں طرف کی پڑھائی کو۔

ایک دفعہ میں اور بھائی فلم دیکھنے گئے تو پتا چلا وہ اپنی مام کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی۔ مجھے تو لگا جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ لیا ہو اگر آنٹی کے آنے کا میم مجھے بتا دیتیں میں تو کبھی پکچر دیکھنے نہ جاتا۔

اسی طرح ایک اور بار وہ آئی تب بھی میں گھر پر موجود نہ تھا بھائی تھا۔ اس نے خوب آنکھیں سینکی ہوں گی میں تو جل، جل مرا۔ پتا نہیں آنٹی نے کیوں طے کرلیا تھا کہ جب میں گھر پر نہ ہوں تبھی آنا ہے۔ اس کی دید کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ ویسے تو ہمارے گھر میں کوئی بھی لڑکی حتیٰ کہ پڑوس کی بھی آجاتی ہم دونوں بھائی اس کے آگے بچھ، بچھ جاتے یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم بدنیت ہی ہوں لیکن ہمارے گھر کسی بھی لڑکی کا آنا ایک معطر جھونکے سے کم نہ تھا اور یہ تو پری تھی جس کے لیے میرے دل میں ایک جذبے نے جنم لے لیا تھا۔

ایک روز بابا کے آرڈر آگئے کہ مجھے ایبٹ آباد بھیجنا ہے میری تو ہاسٹل اور فوج کے نام سے ہی جان نکل گئی۔ مجھے فوج میں جانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا مگر اس گھر میں سب نے الگ، الگ حکومتی عہدے بانٹ رکھے تھے کوئی صدر تھا تو کوئی وزیراعظم بھائی کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا سو ان کے پاس وزارتِ سیر و سیاحت تھی ایک بچا میں تو میں ہی بے چاری عوام تھا اور عوام کی کون سنتا ہے لہٰذا روتا پیٹتا میں ہاسٹل سدھارا۔

یہاں آکر مجھے یاد ہے کہ ایسا برا بھی نہیں لگا تھا مجھے۔ شروع، شروع میں البتہ مجھے سب کچھ بہت عجیب لگا تھا مگر پھر رفتہ، رفتہ دوستوں کا حلقہ بڑھتا گیا اور دلچسپی بھی۔

جب دوست کسی لڑکی کا تذکرہ کرتے تو میں ماضی میں گھوم جاتا اپنی پری کے پاس۔ اب تو وہ بھی بڑی ہوگئی ہوگی مگر مجھے تو اس عمر اسی قامت کی پری اچھی لگی تھی اس وقت میرا سن بھی سولہ کے آس پاس تھا۔

کتنا ظلم تھا وہ مجھے نہ ملی، نہیں ملنا تھا نہ ملتی مگر ایک بار ہی سہی کہیں نظر تو آجاتی۔ میں اتنے برس گزار کر بھی اسے بھول نہ پایا تھا۔ لوگ کہتے ہیں محبت بھلائے نہیں بھولتی مگر مجھے لگتا ہے وہ میرا پہلا عشق بھی پہلا اور آخری۔

کیا اسے بھی مجھ سے محبت ہوگی؟ کیا وہ بھی مجھے سوچتی ہوگی؟ کیا وہ بھی مجھ سے ملنے کے جتن کرتی ہوگی؟ یہ تمام سوالات میرے دماغ کی نسوں تک میں سرایت کرکے ہاں میں جواب ڈھونڈ لاتے تھے۔ جب مجھے پری یاد آتی تو میری نیندیں اڑ جاتیں۔ شاعری کی بہت سی کتابیں میرے سرہانے دیکھ کر میرے دوست میرا مذاق اڑاتے۔

''تم یہاں شاعر بننے آئے ہو؟''

پھر ایک دم میرا جی اچاٹ ہوگیا۔ میں بابا سے فون پر بات کرتے ہوئے بھرا گیا۔ بس پھر کیا تھا مجھے واپس بلا لیا گیا اور میں واپس گھر آگیا۔

یہاں آتے ہی ایک شناسا خوشبو نے میرا خیر مقدم کیا تھا۔ وہ خوشبو پری کی تھی۔ میں نڈھال قدموں سے ڈرائنگ روم تک چلا آیا۔ اس کی یاد میرے اردگرد خوشبو بن کر بھٹکنے لگی۔ میں اسی صوفے کے پاس آکر زمین پر بیٹھ گیا جہاں کبھی وہ بیٹھی تھی۔ میں رو دیا۔ میں نے اپنے ہاتھ اس صوفے پر پھیرے۔

''باسی پھول میں جیسے خوشبو
پھول پہننے والی کی''

میں بہت دیر روتا رہا۔ میں نے میم سے کہہ دیا میں آئی بی اے میں داخلہ لوں گا۔ وہ کچھ نہ بولیں۔ دل تو میں ان کا توڑ ہی چکا تھا۔

''جو تمہاری مرضی۔'' بس انہوں نے اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔

میں پڑھنے میں گم ہوگیا۔ میں نے طے کرلیا تھا کسی قابل ہوجاؤں تو میں پری ہی سے شادی کروں گا ورنہ کسی سے نہیں۔ بھائی کی شادی بابا کے عزیزوں میں کردی گئی تھی اس کے لیے باہر سے بہت اچھی جاب آفر ہوئی تو وہ بھابی کو لے کر چلا گیا۔ اب گھر میں، میں تھا، میم تھیں اور پری کی یادیں۔

ایک دن پھر خود کو کمپوز کرکے میم سے پری کی ممی کا پوچھا۔

''وہ......'' بہت لمبا وہ سن کر میں تو دہل ہی گیا خدا خیر کرے۔ ''وہ آج کل باہر ہوتی ہیں۔'' میری جان میں جان آئی۔

''اب آپ کی ملاقات نہیں ہوتی؟''

''جب باہر ہے تو کیسے ملاقات ہوگی اسٹوپڈ۔'' انہوں نے بےوقوف کہنے کے ساتھ ساتھ مجھے دیکھا بھی ایسے جیسے کسی گدھے نما انسان کو دیکھا جاتا ہے اور میں خجل سا ہوکر رہ گیا۔

پری کے حوالے سے جو معلومات لینا چاہ رہا تھا وہ سارے سوالات حلق میں اٹک کر کہیں مدغم ہوگئے۔ میں چپ ہو رہا۔

☆☆☆

میں نے ایم بی اے کے بعد جاب کرلی تھی ہم دونوں کو اپنی میم کے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میم نے ہلکی پھلکی کوشش تو کی لیکن کبھی اپنی مرضی مسلط نہیں کی ان کا بزنس کافی پھیلا ہوا تھا جسے وہ باہمت خاتون بڑی تندہی سے رن کر رہی تھیں۔ میم کچھ بیمار رہنے لگیں تو بزنس پر توجہ بھی کم کردی اور پارٹیز بھی بہت کم ہوگئیں نہ ہونے کے برابر مگر جب بابا ریٹائرڈ ہوکر واپس آئے تو یہ پارٹیز کا سلسلہ بالکل موقوف ہوگیا کہ بابا کو یہ سب کچھ پسند نہ تھا۔ میم صلح جو طبیعت کی خاتون تھیں انہوں نے بھی پارٹیز سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ بزنس تقریباً ختم......سو دوستیاں بھی سب سے ختم ہوکے رہ گئی تھیں۔

میں ملول رہنے لگا تھا۔ ایک نامعلوم اداسی مجھے ہمیشہ اپنے حصار میں رکھتی۔ میں اتنا shy تھا خود سے پری کے لیے اظہار نہ کرسکا۔ ساری زندگی منصوبے بناتا رہا۔ میم پوچھیں گی تو یہ......میم پوچھیں گی تو وہ۔

اب بھی میں نے سوچا ہوا تھا جب میم مجھ سے شادی کے حوالے سے میری رائے پوچھیں گی تو میں بے دھڑک پری کا نام لے دوں گا مگر ہوا کیا۔

''یہ دیکھ لو۔'' انہوں نے اپنی دوست کی بیٹی کی تصویر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر سمجھ میں آئے تو تم دونوں اسکائپ پر بات کرلو۔''

''کون سی دوست؟'' میں نے بہت اشتیاق سے تصویر میں پری کے خدوخال تلاش کرنے چاہے۔ وہاں تو ذرا پری کی جھلملاہٹ تک نہ تھی۔

''ہے ایک دوست...... تم نہیں جانتے۔ یہ لڑکی وہیں آسٹریلیا میں پیدا ہوئی ہے۔''

''میں نہیں جانتا۔'' میں زیرلب بڑبڑایا۔

''بس پھر کیا کرتا اس کا۔'' میں نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کھول کر تصویر اندر پھینک دی۔

کئی دنوں بعد انہوں نے ناشتے کی ٹیبل پر تصویر سے متعلق مجھ سے استفسار کیا۔

''مجھے پسند نہیں۔'' ناشتا کرتے ہوئے میں نے سر جھکا کر جواب دیا اور کن انکھوں سے انہیں دیکھا۔ میم اور بابا دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر چپ ہوکر ناشتے میں لگ گئے۔ کمرے میں برتنوں کی کھنک بول رہی تھی ورنہ کمرے میں سناٹا تھا۔

☆☆☆

میرا سر بہت بھاری ہو رہا تھا مجھے بخار تھا۔ میم میری خدمت میں مصروف تھیں کہ ان کی دوست کا فون آگیا۔ وہ بہت خوش ہوکر ان سے باتیں کرنے لگیں پھر جلد ملنے کا کہہ کر فون بند کردیا۔

مجھے تو ہر آہٹ پر، فون بیل پر، ڈور بیل پر ایک ہی ہستی کا انتظار تھا۔ بخار کی حدت میں بھی جی چاہا اٹھ کر پوچھ لوں کہ کس کا فون تھا؟ پری کی ماں کا مگر میں چپ رہا، وہ خود بولیں۔

''میری دوست وطن لوٹ آئی ہے۔'' میرا دل بلیوں اچھلنے لگا دل نے کہا یہ دوست پری کی ماں ہی ہیں مگر مجھے حوصلہ رکھنا تھا کچھ ظاہر نہیں کرنا تھا میں نے بظاہر بے پروائی سے پوچھا۔

''کون...... ایش کی ممی؟''

''ہاں، ہاں۔'' وہ بہت خوش ہوکر بولیں ساتھ میرا سر دباتی جاتیں۔

''ایش کی شادی کردی کیا؟'' دل پر گرتے دھڑا دھڑ سنگ مرمر کے ساتھ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ عین اسی لمحے کمرے میں بابا آگئے اور میرا جواب بالکل اسی طرح خلا میں معلق رہ گیا جس طرح بھائی کے آجانے سے رہ جاتا تھا۔

''ارے بھئی جاؤ وہ دودھ والا آیا ہے۔ تم نے کہا تھا ناں تمہیں اس سے کچھ بات کرنی ہے۔'' بابا میرے دل کے احساسات سے کب واقف تھے کمرے میں گھستے ہی شروع ہوگئے اور میم فوراً اٹھ کر یہ جاوہ جا۔

میں نے اپنی بخار زدہ گرم، گرم آنکھوں سے بابا کو گھورا کچھ دیر ہی کر دیتے آتے، آتے۔ ادھر دودھ والے کو کوسا، کیا تھا منحوس آج ناغہ کرلیتا اور ہمیشہ کی طرح میرے دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔

میں آج تک سوچتا ہوں کہ میں اس معاملے میں اتنا shy کیوں تھا ویسے تو میں ایک shy لڑکا ہرگز نہیں تھا۔ جانے کیوں میں نے پری سے اپنی محبت کو کن غلافوں اور تہ بہ تہ تاج محلوں میں کیوں دفن کر رکھا تھا؟

زندگی سے کچھ اور دن سرک گئے۔ میم نے لڑکیوں کی تصاویر لانے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کردیا۔ کوئی ان کی دوست کی بیٹی ہوتی تو کوئی ان کی جاننے والی کی، کوئی بابا کے عزیزوں میں سے تو کوئی میم کی دور پرے کی رشتے دار مگر وہ جس کی آہٹ کا دل صدیوں سے منتظر تھا اسی کی تصویر نہ تھی۔

واقعتاً میں بہت بور ہوگیا تھا، دل زندگی سے اچاٹ ہوگیا تھا پھر مہینوں گزر گئے میں کبھی نہ سمجھ سکا کہ پری کا دھیان آپ کو کیوں نہیں آتا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا کوئی طاقت مجھے روک رہی ہے۔

عمر کتنی منزلیں طے کر چکی
دل جہاں ٹھہرا تھا ٹھہرا رہ گیا

میں اگر کسی کو اپنی کہانی سناتا تو وہ ہنستا اور مجھے پاگل ہی کہتا۔ بارہ، تیرہ سال کی لڑکی کو ایک نظر دیکھنے کے بعد پورے کا پورا دل اس پر وار کر اس کے حوالے کردیا...... پلٹ کر یہ نہ دیکھا کہ اس نے دل کا کیا کیا؟ سنبھالا یا آگے نکل گئی۔ جو کچھ اس حوالے سے فرض کیا، میں نے خود ہی کیا اور مجھے پھر بھی امید تھی کہ وہ مجھے مل جائے گی۔

ڈراموں اور فلموں کی طرح جب میں نہ چاہتے ہوئے مرے مرے قدم اٹھا کر حجلہ عروسی میں پہنچ کر شکستہ دل کے ساتھ اپنی دلہن کا گھونگٹ اٹھاؤں گا تو سامنے پری کو پاکر بے خود ہو جاؤں گا اسے گول، گول گھما کر پورے کمرے میں خوشی سے چکر لگاؤں گا۔ چیزوں کی توڑ پھوڑ مچا کر خوشی کا اظہار کروں گا۔ اس کے حیرت سے تکنے پر سب اصلیت بتاؤں گا، اسے بتاؤں گا کہ میں نے اسے حاصل کرنے کے لیے...... مگر کیا، کیا؟ کچھ بھی تو نہیں اور جو اپنی تڑپ اسے بتانے کی بات ہے تو وہ اسی وقت بتا سکوں گا ناں جب وہ میری دلہن بنے گی۔

''دھت تیرے کی۔'' میں سرشاری کو ناکامی سے بدلتے دیکھ کر پھر اداس ہوگیا۔ میں نے کون سی کوششیں کی ہیں جو وہ مل جائے گی۔ مجھ میں تو اتنی جرات تک نہیں کہ میم سے صاف، صاف کہہ ڈالوں۔

''آپ دس لڑکیاں دکھانے کے بجائے سیدھے، سیدھے پری سے میری شادی کردیں۔'' جب بھی میں نے پری کے حوالے سے بات کرنا چاہی تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی دیوار بن کر آگیا۔ کبھی بھائی، کبھی بابا، کبھی فون، کبھی دودھ والا۔

☆☆☆

آفس سے واپسی پر مین روڈ پر ٹریفک جام تھا۔ طویل قطار میں لگنے کے بجائے میں نے اندرونی گلیوں سے نکلنے کے لیے گاڑی کو ٹرن کیا، ایک صاف ستھری چوڑی روڈ پر گاڑی دوڑانا چاہی کہ ایک خاتون کو گاڑی سے نکل کر ڈور بیل بجاتے دیکھا۔ عموماً اس طرح کے منظر ایسے نہیں ہوتے جنہیں رک کر دیکھا جائے مگر جانے کیوں میں نے ایک اچٹتی مگر بھرپور نگاہ ان خاتون پر ڈالی اور پھر مجھے لگا زمین آسمان کی گردش ٹھہر گئی ہو۔ میں انہیں ہزاروں، لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ بلامبالغہ پری کی ماں تھیں۔ بہت ہلکا سا ان میں چینج آیا تھا۔ میں نے تیزی سے بریک لگائے۔ بریک کی تیز چرچراہٹ نے خاتون کو مڑ کر دیکھنے پر مجبور کردیا۔ میں کار سائڈ پر لگا کر تیزی سے ان کے پاس پہنچا، وہ ایک اجنبی کو اپنے پاس آتا دیکھ کر ٹھٹکیں۔

''آنٹی آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟'' میں نے ایک ہاتھ سے ٹائی کی ناٹ ٹائٹ کی جو میں نے راستے میں ڈھیلی کردی تھی۔ انہوں نے قطعاً اجنبیت سے انکار میں سر ہلادیا۔

''میں مینا کا بیٹا ہوں جو ٹیپو سلطان روڈ......''

''اوہ......'' فرط جذبات سے مسکرا کر انہوں نے وہیں مجھے گلے سے لگایا کسی کے دروازہ کھولنے پر وہ مجھے اندر لے کر چلیں۔ راستے بھر میم کی بابت پوچھتی رہیں۔

''آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔'' میں کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''ہاں بیٹا...... بس۔'' وہ اتنا ہی بولیں۔ ''اور بیٹا تم کیسے ہو؟''

''مم...... مم...... میں بالکل ٹھیک۔'' کمرے میں داخل ہوتی لڑکی پر میں ٹھٹک گیا تھا۔ میں نے اندازے سے پہچانا وہ پری ہی تھی۔ لمبی، دبلی پتلی، نازک کانچ جیسی۔ اس میں بھرپور تبدیلی آئی تھی۔ اتنی جتنی آٹھ نو برسوں میں کسی دوشیزہ میں آسکتی ہے۔ حسین سراپا کچھ اور نزاکت سمیٹ چکا تھا۔ میں پہلے کی طرح اسے

براہِ راست نہیں دیکھ پارہا تھا کبھی نظروں کی چوری کرتا تو کبھی براہِ راست دیکھ کر نظر اِدھر اُدھر گھمالیتا۔

اس کی نظر میں کوئی خاص شناسائی نہ تھی، میں بجھ کر رہ گیا۔ آنٹی نے جب میری بابت بتایا تب وہ مدھم مسکرائی پھر کچھ دیر کو بیٹھی بھی تھی۔ میرا دل دھڑکنا بھولتا جارہا تھا۔ میں لاکھ جتن کے باوجود بھی اس سے اس کا حال احوال نہ پوچھ سکا۔ بس نظریں اس کا طواف کرتی رہیں کہ وہ لمحوں میں اٹھ بھی گئی۔

''میں ڈرنک بھجواتی ہوں۔'' اس کی جھرنے جیسی آواز نے مجھے پھر نو سال پیچھے دھکیل دیا جب میں اس کے لیے ڈرنک لے آیا تھا اور اس نے لینے سے معذرت کرلی تھی۔

وہ چلی گئی تو لگا کمرا ہی نہیں میری پوری دنیا ویران اندھیری ہوگئی ہو۔

''بٹو۔'' ان کے میسم کی طرح پکارنے پر میں چونکا۔ اب تو میسم اور بابا بھی بٹو نہ پکارتے تھے میکال ہی کہتے تھے۔ میں پورا کا پورا ان کی جانب گھوم گیا۔

''جس دن میں ایش کے ساتھ تمہارے گھر آئی تھی۔'' آنٹی دھیرے دھیرے بولیں۔ ''میں نے تمہاری آنکھوں کا پیغام پڑھ لیا تھا۔'' آنٹی نے گویا میرے سر پر ٹنوں وزنی دھماکا کردیا تھا۔ میں شرم سے نظریں نہیں اٹھا پارہا تھا وہ پھر گویا ہوئیں۔

''جب وقت آیا اور ایش کی شادی کا لمحہ آیا تو... ازخود میں نے مینا کو اپنی بیٹی کے لیے پیغام دیا، تصویر بھی دی۔'' میں بری طرح چونکا۔ ماتھے پر ڈھیروں سلوٹیں پڑگئیں۔ آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں۔ میرا رواں، رواں کان بن چکا تھا اور میں واقعتاً ہمہ تن گوش تھا۔ وہ چپ ہوگئیں۔ مجھے ان کا چپ ہونا کھل رہا تھا۔

''پھ... پھر؟'' میں ہکلایا۔

''پھر یہ کہ تم نے مینا کو کوئی مثبت جواب ہی نہ دیا تو دو ماہ قبل میں نے ایش کی شادی کردی۔'' مجھے لگا دھماکا میرے اردگرد ہی ہوا ہے جس نے نہ صرف میری سماعت پر بری طرح اثر ڈالا ہے بلکہ میرے وجود کو اتنے ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے کہ اپنے ہی ٹکڑے مجھ سے نہیں سمیٹے جارہے۔ آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں۔ مجھے لگا ہزاروں وولٹ کا کرنٹ مجھ میں سے گزر کر ارتھ ہوگیا ہو اب بچا ہی کیا تھا؟ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جارہا تھا۔ کھڑا ہونا چاہا تو مجھے اپنا وجود اتنا وزنی لگا کہ مجھ سے کھڑا نہ ہوا گیا۔ بہ مشکل میں نے اپنے مردہ وجود کو گھسیٹا۔

ملازمہ کے ساتھ پری ڈرنک لیے اندر داخل ہوئی میں بہ مشکل باہر نکل رہا تھا۔ آنٹی کی آواز کے ساتھ ہی پری کی آواز بھی شامل تھی۔

''یہ لیجیے ناں...... آپ کہاں جارہے ہیں؟''

مگر میں حواسوں میں کب تھا۔ میرے لب تو شاید سِل چکے تھے۔ ایک اور آخری نظر پری پر ڈالی۔

آنکھوں میں اتنی دھند اور نمی تھی کہ پری مجھے نظر نہ آسکی۔ میں اپنے شکستہ وجود کے چیتھڑے سمیٹے کس طرح گھر پہنچا، کس طرح کمرے تک آکر سائڈ ٹیبل کی دراز کھول کر تصویریں چھانٹیں بالآخر ایک تصویر میں پری مسکرا رہی تھی۔

''اُف خدا!'' جی چاہا بم سے اپنا وجود پرخچوں میں اڑالوں۔

یہ تصویر کب، کیسے اور کس طرح میرے ہاتھوں سے نکل گئی؟ کچھ سمجھ نہ آیا۔

''جنہیں ہمارا نہیں ہونا ہوتا وہ یونہی ہتھیلیوں سے جھاگ کی طرح پھسل جایا کرتے ہیں۔'' میری آنکھوں میں بادو باراں بھرا ہوا تھا اس کی تصویر بیڈ پر رکھ کر عقیدت سے سر اس پر جھکا دیا۔ گویا عشق کی بارگاہ میں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا ہو۔

چلو آؤ آنکھوں کو کاری کریں
محبت کا ماتم نہیں دیکھنا

دھجیاں

روشانے عبدالقیوم

زینب کالج سے آکر گھر میں داخل ہوئی تو پہلا منظر جو اسے دیکھنے کو ملا ہمیشہ کی طرح اسے اذیت میں مبتلا کر گیا۔

آنگن کے بیچوں بیچ زینب کی ماں بال کھولے سر پھوڑا ئے بلّ بلّ کر رو رہی تھی، زینب کا ابا اس کے سر پر کھڑا ہاتھ ہلا، ہلا کر اسے گالیوں اور کوسنوں سے نواز رہا تھا۔ وہ بھاگ کر ماں کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی، اپنے ابا کو دیکھا، اس کی ملامت بھری



شکایت کرتی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ غصے میں گھر سے ہی چلا گیا۔

''اماں! تم مجھے بتاتی کیوں نہیں، آخر ابا ایسا کیوں کرتا ہے، تمہارے ساتھ؟'' زینب نے روتی ہوئی ماں کو دیکھا جو بچپن میں اس کی آنکھوں میں سوال ہوتا وہ آج لبوں پر آہی گیا مگر اس کی ماں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش آنسو بہاتی رہی۔

☆☆☆

جب زینب چھوٹی سی تھی تب سے وہ یہی سب کچھ دیکھتی آرہی تھی، جب بھی ابا، اماں کو مارتا گالیاں دیتا گھر سے رخصت ہوجاتا وہ ماں سے لپٹ کر زور، زور سے روتی، اس کے غم میں برابر کی شریک رہتی مگر زینب نے کبھی اپنی ماں کی زبان سے حرف شکایت نہ سنے، ہمیشہ اس کا باپ بولتا اور ماں خاموشی سے سنتی رہتی۔ وہ تھوڑی سی سمجھدار ہوئی تو اکثر یہ سوچ اسے اپنی گرفت میں لیتی کہ ابا ایسا کیوں کرتا ہے، اتنی نفرت اور حقارت کیوں ہوتی ہے اس کے لہجے میں اس کی ماں کے لیے...... مگر زینب کو آج تک اپنے ان سوالوں کا جواب نہ ملا البتہ اس کے ابا کو اس سے بہت محبت تھی...... وہ اس کی اکلوتی اولاد جو تھی شاید اسی لیے ابا اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا اسے خاص طور پر تعلیم دلوائی، اچھے سے اچھا کھلایا، پلایا، پہنایا، ہمیشہ اس کا خیال رکھا، اس کو اگر اپنے ابا سے کوئی شکایت تھی تو بس یہی کہ اماں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتا تھا۔ اسے پوچھنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی۔ اسی بات پر وہ اپنے ابا سے دل ہی دل میں ہمیشہ خائف رہی۔

☆☆☆

''یار واقعی لڑکی تو ہیرا ہے ہیرا......'' حماد نے اپنے دوستوں کے گروپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، جن میں آصف، عمران اور ارباز شامل تھے۔

ان کی گفتگو کا مرکز ان کی کلاس کی ذہین ترین لڑکی زینب تھی، ارباز کی زبانی حماد نے جب سنا کہ ہر وقت عبایا، اسکارف میں رہنے والی یہ ہیرا صفت لڑکی، کالج میں کسی بھی لڑکے کو گھاس نہیں ڈالتی، بہت سے لڑکوں نے اس سے فری ہونے کی کوشش بھی کی مگر ان کو منہ کی کھانا پڑی، وہ لڑکوں سے تو دور کی بات کسی لڑکی سے بھی زیادہ فری نہیں ہوتی، الگ تھلگ بیٹھی پڑھتی رہتی تھی۔ اس کے کلاس فیلوز اسے مغرور حسینہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بہت سے دیوانوں کے دل اس کے قدموں تلے روندے جاچکے تھے۔ حماد کو اس زینب نامی مغرور حسینہ کو دیکھنے میں دلچسپی محسوس ہوئی۔

ارباز نے اِک دن کالج کے لان میں بیٹھے ہوئے حماد کو سامنے متوجہ کیا جہاں ان سے کچھ ہی فاصلے پر بنچ پر بیٹھی ہوئی وہ نوٹس بنانے میں مگن تھی۔ حماد نے بے ساختہ اس کے حسن کو سراہا۔

''تم بے شک جتنی تعریف کرو وہ تمہیں گھاس ڈالنے والی نہیں۔'' ارباز نے حماد کی طرف ہنستے ہوئے دیکھا۔

''کیوں، کیا کمی ہے مجھ میں؟ اتنا خوب صورت ہوں، ہینڈسم ہوں اور پھر یہ کون سی کوہ قاف کی پری ہے؟'' حماد نے طیش سے سامنے بنچ پر بیٹھی ہوئی زینب کو دیکھا۔

''اس میں کوئی شک نہیں میرے دوست کہ تم شہزادے ہو، بہت خوب صورت ہو مگر یہ آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں۔'' ارباز نے چیلنج بھرے لہجے میں کہا۔

''تو ٹھیک ہے، میں بھی دیکھتا ہوں کیسے یہ مجھے گھاس نہیں ڈالے گی۔'' حماد نے مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے سامنے بیٹھی زینب پر نگاہ ڈالی۔

''یار کیوں اس بے چاری کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟ کسی سے ہنستی بولتی نہیں...... تو تم لوگوں کو کیا تکلیف؟ ہر کسی کا اپنا مزاج ہوتا ہے، اپنی مرضی ہوتی ہے؟'' عمران جو کب سے خاموش بیٹھا ہوا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس سے برداشت نہیں ہوسکا تو بول پڑا۔

''تمہیں کیوں ہمدردی کے مروڑ اٹھ رہے ہیں؟ کہیں تم بھی تو اس میں انٹرسٹڈ نہیں......؟'' ارباز نے عمران کا مذاق اڑایا۔

بکواس نہ کر...... میں نے تو بس ویسے ہی کہہ دیا تھا۔'' عمران جھینپ گیا۔

''پھر حماد! شرط لگی؟'' ارباز نے شرارت بھری نگاہ حماد پر ڈالی۔

''کیسی شرط......؟'' وہ حیران ہوا۔

''یہی کہ تم اس مغرور حسینہ کو اپنے دام میں پھنساؤ گے؟'' ارباز نے اسے یاد دلایا۔

''ماننا تو اس کے باپ کو بھی پڑے گا۔ حماد نے اچٹتی ہوئی نگاہ زینب پر ڈالی اور ہنستے ہوئے ارباز کو آنکھ ماری۔ کلاس روم کی طرف جاتے ہوئے عمران نے ان کا مشترکہ قہقہہ سنا تو پلٹ کر ملامت بھری نظر ان دونوں پر ڈالی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان پر اس گھوری کا کوئی اثر نہیں ہونے والا تھا۔

☆☆☆

خود کو لاکھ سمجھانے کے باوجود، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس پرخطر راستے پر چل پڑی، وہ جو سمجھتی تھی کہ وہ ناقابل تسخیر ہے، جس نے بہت سے دلوں کو توڑا، ان کی حوصلہ شکنی کی، ان کو آگے بڑھنے سے روکا...... اور وہ غلط بھی نہیں تھی، اسے اپنی، اپنے ماں، باپ کی عزت پر ناز تھا، غرور تھا، فخر تھا۔

حماد کی شخصیت اور اس کی جادو بھری سحر انگیز گفتگو کے آگے وہ بے بس اور مجبور ہوگئی۔

پہلے پہل اس نے حماد کو بہت روکا، اس کی حوصلہ شکنی کی اسے جھٹلایا، جانے یہ حماد کی مستقل مزاجی تھی یا اس کی طلسماتی شخصیت کا اثر...... وہ اس کے آگے ہار گئی۔

آہستہ، آہستہ وہ اس کی گرویدہ ہوتی چلی

دھیان

امتحان

دوست کا امتحان...... مصیبت میں
بیوی کا امتحان...... غربت میں
مومن کا امتحان...... غصے میں
آنکھ کا امتحان...... بازار میں
زبان کا امتحان...... محفل میں
دل کا امتحان...... عشق میں
ہاتھ کا امتحان...... کھانا کھانے میں
اور
انسان کا امتحان...... قبر میں ہوتا ہے
اللہ تعالیٰ ہمیں تمام امتحانوں میں کامیاب کرے۔ (آمین)
مرسلہ: ماہ نور قیصر...... راول پنڈی

گئی...... کبھی کبھی وہ خود کو اپنی بے اختیاری پر سرزنش کرتی مگر پھر حماد کی محبت اس پر حاوی ہوجاتی اور وہ سب کچھ بھول جاتی، اسے کچھ یاد رہتا تو بس حماد کی محبت تھی......

☆☆☆

زینب کی چھوٹی پھپھو جو بچپن سے زینب کو پسند کرتی آئی تھیں اور اس کا اظہار وہ بھائی بھاوج کے سامنے بارہا کرچکی تھیں، انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے شہروز کے لیے زینب کا رشتہ مانگ لیا تھا، ماں کا اصرار بڑھتا جارہا تھا کہ وہ کوئی مثبت جواب دے تو وہ اس رشتے کے لیے حامی بھرلیں۔ زینب ہر بار ابھی نہیں کرنی شادی کہہ کر ٹال جاتی...... مگر آج تو اماں نے اس سے دوٹوک بات کرنے کی ٹھانی تو وہ پریشان ہوگئی۔ اس نے حماد کو فون کرکے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا اور اس سے اس کی رائے پوچھی۔ حماد کا مشورہ سن کر وہ اور پریشان ہوگئی، حماد...... کی سحر زدہ گفتگو اور مضبوط دلائل کے آگے وہ ہار گئی۔ بالآخر طے پایا کہ اگلی صبح بارہ بجے حماد اپنے فلیٹ پر زینب کا انتظار کرے گا۔

☆☆☆

زینب حماد کے بتائے ہوئے مطلوبہ پتے پر اس کے فلیٹ کے سامنے کھڑی تھی، وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی پہلی بار گھر سے پوچھے بغیر کسی اجنبی جگہ پر آئی تھی۔ دروازے کی ناب پر اس نے آہستہ سے ہاتھ رکھا تو وہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ وہ فلیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔ بائیں جانب پر اِک کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا جس میں سے باتوں کی آواز آسانی سے باہر تک پہنچ رہی تھی۔

”بڑی پارسا بنتی تھی، آج خود اپنے پیروں پر چل کر آئے گی ناں میرے پاس تب تم لوگوں کو یقین آئے گا، میں کہتا تھا ناں کہ یہ لڑکیاں بس اپنی ویلیو بڑھانے کے لیے ذرا نخرے دکھاتی ہیں پھر خود ہی پہنچ جاتی ہیں اور پاؤں میں پڑ کر گڑگڑاتی ہیں کہ پلیز مجھ سے شادی کرلو نہیں تو میں مرجاؤں گی، ہونہہ۔“ حماد نے انتہائی حقارت سے کہا اور آخر میں اس کا قہقہہ سنائی دیا۔

”یار واقعی، یہ تو کمال کردیا تم نے...... ورنہ وہ کہاں کسی کو گھاس ڈالنے والی تھی۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آرہا۔ آئی کانٹ بلیو دس۔“ ارباز کی حیرت میں ڈوبی آواز ابھری۔

”یار تم لوگ اس کے ساتھ اچھا نہیں کررہے؟“ عمران کی حساس طبیعت پر ان کی باتیں گراں گزر رہی تھیں وہ یاسیت سے بولا۔

”تم تو ہمیشہ سے اس کے ہمدرد ہو......! کہو تو تمہارا... پروگرام سیٹ کردیں اس کے ساتھ؟“ وہ مکاری سے ہنس رہے تھے۔

دھڑ دھڑ دھڑ...... پہلے تو زینب کچھ سمجھی نہیں، جب ساری بات سمجھ میں آئی تو اس پر ساتوں آسمان گر پڑے۔ سر پر آسمان ٹوٹ پڑنا، پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ جانا کسے کہتے ہیں...... آج اسے سمجھ آیا تھا۔ وہ منہ کے بل گر پڑی تھی۔ جب ٹانگیں اس کے وجود کا بوجھ سہارنے سے انکاری ہوگئیں تب اسے اندازہ ہوا کہ بہت دیر ہوچکی ہے۔ دیر ہوئی تھی مگر اس کے گھر کی عزت ماں، باپ کی محبتوں کے خزانے......؟ ”نہیں دیر نہیں ہوئی ...“ اس نے بے دردی سے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنے رخسار پونچھ ڈالے اور نہایت آہستگی سے اس کے فلیٹ سے باہر نکل آئی۔

”میں اِک گھٹیا اور بے درد شخص کے لیے اپنے قیمتی آنسو ہرگز نہیں بہاؤں گی۔“ سیڑھیوں سے تیزی سے اترتے ہوئے وہ مسلسل اپنے آنسو پونچھ رہی تھی...... نیچے آکر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کمپاؤنڈ سے باہر نکل آئی۔ ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کررہی تھی کہ جس نے اسے تباہی سے بچالیا تھا۔

رکشے میں بیٹھ کر اسے احساس ہوا کہ فون بج رہا تھا، اس کی وائبریشن پر وہ چونکی اور اسکرین پر نظر ڈالی جہاں حماد کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے نہایت حوصلے سے گرین بٹن پریس کیا۔

”کہاں ہو یار تم؟ کب سے انتظار کررہا ہوں؟“ جبھی حماد کی بے قرار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”ہاں حماد...... وہ دراصل اسی ہفتے میری منگنی ہورہی ہے، اپنے کزن سے اس لیے آئندہ مجھ سے ملنے کی یا فون کرنے کی کوشش مت کرنا...... خدا حافظ......“ زینب نے اپنی بات کہہ کر اس کا جواب سنے بغیر لائن کاٹ کر فون آف کردیا تھا۔

گھر میں داخل ہونے پر ایک مرتبہ پھر وہی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا وہ کچھ دیر بعد اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ماں نے اس کے سامنے چائے کا کپ لاکر رکھا اور جیسے ہی وہ مڑنے لگی تو زینب نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

”اماں! آج تمہیں سب کچھ سچ، سچ بتانا ہوگا کہ ابا کیوں تمہارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔ کیا بات تم ابا کی نہیں مانتیں جو وہ یہ سلوک کرتے ہیں۔“

اماں نے زینب کی آنکھوں اور چہرے کو بغور دیکھا، اس کے چہرے اور آنکھوں میں معمول سے ہٹ کر کچھ تھا۔

آج اماں نے ہمیشہ کی طرح خاموش رہنا مناسب نہیں سمجھا اور خود کو مضبوط کیا کہ آج سب کچھ بیٹی پر عیاں کرنا ہے اِک نہ اِک دن تو اسے سب پتا چل ہی جانا تھا اور وہ دھیرے، دھیرے کھلتی چلی گئی۔

”میں پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن اور سب سے چھوٹی ہونے کے ناتے گھر بھر کی لاڈلی تھی، سب مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ میرے جوان ہوتے ہی رشتوں کی لائن لگ گئی، اِک دن تمہارے ابا سے کسی شادی میں آمنا سامنا ہوا بس پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں اِک دوسرے کو دل دے بیٹھے۔ وہ ہمارے سامنے والے گھر میں کرایے پر رہتے تھے، انہی دنوں میرا ایک بہت ہی اچھا رشتہ آیا ادھر میں تمہارے ابا کو کھونا نہیں چاہتی تھی مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میرے گھر والے اس رشتے کے لیے ہاں کردیں گے اسی لیے میں نے تمہارے ابا سے حتمی بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ سب کی منہ چڑھی تو میں تھی ہی سوچی دار بھی بہت تھی، میں نے ساری بات ان کے گوش گزار کردی۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ بھاگ کر شادی کرلیں ورنہ اور کوئی صورت نہیں...... کیونکہ ہمارے گھرانے میں برادری سے باہر شادی کو گناہ سمجھا جاتا تھا۔ میں نے تمہارے ابا کے ساتھ بھاگ کر شادی کرلی اور ان کے ساتھ کراچی ان کے گھر آگئی جہاں تمہاری دادی اور چاروں پھپھیوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا سب نے بہت محبتیں دیں اتنی محبتوں پر میں پھولے نہ سماتی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں تو تمہارے ابا نے مجھے بہت محبت سے رکھا پھر آہستہ، آہستہ انہوں نے میرے اوپر نظر رکھنا شروع کردی۔ میری ہر بات میں کیڑے نکالتے، مجھ پر شک کرتے شوخ رنگوں کے کپڑے پہننے نہ دیتے۔ میں بج سنور نہیں سکتی تھی۔ کسی سے ہنس کر بات نہیں کرسکتی تھی ٹوک دیتے، میرے گلی میں جھانکنے تک پر بھی پابندی لگادی گئی۔ کسی کام سے جھانکتی تو طعنہ ملتا کہ کس یار کے لیے باہر تانکا جھانکی ہورہی ہے، اتنی تذلیل پر میں زمین پر گڑ جاتی، آہستہ آہستہ دن گزرتے رہے پھر تم پیدا ہوگئیں، تمہاری دادی چل بسیں اور دونوں نندوں کی بھی شادی ہوگئی۔ بڑی دو تو پہلے سے ہی شادی شدہ تھیں۔

اس کے بعد تو جیسے تمہارے ابا کو کھلی چھوٹ مل گئی مجھ پر ہاتھ بھی اٹھانے لگے۔ ایسے ایسے الزامات کی بارش کرتے کہ میں مرنے کی خواہش کرنے لگتی، کام پر جاتے تو تالا لگا جاتے کہ کہیں میں اپنے کسی پرانے عاشق کے ساتھ انہیں جھانسا دے کر بھاگ نہ جاؤں۔ بیٹی اِک تمہارا آسرا اور خیال نہ ہوتا میں کب کی ان در و دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دے دیتی۔ خدا کا شکر تھا کہ تمہارے ابا نے تمہیں میری بیٹی ہونے کی سزا نہیں دی اور تم سے ہمیشہ محبت کی ورنہ تو یہ صدمہ شاید ہی میں برداشت کر پاتی...... بس اب تم عزت سے اپنے گھر کی ہوجاؤ تو ہی مجھے سکون ملے گا...... مجھے گھر سے بھاگ کر شادی کرنے کی سزا آج تک مل رہی ہے اور شاید غلطی بھی میری ہی تھی۔ میں نے جو بویا وہی کاٹ رہی ہوں۔ یہ سب کرنے کا موقع میں نے خود ہی دیا تھا۔ میں ان کی نظروں میں گر چکی ہوں اب انہیں کوئی بدل نہیں سکتا، جتنی زندگی گزارنی تھی گزر چکی اب تو بہت تھوڑی سزا باقی ہے۔“

تب زینب بھی ان کے گلے لگ کر بلک، بلک کر رو دی۔ اس نے آج اپنی انا اور اپنے وقار کے مجروح ہونے کا دکھ سہا تھا، جن والدین کو اس پر اندھا اعتبار تھا آج وہ ان کے اعتبار کی دھجیاں اڑانے چلی تھی۔ کاش وہ یہ سب کچھ پہلے ہی جان پاتی مگر اب بھی دیر نہیں ہوئی تھی۔

ارتضٰی خان واپس آ رہا تھا۔ حویلی کے دروازے جو تقریباً آج سے دس سال قبل اس کے لیے ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے تھے۔ آج اس کی ایک فون کال پر ذرا سی معذرت کے بعد مکمل طور پر اس کے لیے وا ہو چکے تھے۔ سبھی گھر والوں کے دل جس قدر تیزی سے ارتضٰی خان کی طرف سے صاف ہوئے تھے۔ کم از کم اسے ایسی توقع ہرگز نہ تھی۔

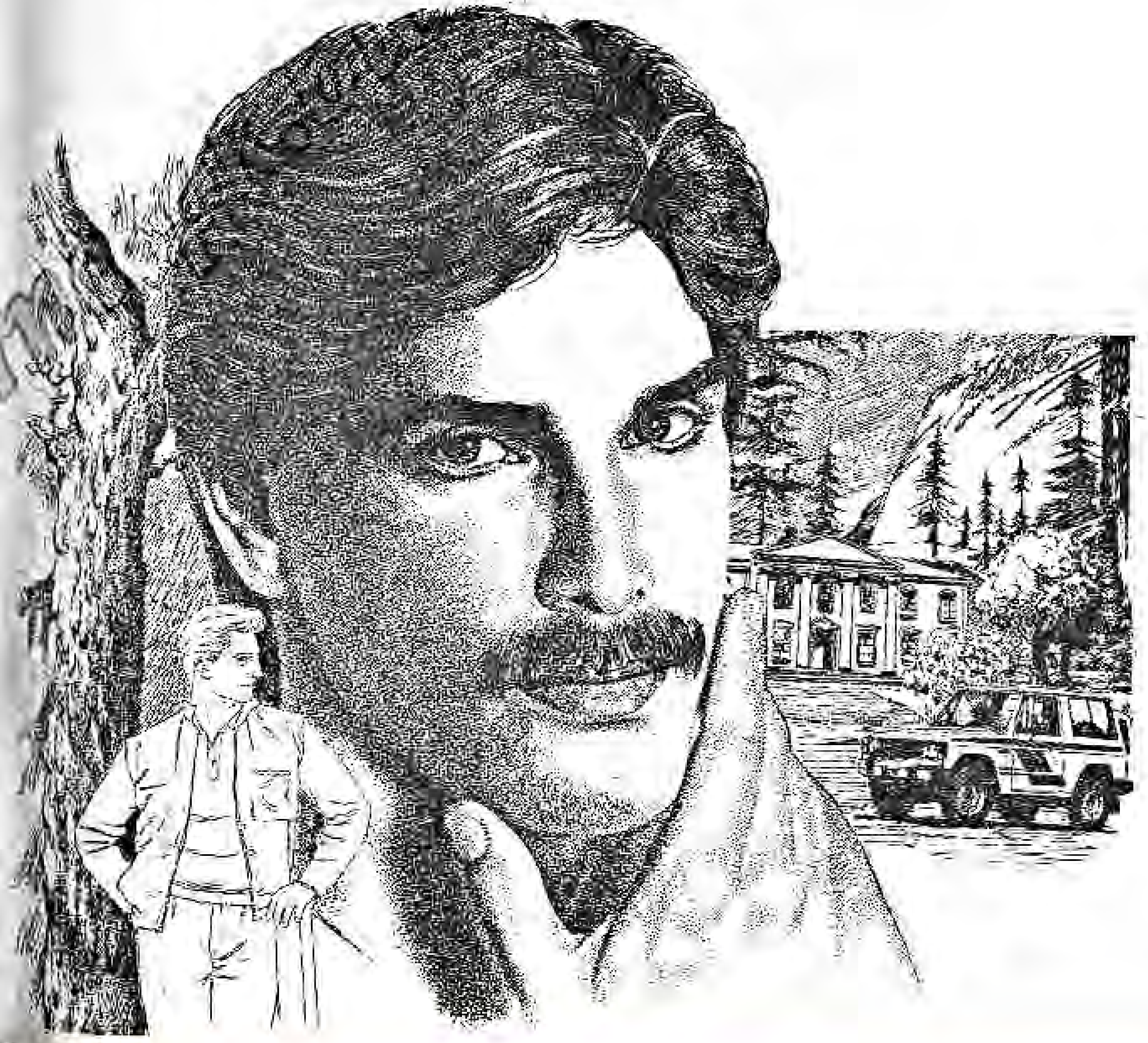
بڑے ابی، تایا، تائی جان اور اس کے سارے

مکمل ناول



کرچیاں محبت کی

حیا بخاری



کزنز کس قدر خوش ہوگئے تھے ارتضٰی سے بات کرکے......اور اس کی ذات، عزتِ نفس، اس کی کرچی، کرچی محبت کسی کو یاد نہ آئی۔ کسی نے ایک مرتبہ بھی اس سے پوچھنا گوارا نہیں کیا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ کیا وہ بھی ارتضٰی خان کو معاف کرتی ہے۔ کیا وہ اسے اس حویلی میں ایک بار پھر آباد دیکھ پائے گی۔ اس کے دل پر کیا بیتے گی۔ وہ کس قیامت کی پکڑ میں آجائے گی۔ کسی نے بھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے امی، بابا کی یاد آئی تھی۔ اسے لگا واقعی وہ یتیم تھی۔ یہ احساس آج سے پہلے اسے کبھی زندگی میں نہیں ہوا تھا۔ بڑے ابی، تایا جان، تائی جان اور گھر کے دوسرے تمام افراد نے اس پر کچھ اس طریقے سے محبتیں نچھاور کی تھیں کہ اسے کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ یتیم ہے۔ نہ کبھی اس کے ماں باپ اسے یاد نہ آئے تھے۔ نہ ہی کبھی کوئی ملال دل میں جاگا مگر آج......نہ جانے کیوں دل میں کسک سی جاگ اٹھی۔

وہ بیڈ سے اتر کر سیدھی کمرے سے ملحق چھوٹے سے ٹیرس پر چلی آئی۔ باہر چھم، چھم برستی زوروں کی بارش نے موسم بے حد خوب صورت کردیا تھا مگر نہ جانے کیوں اسے اپنے چہار سو اداسی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ دل کے زخم پھر سے اُدھڑنے لگے تو بے اختیار دل کے اندر باہر بھی بارش شروع ہوگئی۔ بارش کے قطروں میں کب اس کے آنسوؤں کی آمیزش ہوئی اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔

”میں کیسے اس شخص کے سامنے ٹھہر پاؤں گی جو اپنی ذات پر بڑا مان کرکے میری شخصیت کا غرور توڑتا، میری عزتِ نفس اپنے پاؤں تلے روند کے چلا گیا۔ سب گھر والے اسے معاف کرسکتے ہیں مگر میں نہیں......میں آج تک خود کو اس احساسِ ذلت سے نجات نہیں دلا پائی۔ کس طرح کسی گری پڑی لاوارث لڑکی کی طرح اس نے سب حویلی والوں کے سامنے نہ صرف مجھے اپنانے سے انکار کردیا تھا بلکہ براہِ راست میری شخصیت پر وار بھی کیے۔ مجھے ٹھکرانے کا جواب بھی میری ہستی کو ہی بنایا اور آج اتنے سالوں بعد......بھلا میں دوبارہ سے کیسے اس شخص کا سامنا کروں گی۔“ وہ ہچکیاں لینے لگی۔ تبھی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے فوراً چہرہ رگڑ کر صاف کیا۔

”پری۔“ تائی امی کی آوز پر اسے مزید رونا آیا۔ اس نے بہ مشکل خود کو کنٹرول کیا اور ٹیرس سے اندر کمرے میں آگئی۔

”اوہ......تو بارش کا مزہ لے رہی ہو تم۔“ تائی امی اسے بھیگا دیکھ کر مسکرادیں۔ وہ چپ چاپ اثبات میں سر ہلا گئی۔ تائی امی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ بیڈ پر لا بٹھایا۔

”تم رو رہی تھیں پریشے؟“ ان کی آواز میں پریشانی تھی۔ وہ چپ رہی۔

”تم جانتی ہو پری، میں نے اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر چاہا ہے تمہیں......کیا تمہیں میری محبت پر شک ہے بیٹا؟“ وہ اداس ہوئیں۔ پریشے گڑبڑا گئی۔

”نہیں تائی امی، بالکل بھی نہیں۔“ اسے کچھ دیر پہلے والی اپنی تمام سوچوں پر شرمندگی ہوئی۔

”کبھی شک کرنا بھی مت پری بیٹا۔ صرف تمہاری وجہ سے ہی میں نے ارتضٰی کو خود سے دس سال دور رکھا۔ اب جب اس نے ہم سب سے معافی مانگ لی ہے۔ جب اس نے ٹھیک ٹھاک اپنے کیے کی سزا بھگت لی ہے تو تم خود سوچو بیٹا‘ وہ ہے تو ہمارا ہی خون......پھر ہم بڑے ہیں۔ بچوں کو ان کی غلطی کا احساس ہوجائے یہ بات بڑوں کے لیے بہت اہم ہوتی ہے۔ ان کی غلطیاں پھر بہت معمولی ہوجاتی ہیں۔ تم خود سوچو اگر اس مشکل وقت میں جبکہ وہ مکمل طور پر بکھر چکا ہے اور اسے ہماری ضرورت ہے تو ماں ہوکر میں نہیں تو اور کون اسے گلے لگائے گا

بیٹا۔“ وہ چُپ چاپ آنسو بہاتی گئی۔ تائی امی ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

”لیکن ایک بات یاد رکھنا پری، میرے لیے آج بھی ارتضٰی خان سے بڑھ کر تم ہو۔ تمہارا باپ بھلے سے میرا چھوٹا دیور تھا مگر مجھے میرے سگے بھائیوں سے بڑھ کر عزیز تھا اور تم میرے پاس اس کی واحد نشانی ہو۔ ارتضٰی تمہارا گناہ گار ہے تم اس کی گناہ گار نہیں۔ یہ گھر کل بھی تمہارا تھا اور آج بھی تمہارا ہے۔ تم سے نظریں چرانے کی ضرورت اگر کسی کو ہے تو وہ ارتضٰی خان ہے۔ تمہیں یہ فکر نہیں کرنی چاہیے کہ تم اس کا سامنا کیسے کروگی بلکہ یہ بات تو ارتضٰی کو پریشان کرے کہ وہ تمہارا سامنا کیسے کرے گا۔“ تائی امی واقعی اس کی ماں سے بڑھ کر تھیں تبھی تو بولے بنا ہی اس کی ساری پریشانی جانچ لی تھی انہوں نے۔ اسے خود سے نظریں ملانا دوبھر ہونے لگا۔

”خدا جانتا ہے پری، ان دس سالوں میں، میں نے کتنے خلوص سے کوشش کی کہ تمہارا بھی گھر بس جائے، تم بھی اپنے گھر آباد ہو لیکن تمہاری مرضی کے آگے میں مجبور رہی لیکن آج پھر تم سے ایک ماں کی حیثیت سے کہہ رہی ہوں بیٹا کہ تم اور تمہاری خواہش میرے لیے سب سے اہم ہے۔ سو کبھی کوئی بات مجھ سے چھپانے کی کوشش مت کرنا اور یاد رکھنا تم میرا فخر ہو۔ تمہیں نہ تو کسی کے سامنے سر جھکانے کی ضرورت ہے نہ ہی آنکھیں۔ اب جاؤ منہ ہاتھ دھو کے فریش ہوجاؤ، میں تمہارے لیے گرما گرم پکوڑے بناتی ہوں۔“ تائی امی نے پیار اس کی پیشانی پہ ثبت کرتے ہوئے کہا تو وہ دھیرے سے سر ہلاتی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ تائی امی کی آنکھوں میں سوچ کے گہرے سائے بہت واضح تھے۔

☆☆☆

وہ ان خوب صورت منقش درودیوار کی وسیع حویلی میں بیاہ کر آئیں تو انہیں پتا چلا کہ اس حویلی میں وہ واحد صنفِ نازک تھیں۔ ملازم اور ملازماؤں کی تو کثرت تھی مگر گھر کے افراد میں صرف تین اشخاص بڑے ابی، مرتضٰی خان اور مصطفیٰ خان۔ مصطفیٰ بڑے ابی کی دوسری بیوی کی اولاد تھا۔ تبھی اپنے بھائی مرتضٰی سے کافی چھوٹا تھا وہ۔ ثمرین کے آنے کی سب سے زیادہ خوشی بھی مصطفیٰ کو ہی ہوئی تھی۔ ثمرین کو بھی وہ بالکل اپنے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز تھا۔

حویلی کی مضبوط عمارت میں اس نے اپنے سسر، شوہر اور دیور کے ساتھ مل کر محبتوں کا عظیم الشان محل تعمیر کیا۔ شادی کے تین سال بعد جب ارتضٰی ان کی زندگی میں آیا تو گویا ان کی جنت ہی مکمل ہوگئی۔

مصطفیٰ کی شادی بھی خاندان میں ہی ہوئی اور خوش قسمتی سے اس کی بیوی بھی گھر بنانے والی ملی۔ ارتضٰی کے بعد ثمرین بی بی نے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کو جنم دیا لیکن مصطفیٰ کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس بات نے مصطفیٰ کو خاصا پریشان بھی کیے رکھا لیکن شادی کے چھٹے سال جب اللہ نے انہیں پریشے جیسی خوب صورت بیٹی سے نوازا تو جیسے وہ پھر سے جی اٹھا۔ ننھی منی سفید کمبل میں لپٹی وہ معصوم گلابی گڑیا اٹھائے سیدھا ثمرین بھابی کے پاس آیا تھا اور پریشے ان کی گود میں ڈالتے ہوئے پورے مان سے بولا تھا۔

”بھابی، میری پریشے آپ کے حوالے......پلیز اس کا خیال رکھنا۔“ اس وقت ثمرین کو واقعی سمجھ نہ آیا تھا کہ مصطفیٰ نے ایسا کیوں کیا مگر صرف ایک ہفتے بعد جب شہر جاتے ہوئے ان کی گاڑی کو ایک ٹرک نے ٹکر ماری اور وہ دونوں میاں، بیوی موقع پر ہی دم توڑ گئے تو ثمرین قدرت کی مصلحت سمجھ گئی۔ خدا نے خود ہی مصطفیٰ کے دل میں یہ بات ڈال کر ان تک پہنچادی تھی اور ثمرین نے تمام عمر مرحوم دیور کی بات کا پاس رکھا تھا۔

ان کی ہر صبح پری سے شروع ہوتی تو ہر دن کا

اختتام بھی پری پر ہوتا۔ پری کے لیے وہ اپنے بچوں کو بری طرح جھڑک کے رکھ دیتیں۔ پری کی خوشی کے سامنے انہیں اپنے بچوں کی خوشی بھی نظر نہ آتی۔ وہ بس پری کی خوشی منائیں، اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتیں۔ پریشے کا ایک آنسو نکلنے سے پہلے ہی اس کی تکلیف سمجھ جاتیں۔

اپنی اس دیوانگی میں انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ کب ان کا اپنا بچہ ارتضیٰ خان دل ہی دل میں ان کی اس قدر مہربانیوں کی وجہ سے پریشے سے مُخاش رکھنے لگا تھا حالانکہ ارتضیٰ خان عمر میں پریشے سے کافی بڑا تھا۔ انہیں اگر یہ خدشہ تھا تو وہ بھی اپنے چھوٹے بچوں سے لیکن ان کی پری سے خاصی دوستی تھی۔

دوستی تو ارتضیٰ خان کی بھی کافی تھی پریشے سے مگر وہ اندر ہی اندر اس سے کس قدر خار کھاتا ہے، یہ کسی کو اندازہ نہ تھا۔ وہ پری سے اس قدر محبت اور لگاؤ دِکھاتا کہ تائی امی اب کھلم کھلا ان دونوں کی جوڑی کی بات کرنے لگی تھیں۔ لڑکپن سے گزرتی پریشے کے دل پر ارتضیٰ خان کی محبت کے بیج بونے کی نوبت ہی نہ آئی خود کو اس سے جُڑ تا سن کر محبت خودرو پودے کی طرح اس کے دل کی سرزمین پر پھیلتی چلی گئی۔

ارتضیٰ کا کوئی کام ایسا نہ تھا جو پریشے کے علاوہ کوئی ٹھیک کر پاتا۔ اسے چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کے لیے بھی پریشے کی ضرورت ہوتی۔ سب گھر والے اس بات کو ان دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ سمجھتے رہے اور یہ بات کس قدر غلط تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا نہ ہی کوئی سوچ سکتا تھا۔

☆☆☆

آج کل ایبٹ آباد کا موسم بے حد پیارا ہو رہا تھا۔ اورنج کلر کے خوب صورت سوٹ پر بلیک سوئٹر پہنے وہ ہمیشہ کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چھوٹی سی پگڈنڈی پر اوپر کی طرف اپنے ہی خیالوں میں مگن رواں تھی تبھی اس کی نگاہ دائیں طرف تارکول سے بنی صاف شفاف پختہ سڑک کی طرف اٹھی۔ حیرت سے وہ وہیں رک گئی۔

بلیک کرولا سے ٹیک لگائے سفید شرٹ اور بلیو جینز میں ملبوس وہ دراز قد شخص آج پہلی دفعہ اسے نظر نہیں آیا تھا بلکہ یہ اتفاق کئی روز سے ہو رہا تھا۔ اس نے کئی دفعہ محسوس کیا تھا کہ اس کے اسکول پہنچنے تک یہ گاڑی یہیں کھڑی رہتی اور جیسے ہی وہ اسکول کے اندر چلی جاتی، گاڑی بھی اسٹارٹ ہو جاتی۔ اس مطمئن سے کھڑے شخص کو بھی اس نے کئی بار اپنے راستے میں دیکھا تھا۔ کبھی چیڑ کے درخت تلے، کبھی بشیر چاچا کے کھوکھے پہ تو کبھی یونہی پیروں کی قینچی بنائے گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے لیکن اس نے ہمیشہ اسے اگنور کیا تھا مگر آج وہ چاہ کر بھی اسے اگنور نہ کر پائی تھی کیونکہ آج وہ براہِ راست اسے دیکھ رہا تھا۔ ہمیشہ آنکھوں پر لگا کالا چشمہ آج اس نے ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ تبھی اس کی نظروں کے حصار نے پریشے کو چونکنے اور رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پریشے کو اپنی جانب تکتا پا کر اس نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی تھی۔ پریشے نے فوراً رخ پھیر کر تیزی سے باقی فاصلہ طے کیا تھا اور اسکول کی عمارت کے اندر چلی گئی۔ اس نے ذرا سا گیٹ سے جھانک کر باہر دیکھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ واپس گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور اسٹاف روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

ارتضیٰ خان جب سے شہر پڑھنے گیا تھا، پریشے کو لگتا جیسے سارا ایبٹ آباد ویران کر گیا۔ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہونے لگا تھا۔ اب بھی وہ ثنا اور ندا کے ساتھ کالج سے واپس لوٹی تو گیراج میں کھڑی ارتضیٰ کی مخصوص جیپ دیکھ کر اس کا تن من کھل اٹھا۔

"لالہ آئے ہیں۔" ندا بھی فوراً چیخ مارتی اندر بھاگی۔ وہ شاید اپنے کمرے میں تھا۔ تبھی اس سے

سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس نے جلدی، جلدی بے قراری سے یونیفارم چینج کیا اور باہر چلی آئی۔ ارتضیٰ اب بھی وہاں نہیں تھا۔ پریشے کو ایک، ایک لمحہ بِتانا مشکل ہو رہا تھا۔

"پری...... لالہ کے لیے ایک کپ چائے لے آؤ۔" تبھی اوپر سے ندا نے اسے پکارا تھا اور اس کے جسم میں جیسے بجلی سے بھر آئی تھی وہ فوراً کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"کچھ ضرورت ہے پری تو کسی سے کہہ دیا ہوتا بیٹا۔ ابھی تو کالج سے آئی ہو۔" تائی امی اسے دیکھتے ہی بول اٹھیں۔

"نہیں امی، وہ دراصل ارتضیٰ کے لیے چائے بنانے آئی تھی، آپ پئیں گی؟" اس نے ان سے بھی پوچھا۔

"تم جاؤ آرام کرو، میں تم لوگوں کے لیے کھانا لگا لوں تو خود دے آتی ہوں ارتضیٰ کو چائے۔" انہوں نے سالن ڈونگے میں نکالتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں تائی امی، کوئی مسئلہ نہیں۔ میں بس ابھی دو منٹ میں بنا دیتی ہوں۔" اس نے تیزی سے جواب دیتے ہوئے چائے کا پانی چولھے پر رکھا تو تائی اس کی جلد بازی دیکھ کر مسکرا دیں۔

"چلو جیسے تمہاری مرضی...... مگر جلدی سے دے کر آؤ کھانا ٹھنڈا نہ کر دینا۔" اسے محبت بھری تاکید کرتی وہ باہر چلی گئیں۔ اس نے سکون سے چائے بنائی اور سلیقے سے سر پر دوپٹا جما کے چائے لیے اوپر ارتضیٰ کے کمرے میں چلی آئی۔ ارتضیٰ بیڈ پر لیٹا لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ وہ دستک دیتی اندر آ گئی۔

"ارتضیٰ، چائے۔" اس نے آرام سے کہتے ہوئے ٹرے سائڈ ٹیبل پر دھری۔ ارتضیٰ نے ایک سادہ سی نگاہ اس پر ڈالی اور لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

"دروازہ بند کرو۔" اکیلے میں وہ یونہی حکمیہ انداز اختیار کر لیتا۔ پریشے کو اس کے اس انداز کی کبھی سمجھ نہ آئی تھی۔ وہ حیرت سے اس کو دیکھنے لگی جیسے اس کی بات نہ سمجھ پائی ہو۔

"میں نے کہا دروازہ بند کر دو۔ مجھے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔" اب کی بار اس کے لہجے میں بیزاری بہت واضح تھی۔ پری نے فوراً دروازہ ہلکے سے بند کر دیا۔

"تم لوگوں کے امتحان ہونے والے ہیں، امی ابو ضرور تم لوگوں کی آگے تعلیم کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھائیں گے۔ ثنا اور ندا کا مجھے کوئی پتا نہیں مگر تم نے خود سے صاف انکار کر دینا ہے۔" وہ اِدھر اُدھر کے بجائے سیدھا اپنے مدعا پر آیا تھا۔ پریشے سن سی کھڑی رہ گئی۔

"مگر میں...... میں تو پڑھنا چاہتی ہوں۔" اس کی آواز بے حد کمزور تھی۔

"تو میں تمہیں پڑھائی سے منع نہیں کر رہا، پڑھائی تم گھر پر بھی پوری کر سکتی ہو۔ پرائیویٹ کینڈیڈیٹ کے طور پر۔" وہ اٹھ کر اس کے برابر آٹھہرا اور پریشے کو لگا وہ اس کی سحر انگیز شخصیت کے آگے ایک بار پھر دب سی گئی۔

"لیکن کیوں؟" وہ بہ مشکل بول پائی وہ بھی بے حد نحیف آواز میں۔

ارتضیٰ کی آنکھوں میں غصے کی سرخی سی دوڑ گئی۔ ضبط سے وہ ایک ہونٹ کچل گیا لیکن نرمی سے پریشے کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر وہ اپنے احساسات چھپانے میں کامیاب رہا۔

"کیونکہ میں کہہ رہا ہوں، کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں؟" کتنا مان تھا ارتضیٰ خان کے لہجے میں۔ بارِ حیا سے اس کی پلکیں جھکنے لگیں۔ "اور پھر میں زبردستی نہیں کر رہا صرف اپنی خواہش بتا رہا ہوں۔ اگر تمہارے دل میں میری کوئی قدر ہے تو...... ورنہ......" وہ دھیرے سے کہتا اس کا ہاتھ چھوڑ کر دوبارہ سے بیڈ پر جا بیٹھا۔

"تم جانتے ہو ارتضیٰ کہ تمہاری بات میرے

لیے کیا معنی رکھتی ہے۔'' اس نے آرام سے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

اور پھر بڑے ابی، تایا ابو اور تائی امی کے علاوہ ثنا، ندا اور احتشام سبھی نے کتنی کوششیں کیں کہ پریشے جیسی ذہین اور قابل لڑکی مزید آگے پڑھے لیکن کوئی بھی اس کے انکار کی وجہ نہ جان سکا۔ نہ ہی اس کے اس فیصلے کو تبدیل کر پایا یہ اور بات کہ پرائیویٹ بڑھنے کے باوجود اس نے اپنی تعلیمی ساکھ برقرار رکھی تھی اور ہمیشہ اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی۔ ارتضٰی کی ہستی سے خود اپنے ہاتھوں کھانے والی یہ پریشے مصطفیٰ کی پہلی چوٹ تھی۔

☆☆☆

''وہ آئے یا جائے تمہیں اس کی کسی بات کو اہمیت نہیں دینی چاہیے پریشے۔'' ایمان نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ایمان اس کی وہ واحد دوست تھی جو اس کی زندگی کے ہر تلخ باب سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس نے ارتضٰی خان کے واپس آنے اور سب گھر والوں کے اسے معاف کر دینے کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔

''کہنا بہت آسان ہوتا ہے ایمان لیکن حقیقت میں سامنا کرنا ہو تو انسان کا دماغ ہی کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔'' وہ اداسی سے بولی۔ وہ دونوں اس وقت اسکول کے لان میں بینچ پر بیٹھی فارغ پیریڈ گزار رہی تھیں۔ تبھی پریشے نے ایک مرتبہ پھر اپنی مشکل اپنی مخلص دوست کے سامنے کھول کر رکھ دی۔

''جو شخص تمہیں کھلونا بنا کر کھیلتا رہا، تمہیں تمہارے ہاتھوں مسمار کرتا رہا اور پھر تمہاری اسی محبت کو بے وقوفی کہہ کر تمہارے وجود کی دھجیاں بکھیر گیا ہو، شرمندہ تو اسے ہونا چاہیے ناں۔ تم تو پورے غرور سے اس کے سامنے جاؤ۔ اسے دکھاؤ کہ تم یا تمہاری دنیا صرف اس ایک شخص پر ختم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بھی تم زندہ ہو اور پہلے سے زیادہ بہتر ہو۔'' ایمان نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے ہاتھ نچا، نچا کر کہا تو وہ اس کے اس معصوم انداز پر مسکرا دی۔

''یار ثنا اور ندا ہوتیں تو مجھے اتنا مسئلہ نہیں ہوتا مگر اب جبکہ ان کی شادیاں ہو گئی ہیں تو ایسے میں ارتضٰی خان سے بار بار سامنا ہوتا رہے گا اور میں نہیں چاہتی کہ اس بار پھر اس کی سحر انگیزی میرے وقار میری انا سے جیت جائے۔'' وہ واقعی پریشان تھی۔

''سوچنا بھی مت...... ورنہ سچ میں تم سے بڑا بے وقوف اس دنیا میں کوئی نہیں ہوگا۔ ویسے ایک بات کہوں پری۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا تو پریشے نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم نے پہلے ہی ابھی تک کوئی فیصلہ نہ کر کے خود کو کمزور ثابت کر رکھا ہے۔ ایسے میں ارتضٰی جیسے کایاں شخص کا دوبارہ تمہیں ٹریپ کر لینا مشکل نہیں۔'' ایمان کے لہجے میں ہلکی سی غصے کی بھی آمیزش تھی۔

''میں کیا کروں ایمان! مجھے پھر خود پر اعتبار ہی نہ رہا۔ مجھے لگا میں کسی کے قابل نہیں رہی۔ میں شاید کسی کے قابل ہوں ہی نہیں۔'' وہ اداسی سے بولی۔

''بھول ہے تمہاری...... ورنہ بدقسمتی ہے ارتضٰی کی کہ تم جیسے ہیرے کو ٹھوکر ماردی۔ جو اللہ نے بن مانگے اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور میں یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ کتنی لائنیں لگی تھیں تمہارے رشتے کے لیے ثمرین آنٹی کے گھر بلکہ سچ پوچھو تو ندا اور ثنا بھی تمہارے انکار کے بعد ہی ان لوگوں نے مجبوراً مانگ لیں۔'' ایمان بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔

''خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔ ندا اور ثنا خود بھی بہت پیاری ہیں۔'' اس نے فوراً تردید کی۔ تبھی اسکول کے چوکیدار کاکا خان اس کے پاس آئے تھے۔

''باجی، کوئی آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔'' اس نے پریشے سے مخاطب ہو کر کہا۔ پریشے کی نگاہوں میں وہ خوبرو سا شخص گھوم گیا۔

''مجھ سے؟'' اسے حیرت ہوئی۔

''جی پریشے باجی آپ سے۔'' کاکا خان نے اسے یقین دلایا۔

''کون ہو سکتا ہے؟'' ایمان بھی حیران تھی کیونکہ ان کی چھ سالہ سروس میں پریشے سے ملنے کبھی کوئی اسکول نہیں آیا تھا۔ نہ ہی کوئی ایسا جاننے والا تھا جو اسکول کا پتا جانتا ہو پھر یہ کون تھا۔

''کیا نام بتایا ہے کاکا؟'' ایمان نے پوچھا۔

''مہد علی خان، کہتا ہے بہت ضروری کام ہے۔'' کاکا خان نے کاندھے پر لٹکی بندوق سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

''چلو مل لو جا کر۔'' ایمان نے اس کا پرس اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ارے ایسے کیسے مل لوں، پاگل ہو گیا!'' وہ گھبرا گئی۔

''لو اس میں اتنا گھبرانے والی کیا بات ہے۔ اچھا چلو...... میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔'' بینچ پر رکھے پاؤں نیچے اتارتے ہوئے ایمان بولی تو پریشے نے بھی مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔

باہر آتے ہی پریشے کو اپنا اندازہ درست ہونے پر حیرت سی ہوئی تھی۔ ان دونوں کو باہر آتا دیکھ کر وہ جو دیار کے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا فوراً سیدھا ہوا۔ ایمان نے اسے دیکھتے ہی سیٹی کے سے انداز میں لب سکیڑے۔ پری نے فوراً اسے کہنی ماری۔

''جی فرمائیں، کیا مدد کر سکتے ہیں ہم آپ کی؟'' ایمان نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔ مہد علی نے بس ایک نظر اس پر ڈالی اور دوبارہ سے سامنے نظر آنے والے وسیع کھیت پر نظریں مرکوز کر لیں۔

''مجھے پریشے سے کام تھا لیکن لگتا ہے وہ شاید اکیلے دنیا کو فیس نہیں کر سکتیں۔'' وہ جو کوئی بھی تھا بہت ذہین تھا۔ ایمان دل ہی دل میں اس کی سمجھداری کی معترف ہوئی۔

''یہ بات نہیں...... بس پری انجان لوگوں سے بات نہیں کرتی۔'' ایمان نے وضاحت کی۔ وہ مسکرا دیا۔ ایمان نے دیکھا اس کی خوب صورت براؤن آنکھوں میں پری کو دیکھتے ہوئے عجیب سے رنگ تیر رہے تھے۔ وہ مسکرا دی تھی۔

''چل پریشے، تیری تو لگ گئی لاٹری۔'' اس نے شرارت سے سرگوشی کرتے ہوئے پریشے کو کہنی ماری۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''میں اپنے بھانجے کا ایڈمیشن کروانا چاہتا ہوں۔ ہم یہاں نئے آئے ہیں تو مجھے اسکولوں کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں۔ اسی لیے میں نے آپ کی مدد لینے کا سوچا۔ ہمارے گھر ایک کام والی آئی ہے اور انہوں نے بتایا آپ کے بارے میں سو میں چلا آیا۔ مجھے لگا اسکول کے اوقات میں ہی آپ سے ملنا ٹھیک رہے گا۔'' بالآخر اس نے اپنا مقصد بیان کر ہی دیا تھا۔

''حیرت ہے، میرے خیال میں تو آپ کو کئی بار یہاں دیکھا ہے۔'' پریشے خود ہی بول پڑی۔ اس کی بات پر جہاں ایمان کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا... وہیں مہد علی کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ مچل اٹھی۔

''جی، بجا فرمایا آپ نے...... یہی کچھ پانچ چھ ماہ ہوئے ہیں ہمیں یہاں شفٹ ہوئے لیکن خیر مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے مجھے نوٹس تو کیا۔ میرا آنا رائگاں نہیں گیا۔'' وہ صاف، صاف بول گیا اس کی اس قدر دلیری پر پریشے نروس سی ہونے لگی۔

''آپ لے آیئے گا بچے کو ایڈمیشن مل جائے گا۔ ویسے یہ کام آپ آفس جا کر بھی کروا سکتے تھے۔'' اس نے بات ختم کرنا چاہی۔

''کر سکتا تھا مگر میرا مقصد ادھورا رہ جاتا۔'' اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے گاڑی کی طرف قدم بڑھائے۔

''آپ سے پھر کبھی بات ہوگی لیکن پہلے

میں ذرا ان سے پوچھ لوں۔" ایمان نے پریشے کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے مہد علی خان کی طرف ہاتھ ہلایا تھا۔ پری اسے وہیں چھوڑ کر تیزی سے گیٹ سے اندر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

ثنا اور ندا شہر کے کالج اور پھر یونیورسٹی میں پڑھنے لگیں لیکن وہ دل ہی دل میں اپنی خواہش دبائے پرائیویٹ تعلیم حاصل کرتی رہی۔

ارتضیٰ خان کی شہر میں جاب ہوگئی تھی۔ اب اس کا آنا جانا مزید کم ہوگیا۔ وہ انگلیوں پر اس کی جدائی کے دن گنتی رہتی۔ انہی دنوں اس کے لیے تائی امی کے ایک رشتے دار کا رشتہ آیا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی تھی۔

"پریشے تو بچپن سے میرے ارتضیٰ کے نام ہے۔" تائی امی نے ایک پل میں اس کے سارے خدشات دور کردیے تھے۔

آنے والے بے طرح اداس تو ہوئے لیکن انہیں چھٹیوں پر آئی ندا بھی بے حد پسند آگئی اور اس کی جگہ ندا کی بات طے ہوگئی۔

"اس دفعہ ارتضیٰ آئے تو دوٹوک بات کرلیں۔ ندا، پریشے کی ذمے داریاں ایک ساتھ نبٹالیں تو میری روح کو سکون ملے۔ ورنہ مصطفیٰ سے کیا وعدہ ہمیشہ میرے لیے امتحان نہ بنا رہے۔" تائی امی جہاں ندا کے لیے خوش تھیں وہیں ارتضیٰ کی گھر سے اس قدر بے پروائی پر پریشان بھی۔ انہیں ہر بار ایک عجیب سا دھڑکا لگا رہتا۔

"ہاں، میں خود بھی سوچ رہا تھا۔ اس بار ارتضیٰ آئے تو اس کی اور پریشے کی شادی طے کردی جائے۔ ویسے بھی اب تو اس کی جاب بھی ہوگئی ہے۔" مرتضیٰ خان نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"صرف بات مت کیجیے گا فیصلہ سنایئے گا اسے۔

پتا نہیں کیوں مگر مجھے اس کے انداز سے ڈر لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ٹالنے لگا ہے ہمیں۔" ثمرین بڑی پریشانی سے بولیں تو مرتضیٰ خان نے بھی پُرسوچ انداز میں سر ہلادیا۔

"میرے خیال میں تو دونوں ایک دوسرے کے کافی قریب ہیں۔ ارتضیٰ جس طرح اپنی ہر ضرورت کے لیے پریشے کو پکارتا ہے کیا تمہیں نہیں لگتا یہ پیار کی علامت ہے؟" ان کی بات سو فی صد سچ تھی مگر ثمرین بی بی کی سوچ ان سے قدرے مختلف تھی۔

"اللہ کرے، آپ کی بات سچ ہو مگر مجھے اس کے انداز سے بیزاری نظر آتی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ پریشے سے اندر ہی اندر کوئی خار رکھتا ہے بالکل مالکوں کی طرح ٹریٹ کرتا ہے وہ اسے جیسے وہ اس کی غلام ہو۔" مرتضیٰ خان نے پیار لٹاتی نگاہ اپنی سادہ اور پُرخلوص شریکِ حیات پر ڈالی۔ وہ ان پر جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔ انہوں نے ان کی یتیم بھتیجی کو ہمیشہ اپنی سگی اولاد پر بھی فوقیت دی تھی۔

"تمہارا وہم ہے ثمر، انشاءاللہ سب اچھا ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ہوں ناں سب سنبھالنے کے لیے پھر اگر اس نے کوئی ایسی ویسی بات کی بھی تو امی ہیں ناں۔ وہ ان کی بات کبھی نہیں ٹالے گا۔" انہوں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے یقین دلایا تو وہ بھی مطمئن ہوکر مسکرادیں۔

☆☆☆

"آپ نے پرنسپل سے جھوٹ کیوں بولا؟" سرخ فراک پر بڑی سی بلیک شال لیے اس کی توقع کے عین مطابق وہ اس کے سامنے کھڑی اس پر برس رہی تھی اور وہ جو بلیک کرولا سے ٹیک لگائے مطمئن سا کھڑا تھا۔ سیدھا کھڑے ہوکر اس کے برابر آگیا۔

"میں نے جھوٹ تو نہیں بولا۔" کمال کا اعتماد...... ایک لمحے کو تو پریشے بھی گڑبڑا گئی۔

"کک...... کیا مطلب ہے؟" وہ واقعی حیران ہوئی۔

"میں نے ان سے کہا کہ ہم آپ کے جاننے والے ہیں اور واقعی میں آپ کو بے حد جاننے لگا ہوں۔ اِن فیکٹ جب سے آپ کو دیکھا ہے بس آپ کو جاننے کی ہی جستجو ہے۔" خوب صورت لہجہ پریشے کے حواسوں پر طاری ہونے لگا۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔

"بہت افسوس ہوا ہے مجھے، میں آپ کو ایک اچھا انسان سمجھتی تھی۔" وہ بہ مشکل بول پائی۔ مہد علی خان مسکرایا۔

"اس افسوس پر بھی آپ کو بے حد افسوس ہوگا۔ اگر آپ مجھے سچ مچ سمجھنے کی کوشش کریں تو۔" بھاری لہجے پر پریشے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ خوب صورت براؤن آنکھوں میں کتنے ہی جذبے جگمگا رہے تھے، وہ نظریں چرا گئی۔

"اس پگڈنڈی پر میں نے آپ کو کتنی بار دیکھا ہے دل نے کتنی مرتبہ مجبور کیا لیکن صرف آپ کی ایک جھلک سے ہی دلِ ناداں کو سمجھا لیتا۔ کبھی آپ سے بات کرنے یا آپ کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی کہ کہیں آپ کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اگر قسمت نے آپ سے بات کرنے کا موقع خود فراہم کردیا ہے تو بھلا اب بتائیں مجھے یہ موقع ضائع کرنا چاہیے؟" وہ بہت خوب صورت بولتا تھا۔ لفظ تھے یا موتی یا پھر اس کا انداز ایسا تھا۔ دھیما لہجہ، محبتوں سے چور، نرمی سے مخمور لہجہ وہ گم صم سی اسے سنتی رہی۔

"میں آپ کے لیے بھلے گلی کا ایک عام انسان ہوں روزانہ آپ کے پاس سے گزرنے والے دوسرے انسانوں کی طرح مگر پریشے میرے لیے آپ ایک ہو۔ جسے میرے دل نے دیکھا تو مچل اٹھا، میرے دل نے جس کی پہلی بار خواہش کی اور جسے نہ جانتے ہوئے بھی ہمیشہ سے اپنا مان لیا...... میں ایک باشعور پڑھا لکھا انسان ہوں۔ یوں کسی کی راہ میں ٹھہرنا نہ تو مجھے زیب دیتا ہے نہ میرا شیوہ ہے مگر دل کو جب عشق کے پر لگتے ہیں تو یہ قریہ قریہ اڑتا ہے پھر ہم اپنی مرضی سے نہیں بلکہ جہاں یہ چاہتا ہے ہمیں لے جاتا ہے۔ کیا غلط کیا صحیح ساری سمجھ بوجھ چھوڑ دیتے ہیں ہم۔ میں دعویٰ نہیں کرتا مگر اقرار کرتا ہوں مجھے آپ سے عشق ہے۔ محبت سے بھی کئی درجے اوپر کی محبت ہوگئی ہے مجھے آپ سے۔ ملنا نہ ملنا میری جستجو نہیں رہی، آپ کو دیکھا، اپنا سمجھا، اپنا محسوس کیا بس ساری تشنگی مٹ گئی۔" وہ بولتے، بولتے اس کے بالکل قریب آگیا تھا۔ تبھی بارش کی ننھی ننھی بوندیں گرنی شروع ہوئیں۔

"لگتا ہے موسمِ گل بے حد قریب ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو گم صم سی کھڑی پریشے کو جیسے اچانک ہوش آیا تھا۔ وہ جیسے دوڑتی ہوئی پگڈنڈی سے اتری تھی ویسے ہی واپس چلی گئی لیکن مہد علی خان دیر تک وہیں کھڑا بھیگتا رہا۔

☆☆☆

"آخر امی کو اتنی جلدی کیا ہے لالہ کی شادی کی۔ پریشے گھر میں ہے کہیں بھاگی تو نہیں جارہی۔" ثنا نے مونگ پھلی کھاتے ہوئے ندا سے کہا۔ ساتھ بیٹھی پریشے کتاب میں سر دیے گئی۔

"امی کہتی ہیں ثنا، لالہ کی جاب ہوگئی ہے پھر خود سوچو پریشے کے لیے اتنے اچھے، اچھے رشتے آرہے ہیں انہیں جواب دیتے دیتے بھی امی تنگ آگئی ہیں۔ جب ان کی شادی ہوجائے گی تو یہ باب بند ہوجائے گا۔" ندا نے کہا تو ثنا بھی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"لیکن پھر بھی ارتضیٰ بھائی مرد ہیں اور مرد کے ساتھ زبردستی تو نہیں کی جاسکتی ناں۔ یہ دوسری مرتبہ ہے ان کے گھر آتے ہی ابی، ابو اور امی سب ہی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ ارتضیٰ لالہ کا تو یہ بات سن کر ہی موڈ آف ہوجاتا ہے۔ ہمیں بھی پھر ان سے جی بھر کر بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔" ثنا اداس ہوئی۔

”امی کا تو تمہیں پتا ہے ناں پریشے سے کس قدر محبت کرتی ہیں وہ۔ اسے حویلی سے باہر نہیں جانے دیں گی پھر خود سوچو اس جیسی پیاری لڑکی بھلا ہمیں اور کہیں ملے گی۔“ اس نے ساتھ ہی بیٹھی پریشے کو ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ بات ارتضٰی لالہ کو کون سمجھائے۔“ ثنا کے لہجے میں کیا تھا پریشے نہ سمجھ سکی۔ ندا نے ثنا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔

”ارتضٰی نے کچھ کہا ہے کیا؟“ وہ بری طرح چونکی۔

”کچھ نہیں یار، اسے تو فضول بولنے کی عادت ہے۔“ ندا نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

”ارے میں تو بھول ہی گئی ارتضٰی لالہ نے کافی مانگی تھی۔“ ثنا کو اچانک خیال آیا۔

”پری پلیز تم بنا کرلے جاؤ۔ مجھے تو اب خوب ڈانٹیں گے لیٹ لانے پر۔“ اس نے فوراً پری کی منت کی۔ وہ فوراً اٹھ گئی۔

”ارتضٰی لالہ اسے کچھ کہہ نہ دیں، تم خود لے جاتیں۔“ ندا پریشان ہوئی۔

”وہ لالہ کی باتوں کو دل پر نہیں لیتی، ڈونٹ وری۔“ ثنا نے بے پروائی سے ہاتھ جھٹکا اور پریشے کی چھوڑی ہوئی کتاب اٹھا کر ورق الٹنے لگی، ندا سوچتی رہ گئی۔

☆☆☆

”یہ مہد علی خان تو اب مجھے روزانہ اسی درخت کے پاس کھڑا نظر آنے لگا ہے۔“ ایمان نے بریک کے وقت پریشے سے ملتے ہی کہا تو وہ مسکرا دی۔

”بڑی نظر رکھنے لگی ہو اس پر کہیں پسند تو نہیں آگیا؟“ پری نے سے چڑایا۔

”ایسا ویسا..... دل و جان سے پسند آگیا ہے اور اب ڈرو کیونکہ میرا ووٹ اب اس کے ساتھ ہے۔“ وہ صاف گوئی سے بولی تو پریشے سر جھٹک گئی۔

”اجڑی ہوئی بستیاں پھر نہیں بستیں ایمان۔“ اس نے اپنی خوب صورت نیلی آنکھیں اسکول کی چھوٹی سی دیوار کے اس پار نظر آنے والے خوب صورت باغ پر جماتے ہوئے کہا۔

”بعض اوقات اجڑی ہوئی بستیوں میں اتنی رونق ہو جاتی ہے کہ پرانے آثار کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔“ ایمان پُرامید تھی۔

”لیکن میرے لیے اب محبت کا لفظ اپنے معنی کھو چکا ہے ایمان۔ مجھے نہ تو محبت پر بھروسا ہے نہ کسی شخص پر۔“ اس کے لہجے میں نفرت تھی۔ ایمان جانتی تھی یہ نفرت کس کے لیے تھی۔

”صرف ارتضٰی سے کی گئی محبت..... تم اسے پوری کائنات کیوں جان بیٹھی ہو؟“ ایمان بری طرح چڑ گئی۔

”کیا مطلب...؟ بس میں ارتضٰی سے نفرت کرتی ہوں، سخت نفرت۔“

”اچھا تو پھر اس کی یاد کو اب تک سینے سے لگائے رکھنے کا مطلب؟“ اب ایمان کی آواز میں غصہ واضح تھا۔

”یہ اس کی یاد نہیں زخم ہیں، میری روح میرے دل پر لگے گھاؤ۔ جو مجھے آگے بڑھنے نہیں دیتے۔“ وہ بے بس ہوئی۔

”لیکن دنیا یہ نہیں سمجھتی، دنیا کو چھوڑو خود ارتضٰی جب واپس آئے گا تو تمہیں یوں اکیلا، بکھرا ہوا دیکھ کر یہی سمجھے گا کہ تم آج تک اس کی محبت میں تڑپ رہی ہو۔ وہ تمہیں پھر سے آپشن بنا لے گا کیونکہ اب تم سے بہتر آپشن شاید ہی کوئی اسے ملے۔“ ایمان کے لہجے کی تلخی محسوس کرکے پریشے کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

”تم میری دوست ہو، تف ہے تم پر۔“ پریشے نے رخ پھیرا۔

”تمہاری دوست ہوں تبھی تمہیں سمجھا رہی ہوں پری، مہد علی خان مجھے لگتا ہے خدا کی طرف سے تمہارے لیے بھیجا گیا خاص تحفہ ہے۔ تم خود سوچو تم

اب کوئی نوخیز لڑکی نہیں بلکہ بتیس سال کی ٹھیک ٹھاک میچور عمر میں ہو۔ تمہاری وجہ سے گھر کے سارے افراد پریشان ہیں اور تمہیں کیا لگتا ہے کہ سب نے ایسے ہی بلامقصد فوراً ارتضٰی خان کو معاف کر دیا۔“ پری نے حیرت سے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا۔

”سب یہی سمجھتے ہیں کہ تم ارتضٰی کی جگہ اور کسی کو نہیں دے سکتیں۔ تبھی ارتضٰی کے آنے کو سب نے کھلے دل سے فوراً تسلیم کیا صرف تمہاری خاطر۔ سب تم سے بہت محبت کرتے ہیں اور دیکھنا کہیں اس بار یہ محبت تمہارے لیے آزمائش نہ بن جائے۔ ثمرین آنٹی ضرور ارتضٰی کو تمہارے لیے منانے کی کوشش کریں گی اور ارتضٰی اوپر سے چاہے کتنا ہی اکڑے سوائے تمہیں اپنانے کے اب اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہ ہوگا اور تم...... تم پریشے مصطفیٰ تمہارے پاس کیا بچے گا۔ ارتضٰی کا احسان کہ اس نے تمہاری محبت کو شرفِ قبولیت بخشا اور تمہیں ساری عمر خود کو لگنے والی ہر چوٹ کے مجرم کو اپنا مسیحا سمجھنا ہوگا۔“ ایمان بولتی چلی گئی اور پریشے آگہی کے نئے در وا ہونے پر منہ کھولے سنتی رہ گئی۔

”اب بھی وقت ہے پری، سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں ارتضٰی کے لوٹنے سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا۔ مہد علی خان تم سے محبت کرتا ہے، بے لوث محبت۔ ارتضٰی خان نے تمہاری محبت کا مذاق اڑایا، وہ تم سے ساری عمر جتا رہا اور تمہیں اپنی محبت کے جھوٹے رنگ سے بے وقوف بھی بناتا رہا۔ منزل کون ہے اور سراب کون بہت واضح ہے اور منزل کی طرف جانے والا راستہ بھی صاف۔ پلیز سوچ لو پری اس سے پہلے کہ ایک مرتبہ پھر تمہارے ہاتھ میں سوائے پچھتاوؤں اور درد کے اور کچھ باقی نہ رہے۔“ ایمان نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے کہا تو وہ اس کے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ایمان نے اس کے سر سے اوپر دیکھتے ہوئے دیوار کے پار چیڑ کے درخت کے نیچے کھڑے مہد علی خان کی طرف ہاتھ بلند کرکے وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ ایمان نے دیکھا اس کی مسکراہٹ میں اداسی کا عنصر بے حد واضح تھا۔ اس نے مضبوطی سے پریشے کے گرد اپنے بازو باندھ دیے۔

☆☆☆

وہ کافی لے کر اندر آئی تو ارتضٰی کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے مگ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز پر وہ بری طرح چونکی اور پلٹ کر دیکھا۔ ارتضٰی بلیو جینز پہ بنیان پہنے دروازے کے سامنے ایستادہ تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں پریشے گھبرا گئی۔ اسے لگا جیسے دھڑکتا دل سینہ چیر کے ابھی باہر آجائے گا۔

”ارتضٰی۔“ اس کی آواز گلے میں ہی اٹک گئی۔ وہ دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتا اس کے پاس آگیا۔ اتنا پاس کہ اس کی گرم سانسیں پریشے کا چہرہ جلانے لگیں۔

”بہت شوق ہے تمہیں میرا ہونے کا، میرے قریب آنے کا۔“ ارتضٰی نے اتنا اچانک اسے جھٹکے سے خود سے لگایا تھا کہ وہ چوں چرا بھی نہ کرسکی۔ اسے سانس لینی دشوار ہونے لگی۔

”کردوں تمہارے سارے شوق پورے، ہاں بتاؤ؟“ سرخ آنکھوں کے ساتھ شرارے برساتی زبان اور لہجہ۔ یہ ارتضٰی تو نہ تھا۔ اس کی روح تک کانپ گئی۔ یہ ارتضٰی کا کون سا روپ تھا۔

”بتاؤ ناں، اب کیوں سانپ سونگھ گیا۔“ وہ چیخا تھا، پریشے کانپنے لگی۔

”پلیز ارتضٰی، چھوڑو مجھے۔“ وہ رو دی۔

”کیوں چھوڑ دوں، تم کیوں نہیں چھوڑ دیتیں ہماری جان، ہم سے ہماری ماں چھین لی، ماں کی ساری توجہ چھین لی پھر بھی تمہیں چین نہیں آیا۔ بڑے

ابّی کی محبت تمہاری، ابو کی محبت تمہاری، بہن بھائیوں کی محبت تمہاری...... پھر بھی تمہیں چین نہیں، ایک میں رہ گیا، تمہیں اس کی بھی محبت چاہیے۔ آج میرے خیال میں بہترین موقع ہے لٹا نہ دوں تم پر اپنی محبتیں...... کچھ تمہیں بھی تو پتا چلے محبتیں درد بھی دیتی ہیں۔'' اس نے بری طرح اس کے بازو دبوچ لیے۔ پریشے کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

''میں تم سے نفرت کرتا ہوں پریشے، شدید نفرت، یہ جو میں تمہارے آگے پیچھے پھرتا رہا اپنے ہر کام کے لیے تمہیں دیکھتا تھا تمہیں کیا لگا میں تمہارے اس حسن کا دیوانہ تھا۔ نہیں مس پریشے، میں صرف تمہاری توجہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم جس نے ہم سے ہمارے ماں باپ کی محبت بٹوری، اب میری محبت میں یوں پاگل ہو جاؤ کہ جب میں تمہیں ٹھکراؤں تو تم کرچی، کرچی ہو جاؤ۔'' اور پریشے کو لگا جیسے اس کے اندر کچھ چھن سے ٹوٹا تھا۔ اعتماد، اعتبار یا پھر سب سے قیمتی چیز دل اور اس کے نازک کانچ جیسے خواب۔

''تم بکھر جاؤ، تمہیں پھر کوئی محبت نہ سمیٹ سکے۔ اتنی نفرت کرتا ہوں میں تم سے۔'' وہ اس کے سینے سے لگی بے جان کھڑی تھی۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ سارے گھر کا دباؤ ڈال کر تم مجھے اپنانے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ ہرگز نہیں پریشے مصطفیٰ، تم ساری عمر میری دی گئی اس چوٹ کو یاد کر کے روؤ گی، تڑپو گی، تمہیں اس گھر میں ملا ہر سکھ بھول جائے گا۔ سوائے میرے دیے درد کے تم کچھ یاد نہیں رکھ پاؤ گی۔ میں تمہیں کسی خوشی کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے جھٹکے سے اسے چھوڑا تھا۔ وہ سیدھی بیڈ پر جا گری تھی۔ وہ بیڈ پر ہی پڑی شرٹ اٹھا کر پلٹا اس پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتا شرٹ پہنتا باہر نکل گیا۔ پریشے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

☆☆☆

مسلسل دو دن ہونے والی بارش نے موسم بے حد سرد کر دیا تھا۔ گھر پر اکیلے بیٹھے بوریت سی ہونے لگی تھی اس کے اسکول کی چھٹیاں تھیں اور یہ وقت بتانا اسے دوبھر ہو گیا تھا۔ اس نے سفید بڑی سی اونی شال میں خود کو اچھی طرح لپیٹا اور باہر نکل آئی۔

سارے گھر میں تائی کے ہاتھوں کے لذیذ پکوانوں کی خوشبو رقص کر رہی تھی۔ اس نے کچن میں جھانکا تائی امی کوئی پشتو کا نغمہ گنگنا رہی تھیں اور ساتھ، ساتھ پکوڑے بھی بنا رہی تھیں۔ جب سے ارتضیٰ نے اپنے آنے کی خبر دی تھی تائی امی نکھر سی گئی تھیں۔ ان کی شخصیت پر ایک دم سے طاری ہونے والی سنجیدگی اچانک ہی سے رفو چکر ہو گئی تھی۔ اسے اپنی مخلص تائی امی کا یہ اجلا نکھرا روپ بے حد اچھا لگا۔ وہ اندر چلی آئی۔

''میں مدد کروں تائی امی؟'' اس نے قریب آ کر پوچھا۔

تائی امی نے ایک گہری نظر سے اس کا سراپا دیکھا۔ چوڑی دار پاجے پر سبز کلیوں والا کرتا اور سفید اور سبز شال لیے وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ انہوں نے دل ہی دل میں اس کی نظر اتارتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

''ہمیشہ خوش رہو میری بچی.... تم بھلا کام کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہو۔ تم تو میری جان ہو، میرے گھر کی رانی، یہ لو پکوڑے کھاؤ اور بتاؤ کیسے بنے ہیں؟'' انہوں نے گرما گرم پکوڑے اس کے سامنے رکھے۔ وہ اطمینان سے وہیں کاؤنٹر پر ہی پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور ایک پکوڑا اٹھا لیا۔

''آپ کے پکوڑوں کی خوشبو سے پتا چل جاتا ہے کہ کیسے بنے ہیں۔'' اس نے کھلے دل سے تعریف کی۔

''تمہارے ابّی بھی یہی کہا کرتے تھے جب میری نئی، نئی شادی ہوئی تھی تو اکثر فرمائش کر کے بنواتے تھے اب تو جیسے انہیں زندگی میں کچھ بھاتا ہی

نہیں۔'' وہ اپنے سسر کا سوچ کر اداس ہو گئیں۔

''تمہارے بابا اور امی کی بے وقت موت نے انہیں توڑ کے رکھ دیا پھر رہی سہی کسر تمہارے ساتھ ارتضیٰ کے رویے اور زیادتی نے پوری کر دی۔'' انہوں نے اداسی سے کہا۔

''پلیز تائی امی، میں خوش ہوں بہت خوش۔ آپ سب یہ بات تسلیم کیوں نہیں کر لیتے۔'' وہ اٹھ کر ان کے قریب چلی آئی۔ تائی امی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''ماؤں کے دل بہت حساس ہوتے ہیں بیٹا۔ خصوصاً بیٹیوں کے معاملے میں...... تم کیا سمجھتی ہو تمہارے ایسے کہہ دینے سے میں مطمئن ہو جاؤں گی۔ بھول ہے تمہاری پری۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

''تمہارا یہ بکھرا، بکھرا تنہا، تنہا وجود دیکھتی ہوں تو اندر تک جل جاتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے تمہاری اس حالت کی ذمے دار صرف میں ہوں۔ نہ میں تمہارے کچے ذہن میں ارتضیٰ کے حوالے سے خوابوں کے بیج بوتی، نہ تم یوں اس کے ہجر کی سولی چڑھتیں۔'' تائی امی کی آنکھوں کے ساتھ ان کا لہجہ بھی بھیگنے لگا۔

''ارے نہیں تائی امی، یہ غلط سوچ رہی ہیں آپ۔ میں نے ارتضیٰ کی جدائی میں خود کو تنہا نہیں کیا بلکہ میرا اعتبار اٹھ گیا ہے اس دنیا سے۔ مجھے رشتوں کی ضرورت ہی نہیں رہی مزید۔'' اس نے اپنے تئیں ان کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

''تم ساری دنیا کو بے وقوف بنا سکتی ہو مگر مجھے نہیں۔'' انہوں نے محبت سے اس کا خوب صورت چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''ماں ہوں تمہاری، تمہاری ہر خواہش، ہر کسک سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم نہیں جانتی پریشے مگر میں نے اپنے بیٹے ارتضیٰ کو اتنا رب سے نہیں مانگا جتنا تمہارے لیے اس کے واپس آنے کی دعائیں کی ہیں اور مجھے لگتا ہے میرے رب نے میری دعائیں سن لی ہیں۔ میری بچی کے سارے غم اب بہت جلد دور ہو جائیں گے..... انشاء اللہ۔'' انہوں نے دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ پریشے گم سی کھڑی رہ گئی۔ اسے ایمان کی باتیں آج بالکل ٹھیک لگنے لگیں۔

''مجھے ہر چیز منظور ہے مگر ارتضیٰ خان.... سے دوبارہ جڑنا، ہرگز نہیں۔'' اس نے دل ہی دل میں جیسے خود کو باور کروایا تھا۔

☆☆☆

ارتضیٰ کے رویے نے نہ صرف اسے بری طرح ہرٹ کیا تھا بلکہ اس قدر گہری چوٹ دی تھی کہ وہ خود کو سنبھال نہ پائی تھی۔ وہ بری طرح اندر سے ٹوٹ چکی تھی اور اس بات سے یا تو صرف وہ خود واقف تھی یا پھر ارتضیٰ خان۔ سب اس کی کھوئی، کھوئی حالت سے پریشان تھے مگر اس نے کسی کو حقیقت بتانا پسند نہ کی تھی البتہ اس نے ارتضیٰ خان کے لیے ایک آسانی کر دی تھی۔ اس نے تائی امی سے ارتضیٰ سے شادی نہ کرنے کی بات کی تھی۔ تائی امی اس کی بات سن کر بالکل خاموش ہو گئی تھیں اور وہ یہی سمجھی تھی ہمیشہ کی طرح تائی امی نے اس کی بات رکھ لی تھی مگر اس کا اندازہ غلط تھا یہ اگلے دن ہی اسے پتا چل گیا جب وہ شام کے وقت تائی امی کو دودھ دینے ان کے کمرے میں جانے لگی تو ان کی غضب ناک آواز پر کمرے کے باہر ہی رک گئی۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں ارتضیٰ!''

''ہاں...... ہاں میں نے کہا ہے پریشے سے کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دے تو؟'' ارتضیٰ بھڑک اٹھا۔

''کیوں، کیوں کہا تم نے ایسا؟'' تائی امی مزید بپھریں۔

''کیونکہ آپ سب تو میری بات کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔'' ارتضیٰ تلخی سے بولا۔

''ہاں تو کیوں دیں اہمیت، کتنے اچھے رشتے آئے اس کے لیے۔ تمہارا نام لے کر ہی تو سب کو

جواب دیتے رہے اور اب تم ایسا کرو گے تو ہم سب کو کیا جواب دیں گے۔" تائی امی ہانپنے لگیں۔

"ہاں تو مجھ سے کب کسی نے پوچھا کہ تم کرو گے شادی یا ہم کسی اور کو ہاں کردیں۔ اگر پوچھتے تو میں یہی کہتا کہ باندھ دیں کسی اور کے ساتھ اسے، مجھے نہیں کرنی اس سادہ سی گھریلو ٹائپ لڑکی سے شادی۔" کتنی نفرت تھی اس کے لہجے میں۔

پریشے کا چہرہ بھیگنے لگا وہ بے آواز رونے لگی۔

"اوہ، تو تمہیں بیوی نہیں ماڈل گرل چاہیے، ہاں؟" تائی امی مزید غصہ ہوئیں۔ "ایک بات کان کھول کرسن لو ارتضٰی، شادی تو تمہاری پریشے سے ہی ہوگی جو چاہے کرلو۔" تائی امی نے آخری دھمکی دی۔

"لیکن کیوں، آخر یہ ضد کیوں کہ میں ہی کروں پریشے سے شادی؟" وہ جھنجلا گیا۔

"کیونکہ وہ بچپن سے تمہارے نام سے منسوب ہے اور پھر سب سے اہم کہ وہ ہم سب کو بے حد عزیز ہے۔" تائی امی بھی ہار ماننے والی نہیں تھی۔

"آپ سب کو عزیز ہے ناں...... تو رکھیں ساری عمر اپنے پاس۔ میں کیوں شادی کروں؟ مجھے وہ عزیز نہیں بلکہ نفرت کرتا ہوں میں اس سے شدید نفرت۔ ساری عمر وہ مجھ سے چھینتی آئی ہے۔ آپ کی محبت، امی کی توجہ، ابو کی شفقت سب میں اس نے مجھ سے شیئر لیا ہے۔"

"ارتضٰی۔" تائی امی تاسف سے سر ہلانے لگیں۔ "یہ سب تو ندا، ثنا اور احتشام نے بھی کیا ہے تو کیا تم کل انہیں بھی چھوڑ دو گے؟"

"وہ میرے سگے بہن بھائی ہیں، خون ہیں میرا۔" ارتضٰی نے سفاکیت کی ساری حدیں پار کرلی تھیں۔ پریشے چوکھٹ تھام گئی اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔

"پریشے بھی تمہارا ہی خون ہے۔ تمہارے مرحوم چچا کی نشانی۔" ثمرین بی بی نے اسے یاد دلانا چاہا۔

"بس اسی بات کا تو فائدہ اٹھاتی آئی ہے وہ ساری عمر لیکن اب بس امی، مزید نہیں...... میں نے کہا ناں مجھے پریشے کسی صورت اپنی شریک حیات کے طور پر منظور نہیں۔ اس جیسی بے وقوف، سادہ سی لڑکی کو کوئی بھی شخص آسانی سے قبول کرلے گا مگر ارتضٰی خان ہرگز نہیں، مر کر بھی نہیں۔" دوٹوک لہجے میں انکار کرکے وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا تو پریشے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ قہر آلود نظریں اس کے کانپتے وجود پر ڈالتا وہ تیزی سے اس کے پاس سے نکلتا چلا گیا تھا۔ پریشے دودھ کا گلاس بہ مشکل کچن میں رکھ کر اپنی ہچکیاں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے روکتی اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ ارتضٰی خان نے جو چوٹ اس دفعہ اسے لگائی تھی وہ اسے ہمیشہ یاد رہنے والی تھی۔

☆☆☆

کب کی چھٹی ہوچکی تھی اسکول کی مگر نہ جانے کیوں آج اس کا حویلی جانے کا دل ہی نہیں کررہا تھا۔ موسم بھی بے حد پیارا ہورہا تھا۔ گہرے بادلوں کے ساتھ ہلکی پھلکی ہوائیں ماحول میں عجیب سا سحر پیدا کررہی تھیں۔ وہ دیر تک یونہی دیار کے درخت کے نیچے ٹھہری اردگرد پھیلے خوب صورت ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ کر دل بہلاتی رہی مگر کب تک، کسی نہ کسی وقت تو اسے واپس حویلی جانا ہی تھا۔

"پرسوں ارتضٰی واپس آرہا ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے نیچے کی طرف جانے والی خوب صورت چھوٹی سی سنگی پگڈنڈی پر قدم دھرے۔ "اور گھر والوں کو لگتا ہے کہ وہ میرے لیے لوٹ رہا ہے۔ کیا گھر والے اس کے اس قدر ذلیل انکار کے بعد بھی مجھ سے توقع رکھ سکتے ہیں کہ میں ارتضٰی خان کی غلامی قبول کرلوں گی؟" اس نے نفرت سے سوچا۔

"ہاں، وہ ایسا سوچ بھی سکتے ہیں اگر تائی امی میری تنہائی، میری خاموشی کو ارتضٰی کے ہجر اور جدائی کا نتیجہ مان سکتی ہیں تو امی اور تایا ابو کے لیے کیا مشکل ہے۔ تائی امی نے ہمیشہ مجھے سگی اولاد کی طرح سمجھا اگر وہ مجھ سے ان سب باتوں کا قرض مانگ بیٹھیں تو کیا میں انکار کرسکوں گی؟" پریشانی سے اس کے سر میں درد ہونے لگا وہ یونہی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نرمی سے سر سہلانے لگی۔

"مجھے یہ سب نظر میں رکھنا ہوگا، ایمان ٹھیک کہتی ہے تائی امی پھر بھی ہیں تو ماں ناں' اس دفعہ بکھرا، اجڑا ان کا اپنا بیٹا بھی ہے تو کہیں وہ میرے سامنے جھولی نہ پھیلا دیں۔ نہیں...... نہیں مجھے اس سے پہلے ہی کچھ سوچنا ہوگا۔ مجھے پہلے سے ہی امی یا تایا ابو سے اس معاملے پر تفصیلی بات کرنا ہوگی اس سے پہلے کہ تائی امی میری یا اپنے بیٹے کی محبت میں کوئی بات سوچ لیں یا کوئی فیصلہ کرلیں۔ نہیں ارتضٰی خان، اس بار میں اپنی زندگی کا فیصلہ تمہارے ہاتھ سے ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے تلخی سے سوچتے ہوئے نچلا لب دانتوں تلے کچلا۔ تبھی شاید کوئی پتھر اس کے پاؤں تلے آیا تھا۔ وہ خود کو سنبھال نہیں پائی اور منہ کے بل گرنے لگی تبھی کسی کے مضبوط ہاتھ نے اسے گرنے سے بچایا تھا۔ اس نے سنبھلتے ہی دھڑکتے دل سے سامنے والے وجود کو دیکھا تھا اور خجل سی ہوگئی۔ مہد علی خان اس کے بے حد قریب کھڑا ویسی ہی شاندار مسکراہٹ سے اسے تھام رہا تھا۔ وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

"آئی ایم سوری، میں آج لیٹ ہوگیا لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی خود کو یہاں آنے سے روک نہ پایا لیکن آپ کو یہاں دیکھ کر سمجھ گیا کہ دل کیوں مچلا جارہا تھا۔ مجھے لگا آپ گرنے لگی ہیں تبھی......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ گیا۔ پریشے حیا سے سرخ پڑگئی۔ مہد علی نے یہ خوب صورت منظر آنکھوں سے دل میں قید کیا۔

"ہاں، وہ میرا پیر غلط پڑ گیا تھا شاید پتھر تھا کوئی۔" وہ بارِ حیا سے پلکیں نہیں اٹھا پارہی تھی۔

"میں ہمیشہ زندگی کی ہر راہ پر آپ کو سنبھالنے، سہارا دینے کے لیے تیار ملوں گا۔" مہد علی خان ایک جذب سے بولا تو پریشے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"نہیں، میرا خیال ہے اب مجھے خود کو سنبھالنا آگیا ہے۔ ویسے بھی اب مجھ میں مزید ٹھوکر کھانے کی ہمت نہیں رہی۔" اس کا لہجہ ایک دم اسے کرچی، کرچی سا محسوس ہوا تھا۔

"آپ سے ایک بات کہوں؟" پریشے کو چپ چاپ سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے دیکھ کر وہ بھی دھیرے سے اس کے پیچھے اسی پگڈنڈی پر ہولیا۔

"کہیں۔" وہ مختصر بولی۔

"آپ صرف ٹھوکر کے ڈر سے یوں سنبھل، سنبھل کر چلنا چھوڑ دیں۔ زندگی بہت خوب صورت ہے اور ٹھوکر اس خوب صورتی کا اصل مزہ حاصل کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔" اس کی آواز میں کچھ تو تھا کہ پریشے کے قدم تھمنے لگے۔

"صرف ایک یا دو بار ٹھوکر لگنے کے بعد ٹھوکر کے ڈر سے یا تو مزید سفر کرنا ہی چھوڑ دینا یا پھر کانپتے، لرزتے سفر جاری رکھنا زندگی کے سفر کی ساری چاشنی ختم کردیتا ہے۔ میرے خیال میں یہ مایوسی ہے، اللہ کی ذات پر بھروسا ہو تو سب کچھ اسی پر چھوڑ دینا چاہیے اور میرا یقین کریں زندگی کے بارے میں بہترین فیصلہ قدرت کا ہی ہوتا ہے۔ ہم نادان کہاں کچھ کرنے سمجھنے کے لائق ہیں۔" اسے رکتا دیکھ کر وہ اس کے سامنے آ ٹھہرا تھا۔ پریشے چپ چاپ خوب صورت آنکھیں اس کے صبیح چہرے پر جمائے اسے دیکھتی رہی۔

"آپ بولتی بہت کم ہیں مگر تھینکس گاڈ دیکھتی تو ہیں۔" وہ شریر ہوا، پریشے جھینپ گئی اور رخ دوسری طرف موڑ لیا مہد علی خان دل سے مسکرادیا۔

"بارش شروع ہونے والی ہے اگر اعتبار ہو تو میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دوں؟" وہ شاید ابھی تک اس کی ٹھوکر والی بات پر اٹکا تھا۔ پریشے نے

اس کے انداز میں طنز محسوس کرنا چاہا مگر وہاں اسے سوائے پیار اور خلوص کے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلا گئی۔

''تھینکس گاڈ۔'' مہد علی خان نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو پریشے بھی مسکرا دی۔ چند ہی پل میں وہ اس کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر اس کے ہمراہ حویلی کی طرف رواں تھی۔

''ویسے پتا ہے پری، میں نے سنا تھا کہ ایبٹ آباد میں پریاں بستی ہیں مگر میں نے کبھی یقین نہ کیا۔'' وہ اچانک بولا وہ اس کے طرزِ تخاطب پر خاموش رہی۔ ''میری دادی مجھے اکثر بتایا کرتی تھیں مگر مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا مگر اب......'' وہ خاموش ہوا۔ پریشے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ مہد سے وہ سب سننا چاہتی تھی جو وہ کہنے جا رہا تھا۔ اپنی کیفیت پہ وہ خود بھی حیران تھی۔

''مگر جب یہاں آیا، تمہیں دیکھا تو مجھے دادی کی بات پر یقین ہو گیا۔'' بالآخر وہ بول پڑا۔ پریشے کھلکھلا کر ہنس دی۔ بہتے آبشار کے شور جیسی گنگناتی ہنسی۔ مہد علی خان نے ایک گہری نگاہ اپنے ہم سفر پر ڈالی۔

''آئی ایم سیریس۔'' وہ خفا ہوا۔

''اچھا پلیز، یہ دائیں طرف جا کر روک دیں۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔'' پریشے نے فوراً سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں پری واقعی بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں مزید صبر نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں آپ سے دو ٹوک فیصلہ سننا چاہتا ہوں!'' اس نے فوراً اس کی بتائی جگہ پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

''کک...... کیا مطلب؟'' پریشے کو شاید اس سے ان الفاظ کی امید نہ تھی۔

''کیا مجھے اب بھی وضاحت کی ضرورت ہے پریشے؟'' اس کی خوب صورت سنہری آنکھیں ایک دم سے اداس ہونے لگیں۔ نہ جانے کیوں پریشے کو برا لگا مگر وہ خود پر ضبط کر گئی۔

''آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے مہد۔ زندگی بس ایک نظر کے فیصلے پر کہاں چلتی ہے۔'' وہی کرچی، کرچی لہجہ۔

''کبھی، کبھی ایک نظر ہی ساری زندگی پر حاوی ہو جاتی ہے پری اور میں اقرار کرتا ہوں کہ تمہیں دیکھتے ہی میری زندگی بلکہ میں خود بدل گیا۔ اپنی پینتیس سالہ زندگی میں کبھی محبت کا ننھا سا پودا جس دل میں نہ اگ سکا تمہیں دیکھتے ہی اس دل میں عشق جیسا مضبوط درخت جڑ پکڑ گیا۔ میں ایسا تو نہ تھا کہ بس کسی کی ایک جھلک کے لیے یوں دیوانوں کی طرح اس چھوٹی سی پگڈنڈی پر چلا آتا۔ یہ صرف تمہاری محبت کا اعجاز ہے پری اور مجھے اس پر کوئی شرمندگی بھی نہیں۔'' اس کا لہجہ کتنا صاف اور سچائی سے پُر تھا۔ پری کو لگا اسے آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لینا چاہیے مگر وہ اس پچھلے تجربے کا کیا کرتی جو ہر قدم پر ہی دل ہولا کر رکھ دیتا۔

''لیکن میرے لیے یہ اتنا آسان نہیں۔ میرے دل میں سوائے درد اور کرچیوں کے کچھ نہیں ہے مہد علی خان یوں نہ ہو کہ تم اپنا آپ ہی زخمی کر بیٹھو۔'' زخمی لہجے میں کہتی وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ مہد علی خان کی پُرسوچ نگاہوں نے لکڑی کے بڑے سے پھاٹک تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

''انجام جو بھی ہو پریشے مصطفیٰ! مجھے سفر تمہارے ساتھ ہی طے کرنا ہے۔ یہ طے ہوا رستہ چاہے پُرخار ہو یا پھولوں سے سجی راہ گزر۔'' خود سے عہد کرتے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

☆☆☆

سب کے لاکھ اصرار کے باوجود ارتضیٰ خان نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا تھا۔ ابی، تایا ابو، تائی امی حتیٰ کہ

سب بہن بھائی اسے محبتوں کے واسطے دے، دے کر تھک گئے تھے مگر ارتضیٰ خان کے دل میں کسی کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ نکل سکی۔

پریشے تو اس قدر ٹوٹ چکی تھی کہ اسے کیا ہو رہا ہے، سب کیا کر رہے ہیں اسے نہ تو کچھ خبر تھی نہ ہی کسی بات سے کوئی سروکار۔ اسے تو عجیب سی چپ لگ گئی تھی۔ اس کی اس بکھری حالت نے گھر کے بڑوں کے ساتھ، ساتھ ندا اور رشا کو بھی ملول کر دیا تھا۔ ابی اور تایا ابو کے تو غصے کی حد نہ رہی تھی۔

''ایک بات کان کھول کر سن لو ارتضیٰ خان اگر تمہیں پریشے جیسی نیک اور شریف لڑکی کا رشتہ منظور نہیں تو یاد رکھو اس حویلی سے بھی تمہارا کوئی رشتہ نہیں رہے گا۔'' تایا ابو کی گرج دار آواز پر ارتضیٰ نے ایک نظر ماں کی طرف دیکھا تھا جنہوں نے فوراً خفگی سے منہ پھیر لیا تھا۔ ارتضیٰ کے دل میں پریشے کی نفرت مزید بھڑک اٹھی۔

''میں اپنی زندگی خود گزارنا چاہتا ہوں ابو، آخر اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے مجھ پر دباؤ کیوں؟'' وہ بے بس ہوا تھا۔ تائی امی کی آنکھوں میں یک لخت امید چمکی تھی۔

''وہ بچپن سے تمہاری منگیتر ہے اور تم جانتے ہو اس معاملے میں ہماری روایات کس قدر سخت ہیں۔'' تایا ابو سختی سے بولے۔

''ہاں...... تو فیصلہ آپ لوگوں نے ہی لیا تھا تب بھی اور اب بھی۔ نہ مجھ سے اس وقت پوچھا گیا تو نہ اب پوچھنے کی زحمت کی جا رہی ہے۔ میں آپ سب کو کلیئر کر چکا ہوں کہ میں پریشے کی شکل دیکھنے تک کا روادار نہیں اور پھر ساری زندگی ایک ان چاہا بوجھ اپنے کاندھوں پر لیے پھرتا رہوں۔ یہ کم از کم مجھ سے نہیں ہو گا۔'' ارتضیٰ نے بدلحاظی کی ساری حدیں پھلانگ لی تھیں۔

''ارتضیٰ۔'' تایا ابو غصے سے اس پر ہاتھ اٹھا گئے۔ مارے ضبط کے ارتضیٰ کا وجود کانپنے لگا۔ تائی جی، ابی سب جیسے بت بنے رہ گئے۔ مرتضیٰ غصے میں جوان بیٹے پر ہاتھ اٹھا لیں گے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

''میں نے پرسوں کی ٹکٹ کنفرم کروا لی ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے یہ ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میری بلا سے پریشے جیے یا مرے۔ مجھے اس کا ساتھ مر کر بھی قبول نہیں۔ آپ سب لوگ سنبھال کر رکھیں اس سپنی کو۔'' اس کی زبان زہر اگل رہی تھی سیڑھیوں پر ٹھہری پریشے سسک اٹھی۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا ارتضیٰ۔'' مرتضیٰ غصے سے کانپنے لگے تھے۔ ابی اور احتشام نے فوراً انہیں سنبھال لیا۔

''دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے اور مجھے کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔ تمہارے لیے نہ تو ہمارے گھر میں جگہ ہے نہ ہمارے دل میں۔'' تایا ابو نے نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر چیختے ہوئے کہا۔ وہ غصے سے پیر پٹختا اس وقت اپنی جیپ لے کر حویلی سے باہر نکل گیا۔ سبھی افراد سینہ مسلتے مرتضیٰ خان کی طرف بھاگے تھے جو بے حال ہو کر صوفے پر ڈھے سے گئے تھے۔

☆☆☆

اگلے چند ماہ میں ایک جاننے والے سے انہیں پتا چل گیا تھا کہ ارتضیٰ خان نہ صرف ملک سے باہر سیٹل ہو گیا ہے بلکہ وہیں کی ایک امیر کبیر عورت سے شادی بھی رچا لی ہے۔ وہ ارتضیٰ خان، جس نے اس کی ہستی کے وقار کو پاؤں تلے روند ڈالا تھا خود آباد ہو گیا تھا مگر پریشے مصطفیٰ کی دوبارہ سے دل کی دنیا نہ بسا سکی۔ ابی، تائی امی، تایا ابو سبھی نے اس کو بارہا منانے کی کوشش کی مگر دل کی سرزمین پر بکھری پہلی محبت کی کرچیاں اس قدر جلن دیتیں کہ وہ چاہ کر بھی زندگی میں آگے نہ بڑھ سکی۔ بس ارتضیٰ خان کے

لگائے زخموں سے چور وجود لیے وہ تنہائی کے خول میں سمٹ گئی۔ محبت اور اعتبار کے جذبوں سے کچھ یوں اس کا اعتبار اٹھا کہ وہ دوبارہ سے محبت کو سوچ بھی نہ سکی اور اب اتنے سالوں بعد جب زخم مندمل ہونے لگے تو وہ دوبارہ سے اس کی زندگی میں لوٹ رہا تھا۔ زندگی بھی بار بار امتحان نہ لے تو جیسے اس کی مدت پوری نہیں ہوتی۔ پریشے کی زندگی بھی ایک بار پھر اس پر تنگ ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

''ابی۔'' اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی اور دھیرے سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی آرام دہ کرسی پر تقریباً لیٹے ابی اس کا چہرہ دیکھتے ہی مسکرا دیے۔

''پری بیٹا، آؤ ناں وہاں کیوں کھڑی ہو؟'' انہوں نے فوراً اپنا دایاں ہاتھ پھیلایا، وہ دوڑ کر ان کے پیروں میں جا بیٹھی۔

''کیا بات ہے پری، اداس ہو؟'' انہوں نے چپ چاپ سی پری کو دیکھتے ہی اس کے دل کی حالت بھانپ لی تبھی فوراً پوچھ بیٹھے۔

''نہیں ابی، آپ سب کے ہوتے ہوئے بھلا میں اداس کیسے ہو سکتی ہوں؟'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''دیٹس لائک مائی بریو گرل۔'' انہوں نے محبت سے اس کا سر تھپتھپایا۔ ''لیکن پھر بھی مجھے کیوں لگ رہا ہے جیسے میری گڑیا پریشان ہے۔'' انہوں نے محبت سے پوچھا تو پریشے کی آنکھیں بھر آئیں وہ فوراً سر جھکا گئی۔

''ارتضٰی کے واپس آنے سے پریشان ہو؟'' ابی کی بات پر وہ چونکی کتنے سمجھدار تھے ابی۔ اسے حیرت ہوئی۔ ''بولو بیٹا کیا میرا انداز درست ہے؟'' انہوں نے دوبارہ پوچھا تو وہ چپکے سے سر ہلا گئی۔

''ایک بات یاد رکھنا پری، ہم سب چاہے کھلے دل سے ارتضٰی کو معاف بھی کر دیں مگر اس کی خلاصی صرف تبھی ہوگی جب تم اسے معاف کرو گی۔ ورنہ وہ ہماری نظروں میں اب صرف تمہارے مجرم کے علاوہ کچھ نہیں۔ تمہیں اس کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ یہ حویلی پہلے تمہاری ہے پھر ارتضٰی خان کی۔'' وہ کچھ توقف کرتے ہوئے بولے۔

''اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہے بیٹا کہ ہم میں سے کوئی بھی تمہاری ذات کے حوالے سے تمہاری مرضی کے خلاف یا تمہیں اپنی محبت سے مجبور کر کے کوئی فیصلہ کرے گا تو یہ خدشہ اپنے دل سے نکال دو بیٹا۔ ہم پہلے ہی تمہاری ذات کے حوالے سے کچھ بے وقوفیاں کر چکے ہیں۔ اب نہیں، ہرگز نہیں۔ اس بار جو تم چاہو گی صرف وہی ہوگا۔ میں تمہیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں۔'' ابی نے اپنا جھریوں سے بھرا کمزور سا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا تو پریشے نے نم آنکھیں ان کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

''اور میں بھی تمہارے ساتھ ہوں بیٹی۔'' تائی امی نہ جانے کب وہاں آ گئی تھیں اپنے سر پر ان کا شفقت بھرا لمس محسوس کر کے پری کے اندر تک طمانیت بھر گئی۔

''تم مجھے ہمیشہ اپنی سگی اولاد سے بھی زیادہ عزیز تھیں پری اور عزیز ہو۔ تمہارے جیسی اولاد تو اللہ ہر مسلمان کو دے۔'' تائی امی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے کہا تو وہ طمانیت سے آنکھیں موند گئی اندر ہی اندر کہیں سر اٹھاتے اندیشے دم توڑنے لگے۔

☆☆☆

وہ اکیلا نہیں آیا تھا اس کا پانچ سالہ خوب صورت سا گول مٹول بیٹا اسفند یار بھی اس کے ساتھ تھا۔ نیلی آنکھوں والا وہ سفید رنگت والا بچہ بے حد ذہین لگ رہا تھا۔ اس کے خوب صورت گلابی ہونٹوں پر بہت پیاری شریری مسکان چپکی ہوئی تھی۔ ندا، ثنا بھی اپنے بچوں کے ہمراہ آئی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی تک خود کو کمرے میں بند کیے بیٹھی تھی۔ کسی نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔ اس کی ذہنی ابتری سے سبھی واقف تھے۔ کوئی بھی اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اب تو وہ آ چکا ہے اسے بھی اسی گھر میں رہنا ہے تو میں کیا اس سے چھپتی پھروں گی۔ وہ گناہ گار ہے وہ ظالم ہے اور میرے خوابوں کا قاتل ہے تو منہ میں کیوں چھپاؤں۔ اس طرح تو وہ مجھے کمزور سمجھے گا پھر میرے جذبات سے کھیلنے کی جرأت پکڑے گا۔ نہیں...... مجھے ارتضٰی خان کو دکھانا ہوگا کہ میں وہ سادہ جذبوں سے گندھی، محبت کے نام پر مر مٹنے والی پریشے مصطفیٰ نہیں رہی۔ میں اب کبھی مسخر نہ ہونے والی چوٹی بن چکی ہوں۔ اس کی دسترس اور سوچ سے بہت دور۔'' اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سوچا اور خود کو غور سے دیکھنے لگی۔ ہلکے گلابی کلر کے کرتے پاجامے میں وہ اپنی عمر سے کئی سال چھوٹی لگ رہی تھی۔ لمبے بال ہمیشہ کی طرح کیچر میں قید کر رکھے تھے۔ چہرے پر آج بھی وہ بلا کی معصومیت تھی جو کبھی ارتضٰی خان کو زہر لگنے لگی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر خود کو ہلکا پھلکا کیا اور سلیقے سے سر پر بڑا سا دوپٹا لیتی نیچے چلی آئی۔ ننھا اسفند یار سب سے تعارف لے رہا تھا۔ پریشے نے دیکھا سبھی ارتضٰی کو پاس دیکھ کر اور اسفند یار کی معصوم باتوں پر کھلے جا رہے تھے۔ وہ آخری سیڑھی پر تھی جب سب کی نظریں اس کی طرف اٹھیں اسفند یار فوراً اس کی طرف آیا۔

''یہ کون ہیں؟'' اس نے معصومیت سے اس کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے خوب صورت اردو میں سوال کیا تھا۔ تبھی نفوس کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ پریشے اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''میں پریشے، آپ کی بڑی پھپھو۔'' اس نے جلدی سے ارتضٰی سے جڑے اس بچے کو اپنی پسند کا رشتہ بتا دیا اور اسے اطمینان بھی تھا۔ ابی، تایا ابو اور

تائی امی محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ تبھی اس کی نگاہ ارتضٰی پر پڑی تھی۔ وہ اسے ہی یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیا تھا پریشے سمجھ نہ سکی۔

''کیسی ہو پری؟'' ارتضٰی نے براہِ راست اسے ہی مخاطب کیا تھا۔

''اوہ تو آپ فیری ہیں۔'' ننھے اسفندیار نے باپ کی بات پکڑتے ہوئے کہا تو سبھی ہنس دیے۔

''نہیں...... میں عام انسان ہوں آپ کی طرح۔'' اس نے محبت سے اس کی چھوٹی سی ناک پکڑی، وہ ہنس دیا۔

''جی، میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں کیا حال چال ہیں؟'' پورے اعتماد سے وہ اٹھ کر ابی کے ساتھ والی سیٹ پر آبیٹھی۔ اس نے یوں ارتضٰی سے حال پوچھا جیسے ان دونوں کی کافی پرانی دوستی چلی آرہی ہو۔ ارتضٰی کی آنکھوں میں اس کے اس قدر پُراعتماد لہجے پر ایک پل کے لیے حیرانی سی ابھری۔

''حال چال تو کب کا بگاڑ بیٹھے اپنی نادانیوں کے ہاتھوں۔'' ارتضٰی کے لہجے میں زمانے بھر کی تھکن تھی۔

''بھول جاؤ پرانی باتیں بیٹا۔ ویسے بھی انسان وہی بہادر ہوتا ہے جو اپنی غلطیوں سے سبق سیکھے اور ان کی روشنی میں اپنے حال کو سنوارنے پر توجہ دے۔ بجائے اپنی ماضی کی غلطیوں پر روتے رہنے کے۔'' ابی نے بید کی چھڑی ہاتھوں میں گھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں ابی، ماضی ہی تو بھلا دینا چاہتا ہوں تبھی تو یہاں واپس آیا ہوں۔'' اس نے ایک گہری نگاہ پری پر ڈالتے ہوئے کہا تو پری بے اختیار نظریں پھیر گئی۔

''مجھے ذرا کچھ ٹیسٹ چیک کرنے ہیں بچوں کے صبح تک رزلٹ بھی جمع کروانا ہے۔'' وہ بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔ کمرے تک آتے، آتے وہ نڈھال ہو چکی تھی۔ بعض اوقات خود کو نارمل ظاہر کرنا کس قدر کٹھن ہوتا ہے۔ اسے یہ بات آج پتا چلی تھی۔

☆☆☆

''آپ؟'' وہ آج سردرد کی وجہ سے جلدی اسکول سے نکل آئی تھی۔ ارتضٰی کے آنے پر خود کو نارمل رکھتے، رکھتے وہ جیسے مزید بکھرنے لگی۔ نہ جانے کیوں وہ جتنا خود کو مضبوط بناتی، ارتضٰی سے سامنا ہوتے ہی سارے زخم جیسے خود بخود اُدھڑنا شروع ہو جاتے پھر وہی درد، وہی کسک اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ رات بھی وہ صحیح طرح سے سو نہ پائی تھی۔ سو اب صبح سے سر میں درد کی شدید لہروں نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ نڈھال سی اسکول سے باہر نکلی تو پگڈنڈی کے ساتھ ہی پڑے بڑے سے پتھر پر مہد علی خان کو بیٹھا دیکھ کر چونک پڑی۔

''جی بس بھانجے کو دیکھنے آیا تھا۔'' اس نے بہانہ تراشا۔ وہ مسکرا دی۔

''لگتا ہے بہت پیار ہے آپ کو اپنے بھانجے سے۔'' وہ شریر ہوئی نہ جانے کیوں مہد علی خان سے بات کرنا اب اسے اچھا لگنے لگا تھا۔

''ماں باپ کے بعد بہن نے مجھے پالا پوسا اور آج تک مجھے اکیلا نہیں چھوڑا پھر میں ہوں ہی ایسا جس سے پیار کرتا ہوں اس کی اتنی ہی کیئر کرتا ہوں۔'' وہی بھاری سحر انگیز لہجہ۔

''بہت اچھی بات ہے۔'' وہ ایک دم سے ہی ہلکی پھلکی ہو گئی تبھی مسکرا کر کہتے ہوئے نیچے اترنے لگی۔ مہد علی خان تیزی سے اس کے ہم قدم ہوا تھا۔

''آپ جانتی ہیں پری، میں پچھلے ایک سال سے یہاں کیوں آتا ہوں؟'' اس کے لہجے میں عجیب سی بے بسی تھی۔ پریشے کو دکھ بھی ہوا مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔

''میں آپ کی مستقل مزاجی کی قدردان ہو گئی ہوں۔'' وہ تعریفی لہجے میں بولی تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

''مستقل مزاجی نہیں عشق کہیے۔'' مسکراتا لہجہ، پریشے کے اندر کوئی ٹھنڈک سی اتارنے لگا۔

''عشق کسی کام کا نہیں چھوڑتا مہد علی خان۔'' وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

''اب اس اطلاع کا کیا فائدہ...... میں تو کب کا ہر کام سے نکل چکا۔'' مہد نے ہاتھ جھاڑے۔

''جی نہیں، اب بھی وقت ہے پلٹ جائیں۔'' اس نے اچانک رک کر مہد کی طرف پورا مڑتے ہوئے کہا وہ بھی فوراً رک گیا۔

''پلٹنے کا تو کوئی چانس ہی نہیں ہے پری۔ اب اگر ہوگا کچھ تو وہ آپ کا بڑھنا ہوگا میری طرف اور مجھے نہ صرف اپنی محبت کی سچائی پر یقین ہے بلکہ اپنے خدا پر بھی پورا بھروسا ہے۔'' اس نے پُریقین لہجے میں کہا اس کے اس قدر اطمینان پر پریشے کو رشک سا ہوا۔

''اے پری۔'' تبھی اوپر اسکول کے گیٹ سے ایمان چیخی تھی۔ ان دونوں نے اوپر دیکھا۔ وہ تیزی سے نیچے اترتی ان کے قریب چلی آئی۔ ''یہ تم نے مجھے کب سے پیچھے چھوڑنا شروع کر دیا؟'' اس نے مہد علی خان کی طرف دیکھتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا تو مہد کھل کر مسکرا دیا جبکہ پریشے اس کے انداز پر گڑبڑا گئی۔

''او بھائی، مجھ سے میری دوست مت چھین لینا۔ یہی ایک ہی پیس ملا ہے مجھے ساری دنیا میں۔'' ایمان نے مہد کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے معصوم لہجے میں کہا تو پریشے اس کے اس انداز پر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ویسے سچ بولوں سسٹر، تو مجھے بھی یہی ایک پری ہی اچھی لگی ہے سو میرا ابھی پیچھے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہیں۔'' مہد نے کہتے ہوئے اسے ہری جھنڈی دکھائی۔

''سوری ایمان، میری طبیعت خراب تھی سو جلدی نکل آئی مہد تو مجھے اتفاقاً ہی راستے میں مل گئے۔'' پریشے نے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے بات بنائی۔

''ہائے اللہ ایسا کوئی خوب صورت اتفاق ہمارے ساتھ بھی ہو جائے۔'' اس نے آہ بھرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔

''شرم کرو، اتنے پیارے تو ہیں زبیر بھائی۔'' پریشے نے اس کے منگیتر کا نام لیتے ہوئے کہا۔

''وہی اتفاقاً یہاں آجائیں۔ میں کون سا کسی دوسرے کی دعا کر رہی ہوں۔'' ایمان نے چڑے ہوئے لہجے میں کہا تو اس بار پریشے کی طرح مہد بھی قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ وہ تقریباً پگڈنڈی کراس کر چکے تھے اور سڑک کے قریب ہی تھے تبھی ایک سفید جیپ ان کے قریب آکر رکی تھی۔ پریشے کے ڈھیلے ڈھالے اعصاب ایک دم ہی تن گئے تھے۔ وہ کوئی اور نہیں ارتضٰی خان تھا۔ اسے ارتضٰی کی نظروں میں مہد کو دیکھ کر عجیب سا تاثر محسوس ہوا تھا۔

''پری، آؤ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' اس نے وہیں سے پری کو آواز دی تھی یونہی پریشے کی نظر مہد پر پڑی تھی۔ اس نے مہد علی کی آنکھوں کے دیے ایک دم ماند پڑتے محسوس کیے تھے۔

''یہ...... یہ کب آیا؟'' ایمان کے منہ سے حیرت کے مارے پھسلا۔

''میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں پری۔'' اس بار اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ پری کو نہ جانے کیا ہوا چپ چاپ جا کر جیپ میں بیٹھ گئی۔ ارتضٰی نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''یہ......'' مہد علی کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

''ہاں یہی ہے اس کا نام نہاد منگیتر...... جس نے پریشے کے اتنے قیمتی سال ضائع کر دیے۔ نہ جانے اب کیوں لوٹ آئی ہے یہ مصیبت اور پریشے...... کل آنے دو اس سے میں پوچھتی ہوں اس کے حکم پر کیسے اس کے ساتھ اس طرح بیٹھ سکتی ہے وہ۔'' وہ بہت غصہ تھی۔

''پریشے بہت الگ ہے۔ ارتضٰی سے صرف اس کی نفرت اور درد نہیں بلکہ کتنے ہی اپنوں کی محبتیں

جڑی ہیں۔ وہ بے حد حساس لڑکی ہے۔ بس دعا کرو اس بار وہ کوئی غلط فیصلہ نہ کرے۔" مہد نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو ایمان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اونچا، لمبا کسرتی جسم کا مالک وہ خوبرو انسان جس قدر باہر سے سحرانگیز شخصیت کا مالک تھا اس کا اندر بھی اسی قدر پیارا تھا۔ ایمان نے دل ہی دل میں اس کے اور پریشے کے لیے ساتھ کی دعا کی تھی۔

"اللہ کرے اس دفعہ تو شکست ارتضٰی خان کا ہی مقدر ہو کچھ تو حساب برابر ہو۔" وہ بڑبڑائی، مہد علی اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑا رہا۔

☆☆☆

آج کافی دنوں بعد اچھی دھوپ نکلی تو وہ بھی علامہ اقبال کی بانگِ درا اٹھائے چھت پر چلی آئی۔ ایک طرف تار پر دھلے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے اس نے دیوار کے قریب ہی کرسی کھینچی اور بیٹھ کر محویت سے کتاب پڑھنے لگی۔ اچانک ہی اسے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ارتضٰی قریب ہی رکھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ نظریں البتہ اسی کا احاطہ کیے ہوئی تھیں۔

"آپ......" وہ حیران تھی۔

"تم تو مجھ سے چھپتی پھرتی ہو، میں نے سوچا خود ہی تمہیں ڈھونڈ لوں۔" اس کے لہجے میں کچھ تو تھا مگر پریشے کچھ بھی اخذ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے اب نہ تو ارتضٰی خان کی ذات میں کوئی دلچسپی باقی رہی تھی نہ ہی اس کی باتوں میں۔

"بعض اوقات ہم اپنے ہاتھوں سے کچھ کھو دیتے ہیں اور پھر ڈھونڈتے ہی رہتے ہیں۔" اس نے خود میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے ارتضٰی پر چوٹ کی اور واقعی وہ حیران ہوا تھا۔

"لگن سچی ہو تو گم شدہ مل بھی جاتے ہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا پریشے نے اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔ وہ کسی طور اس کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

"کبھی کبھی ہی ایسا ہوتا ہوگا ارتضٰی خان ورنہ اکثر تو کھونے والوں کی دھول بھی ہاتھ نہیں آتی۔" اس نے بہت گہری بات کی تھی۔

"لیکن میرا... معاملہ تو بالکل الٹ ہے۔ میری منزل تو آج بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ صرف میں راستہ بھٹک گیا تھا کھو تو میں گیا تھا اور دھول سمیت اپنی منزل کے بے حد قریب موجود بھی ہوں۔" وہ کتنے یقین سے بولا تھا اور پریشے، چپ سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ وہ کتنا سفاک تھا۔ اسے آج بھی پریشے سے کی ناانصافی کا افسوس نہ تھا۔ وہ آج بھی اسے ویسی ہی بے وقوف لڑکی سمجھتا تھا جو اس کی محبت کا دم بھرتی، اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی۔ کیا وہ آج بھی اسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا؟

"میں جانتا ہوں پری تم آج بھی میرے انتظار میں بیٹھی ہو۔ ہماری روایات ہیں ہی ایسی کہ ایک دفعہ منگنی ہو جائے کسی سے نام جڑ جائے تو مر کر ہی ساتھ چھوٹتا ہے اور تم تو تھی ہی وفا کا پتلا، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں پریشے؟ میں نے تمہیں ٹھکرا کر خود بھی کچھ نہیں پایا۔ اسفند یار کی ماں نے مجھے بے شک باہر رہنے کا حق تو دے دیا مگر مجھے نوکر کی طرح ٹریٹ کرتی رہی اور پھر اسفند یار کو بھی میری سپردگی میں سونپ کر خود کسی اور کے ساتھ چلی گئی۔ مجھے ٹھکرا کر...... ارتضٰی خان کو ٹھکرا کر تبھی میں پھر سے تمہارے لیے لوٹ آیا ہوں۔ مجھے جب ثنا نے بتایا کہ تم آج بھی میرا انتظار کر رہی ہو، میرے نام پہ بیٹھی ہو تو میں نے فوراً واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ بولو پریشے کیا میں امی سے بات کروں؟" اس نے اچانک ہی گم صم سی پری کے ہاتھ پہ اپنا بھاری ہاتھ رکھنا چاہا۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"نہیں ارتضٰی خان، اس بار نہیں۔ اس بار فیصلہ میں کروں گی۔" وہ تڑپی۔

"شوق سے پری کیونکہ میں جانتا ہوں تمہارا فیصلہ کیا ہوگا۔" وہ آج بھی ویسا ہی وجیہہ، ضدی اور مغرور تھا مگر اس بار پریشے اس کے سحر میں نہیں جکڑی تھی۔

"یہ وقت بتائے گا ارتضٰی خان۔" وہ کہہ کر رکی نہیں اٹھ کر نیچے بھاگ گئی۔ ارتضٰی وہیں بیٹھا اسے اپنے قریب محسوس کرتا رہا۔

☆☆☆

کمرے میں آکر وہ بیڈ پر ڈھے گئی اور پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔ ارتضٰی کے اس قدر استحقاق بھرے لہجے نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس بار بھی وہ اسے معاف نہیں کرے گا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس کا دعوے دار ہوگا اور اس بار اسے صرف اپنی پریشانی ہی نہیں تھی بلکہ مہد علی خان کی بھی فکر تھی جو بالکل انجانے میں اس کے دل کی دھڑکنوں میں آبسا تھا۔ جس نے محبت کی کرچیوں کی چبھن کو بہت حد تک کم کر دیا تھا۔ اس کے دل میں محبت اور اعتبار نے پھر سے جڑیں پکڑنا شروع کر دی تھیں لیکن ارتضٰی خان، وہ خود سب کچھ برداشت کر لینے کو تیار تھی مگر مہد علی خان جیسے شریف اور پیارے آدمی کے ساتھ اسے کچھ بھی برا ہونا گوارا نہیں تھا۔

"نہیں ارتضٰی خان اس بار نہیں۔ میں تم سے ڈرنے والی نہیں۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ پاؤ گے۔" اس نے دل ہی دل میں خود کو مضبوط کرتے ہوئے سختی سے آنسو رگڑ ڈالے۔

☆☆☆

"امی، میں آپ سے بات کر رہا ہوں اور آپ ہیں کہ بس اِدھر اُدھر کے کام کیے جا رہی ہیں۔" ثمرین بی بی الماری سے زیورات کا ڈبا نکالنے لگیں کہ ارتضٰی نے پیچھے سے انہیں تھام کر اپنے برابر لا کھڑا کیا۔

"تمہاری بات سن تو لی، کہہ دیا ناں بات کروں گی سب سے۔" انہوں نے پہلے والا جواب دُہرایا۔

"ہاں یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ سب سے بات کا کیا مطلب...... آپ جانتی ہیں امی، بابا بھی جانتے ہیں کہ پری میری بچپن کی منگ ہے۔" وہ چڑ کر بولا۔

"ذرا آج سے چند سال پیچھے جاؤ یہی بات تمہیں گھر کے ایک، ایک فرد نے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر تم......" ثمرین بی بی کو غصہ آ گیا۔

"میں ماضی بھلا دینے آیا ہوں امی اور پھر جب پری کو کوئی اعتراض نہیں تو آپ کو کیوں یا کسی اور کو کیوں؟" ارتضٰی کے صاف لہجے پر کمرے سے باہر گزرتی پریشے کے قدم خود بخود رک گئے۔

"تمہیں کیسے پتا کہ پری کو کوئی اعتراض نہیں؟" وہ حیران ہوئیں۔

"میرے جانے کے بعد پری کے اتنے اچھے رشتے آئے مگر وہ آج بھی میرے انتظار میں بیٹھی ہے امی... اب میں کوئی اتنا بچہ بھی نہیں ہوں کہ اتنی بڑی بات نہ سمجھ پاؤں۔" وہ طنزاً بولا۔

"بھول ہے تمہاری، تمہاری دی گئی چوٹ ہی اس قدر گہری تھی کہ وہ کسی دوسرے پر اعتبار ہی نہ کر پائی۔" تائی امی نے اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

"یہ سب آپ کی بھول ہے۔ پریشے آج بھی ویسی ہی سادہ اور محبتوں سے گندھی ہوئی لڑکی ہے۔ وہی روایتی لڑکی میرے بعد وہ دل میں کسی اور کو جگہ دے ہی نہیں سکتی۔ بچپن سے منسوب رہی ہے میرے نام سے اور ساری عمر یہی سنتی آئی ہے وہ آپ سب سے۔ لڑکیاں اس معاملے میں کچی مٹی کی طرح ہوتی ہیں امی...... جو تحریر لکھ دو ساری عمر کے لیے اَن مٹ رہ جاتی ہے اور پری کے دل پر ارتضٰی کا نام ثبت ہے۔" اس کے لہجے میں غرور تھا۔

"کچی مٹی جب گیلی ہو تب ہی اس پر نقش بنتے ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے ارتضٰی کہ گیلی مٹی ہمیشہ گیلی نہیں رہتی، سوکھ بھی جاتی ہے اور تب اگر ذرا سی بھی ٹھوکر لگے تو پھر کبھی اصل حالت میں نہیں آتی۔

سب نقش بگڑ جاتے ہیں۔ تم نے بھی خود لات مار کر پری کے دل سے اپنے نقش مٹا ڈالے۔ میں تو تمہاری اتنی پُرامیدی پر حیران ہوں۔“ ثمرین بی بی نے صاف جواب دیا۔

”امید نہیں امی، فیصلہ ہے میرا۔ پری اگر کسی کی بیوی بنے گی تو وہ صرف ارتضٰی خان ہے۔ مجھے ہر حال میں پریشے چاہیے اور بس......“ غصے سے کہتا وہ باہر آیا تو پریشے سے ٹکراتے، ٹکراتے بچا۔ بڑی ہی محبت پاش نظروں سے اس کو تکتا، دلفریب مسکراہٹ اچھالتا وہ اس کے بے حد قریب سے گزرتا چلا گیا۔

پریشے چند سال پہلے کی ایسی ہی اِک گھڑی سوچنے لگی۔ قدرت بھی کیا، کیا وقت دکھاتی ہے انسان کو۔ وہی جگہ تھی، وہی کردار، وہی ارتضٰی خان جس نے صرف اپنی انا کی خاطر پریشے مصطفیٰ کی ذات کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ اس کی ہستی کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ اسے اس وقت موت قبول تھی مگر پریشے مصطفیٰ سے رشتہ نہیں کوئی تعلق منظور نہیں تھا۔ وہ اسے دیکھنے تک کا روادار نہیں تھا اور آج وہی ارتضٰی خان نہ صرف اسے پانے کا خواہش مند تھا بلکہ نام نہاد منگنی کو بنیاد بنا کر پورے حق سے اس کا دعوے دار بن رہا تھا۔ وہی حقیری پریشے مصطفیٰ اب اس کی طلب بن چکی تھی۔

یہی دروازہ تھا جب اس نے کتنی نفرت بھری زہریلی نگاہ سے پریشے مصطفیٰ کی روح تک چھلنی کردی تھی۔ آج انہی نظروں نے کیسا پیار نچھاور کیا تھا اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ اب جبکہ اسے مہربانی کی نہ تو کوئی خواہش تھی نہ کوئی ضرورت۔ اب پریشے مصطفیٰ، ارتضٰی خان کا نام ہمیشہ کے لیے اپنے دل کے آئینے سے کھرچ چکی تھی۔

”ایمان ٹھیک کہتی ہے، اس گھر میں رہتے ہوئے میں ارتضٰی خان نامی آسیب سے کبھی نہیں بچ سکتی۔ مجھے اپنے لیے اس دفعہ اچھی پناہ گاہ کا انتخاب خود کرنا ہوگا۔“ اس نے سوچتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

”اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ تمہیں یہاں نہیں لانا چاہیے تھا زبردستی۔“ وہ لوگ پشاور اپنے کزن کی شادی میں آئے ہوئے تھے۔ ارباب نے کونے میں گم صم بیٹھے بھائی کو دیکھا تو پریشان ہوگئی۔ مہد چونک گیا۔ پانچ سالہ فہد نہ جانے کب اس کی گود میں نیند کی وادیوں میں اترا اسے کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔

”ارے نہیں آپی، بس آپ کو پتا ہے ناں میرا ان محفلوں میں دل نہیں لگتا۔“ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”دل یہاں ہوگا تو لگے گا ناں......میں نے سوچا شادی ہے رنگ برنگے دھانی آنچل دیکھو گے تو ہوسکتا ہے کہ کوئی لڑکی پسند آجائے مگر لگتا ہے تمہیں بس وہی پری ہی چاہیے۔“ رباب مسکراتے ہوئے بولی۔ پری کا نام سنتے ہی خود بخود اس کے لبوں پر بہت خوب صورت مسکراہٹ مچل اٹھی۔

”بہت پیار کرتے ہو اس سے؟“ رباب نے دل ہی دل میں اپنے پیارے بھائی کی نظر اتاری۔

”کچھ خبر ہی نہیں آپی بس ایک اس کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا، ہر وقت اس کا چہرہ پلکوں تلے بسا رہتا ہے پھر بھی دل کی تشنگی ہے کہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس کے راستوں میں جانے کی ضد کرتا رہتا ہے۔ اس کے دیدار کے لیے مچلتا رہتا ہے یہ پاگل۔“ وہ ایک جذب سے کھویا، کھویا سا بولا۔ رباب اس کی اس قدر کھوئی، کھوئی سی حالت پر ... اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا گئی۔

”اب تو مجھے اس لڑکی سے ملنا ہی پڑے گا۔ جس نے میرے اتنے ذہین اور قابل، انجینئر بھائی کو پاگل بنا دیا ہے۔“ وہ اس کے کان پکڑتے ہوئے بولی۔

”اس کی طرف سے کوئی جواب تو ملے۔ سب سے پہلے آپ کو ہی ملواؤں گا۔“ اس نے اپنا کان چھڑواتے ہوئے کہا۔

”اور اب پلیز میں تو کہتا ہوں کل واپس چلیں۔ آج پانچ دن ہوگئے ہیں نہ جانے وہاں کیا کچھ ہوگیا ہو۔“ اس کے لہجے میں انجانا سا خوف تھا رباب چونک گئی۔

”کیا مطلب مہدی، کوئی بات ہے کیا، کیا ہوگیا ہوگا؟“ وہ پریشان ہوگئی۔

”ارے کچھ نہیں آپی، میرا مطلب ہے اس کا رشتہ طے نہ ہوگیا ہو۔“ وہ ارتضٰی کے متعلق انہیں کچھ بھی بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تبھی بات بنا گیا اس کی بات پر رباب کھلکھلا کر ہنس دی۔

”چلو ٹھیک ہے، تم کل صبح کے ہی ٹکٹ لے لو ہم کل ہی چلے جائیں گے واپس، خوش!“

”بہت خوش۔“ مہد علی خان کا چہرہ کھل اٹھا۔ رباب اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی وہاں سے اٹھ گئی وہ وہیں بیٹھا فہد کو گود میں لیے پریشے کو سوچتا رہا۔

☆☆☆

چھ دن سے اوپر ہوگئے تھے مہد اسے دوبارہ نظر نہ آیا تھا۔ دو دن تک تو اس نے کچھ خاص نوٹس نہیں کیا تھا لیکن تین چار روز گزرنے کے بعد وہ واقعتاً پریشان ہوگئی تھی۔ وہ اسکول سے جلدی نکل آتی اور بلاوجہ ہی پگڈنڈی کے پاس پکی صاف سڑک کے کنارے دور تک پیدل چلتی رہتی۔ اپنی اس قدر بے چینی پر وہ خود بھی حیران تھی۔ مہد علی خان دل کے اس قدر قریب آچکا تھا اسے اب احساس ہو رہا تھا۔

آج بھی وہ دل ہی دل میں اس کے آنے کی دعائیں کرتی اسکول سے کچھ جلدی ہی نکل آئی۔ اس نے دیکھا نیچے سڑک پر دور دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کی نگاہیں مایوس ہوکر پلٹ آئیں۔ وہ دل گرفتہ سی ہوکر اسکول کے پاس ہی لگے دیار کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کے ٹھہر گئی۔

”مجھے بھی تم سے محبت ہوہی گئی مہد علی لیکن لگتا ہے میں نے دیر کردی۔“ اس کی آنکھیں ہی اس جان لیوا خیال سے بھیگنے لگیں۔

”پری۔“ تبھی کسی نے بہت دھیرے سے اسے پکارا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا مہد علی اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ گلابی لبوں پر مسکان کھیلنے لگی۔ مہد علی خان نے پُرشوق نگاہوں سے اس کا یہ دھوپ بادل جیسا روپ دیکھا تھا۔

”نہ جانے کیوں آج آپ کو دیکھ کر مجھے خوش فہمی سی ہو رہی ہے کہ جیسے آپ نے میرے نہ آنے کو نوٹس کیا۔“ وہ ایک جھکی ہوئی ٹہنی سے پتا توڑتے ہوئے بولا۔

”اور اگر میں کہوں کہ یہ خوش فہمی نہیں حقیقت ہے تو......“ پلکیں جھکاتے ہوئے پریشے نے جیسے ہفت اقلیم کی دولت بخش دی تھی وہ کچھ بول ہی نہ پایا۔ بس چپ چاپ پری کو دیکھے گیا۔ جس کی گھنی پلکیں بارِ حیا سے اٹھ ہی نہیں رہی تھیں۔

”ایک مرتبہ تو مجھے لگا مہد جیسے میں نے دیر کردی بہت دیر... مجھے لگا آپ میرا رستہ دیکھتے، دیکھتے تھک گئے۔ میں نے آپ کو کھو دیا۔ یہ خیال ہی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔“ وہ بولتی چلی گئی۔ ”لیکن میں آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی مہد۔ میرے دل میں محبت کی کرچیوں کی چبھن اس قدر زیادہ تھی کہ میں چاہ کر بھی آپ کی طرف قدم نہ بڑھا پائی مگر کچھ دنوں سے مجھ پر اپنا آپ کھل رہا ہے۔ آپ کی محبت اور خلوص نے میرے دل سے نفرت اور بے اعتباری کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ میرے دل کی سرزمین پر درد کے کانٹوں کی جگہ محبت کے موسمِ گل نے لے لی ہے۔ آپ نہیں جانتے، آپ کے اعتبار نے مجھے کس قدر مضبوط بنا دیا ہے۔ مجھے فیصلہ کرنے کی طاقت صرف آپ کی محبت نے بخشی ہے۔“

”آپ کس قدر حسین بولتی ہیں۔“ مہد علی اس

کی گفتگو سے متاثر ہوتے ہوئے بولا تو پری مسکرادی۔

''یہ سب آپ ہی کی دین ہے۔'' اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

''پری!'' تبھی ارتضٰی خان کی پاٹ دار آواز نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں اردگرد سے اتنے لاتعلق تھے کہ ارتضٰی وہاں کب آیا انہیں کچھ خبر نہ ہوئی۔

''ارتضٰی، آپ!'' پریشے اسے دیکھ کر پوری طرح گھبرا گئی۔

''جاؤ تم گاڑی میں بیٹھو۔'' ارتضٰی نے پریشے کو حکم دیا مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔

''تم نے سنا نہیں پری میں نے کیا کہا۔'' وہ غرایا۔

''میں تمہاری مرضی کی پابند نہیں ارتضٰی خان۔ تم شاید یہ بات بھول رہے ہو۔'' وہ اس کے سامنے ٹھہرتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔

''میں تم پر اب بھی حق رکھتا ہوں پریشے، تم آج بھی میرے......''

''بس ارتضٰی بس اور نہیں تم وہ حق مجھ سے عرصہ ہوا چھین چکے ہو۔ میری ذات کے پرخچے اڑاتے وقت کہاں گئے تھے سارے حق۔ تم اب میرے لیے صرف ماضی کا ایک باب بن چکے ہو جو میں نے ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے بند کردیا ہے۔''

''تم اتنی آسانی سے میرا اور اپنا رشتہ ختم نہیں کرسکتیں۔'' اس نے مضبوطی سے پری کی نازک کلائی پکڑ کر اسے خود سے قریب کرتے ہوئے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پریشے کراہنے لگی۔ مہد فوراً ارتضٰی کی طرف بڑھا لیکن پری نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا۔

''تم گھر جاؤ مہد، یہ معاملہ میں خود نبٹاؤں گی۔'' اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور تیزی سے نیچے سڑک پر کھڑی ارتضٰی کی جیپ کی طرف بڑھ گئی۔ ارتضٰی نے ایک بھری نگاہ مہد علی خان پر ڈالی اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں لب کاٹتی پریشے مصطفیٰ اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

''وہ کون ہے پری؟'' ارتضٰی نے سب سے پہلے یہ خبر تائی امی کو دی تھی۔ وہ فوراً پریشے کے پاس آئی تھیں۔

''میں نہیں جانتی تائی امی لیکن صرف محسوس کیا ہے کہ وہ مجھے عزت دیتا ہے، میری قدر کرتا ہے وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس نے ہی میرے دل میں دوبارہ سے محبت اور اعتبار کے لیے گنجائش پیدا کی۔ وہ بہت اچھا ہے تائی امی بہت اچھا......'' اس کی آنکھوں میں محبت بے حد واضح تھی۔ تائی امی مسکرادیں۔

''ارتضٰی شرمندہ ہے بیٹا، وہ جس قدر تمہیں پالینے سے ہچکچا رہا تھا اب تمہیں پانے کے لیے اسی قدر وہ تڑپ رہا ہے۔'' پری نے حیرت سے تائی امی کی طرف دیکھا۔ کیا وہ ارتضٰی کی حمایتی بن کر آئی تھیں۔

''ارتضٰی کی یہی شدت مجھے اچھی نہیں لگتی تائی امی پھر ارتضٰی نے جو کچھ میرے ساتھ کیا میں چاہ کر بھی اتنے سالوں سے وہ درد بھلا نہیں پائی۔ اس کی محبت نے مجھے سکون نہیں دیا بلکہ ساری عمر کرچیوں کی صورت چبھتی رہی ہے میرے سینے میں۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں پری، تم مہد سے کہو وہ اپنے گھر والوں کو بھیج دے۔ ارتضٰی ہمارا بیٹا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم سبھی تمہاری خواہش، تمہاری خوشیوں میں تمہارا ساتھ دیں گے۔ ارتضٰی نے جو بھی سہا اس کی اپنی مرضی اس کا اپنا کیا تھا۔ تم کم از کم اس کی کسی خواہش کی پابند نہیں ہو۔'' تائی امی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور اسے دعا دیتیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

''جب میں نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا تو آپ سب نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ مجھے، اس گھر کے سب سے بڑے بیٹے کو گھر سے باہر پھینک دیا تھا اور اب...... اب جب وہ مجھے ٹھکرا رہی ہے تو پھر ایک بار پھر آپ سب اسی کا ساتھ دے رہے ہیں۔'' وہ بری طرح چڑا ہوا تھا۔ غصے سے کہتا اِدھر اُدھر ٹہلتا ارتضٰی سب کو ایک مرتبہ پھر پریشان کررہا تھا۔

''لیکن بھائی، آپ نے اپنی مرضی سے پریشے سے راستے الگ کیے تھے۔ ہم نے اس وقت بھی آپ کو سمجھانے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن آپ، آپ پر نہ جانے پریشے کی نفرت کا کیسا بھوت سوار تھا اور آج ایک دفعہ پھر آپ کی وہی ضد اب اگر اچانک سے آپ کے دل میں پریشے کی محبت جاگ اٹھی تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور......؟'' ثنا نے کھلے دل سے پری کی حمایت کی۔

''تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں، پریشے کو ہم نے ہمیشہ اس گھر میں عزت دی ہم سے بڑھ کر ہمارے والدین نے اسے محبت سے نوازا۔ اب جب مجھے، اس گھر کو اسفند یار کو اس کی ضرورت ہے تو کیا اس کا فرض نہیں بنتا کہ وہ اپنی تھوڑی سی خواہشات قربان کردے۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''شاباش بیٹا، شاباش!'' تایا ابو نے بیٹے کی اس قدر خودغرضی پر تالیاں بجا کر داد دی۔ ابی تاسف سے سر ہلا گئے۔

''مطلب اس دفعہ بھی تم صرف اپنا مطلب ہی سوچ رہے ہو کیا بگاڑا ہے اس معصوم نے تمہارا۔ اللہ سے ڈرو ارتضٰی، کیوں خواہ مخواہ ایک یتیم کے پیچھے پڑگئے ہو۔ یتیم بھی کوئی غیر نہیں تمہاری سگی چچا زاد بہن ہے وہ۔'' مرتضٰی خان غصے سے کانپنے لگے۔

''ہاں تو یہی تو کہہ رہا ہوں بابا اگر وہ اسی گھر میں رہ جائے تو کیا جاتا ہے کسی کا۔'' اس کی ضدی طبیعت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

دورِ ظلمت

رات میں نے اک خواب دیکھا ہے
کیسے بتاؤں کہ اک عذاب دیکھا ہے
زخموں سے چُور بدن غریبوں کے
ظلم کو ایسے بے نقاب دیکھا ہے
عورت کی آبرو ہوئی نیلام سر بازار
بنتِ حوا کی ردا کو تار تار دیکھا ہے
دندناتے پھرتے ہیں بے خوفی سے قاتل
یوں ظلمت کا راج دیکھا ہے
جھوٹ کو ہے فوقیت سچ پہ ایشل
وقت کی کتاب میں یہ باب دیکھا ہے

شاعرہ: ایشل شادیان آرائیں، گولارچی

''جو بھی ہے ارتضٰی، یہ فیصلہ پریشے کا ہے اور اسے اپنے سارے فیصلے کرنے کا حق ہے اور ہمارے لیے بھی اس کا فیصلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔'' ابی نے گویا بات ہی ختم کردی تھی۔ ارتضٰی بے بس سا وہیں صوفے پر ڈھے گیا۔ دونوں ہاتھوں میں سر جکڑے وہ سب کو اداس کرگیا مگر کسی نے اسے تسلی تک نہ دی تھی۔

☆☆☆

''میں تو کم از کم تمہارے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں پری، سچ بولوں تو زندگی میں پہلی بار تم نے عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے۔'' ندا مونگ پھلی کھاتی اس کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''مجھے تو تم دونوں سے ڈر تھا کہ تم لوگ ارتضٰی کی حمایت کروگی۔'' پریشے نے اپنا خدشہ بیان کیا تو ندا کے ساتھ ثنا بھی ہنس دی۔

''یار واقعی غلطی ہماری تھی، تمہاری اس طرح سادہ اور تنہا زندگی دیکھ کر ہم یہی سمجھے کہ تم آج تک ارتضٰی بھائی کو بھلا نہ پائی ہو۔ ارتضٰی لالہ ہمارے

ساتھ رابطے میں تھے۔ سو جب ہمیں پتا چلا کہ ان کی انگریز بیوی نے ان کو دغا دے دی اور اب وہ پردیس میں بھی مشکلات کا شکار ہیں تو ہم نے ہی تمہارا نام ان کے سامنے لیا کہ تم آج بھی ان کے انتظار میں بیٹھی ہو۔ ہم نے سوچا اس طرح نہ صرف ہمارے اجڑے ہوئے بھائی کی زندگی سنور جائے گی بلکہ تمہاری زندگی کی ویرانیوں کا بھی خاتمہ ہوگا۔'' ثنا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے محبت سے کہا۔

''یہ تم لوگوں نے بہت غلط کیا تم لوگ کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیتے۔ جانتی ہو ثنا میں آج تک ارتضیٰ کا ایک لفظ بھی نہیں بھلا پائی جو اس نے میرے بارے میں کہا تھا۔ مجھے اس کے لہجے، اس کی آنکھوں سے چھلکنے والی وہ نفرت، وہ زہر آج بھی درد دیتا ہے۔ پھر بتاؤ میں کیسے اسے اپنا سب کچھ مان لوں؟ مجھ سے یہ خیانت نہیں ہوگی۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''تم اپنی جگہ بالکل صحیح ہو بس ہم سب غلط سمجھے لیکن سچ کہوں تو ارتضیٰ لالہ کی اس دفعہ پھر ضد مجھے ہولائے دے رہی ہے۔'' ثنا نے اپنا خدشہ بتایا۔

''ارتضیٰ لالہ دل کے برے نہیں، جو بھی ہو وہ پری سے زبردستی کا رشتہ ہرگز نہیں جوڑیں گے۔ ہاں البتہ اسے راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش ضرور کریں گے۔'' ندا نے انہیں اطمینان دلایا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ارتضیٰ خان کو اپنے گھر کے لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر مہد علی خان واضح طور پر چونک گیا تھا۔ ارتضیٰ خان کے چہرے پر بڑی مطمئن سی مسکراہٹ تھی۔ مہد علی کے بہنوئی احمد علی خان نے تیز نظروں سے مہد علی خان کی طرف دیکھا تھا۔

''آپ یہاں؟'' وہ ان کی پروا کیے بغیر سیدھا ارتضیٰ خان کی طرف آیا تھا۔

''کیوں، میرا یہاں موجود ہونا آپ کو اچھا نہیں لگا؟'' ارتضیٰ خان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا جو مہد علی خان نے یکسر نظر انداز کر دیا۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں اس تکلیف کی؟'' اس کے لہجے میں اجنبیت تھی۔

''یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، کیا وہ سچ ہے مہد علی خان؟'' اس مرتبہ احمد علی ان سے مخاطب ہوئے تھے۔ احمد علی خان صرف اس کے بہنوئی نہیں تھے بلکہ بڑے بھائی کی حیثیت رکھتے تھے۔

''مجھے نہیں پتا لالہ کہ انہوں نے آپ سے کیا کہا ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ نگاہیں البتہ ابھی تک ارتضیٰ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''بات بالکل صاف ہے مہد علی خان، پری میری بچپن کی منگیتر ہے اور ہم لوگ اپنی عزت کی خاطر نہ جانے لینے سے ڈرتے ہیں نہ دیتے سے۔'' ارتضیٰ خان نے اس دفعہ براہِ راست اس سے بات کی۔

''احمد علی خان تمہارے بڑے بھائی ہیں تبھی میں ان کے پاس آیا ہوں تاکہ تمہیں سمجھا سکیں۔ کل کو اگر بات ہاتھ سے نکل گئی تو......''

''بس ارتضیٰ خان، اس سے آگے ایک لفظ مت کہنا۔ رہی بات منگیتر کی تو آج وہ دور نہیں رہا پری پڑھی لکھی، سمجھ دار لڑکی ہے۔ وہ اپنا فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے پھر سب سے ضروری بات، میری اطلاع کے مطابق خود آپ وہ رشتہ سالوں پہلے ختم کر چکے ہیں۔ گھر والوں نے اس کے بعد پری کی شادی کئی دفعہ کروانی چاہی مگر وہ راضی نہیں تھی اور اب میری یہ خوش قسمتی ہے کہ مجھے اس نے اپنے قابل سمجھا۔ اب آپ یہاں سے چلے جائیں ورنہ......'' بات کے آخر میں خود بخود اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

''جو کچھ بھی تھا وہ ہمارا ذاتی معاملہ تھا اور میں تمہیں وارننگ دینے آیا ہوں مہد علی خان، ایسا نہ ہو کہ کوئی نقصان اٹھا بیٹھو۔'' ارتضیٰ نے مہد علی خان

کے قریب آ کر دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو احمد علی خان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''تم بھول رہے ہو ارتضیٰ خان کہ تم اس وقت ایک پولیس آفیسر کے گھر میں کھڑے ہو۔'' وہ غصے سے بولے۔

''میں نے کہا احمد علی عزت کے لیے ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔'' اس نے کاندھے پر رکھی سفید چادر جھٹکی اور وہاں سے باہر نکل گیا۔ احمد علی خان کے پوچھنے پر اس نے ساری تفصیل انہیں بتا دی۔ رباب نے سب سنا تو دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''تم اس کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے مہدی۔'' وہ فوراً بھائی کو سمجھانے لگی۔

''آپ کیا چاہتی ہیں آپی، میں زندگی چھوڑ دوں۔'' وہ اداسی سے مسکرا دیا۔

''ہائے اللہ نہ کرے مہدی، تمہارے سوا بھلا میرا اور کون ہے اس دنیا میں۔'' وہ فوراً آنسو بہانے لگی۔

''لو جی، میں تو پڑوسی ہو گیا۔'' احمد علی خان نے خفگی بھرے انداز میں کہا تو وہ فوراً کان پکڑ گئی۔

''میرا مطلب میکے سے تھا، آپ بھی ناں ہر بات خود سے جوڑ لیتے ہیں۔'' وہ خفا ہوتے ہوئے بولی۔

''تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو پھر تم صرف اپنے بھائی کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہو پری کے متعلق جو کچھ مہد علی نے بتایا تو میرے خیال میں اس جیسی لڑکی ارتضیٰ ڈیزرو ہی نہیں کرتا پھر تم خود سوچو مہد علی کی پسند کوئی ایسی ویسی تھوڑی ہوگی۔ میرے خیال میں تو ہمیں مہد کی بات مان لینی چاہیے اور پری کے گھر جانا چاہیے۔ اس کے گھر والوں کا ری ایکشن دیکھ کر ہی ان دونوں کی قسمت کے بارے میں کوئی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔'' انہوں نے پریشان بیٹھے مہد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کھل اٹھا۔

''مجھے یقین ہے لالہ فیصلہ میرے حق میں ہی ہوگا۔''

''لیکن ارتضیٰ خان نے کچھ ایسا ویسا......''

رباب خوف زدہ تھی۔

''تو ہم بھی اس سے کم نہیں آپی۔'' مہد علی خان نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو رباب دل ہی دل میں گھبراتے ہوئے درود شریف کا ورد کرنے لگی۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے وہ اس قدر پریشان تھی کہ اسکول بھی نہ جا سکی۔ ارتضیٰ کی طرف سے عجیب سا ڈر لگا رہتا تھا اسے۔ اس نے زیادہ تر اپنے کمرے سے باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا تاکہ ارتضیٰ سے سامنا نہ ہو۔ ارتضیٰ گھر سے باہر ہوتا تبھی وہ باہر نکلتی۔ ننھا اسفندیار اس سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔ وہ اسے بھی آج اسکول لے آئی تھی۔ اسفندیار کو یہاں آ کر بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔

''فیری، یہ کون ہیں؟'' وہ بریک کے وقت اسے لے کر ایمان کے پاس آئی تو وہ فوراً پوچھ بیٹھا۔

''یہ آپ کی آنٹی ہیں بیٹا اور میری بہت اچھی دوست۔'' اس نے مسکراتے ہوئے تعارف کروایا۔

''کتنا پیارا بیٹا ہے ناں ارتضیٰ بھائی کا۔ بالکل ان پر گیا ہے۔ اللہ کرے بس اس کا دل ان کی طرح نہ ہو۔ سخت اور جذبات سے عاری۔'' ایمان نے سچے دل سے دعا کی۔

''میں آج تک اسے نہیں سمجھ سکی ایمان، وہ کبھی ایسا تو نہ تھا سب سے کتنے پیار سے بات کرتا تھا وہ۔ امی، تایا ابو اور تائی امی کا کتنا فرمانبردار تھا وہ۔ کبھی، کبھی میں سوچتی ہوں واقعی میری ہی ذات ہے جس نے ارتضیٰ کو اس قدر بدل ڈالا۔ اس کے دل میں نفرت بھر دی، اسے سب رشتوں سے دور کر دیا۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔ اسفندیار گراؤنڈ میں کھیلتے بچوں کی طرف بھاگ گیا۔

''پاگل ہو تم، فطرت، فطرت ہوتی ہے پھر خود سوچو تم جیسی بے ضرر سی لڑکی سے اس قدر پرخاش کیا اس جیسے مضبوط مرد کو زیب دیتی ہے؟ یہ اس کے اندر

کا کوئی احساسِ کمتری ہے پری جس نے خود اس کو سب سے دور کردیا ہے، اس کی اپنی زندگی جہنم میں گزری۔ بقول تمہارے جو حالات اس نے ملک سے باہر دیکھے کوئی غیرت مند انسان بھلا کب برداشت کرسکتا ہے، اس کی غلطیاں تھیں سو خمیازہ تو لازمی بھگتنا تھا اس کو۔" ایمان کے لہجے میں تلخ سچائی تھی۔

"شاید تم صحیح ہو، اچھا یہ بتاؤ... یہ مہد علی خان آیا تھا کیا دوبارہ؟" اس نے ذرا سی گردن اونچی کر کے اسکول کی چھوٹی سی دیوار کے پار دیار کے درخت تلے جیسے کسی کو ڈھونڈنا چاہا تھا۔ ایمان مسکرادی تھی اس کی اس حرکت پر۔

"ہاں آیا تھا، میں نے تمہاری چھٹی کا بتادیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے بڑوں کو تمہارے گھر بھیج سکتے ہیں۔" ایمان نے محبت سے پری کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"بس دعا کرو اللہ خیر ہی کرے، ورنہ ارتضٰی کے رویے نے تو مجھے پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ کاش...... کاش کہ ارتضٰی واپس نہ آیا ہوتا۔" اس نے حسرت سے کہا تھا بالکل پاس آتے ذہین اسفندیار نے حیرت سے اس کی بات سنی تھی مگر خاموش رہا تھا اور گھر آنے تک بھی وہ خاموش رہا... یہاں تک کہ خود پری کو اس کی اس اچانک خاموشی پر حیرت ہوئی تھی۔

☆☆☆

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پلکیں موندتے ہی بار بار پریشے کا خوب صورت مسکراتا چہرہ سامنے آجاتا۔ اس نے پلکیں بند کرنا ہی ترک کردیں اور اپنے متعلق سوچنے لگا۔

کس قدر سنگین غلطی ہوئی تھی اس سے۔ اس کی محبت، اس کی چاہت قدرت نے اس کی دسترس میں رکھی پتا چاہے، بِنا طلب کیے اور اس نے کیا، کیا...... اپنے ہاتھوں دل میں خود رو نفرت کے کانٹے اگا ئے اس نے خود ہی اپنی محبت کو ٹھوکر ماردی۔ اپنی انا اور نفرت میں اس نے اپنے پیاروں تک کو چھوڑ دیا۔ اپنے بڑوں کا نافرمان ہوا اور نتیجہ وطن سے میلوں دور ذلت کی زندگی، ایک اَن چاہی عورت کی غلامی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کب پھر سے اس کے دل نے پھر سے گواہی دینا شروع کردی کہ اس کی اصل محبت تو پریشے تھی۔ دوسرے سب گھر والوں کی طرح وہ بھی پریشے جیسی اچھی لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا مگر وہ کبھی یہ قبول نہیں کرپایا۔

اور اب...... اب جب وہ اس سے اتنی دور چلی گئی تھی تو وہ خود اس کا طلب گار بن بیٹھا تھا۔ کہاں چلی گئی تھی اس کی مردانہ انا۔ خود ہی تو کہا تھا اس نے کہ موت قبول ہے مگر پریشے مصطفٰی کا ساتھ نہیں۔ سوچتے، سوچتے اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا پاپا؟" معصوم سا اسفندیار بھی فوراً اٹھ بیٹھا۔ ارتضٰی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"تم سوئے نہیں بیٹا بہت دیر ہوگئی ہے۔" اس نے بیٹے کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے نیند نہیں آرہی۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔

"ارے واہ، نیند کیوں نہیں آرہی میرے شیر کو؟" اس نے پیار سے کہتے ہوئے اسفندیار کو اپنے ساتھ لگایا۔

"پاپا آپ سے ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو میری جان۔" ارتضٰی نے ٹھوڑی اس کے ریشمی بالوں پر جماتے ہوئے کہا۔

"کیا پری آپ سے ناراض ہیں؟"

وہ چپ سا ہوگیا۔ ننھے اسفندیار نے یہ کیسا سوال کیا تھا۔

"بتائیں ناں پاپا، کیا آپ نے پری کو ہرٹ کیا ہے؟" وہ سیدھا ہوکر ارتضٰی کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"تمہیں کچھ کہا ہے انہوں نے؟" اسے عادت کے مطابق فوراً غصہ آنے لگا۔

"آپ اس قدر ہارش کیوں ہوجاتے ہیں۔ فیری نے مجھے کچھ نہیں کہا...... لیکن مجھے خود لگتا ہے جیسے آپ فیری سے خوفزدہ ہوں یا وہ آپ سے ڈرتی ہیں، کیا ایسا ہے پاپا؟" وہ کس قدر سمجھدار بچہ تھا۔ ارتضٰی کو حیرت ہوئی۔

"نہیں بیٹا، ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم اب سوجاؤ ورنہ صبح نماز کے لیے نہیں اٹھ سکو گے۔" اس نے زبردستی اسے اپنے بازو پر سلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے سنا پاپا، فیری اپنی فرینڈ سے کہہ رہی تھی کہ کاش آپ کبھی واپس نہ آتے۔ انہوں نے ایسا کیوں کہا پاپا۔ میرے پاپا تو دنیا کے بیسٹ پاپا ہیں پھر انہوں نے آپ کے بارے میں ایسا کیوں کہا پاپا؟" اس نے اپنا ننھا سا ہاتھ باپ کے چہرے پر پھیرتے ہوئے پوچھا تھا اور ارتضٰی کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

"انہوں نے یہ سب آپ کے سامنے کہا؟" وہ بہت دیر بعد بولا تھا۔

"نہیں پاپا، ان کو پتا ہی نہیں تھا کہ میں ان کے پاس ہوں ان کو یہ بھی پتا نہیں کہ میں نے ان کی یہ بات سن لی۔" وہ غنودگی بھرے لہجے میں بولا۔ اس کی پلکیں بوجھل ہورہی تھیں۔ ارتضٰی نے مزید بات نہیں کی اور اسے سونے دیا۔

"تو کیا وہ مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہے۔" اس نے جیسے خود سے سوال کیا۔ "جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا، جو کچھ اس کی ذات کے بارے میں کہا اس جیسی حساس لڑکی شاید ہی بھول پائے اور میں پھر بھی ایک دفعہ پھر...... کس حیثیت سے اس کی زندگی میں لوٹ آیا۔ کس حق سے میں اسے مانگنے لگا ہے" وہ اپنے ہاتھوں میں بال جکڑ گیا۔

"لیکن یہ بھی سچ ہے میں پریشے سے محبت کرتا ہوں۔ جو کچھ ہوا میں مانتا ہوں وہ غلط تھا اور مجھے اس کی سزا بھی تو ملی۔ نہیں، میں پری سے خود بات کروں گا۔ ایک مرتبہ ضرور اس سے محبت کی بھیک مانگوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے ضرور معاف کردے گی۔"

اس نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دیتے ہوئے خود سے عہد کیا تھا اور سکون سے پلکیں موندلیں۔

☆☆☆

مہد علی کے بہن اور بہنوئی آئے تھے۔ ثنا، ندا کے ساتھ، ساتھ جہاں سب پریشے کی خوشی پر خوش تھے وہیں کہیں اندر ہی اندر ارتضٰی کا خیال سب کو دکھی بھی کررہا تھا۔ ابی نے خود پری کی مرضی معلوم کرتے ہوئے فوراً انہیں ہاں کہہ دی تھی۔

رباب نے سادہ سے کپڑوں میں ملبوس پری کو مہد علی کے نام کی انگوٹھی پہنادی تھی۔

ارتضٰی، تایا ابو کے کسی کام سے پانچ چھ دن کے لیے شہر گیا ہوا تھا۔ سو ابی کو یہ موقع بہترین لگا۔ وہ کسی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتے تھے۔ ننھا اسفندیار بھی خوب چہک رہا تھا۔ ابی نے مہد علی خان کے بہن بہنوئی سے بات کر کے چار دن کے اندر، اندر شادی طے کردی تھی کیونکہ سبھی ارتضٰی کی غصیلی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے سو کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

"اتنی جلدی؟" ایمان نے اسے خوش خبری سنائی تو وہ حیران رہ گئی۔

"شکر پڑھو پاگل، ویسے بھی ارتضٰی بھائی ابھی یہاں نہیں ہیں اگر وہ ہوتے تو سب اتنی آسانی سے تھوڑی ہوتا۔" ایمان نے اسے تسلی دی۔

"مگر کیوں ایمان، اس طرح چوری چھپے کیوں...... میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ شادی کوئی جرم نہیں پھر ڈر بھی ارتضٰی کا جس نے خود مجھے ٹھکرادیا تھا۔" وہ اداس ہوئی۔

"بڑوں کے فیصلوں میں غلط صحیح نہیں ڈھونڈا کرتے پری۔ تم جانتی ہو ہم تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔" تائی امی نے کمرے میں آتے ہوئے شاید اس کی بات سن لی تھی۔ تبھی اسے سمجھاتے ہوئے

بولیں۔ ''ہماری صرف یہ خواہش ہے کہ تمہاری شادی آرام سے ہو اور کوئی بدمزگی نہ ہو۔ ارتضٰی کی غصیلی طبیعت سے تم بھی اچھی طرح واقف ہو۔ ہم اس سے نہیں ڈرتے میرے بچے، ہمیں بس یہ بات فکرمند کررہی ہے کہ تم اپنی خوشی میں پریشان نہ ہو۔ نہ ہی تمہیں ارتضٰی کا خوف ہو۔'' تائی امی نے پیار سے اس کے ماتھے پر آئی لٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''میں اس سے ڈرتی نہیں تائی امی بس میں اس گھر کا سکون خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ بولی۔

''خوش رہو پری، کاش کہ تم میرے گھر کا پھول ہی بن کر مہکتی رہتیں۔ ارتضٰی کی غلطی نے ہم سب کو تباہ کردیا، اللہ تمہیں ہمیشہ شادوآباد رکھے۔ یاد رکھنا پریشے میں تمہاری ماں ہی ہوں بیٹا اور یہ گھر ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔'' انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ، پھوٹ کے رودی۔

☆☆☆

ڈھولک بجے گی ساری رات
مہندی سجے گی تیرے ہاتھ

آج اس کا مایوں تھا، گھر میں ہی چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کرلیا گیا تھا۔

ابی، تایا ابو اور تائی امی سب کے چہروں پر ایک عرصے بعد مطمئن مسکراہٹ سجی تھی۔ سبھی دل ہی دل میں پریشے کی طویل خوشیوں کے لیے دعائیں بھی مانگ رہے تھے۔

تبھی سیڑھیوں کے قریب پڑے فون کی گھنٹی بجی تھی۔ ڈھولک اور میوزک کے تیز شور میں گھنٹی کی آواز دبی جارہی تھی۔ ہر کوئی اپنے کام میں مصروف تھا۔ اسی وقت اسفند یار خوب صورت شیروانی پہنے اوپر سے سیڑھیاں اترتا آرہا تھا۔ اس نے فون کی گھنٹی سن لی تھی۔ تبھی جھٹ سے ریسیور اٹھالیا۔

''ہیلو...... کون؟'' اس نے سننے کی کوشش کی دوسری طرف شاید ارتضٰی تھا۔

''جی پاپا، کہاں ہیں آپ؟ آئیں ناں۔'' وہ مچلا۔

''یہ شور کیسا ہے اسفندیار؟'' ارتضٰی کو اسفندیار کی آواز بہ مشکل سنائی دی۔ وہ شور سن کر عجیب سے خدشے میں گھر گیا۔

''فیری کی شادی ہے ناں، آپ کیوں نہیں آرہے۔ جلدی آئیں ناں بہت مزہ آرہا ہے۔ فیری بہت پیاری لگ رہی ہیں گرین سوٹ میں۔'' وہ ہمیشہ کی طرح طوطے کی طرح بولتا چلا گیا۔ ارتضٰی نے فوراً فون بند کردیا تھا۔ اسفندیار حیران سا ریسیور رکھتا باہر بھاگ گیا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے، میرے اپنے، میرے ساتھ ایسا کیسے کرسکتے ہیں۔'' وہ مضطرب ہوکر لب کاٹنے لگا۔

''پریشے...... کیا پریشے واقعی مجھ سے دور جانا چاہتی ہے۔ مجھے اس سے بات کرنی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ دیر ہوجائے۔'' اس نے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

بہت ہی ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ایبٹ آباد پہنچا تھا۔ باہر بہت تیز بارش برس رہی تھی۔ موسم گل کی پہلی بارش تھی...... موسم سرد ہونے کے باوجود خوشگوار ہوگیا تھا۔ اس نے گاڑی گیراج سے باہر ہی روک دی اور تیزی سے دوڑتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔

''ارتضٰی......!'' وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا پریشے کے کمرے کی طرف جارہا تھا جب تائی امی کی نگاہ اس پر پڑی۔

''لالہ کیسے آگئے اتنی جلدی امی!'' ماں کے ساتھ ثنا بھی شاید اسے دیکھ چکی تھی تبھی پریشان سی ماں کے قریب چلی آئی۔

''میں تو خود حیران ہوں۔'' انہوں نے سادہ سا جواب دیا۔

''میں دیکھوں کہیں وہ......'' ثنا آگے بڑھی تو ثمرین بی بی نے اس کا بازو پکڑلیا۔

''اسے اپنا دل ہلکا کرلینے دو، ثنا اب پری اسے خود ہی بہتر سمجھا سکتی ہے۔'' انہوں نے ثنا کو منع کردیا تھا۔ وہ حیران سی اثبات میں سرہلاگئی۔

☆☆☆

وہ کمرے میں آیا تو پریشے آئینے کے سامنے کھڑی بال بنارہی تھی۔ لمبے گھنے کالے بال آبشار کی طرح اس کی کمر پر بکھرے ہوئے تھے۔ دروازے پر آہٹ نے اسے چونکادیا، اس نے دیکھا وہ کوئی اور نہیں ارتضٰی تھا۔ ارتضٰی کی گہری نظروں کے ارتکاز پر وہ گھبرا سی گئی اور کرسی پر پڑا سبز دوپٹا کھینچ کر اپنے گرد پھیلالیا۔

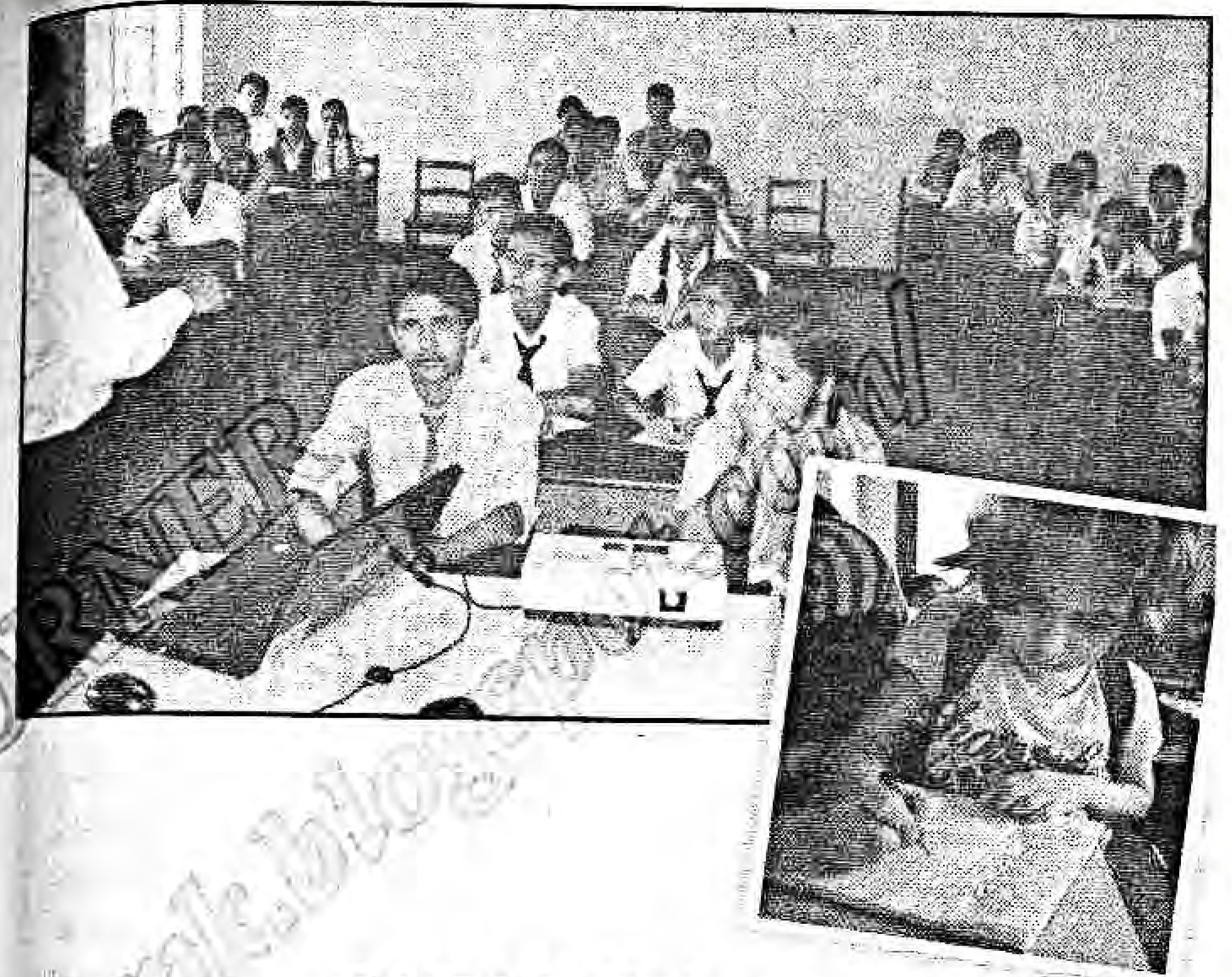
ارتضٰی نے دیکھا سبز اور زرد رنگ کے امتزاج سے بنا خوب صورت کرتہ جس پر کشمیری ٹانکے کی ہلکی، ہلکی کڑھائی تھی۔ اس پر بے حد جچ رہا تھا۔ معصوم اور اجلا، اجلا روپ دل فتح کرلینے کی طاقت رکھتا تھا۔ ارتضٰی دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا آیا۔ پریشے کا دل گھبرانے لگا۔ اسے لگا اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ پریشے کو اپنی دھڑکنیں واضح سنائی دینے لگیں۔

''کیا چاہتی ہو پری، اعترافِ جرم، اقرارِ محبت یا اعتبارِ وفا جو بھی مانگو میں دینے کو تیار ہوں مگر اتنی کڑی سزا نہ دو۔'' پریشے نے اس کے بکھرے لہجے پر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد کمزور لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے نمایاں حلقے اور ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو اسے چاہ کر بھی آج ارتضٰی کی آنکھوں اور چہرے پر وہ ہمیشہ والا غرور نظر نہ آیا۔

''میں کون ہوتی ہوں سزا دینے والی ارتضٰی، تم نے ہی ہمیشہ مجھ پر دفعہ لگائی اور خود ہی سزا مقرر کی۔ اب تو نہ مجھے تمہارے معافی نامے کی طلب رہی نہ تمہارے اقرارنامے کی۔ دل کی جس تختی پر میں نے محبتوں اور عقیدت سے تمہارا نام نقش بند کیا تھا۔ تم نے شدت اور نفرت سے اسے ایسی ٹھوکر ماری کہ وہ تختی ہی کرچی، کرچی ہوگئی۔ ایک حرف سلامت نہ رہا تمہارے نام کا۔ سارا نقش مٹ گیا ارتضٰی، تم تو ٹھوکر لگا کر چلتے بنے اور میں کتنی مدت تک اس کرچی کرچی محبت کی چبھن دل میں محسوس کرتی رہی۔ میرا تن من، میری روح تک زخمی کردی تھی اس محبت کی کرچیوں نے۔ میں کسی پر تو کیا محبت کے پاک جذبے پر بھی اعتبار کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔'' وہ سسکنے لگی۔ ارتضٰی کی آنکھوں میں چبھن سی اتری۔

''میں ان کرچیوں کو سمیٹ لوں گا پھر سے تمہارے دل کی تختی پر اپنا نام نقش کردوں گا۔ ہاں اپنی پُرخلوص محبت سے...... تم صرف ایک موقع تو دو پری۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔'' وہ تڑپا پریشے نے اپنی نمناک گھنی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا اور ارتضٰی کا دل چاہا کہ کاش وہ ان خوب صورت گہری آنکھوں میں ڈوب سکتا۔ اس نے محسوس کیا کہ پری کی آنکھوں میں اس کا عکس دھندلا سا گیا تھا۔

''میرے دل نے اپنا مسیحا، اپنا چارہ گر ڈھونڈلیا ارتضٰی خان، تم نے بہت دیر کردی۔ اگر میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو میری زندگی سے ویسے ہی نکل جاؤ جیسے تم پہلے چلے گئے تھے۔ میرے لیے ایک مرتبہ پھر مشکل پیدا نہ کرو کیونکہ اس بار اگر میں ٹوٹی تو سمٹ نہ پاؤں گی، بکھر جاؤں گی۔ میرے دل میں مہد علی کی محبت اور خلوص نے جو مقام پایا ہے وہ تم کبھی حاصل نہیں کرسکتے۔ خدا کے لیے میرے تھکن زدہ وجود سے یہ خوب صورت احساس چھیننے کی کوشش مت کرو ارتضٰی خان۔'' وہ سسکتی ہوئی باہر بھاگ گئی تھی اور ارتضٰی خان خالی ہاتھ وہیں ٹھہرا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کرچیوں کی صورت چبھن دینے لگی تھی۔ اس کے پاس سوائے پچھتاوؤں کے کچھ نہیں بچا تھا۔



آج کے بچے کل کے معمار

شائستہ زریں

مجھے بچوں کی آنکھوں میں وہ سارے رنگ ملتے ہیں
جنہیں چھونے سے آئے زندگی کی خواہشیں کرنا

پھول اور بچے کسے اچھے نہیں لگتے! دونوں ہی دل میں امنگوں اور آرزوؤں کو فروزاں رکھتے ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ان کے بچپن کی معصومیت کو خوف اور اندیشوں کا عفریت نگل رہا ہے، تکلیف دہ حال اور غیر واضح مستقبل ان کی شخصیت کی تعمیر پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ جیسے باغباں کی عدم توجہی سے پھول مرجھانے لگتے ہیں بالکل ایسے ہی والدین اور اساتذہ کی عدم دلچسپی، بے توجہی، قومی انتشار، سماجی ناہمواری اور معاشی بے اعتدالی بچوں سے معصومیت اور خود اعتمادی چھین لیتی ہے اور اس کی جگہ تفکرات کو مل جاتی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے 1992ء کے جنرل اسمبلی کے اجلاس میں 20 نومبر کو عالمی یوم اطفال منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یوں ہر سال 20 نومبر کو بچوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے، بچوں کے حقوق کے معاہدے کو دُہرایا جاتا ہے اس سلسلے میں ورکشاپس اور سیمینارز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ میڈیا بھی اپنا

کردار نبھاتا ہے الغرض ہر سمت سے حقوقِ اطفال کی صدائیں بلند ہوتی ہیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات...... بچوں کی فلاح و بہبود کے نعرے تو بہت لگتے ہیں لیکن جب ان کا سالانہ جائزہ لیا جاتا ہے تو باضمیر تو یقیناً پانی، پانی ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے مسائل ہیں کہ روز بروز بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور وسائل...... ؟ اتنے محدود کہ مسائل کا حل بھی دشوار ہے۔

بیشتر بچے تعلیم، صحت اور خوراک کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ زندگی کی بنیادی سہولتوں اور ضروریات سے محروم یہ بچے ہاتھ میں مسائل کا کشکول لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ غذائی قلت کا یہ عالم ہے کہ بھوک اور افلاس کے مارے دلگرفتہ اور نفسیاتی الجھنوں کے شکار والدین اپنے بچوں کو فروخت اور قتل کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ بچوں کی تعلیم اور صحت کی کمی کا ایک بڑا سبب غربت ہے جس کے نتیجے میں گداگر اور محنت کش بچوں کی تعداد میں شرمناک اور افسوسناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ معصوم لیبر فورس کا حصہ بن کر ہر قسم کے خطرات میں گھرے مشقت کر کے اپنی صحت ہی نہیں بچپن بھی گنوا رہے ہیں۔ حقوقِ اطفال کی ایک شق کے تحت 14 سال سے کم عمر بچوں کو فیکٹری، معدنی کانوں، تعمیراتی کاموں اور دیگر خطرناک ملازمت میں رکھنے کی ممانعت ہے لیکن بچوں کی اکثریت ایسے ہی مقامات پر کام کر رہی ہے اس کے علاوہ شاہراہوں، ہوٹلوں، ورکشاپس وغیرہ میں بھی محنت کش بچے تندہی سے مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔ 14 سال سے کم عمر بچوں کے ایسے کاموں کی قانونا بندش کے باوجود اس سے بھی نصف عمر کے بچے اس مشقت کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ محنت کش بچوں کی اکثریت سامراجی نظام کی بھینٹ چڑھ رہی ہے ٹھیکا سسٹم میں محنت کش بچوں کی حیثیت چھوٹے کی ہے لیکن کام ان سے بڑوں کا لیا جاتا ہے۔

اوروں کی تقلید میں جینے والے بچے خود اعتمادی سے ارتقا کا سفر طے نہیں کر پاتے۔ اگر والدین بچوں کو آزادیِ رائے کا حق دیں انہیں ان کے مستقبل کے بارے میں فیصلے کا شعور دیں تو یقیناً بچے پُراعتماد بھی ہوں گے اور مہذب بھی...... جو بچے اپنے والدین کی رہنمائی، ذاتی توجہ، اپنی ذات کے حوالے سے ان کی دلچسپی کو محسوس کرتے ہیں وہ ان بچوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر قوتِ فیصلہ اور قوتِ عمل رکھتے ہیں جو بچوں کی رہنمائی کرنے کے بجائے ان پر حکم صادر کرتے ہیں یا بچوں سے مشاورت کرنے کے بجائے ہر فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں ایسے بچے اور نوجوان جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو کامیابی ان کے ہمرکاب نہیں ہوتی۔ سو بہتر یہی ہے کہ بچوں کو آزادیِ رائے کا حق دے کر ان کی رہنمائی کرتے ہوئے ان کا مستقبل روشن بنا کر انہیں کامیاب انسان ہی نہیں بہترین شہری بھی بنائیں۔

والدین کے باہمی اختلاف اور علیحدگی کی صورت میں بچوں کے ذہن بھی تقسیم ہونے لگتے ہیں کیونکہ والدین میں سے کسی ایک سے بھی دوری بچوں میں احساسِ محرومی کو جنم دیتی ہے جو ناگ بن کر بچوں کے مستقبل کو ڈس لیتی ہے۔ والدین کی اس جنگ میں بچے بری طرح پستے ہیں کہ والدین ضد اور غصے میں بچوں سے عدم دلچسپی کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے بچوں میں قوتِ فیصلہ کی نہیں قوتِ عمل کی بھی کمی ہوتی ہے کیا ہی اچھا ہو جو والدین باہمی اختلافات بھلا کر اپنے بچوں کی خاطر سمجھوتا کرلیں۔

گزشتہ چند برسوں سے بچوں کے کھیلوں کے مزاج اور رجحان میں بہت واضح تبدیلی آگئی ہے۔ جس کا براہِ راست اثر ان کی شخصیت پر پڑ رہا ہے۔

بچے تن آسانی کا شکار ہو رہے ہیں نہ وہ پہلی سی پھُرتی رہی نہ خوش دلی، ہر بچہ من پسند تفریح کے باوجود بیزار اور سست اور اپنے اطراف کے ماحول سے کٹا، کٹا نظر آتا ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ بچوں کے حوالے سے یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ بالکل سامنے کی بات کسی کو نظر نہیں آتی، اکثر والدین بچوں کو وڈیو گیمز کی علت میں مبتلا کر کے ان سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ یہ تک دیکھنا گوارا نہیں کرتے کہ بچے کس نوعیت کے کھیلوں میں دلچسپی لے رہے ہیں؟ اور ان سے کیا سیکھ رہے ہیں؟ وہ بچوں میں در آنے والی تبدیلیوں سے متفکر تو نظر آتے ہیں لیکن اس کے اسباب وعوامل پر غور نہیں کرتے اور تمام تر الزام ''پڑھائی کے بوجھ'' پر ڈال دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن یہ تو سوچیں کہ اسی بار کے ساتھ آپ کا بچہ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک محض نصابی ہی نہیں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لے رہا تھا۔ پھر اب کیا ہوا؟ اور کیسے ہوا؟ بات بہت واضح ہے چونکہ بیشتر سنسنی خیز وڈیو گیمز ایک طرف ان کے اندر جارحیت اور تشدد کو پروان چڑھا رہے ہیں تو دوسری جانب انہیں ذہنی وجنسی بے راہروی میں مبتلا کر کے انہیں اخلاقی پستی کا شکار بنا رہے ہیں اور بے شمار نفسیاتی مسائل سے دوچار کر رہے ہیں۔

وڈیو گیمز کے ساتھ، ساتھ ایک بڑا مسئلہ چار سال سے اٹھارہ سال تک کے بچوں کا موبائل کا استعمال ہے۔ نہایت کمسنی سے بچے نیٹ بھی استعمال کرنے لگتے ہیں۔ والدین یہ نہیں جانتے کہ ان کا بچہ کس ڈگر پر جا رہا ہے؟ ان کی دی ہوئی سہولت کا ''فائدہ'' وہ کس سطح پر اٹھا رہا ہے؟ واقعی موبائل اور نیٹ کا استعمال اس کے لیے مفید ہے؟ یا موبائل اور نیٹ کے توسط سے اپنے تعلیمی فوائد حاصل کرنے کے بجائے دیگر غیر ضروری اور غیر اخلاقی دلچسپیوں میں گم ہو کر وہ مستقل خسارے میں جا رہا ہے۔ جدید موبائل کی سہولتیں بھی جدید ہیں جس کے نتیجے میں بچے قبل از وقت بہت سی ایسی باتیں جان لیتے ہیں جو ان کے لیے سمِ قاتل ہیں۔ موبائل اور انٹرنیٹ کے توسط سے پروان چڑھنے والی دوستیاں بچوں بالخصوص بچیوں کو تباہی کا پروانہ دے رہی ہیں۔ یہ المیہ نہیں سانحہ ہے اس پر قابو پانے کے لیے والدین کو اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی لانا ہوگی۔ بہتر یہی ہے والدین اپنے بچوں کی جائز خواہشات کا احترام ضرور کریں، انہیں جدید ٹیکنالوجی کی سہولتیں بھی مہیا کریں لیکن ساتھ ہی بچوں کے ان اشیا کے استعمال، بچوں کے روزمرہ کے معمولات اور سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتے ہوئے نہایت سمجھداری اور دور اندیشی سے ان کی دلچسپی کے امور پر ان سے گفتگو کریں اور باتوں ہی باتوں میں ان کے اندر کی الجھنوں کا سراغ لگا کر انہیں دور کریں۔ ورنہ.... بصورت دیگر بچوں کو دی جانے والی والدین کی سہولتیں ان کے اور ان کے بچوں کے لیے صعوبتیں بن جائیں گی۔ یہ بے بصر والدین نہیں جانتے کہ بچوں کو یہ سہولتیں مہیا کر کے ان سے غفلت برت کر وہ بچوں کو تابناک مستقبل میں نہیں اندھیرے میں دھکیلنے کی احمقانہ کاوش کر رہے ہیں۔

ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے بچوں نے اپنے علم اور معلومات کے حصول کا ذریعہ صرف اور صرف موبائل اور انٹرنیٹ کو بنا لیا ہے مطالعے سے ان کی دلچسپی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ حالانکہ یہی ان کے لیے بہترین رہنما ہیں۔ والدین، اساتذہ اور کتابوں کی رہنمائی تو اب خواب وخیال بنتی جا رہی ہے۔ سو بچے اس کی ضرورت اور اہمیت بھی محسوس نہیں کرتے۔ انٹرنیٹ اور موبائل پر کتابی چہرے پڑھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے کتاب کا چہرہ دیکھ لیں کہ اچھی کتاب کا مطالعہ چہرہ ہی نہیں شخصیت بھی

نکھار دیتا ہے۔ بچوں میں کتب بینی کا ذوق شوق پیدا کرنا والدین اور اساتذہ کی ذمّے داری ہے۔ حکومت بھی اس ضمن میں اہم اقدامات کر سکتی ہے۔ ماضی میں گھر کے بزرگ بچوں کو اخلاقی، اصلاحی اور سبق آموز کہانیاں دلچسپ پیرائے میں سناتے۔ ہر روز ایک نئی کہانی بچوں کی ذہنی واخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی قوتِ تخیل کو جلا بخشتی۔ ہر گلی، محلے میں لائبریریز ہوتیں اور بچے اس کے ممبر بھی بنتے۔ لائبریری سے کتابیں لانے، انہیں پڑھنے اور پھر ان پر گفتگو کرنے میں بچوں کو بہت لطف آتا تھا۔ اب سرکاری اسکولوں کے کتب خانوں کا رواج ہی ختم ہو گیا۔ ایسے میں کتب بینی کا شوق ذوق کہاں سے ہوگا؟ جب رہنما ہی بے خبر ہیں تو راہی سے کیا شکوہ؟ طالب علموں اور بچوں کی کثیر تعداد کہانی سے زیادہ لو اسٹوری میں دلچسپی لیتی ہے۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ بلاشبہ اگر کتابیں ہماری بنیادی ترجیحات میں شامل ہو جائیں تو اس کے مثبت اثرات بھی نظر آئیں گے۔ بے شک کتب بینی محض مشغلہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی عمل ہے جو براہِ راست ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اپنے بچوں کے لیے زہر کا انتخاب کرتے ہیں یا تریاق کا......!

حیرت انگیز امر ہے کہ عالمی یوم اطفال کے موقع پر زور وشور سے بیانات دینے والوں کو اپنی مجرمانہ غفلت کا احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم ان معصوم بچوں کو کیا دے رہے ہیں؟ یہ محض ایک سوال ہی نہیں لمحۂ فکریہ بھی ہے اور عہدِ حاضر کے ستم رسیدہ بچوں کی تاریخ کا المناک باب بھی ہے۔ حقوق سے محرومی بچوں کی شخصیت کو مسخ کر دیتی ہے۔ بڑے مصلحِ دعووں اور وعدوں کا انبار لگا سکتے ہیں لیکن بچے؟ وہ مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر برملا اظہارِ رائے کر سکتے ہیں کہ

ہمارا حال ہم سے کہہ رہا ہے
ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہے

قارئین کرام! بچوں کے تمام مسائل کا حل والدین، اساتذہ، حکومت اور بچوں کے لیے بنائی جانے والی سرکاری اور نیم سرکاری تنظیموں کے پاس ہے، اگر وہ اپنی ذمّے داری محسوس کر کے اس ضمن میں پیش رفت کریں تو ان مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس جانب ان کی توجہ بھی تو ہو، بچے منتظر ہیں کہ کوئی ان کی جانب بھی تو دیکھے، کہنے کو سب ہی بالخصوص والدین اور حکومت دونوں مدعی ہیں کہ بچے ہماری پہلی ترجیح ہیں اور بڑوں کی اس بات کو سن کر بچے بھی آس لگا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ

ہے شام انتظار بھی میری نگاہ میں
کہنے کو التفات کی پہلی کرن میں ہوں

اور یہ بڑی سفاک حقیقت ہے کہ آج بچوں کا حال بہت بے حال ہے۔ انہیں آج کی خوش آئند زندگی کی نوید سنائیں۔ انشاء اللہ ان کا آنے والا کل آج سے بہت بہتر ہوگا شرط اخلاصِ نیت اور اخلاصِ عمل ہے۔

ایک خواہش ہے
اور وہ بھی چھوٹی سی
جو دل میں شور مچاتی ہے
اس بار نہ بننے دیں ہرگز
بچوں کے عالمی دن کو ہم
بچوں کا اُلمی دن ورنہ
یہ پھول چمن کے کُملا کر
شاخوں سے جُدا ہو جائیں گے

عالمی یوم اطفال پر بڑوں کو عہد کرنا ہوگا کہ سال میں محض ایک دن ہی نہیں بلکہ ہر لمحہ، ہر پل، ہر ساعت بچوں کا ہے سو ہمیں ان کے لیے سوچنا بھی ہے اس پر عمل بھی کرنا ہے کہ یہ بچے ہمارے مستقبل کے معمار ہیں۔

☆☆☆

وہ آئے بزم میں......

نزہت اصغر





معروف شاعرہ، پُراثر مصنفہ اور قابل استاد محترمہ سیما سراج سے بھرپور نشست

بے حد پیارے اور قدر دان قارئین کرام کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ آج کی اس بزم میں پاکیزہ کی ایک اور دیرینہ ساتھی ہمارے ساتھ موجود ہیں۔ جنہیں آپ کئی حوالوں سے جانتے ہیں پاکیزہ سے عرصے سے ان کی وابستگی کہانیوں اور شاعری کی صورت تو ہے ہی، ساتھ ساتھ مختلف مواقع پر ان کے خیالات اور تبصروں نے بھی ہمیشہ تمام قارئین کو محظوظ کیا...... آج کل ہماری یہ پیاری سی

رائٹر، شاعرہ اور استاد گورنمنٹ عثمانیہ گرلز کالج ناظم آباد میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔

یہ اپنے قلم سے اصلاحِ معاشرہ اور تربیتِ نسواں کا گرانقدر فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے زیرِ سایہ تعلیم حاصل کرنے والی نوجوان نسل کی ترتیب بھی بخیر و خوبی کر رہی ہیں...... کسی ایک فرد کو بالخصوص لڑکی کو اچھی تعلیم و تربیت فراہم کرنا دراصل ایک پوری نسل کی تربیت کہی جاتی ہے۔ اسی مثبت فکر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پروفیسر سیما سراج معاشرے کی بہتری اور بھلائی کے لیے اپنے حصے کا کام کیے چلی جا رہی ہیں۔ آج کی بزم ان کے ہی خیالات اور افکار سے مزین ہے تو عزیز ساتھیو...... آئیں اپنی پیاری مصنفہ، شاعرہ اور معلمہ سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ ایک اور خوشی کی بات کہ اسی ماہ سیما سراج کی سالگرہ بھی ہے تو ادارے اور قارئین کی جانب سے مبارکباد!

پاکیزہ: ہماری اور تمام قارئین پاکیزہ کی طرف سے سب سے پہلے تو سلام قبول کیجیے۔ اب بتائیں بات آپ کی شاعری سے شروع ہو، نثر نگاری سے یا درس و تدریس سے؟

سیما سراج: ...... سب سے پہلے تو سالگرہ کی مبارک باد دینے کا بہت بہت شکریہ۔ اب آتی ہوں بقیہ جواب کی طرف۔ دراصل درس و تدریس میرا پیشہ ہے اور شاعری و نثر نگاری میرا شوق ہے اور مطالعہ میرا مشغلہ...... میرے والد اور والدہ دونوں پروفیسر ہیں اور شعبۂ ادب سے ان کا تعلق ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں صحافی بنوں لیکن وقت نے مجھے شعبۂ تعلیم سے وابستہ کر دیا اور اس مقدس پیشے کو اپنا کر آج میں لیکچرار سے پروفیسر اور پھر پرنسپل کے عہدے تک پہنچ گئی ہوں۔ یقیناً کسی ادارے کو ذمے داری کے ساتھ سنبھالنا اور خوش اسلوبی کے ساتھ فرائض انجام دینا مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں...... بہت سی مشکلات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں اگر کامیاب ترین نہیں تو کامیاب ضرور ہوں اور میری اس کامیابی میں میرے اسٹاف کا بڑا حصہ ہے۔ جن کا صد فیصد تعاون مجھے حاصل ہے۔

پاکیزہ: اچھا یہ بتائیں کہ آپ کی شاعری اور نثر نگاری کے شوق نے کس حد تک آپ کے پروفیشن میں مدد کی؟

سیما سراج: ...... میں نے اردو ادب میں ایم اے کیا...... ظاہر ہے کہ تمام اصنافِ ادب کے مطالعے کا موقع ملا...... میرا شوق اور میرا پروفیشن دونوں ایک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب پر لیکچر دیتے ہوئے میرا شوق وہی کردار ادا کرتا ہے جو کردار کھانے میں نمک کا ہوتا ہے۔ اگر پروفیشن سے مراد موجودہ عہدہ ہے تو گفتگو میں مخاطب کو متاثر کرنے میں بھی شوق یعنی شاعری و افسانہ نگاری کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ لفظوں سے کھیلنے والے دلچسپ گفتگو کرتے ہیں اور دلچسپ گفتگو کرنے والے کبھی غیر دلچسپ شخصیت نہیں قرار دیے جاتے۔

پاکیزہ: کیا آپ آج کی بھی بچیوں کو بیس سال پہلے والا ہی مشورہ دیں گی کہ ٹیچنگ کا شعبہ ان کے لیے بہتر ہے؟

سیما سراج: ...... بیس سال میں بڑا فرق آ گیا ہے۔ کل کی بچیاں اساتذہ و والدین کے مشورے سے مستقبل کا فیصلہ کرتی تھیں لیکن آج کی بچیوں کو مشورہ لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے فیصلے خود کرنا پسند کرتی ہیں۔ ٹیچنگ کا شعبہ یقیناً خواتین کے لیے باعزت پیشہ ہے لیکن آج کل بچیاں دیگر شعبہ جات میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں۔ میرا مشورہ یہی ہوتا ہے کہ طالبات اپنے رجحان کے مطابق پیشے کا انتخاب کریں۔ (یہ بات تو بالکل درست ہے)

پاکیزہ: آپ نے پہلا شعر کس عمر میں کہا اور کیا تحریک تھی؟

سیما سراج: ...... میں نے شاعری کا آغاز

مختصر تعارفی خاکہ

نام: سیما سراج

ولدیت: پروفیسر سراج ادیب۔

شوہر کا نام: منظور احمد۔

جائے پیدائش: کراچی، میٹرک فرسٹ کلاس، بی اے فرسٹ کلاس۔ ایم اے اردو، فرسٹ کلاس، فرسٹ پوزیشن (گولڈ میڈلسٹ) جامعہ کراچی، شعبۂ اردو۔

تدریسی زندگی کا آغاز ایم اے کے فوراً بعد جناح خواتین یونیورسٹی سے کیا۔ شعبۂ اردو کی پہلی استاد کا اعزاز حاصل کیا ہے بلکہ پہلی صدرِ شعبہ، سندھ پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے اچ آئی گورنمنٹ عثمانیہ گرلز ڈگری کالج ناظم آباد کے شعبہ اردو میں بحیثیت لیکچرر تقرر ہوا۔ اسسٹنٹ پروفیسر پھر ایسوسی ایٹ پروفیسر کے گریڈ پر ترقی کرتے ہوئے اسی کالج میں پرنسپل کے فرائض انجام دے رہی ہوں۔ تدریس کے انتیس سالہ تجربے پر فخر ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں تقریری مقابلوں، بیت بازی، ڈراما، کمپیئرنگ، مضمون نویسی کے مقابلوں میں بھرپور شرکت کی۔ سرسید کالج میں میگزین سکریٹری ڈیبیٹنگ سکریٹری اور سلور جوبلی نمبر میگزین کی ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔

نثری نظم سے کیا...... شاعری کا آغاز افسانہ نگاری کے بعد ہوا۔ مضمون بچپن میں، کہانیاں نوجوانی میں اور شاعری جوانی سے کی۔ کوئی خاص تحریک تو نہ تھی...... بس خاص عمر میں سب کچھ کر گزرنے کو دل چاہتا ہے اور یہ دل ہی تو تھا...... اور یہ دل کی خواہشیں...... آنکھوں کے خواب اور ذہن کے تصورات ہی تو تھے کہ پہلی نثری نظم تخلیق ہوئی۔

پاکیزہ ✽ کہانیاں لکھنے کا خیال کب آیا؟

سیما سراج ❖...... پہلی مرتبہ میری کہانی مقامی اخبار میں دلفیز کے نام سے اس وقت شائع ہوئی جب میری عمر 17 سال تھی...... اور میں گیارھویں جماعت میں سائنس کی طالبہ تھی۔ میں ان بچیوں میں سے ہوں جن کے ہاتھ میں بچپن میں گڑیا نہیں قلم ہوتا ہے۔ جو کھلونوں سے نہیں لفظوں سے کھیلتی ہیں۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✽ آپ کے خاندان میں اس شعبے میں کیا آپ پہلی خاتون تھیں، میرا مطلب شاعری اور نثر نگاری سے ہے؟

سیما سراج ❖...... میرا خیال ہے کہ خاندان میں...... میں پہلی خاتون ہوں جو بحیثیت قلم کار اپنی شناخت بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

پاکیزہ ✽ اس راہ میں یا اس لوح و قلم کی مشقتوں میں کیا، کیا مراحل آئے جب آپ کو اپنا ہنر ختم ہوتا نظر آیا؟

سیما سراج ❖...... نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا...... میرا سفر جاری ہے۔ کبھی، کبھی دیگر مصروفیات کی وجہ سے وقفہ ضرور آیا۔ شادی کے بعد گھریلو زندگی کو سجانے اور سنوارنے اور گھر کو سمجھنے اور گھر والوں کو زیادہ وقت دینے کی وجہ سے میں نے محفلوں و مشاعروں میں شرکت بہت کم کر دی۔ میرے وجود کے ساتھ لوح و قلم کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے روح و جسم کا رشتہ۔

پاکیزہ ✽ کیا عزیز، رشتے داروں نے بھی کسی



76ء سے لکھنے کا آغاز کیا۔ الحمدللہ سفر جاری ہے۔ کہانیاں، نظمیں، غزلیں، افسانے، افسانچے، نظمانے، مضامین، کالم، تبصرے، تنقید، ادبی شخصیات کے انٹرویوز، اخبارِ جہاں، جنگ، نوائے وقت، ایکسپریس، جسارت، عوام، دنیا، انصاف، اوصاف، پاکیزہ، کندن، کرن، کومل، ردا، نازنین، خواتین ڈائجسٹ، دائرے، شعاع، اخبار خواتین، تشکیل، تخلیق، سیارہ، طلوعِ افکار، زیست، انشا، اظہار، سخنور، نجم السحر، ٹیلنٹ، رابطہ، لوحِ ادب، پہچان، ہائیکو انٹرنیشنل، ریشماں، دلکش، دیگر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے باقی فہرست یاد نہیں۔

پہلا افسانوی مجموعہ...... نئی رفاقتیں، 76ء میں منظرِ عام پر آیا۔

آرٹس کونسل کی ممبر ہوں۔ پیشہ درس و تدریس ہے۔ مشغلہ مطالعہ ہے۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شرکت کی۔ مشاعرے منعقد کرائے۔ نظامت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ کمپیئرنگ کا تجربہ بھی کیا۔ پاکیزہ حسنِ کارکردگی ایوارڈ، دوشیزہ ایوارڈ، S,P,L,A ایوارڈ، جگر مراد آبادی میڈل اعزاز شیلڈز حاصل کیں۔ (ماشاءاللہ)

قسم کا نکتۂ اعتراض نہ اٹھایا؟

سیما سراج ❖...... عزیز، رشتے داروں کا مجھے مکمل تعاون حاصل ہے۔ اعتراض تو کبھی نہیں ہوا البتہ تعریفی جملے اکثر و بیشتر سننے کو ملتے ہیں۔

پاکیزہ ✽ چلیں یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ کو ہر دور میں پزیرائی ملتی رہی پھر آپ افسانہ نگاری سے دُور ہو کر کالم نگاری کی طرف کیوں آئیں؟

سیما سراج ❖...... کیا ایسا ممکن ہے کہ جائے گلاس میں اور شربت کپ میں پیش کیا جائے بالکل اسی طرح تمام جذبات و احساسات، تخیلات، تجربات و مشاہدات الگ الگ اصناف کے متقاضی ہوتے ہیں۔ وہ سیاسی و سماجی مسائل جو افسانے میں بہتر طریقے سے میں پیش نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لیے میں نے کالم کو بہتر سمجھا اور یوں زندگی کے دیگر تجربات کی طرح کالم نگاری کا تجربہ بھی کر ڈالا۔ تجربہ کس حد تک کامیاب رہا فیصلہ قارئین کریں گے۔

ویسے بھی شاعری میں نثری نظمیں، نظمیں، غزلیات، نظمانے لکھے۔ نثر میں مضامین، تنقید، تبصرے، کہانیاں، کالم لکھے۔ مختلف شخصیات کے انٹرویوز کیے۔ افسانچے کا تجربہ بھی کیا۔ مزاج، موسم کی طرح بدلتا ہے اور بدلتے موسم کا اظہار اپنے لیے صنف کا انتخاب خود کرتا ہے۔ آج کل بلاگ (کمپیوٹر پروگرامنگ کی ایک ٹرم) پر لکھ رہی ہوں۔

پاکیزہ ✽ ہمارے خیال میں یہ سب جداگانہ جہتیں ہیں، آپ وضاحت فرمائیں؟

سیما سراج ❖...... افسانہ نگاری اور کالم نگاری دونوں جداگانہ جہتیں ضرور ہیں لیکن دونوں ہی نثر کی اصناف ہیں۔ اگر آپ کو نثر لکھنے کا ہنر آتا ہے تو بلاشبہ آپ دونوں جہتوں میں بیک وقت کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن آپ کہاں زیادہ کامیاب ہیں اس کا فیصلہ یقیناً پڑھنے والے بہتر کرتے ہیں...... ویسے مجھے کالم لکھنے میں مزہ آ رہا ہے۔ کیوں؟ شاید نیا تجربہ ہے۔

پاکیزہ ﴾ وہ بنیادی محرکات کون سے ہیں جو آپ کو افسانہ، شعر یا کالم لکھنے کی طرف راغب کرتے ہوں؟

سیما سراج ❖ ...... زندگی کے تلخ واقعات و حقائق کو ہم دیکھتے ہیں، حادثات سے گزرتے ہیں، مختلف خوشی و غم کی کیفیات کو محسوس کرتے ہیں اور ان ہی کیفیات کی شدت اظہار چاہتی ہے...... مختلف لوگ مختلف انداز سے اظہار کرتے ہیں اور قلم کار قلم کے ذریعے...... احساس کی یہی شدت مجھے لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

پاکیزہ ﴾ اچھا پاکیزہ سے ناتا جوڑنے کی کچھ تفصیلات بتائیں؟

سیما سراج ❖ ...... میں نے پاکیزہ ایم اے فائنل میں شاید پڑھا تھا۔ اس وقت کی لڑکیوں کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن ہمارے گھر میں دورِ طالب علمی میں رسالہ خاص طور پر افسانے پڑھنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت اتنے چینل نہ تھے۔ موبائل نہ تھے ٹیلی فون کا دور تھا۔ اخبارات میں بھی بچوں اور طالب علموں کا صفحہ پڑھتے تھے۔ اگر کسی سہیلی سے رسالہ لاتے تو چھپا کر پڑھتے۔ ایم اے اردو میں ہم کورس میں منٹو اور عصمت چغتائی کو پڑھ رہے تھے واجدہ تبسم پر تبصرہ کرتے لیکن حیرت کی بات ہے کہ گھر میں ڈائجسٹ کا سلسلہ ایم اے فائنل میں باقاعدہ شروع ہوا۔ شاید اس لیے کہ اس زمانے میں ہر لڑکی فلمیں دیکھ کر اور افسانے پڑھ کر اپنے آپ کو فلمی ہیروئن سمجھنے لگتی تھی اور شاید منفی اثرات سے بچانے کے لیے ایسا عمل اختیار کیا جاتا ہے۔ پاکیزہ پڑھ کر مجھے پاکیزہ میں لکھنے کا شوق ہوا اور میرا رابطہ بذریعہ ٹیلی فون انجم انصار صاحبہ سے ہوا۔ جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور تقریباً ہر ماہ میری کوئی نہ کوئی کاوش رسالے میں شامل ہوتی۔ میری شہرت میں پاکیزہ کا بڑا حصہ ہے۔ خواتین اور بچیوں میں میری پہچان پاکیزہ کے توسط سے بنی۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ﴾ آپ کے خیال میں کیا ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق کم ہوتا جارہا ہے، اگر ہاں تو کیوں؟

سیما سراج ❖ ...... بلاشبہ کتابیں اور ڈائجسٹ پڑھنے کا رجحان کم نظر آرہا ہے۔ ڈائجسٹ زیادہ تر خواتین پڑھتی ہیں۔ خاص طور پر لڑکیاں لیکن لڑکیوں میں اب موبائل کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ اب انہیں افسانے پڑھنے میں دلچسپی نہیں بلکہ موبائل کے غلط استعمال سے وہ خود افسانے کا کردار بنتی جارہی ہیں...... کہانی کے انجام سے بے خبر۔ (یہ تو بالکل درست کہا)

پاکیزہ ﴾ آپ نے ٹیچر اور پرنسپل کی حیثیت سے ہزاروں لڑکیوں کے رویوں کا مشاہدہ کیا ہوگا، مختصراً بتائیں آج کی لڑکی اس کی سوچ اور بیس سے پچیس سال پہلے کی لڑکی کی سوچ میں کیا فرق پاتی ہیں؟

سیما سراج ❖ ...... آپ نے لیکچرار اور پرنسپل کی حیثیت سے میرے تاثرات پوچھے ہیں تو بحیثیت استاد میں ہر سال دو سے ڈھائی ہزار طالبات کا مشاہدہ کرتی ہوں۔ پہلے بھی بچیاں شریر ہوتی تھیں۔ چند ایک بدتمیز بھی ہوتی تھیں لیکن اکثریت طالبات کی باقاعدہ کلاسسز لیتی تھی۔ اساتذہ کا احترام تھا، کتابوں اور نتائج سے دلچسپی...... غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت جبکہ آج کل کی بچیوں کو شرارت و بدتمیزی کا فرق معلوم نہیں۔ کلاسوں سے دلچسپی نہیں، کتابوں میں رغبت ختم ہوچکی ہے۔ غیر ضروری مشاغل توجہ کا مرکز ہیں۔ خاص طور پر موبائل کا بچیوں کی بربادی میں بڑا حصہ ہے۔ ان کے غیر مہذب ہونے اور اساتذہ کے احترام میں کمی کی وجہ شاید والدین اور اساتذہ دونوں ہیں۔ لیکن میڈیا کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔ پہلے استاد کو دیکھ کر نظریں جھکی اور زبان خاموش ہوتی تھی۔ مگر اب نظریں ملا کر بحث کرتی ہیں لیکن آج بھی اچھی بچیاں ہیں جو قابلِ تعریف ہیں اور نمایاں کامیابی حاصل کررہی ہیں۔ (اچھائی برائی تو ہر جگہ ہے ناں)

پاکیزہ ﴾ اپنی کاوشوں میں سے کس پر زیادہ پزیرائی پائی نظم یا نثر؟

سیما سراج ❖ ...... مجھے نثر پر زیادہ پزیرائی ملی۔



شاید اسی لیے کہ میں نے شاعری کم کی ہے اور زیادہ توجہ نثر کو دی ہے۔ نثر یقیناً طاقتور ذریعۂ اظہار ہے۔

پاکیزہ ﴾ کیا بغیر دلی واردات ہوئے گہری اور پُرفکر شاعری ہوسکتی ہے؟

سیما سراج ❖ ...... بغیر دلی واردات سطحی شاعری تو ہوسکتی ہے پُرفکر شاعری ممکن نہیں۔ (آ...... ہم)

پاکیزہ ﴾ شاعری میں اور نثر میں کن سے شعراء ادیبوں کو پڑھا، کن سے متاثر ہوئیں یا کن شعرا کا رنگ و اثر لیا نیز افسانہ اور ناول نگاری میں کن شخصیات سے متاثر ہیں آپ سے پہلے یا آپ کی ہم عصر اور آج کل کی رائٹرز میں سے بھی بتائیں؟

سیما سراج ❖ ...... دورانِ تعلیم اور تدریس کے دوران تقریباً تمام معتبر کلاسیکی شعرا اور 47 کے بعد کے شعرا کو پڑھنے کی کوشش کی اور پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ غالب، اقبال، فراز، فیض کو دلچسپی سے پڑھا انشا (ابن انشا) پسند آئے۔ پروین شاکر کی شاعری بار بار پڑھی لیکن کبھی کسی شاعر کے رنگ و اثر کو قبول نہ کیا...... اپنا ایک منفرد راستہ بنایا، جداگانہ روش اختیار کی۔ جوش کی نظم شکستِ زنداں کا خواب اور نظیر اکبر آبادی کی عوامی موضوعات پر نظمیں پسند ہیں۔ نثر میں منٹو، واجدہ تبسم، عصمت چغتائی بلاشبہ بے باک افسانہ نگار ہیں۔ انسانی نفسیات اور فطرت کی بھرپور تصویر کشی کی۔ قدرت اللہ شہاب کی یا خدا ...... ایک لمبی فہرست ہے۔ میٹرو ون چینل پر دو سال حاصلِ مطالعہ پروگرام میں اردو افسانہ اور افسانہ نگاروں پر بحیثیت مبصر تبصرہ کیا۔ اس طرح مجھے بڑے، بڑے افسانہ نگاروں کے فن کو سمجھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ بڑے افسانہ نگاروں نے چھوٹے افسانے بھی لکھے اور چھوٹے افسانہ نگاروں نے بڑے، بڑے اہم موضوعات پر خوب صورت کہانیاں لکھیں۔ متاثر نہیں ہوئی ہوں لیکن پسند ضرور آئے۔ آج کل کی رائٹرز کے نام نہیں لوں گی کیونکہ محفل میں بیٹھ کر پسندیدگی کے لیے چند شخصیتوں یا لوگوں کی طرف اشارہ نہیں کرسکتی۔ سب نہ ہی اچھا لکھتے ہیں اور نہ ہی برا...... لیکن لکھ رہے ہیں۔ یہ ایک اطمینان بخش بات ہے۔ (کافی مصلحت پسندی سے کام لیا آپ نے)

پاکیزہ ﴾ آپ کو دل کی بات کہنا تو مشکل نہ لگتا ہوگا،

کبھی جملے داغ دیے، کبھی شعر سنا دیا..... کیا خیال ہے؟

سیما سراج ❖......(مسکراتے ہوئے) آپ نے سچ کہا۔ برمحل جملے اور اشعار گفتگو کو خوب صورت بنا دیتے ہیں۔ دل کی بات بھی کہہ لیتے ہیں اور مخاطب برا بھی نہیں مانتا۔ ذو معنی جملے پر صاحب ذوق ہوا تو مسکرا دیتا ہے۔ دل کی بات بھی کہہ لی اور بات بگڑنے بھی نہ پائی۔ (واہ بہت خوب)

پاکیزہ❁زندگی میں رونما ہونے والی کوئی تبدیلی جب آپ کی سوچ کا ٹریک بدلا؟

سیما سراج ❖......زندگی میں بے شمار حادثات و واقعات، دلچسپ و غیر دلچسپ مراحل آتے ہیں۔ دکھ، سکھ کے مرحلے، ناکامی و کامیابی کی ساعتیں۔ نشیب و فراز سے گزر کر ہی جینے کا ہنر آتا ہے۔ شادی سے پہلے اپنی روایات اور مشرقی تربیت کی وجہ سے میری کہانی کا کردار بیڈ روم کے دروازے پر ٹھہر جاتا تھا اور مختصر علامتی جملے پر کہانی کا اختتام کرنا پڑتا تھا لیکن شادی کے بعد میرے کردار بیڈ روم کے اندر بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں اور میں انہیں رقم کرتی ہوں۔ زندگی کے ایک بڑے حادثے سے گزر کر میں نے نظموں اور نثر سے ہٹ کر غزل لکھی......اور یوں غزلیات کا آغاز ہوا گہرا احساس گہری بات کہلا دیتا ہے۔ سوچ کا ٹریک بدل سکتا ہے اور بدل بھی جاتا ہے۔ مگر عادت و فطرت نہیں بدلی۔ بقول شاعر، حوادث سے الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے۔

پاکیزہ❁آپ کس کے لیے لکھتی ہیں، اپنی ذات کی تسکین یا شہرت کا چسکا یا پھر رعب ڈالنے کی غرض......؟

سیما سراج ❖......ذات کی تسکین اور شہرت دونوں کے لیے، رعب ڈالنا مجھے پسند نہیں۔

پاکیزہ❁بھئی اب طرح، طرح کے سوالات سے ہی شخصیت کے چھپے پہلو اجاگر ہوتے ہیں تو سوالات تو ہر طرح کے کرنے پڑیں گے آپ کو برا تو محسوس نہیں ہو رہا؟

سیما سراج ❖......بالکل نہیں مجھے آپ کے سوال اچھے لگ رہے ہیں۔ (شکریہ)

پاکیزہ❁اچھا اب ذرا اپنے رویّوں کے بارے میں بتائیں، خوش خلقی قریبی دوستوں تک ہی ہے یا پبلک ڈیلنگ میں بھی یہ صفت نمایاں ہوتی ہے؟

سیما سراج ❖......مجھے محبت و خوش خلقی کا رستہ پسند ہے لیکن حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی رستہ بدلنا بھی پڑتا ہے۔

پاکیزہ❁ایک عام تاثر ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے......عورت کسی عہدے پر پہنچ کر اکھڑ، مغرور اور خود غرض ہو جاتی ہے۔ آپ کا کیا تجربہ ہے؟

سیما سراج ❖......عہدہ عطا کرنے والی ذات اللہ کی ہے اور وہ غرور پسند نہیں کرتا...... عہدہ و منصب عطا کرنے والا چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ یہی سوچ مجھے غرور سے بچاتی ہے۔ (بے شک)

پاکیزہ❁کوئی دلچسپ واقعہ اپنی تدریس کے دوران کا؟

سیما سراج ❖......جی ہاں مجھے تو دلچسپ لگا تھا ایک دن جب میں کلاس لینے کے لیے کاریڈور سے گزر کر اپنے کلاس روم تک جا رہی تھی تو اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کلاس ہو رہی ہے لیکن یہ کسی اسٹاف ممبر کی آواز نہیں تھی بلکہ کسی لڑکی کی تھی جو میری نقل کرتے ہوئے میرے انداز میں طالبات کو اردو شاعری پڑھا رہی تھی۔ طالبات مزے لے رہی تھیں، ان کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ کہہ رہی ہیں کہ مس سیما بالکل اسی طرح بولتی ہیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہروں پر تھوڑا خوف تھا اور وہ لڑکی جو لیکچر دے رہی تھی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جب میں نے کہا کہ آپ لیکچر جاری رکھیں، میں سن رہی ہوں اور طالبات کے ساتھ میں خود بھی بیٹھ گئی۔ مجھے اچھا لگا مذاق، شرارت، لطف اندوزی، گہرا مشاہدہ، پہلے کچھ رنگ ہی اور تھا۔ اب نہ وہ اساتذہ ہیں اور نہ وہ طالبات، معاشرے کی تبدیلی



دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ بحیثیت رائٹر اور استاد میں اس تبدیلی کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہوں اور اسی موضوع پر کئی مضامین لکھے۔ (واقعی)

پاکیزہ❁آپ نے اپنے تنظیمی امور انجام دینے میں کسی خاص بات کا خیال رکھا یا گورنمنٹ کے دیگر اداروں کی طرح چل چلاؤ کی پالیسی کا حصہ بنیں؟

سیما سراج ❖......تنظیمی امور میں، میں نے اپنی درس گاہ کو ہمیشہ گھر کا درجہ دیا اور جس طرح اپنے گھر کی حفاظت، سجاوٹ، دلچسپی کے ساتھ کرتی ہوں اور وقت دیتی ہوں بالکل اسی طرح کالج کا بھی خیال رکھتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے کالج میں بلاشبہ اسٹاف کے ساتھ پُرسکون اور گھریلو ماحول ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے عہدے کی ذمے داری اگر آپ سنجیدگی سے نہیں نبھا سکتے یا وقت نہیں تو پھر دستبردار ہو جائیں اگر آپ کے پاس ضمیر ہے تو چل چلاؤ کی پالیسی شرمندگی کے سوا کچھ نہیں۔ (بالکل درست فرمایا)

پاکیزہ❁ایک ورکنگ وومن کی حیثیت سے گھر اور ملازمت میں کس طرح توازن برقرار رکھا؟

سیما سراج ❖......میری ملازمت آدھے دن کی ہے یہی وجہ ہے کہ میں آدھا دن ادارے اور آدھا دن گھر کو دیتی ہوں اسی لیے توازن قائم ہے۔ (اللہ ایسا توازن تمام ورکنگ لیڈیز کو دے)

پاکیزہ❁آپ کے شوہر اور بچے کس حد تک متاثر ہوئے یا وہ معاون ہی ثابت ہوئے؟

سیما سراج ❖......میری بیٹی شعبۂ سائنس سے تعلق رکھتی ہے اور بیٹا کامرس سے...... اردو ادب سے ایک خاص فاصلے کے باوجود وہ میری شہرت اور تحریروں سے خوش ہوتے ہیں......اور فخریہ کہتے ہیں کہ ہماری امی پرنسپل ہیں۔ ارے سیما سراج آپ جانتی ہیں وہ تو ہماری امی ہیں۔ میرے بچے اپنے باپ کی طرح محبت والے ہیں اسی لیے ان کی محبت میرے لیے مکمل تعاون ہی ثابت ہوئی۔

پاکیزہ❁اپنی ذات پسند یا ناپسند کو کس حد تک ترجیح دیتی ہیں؟

سیما سراج ❖......میں نے بچپن سے اپنی ذات اور پسند پر دوسروں کے مفاد اور پسند کو ترجیح دی...... دوسروں کو خوش رکھنے کے لیے اپنی ذات کی قربانی دینی پڑتی ہے اور قربانی کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ (بے شک اس کے لیے بھی حوصلہ چاہیے)

پاکیزہ❁چلیں اپنی پسند کے بارے میں ہمارے قارئین کو بھی بتائیں؟

سیما سراج ❖......میری پسند میرا گھر، میرے بچے، میری جنت......

پاکیزہ❁پسندیدہ موسم، فلیور، ڈش، رنگ، تفریحی مقام، کتاب، شخصیت، خوشبو، جملہ، شعر؟

سیما سراج ❖...... پسندیدہ موسم، برسات۔ فلیور، مینگو۔ ڈش، دال، چاول، اچار۔ کتاب، کوئی

مخصوص نہیں۔ خوشبو، گلاب، موتیا۔ جملہ، تم میری ہو صرف میری۔ رنگ، سفید۔ تفریحی مقام، ساحلِ سمندر۔ گیلی ریت، لہریں، ننگے پاؤں۔ شخصیت، قائداعظم اسٹائل۔ شعر، میرا اپنا شعر۔

بہلاتی رہی کھیل کے زخموں سے میں دل کو
سیماؔ بڑے دکھ جھیل کے جینے کا ہنر آیا

پاکیزہ ❖ اب تک کی زندگی سے آپ نے کیا سیکھا کہ زندگی اصل میں ہے کیا یا یوں سمجھیں کہ مقصدِ حیات کیا ہے؟ تین جملوں میں؟

سیما سراج ❖...... زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ ہاں آپ خوش رہنا چاہتے ہیں تو دوسروں کی خوشی کا خیال رکھیں۔ نفرت وحسد کی جگہ محبت کریں۔ کسی کو فتح کرنے کے لیے محبت بہترین ہتھیار ہے۔ (کاش سب لوگ یہ روش اپنا لیں)

پاکیزہ ❖ جیون ساتھی کے بارے میں کچھ بتائیں، آپ کی کامیابی میں ان کا کس قدر حصہ ہے؟

سیما سراج ❖...... جیون ساتھی، میرے ہر قدم پر میرا اہم قدم۔ ہر لمحہ میری خوشی وغم کا شریک۔ کامیابی کی جانب سفر میں، میرا اہم سفر کبھی مجھ سے دور نہیں ہوا۔ اس کے یقین واعتماد کو میں اپنی کامیابی کا بڑا حصہ قرار دوں گی۔ (بلاشبہ) ہمارے دکھ ہماری خوشی مشترکہ ہے۔ ان کی سلامتی میری دعا ہے۔ (الٰہی آمین)

پاکیزہ ❖ بہترین شوہر یا آئیڈیل شوہر کون ہوتا ہے، تین خواص بتائیں، اسی طرح آئیڈیل بیوی کی تین بنیادی صفات؟

سیما سراج ❖...... بہترین شوہر، پہلی خوبی...... اعتماد۔ دوسری خوبی...... محبت۔ تیسری خوبی...... شرافت ووقار۔

بہترین بیوی...... وفاداری، قربانی وایثار، سلیقہ مند اور ایثار انسان اسی وقت کرتا ہے جب محبت ہو۔

پاکیزہ ❖ بچوں کی زندگی ان کے کیریئر کے متعلق فیصلے کون کرتا ہے یا کس کو کرنے چاہئیں؟

سیما سراج ❖...... میں وزیرِ داخلہ ہوں اور وہ وزیرِ خارجہ ویسے بچوں کا فیصلہ ہم باہمی مشورے سے کرتے ہیں کیونکہ ہم دونوں ہی بچوں کے سرپرست ہیں اگر ذہنی ہم آہنگی ہو تو فیصلے مشترکہ ہونے چاہئیں۔ بچے سمجھدار ہوں تو ان کی پسند اور مشورہ بھی اہم ہے۔

پاکیزہ ❖ کیا آپ بچوں یعنی اپنے سے چھوٹوں سے بھی کچھ نہ کچھ سیکھنے پر یقین رکھتی ہیں؟

سیما سراج ❖...... کبھی بچوں یا چھوٹوں کے سوال ہمیں چونکا دیتے ہیں اور سوچ کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ ہم بچوں کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ سیکھنے کا عمل وقت اور عمر کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے اس دور میں، میں اپنے بچوں سے موبائل، نیٹ اور دیگر جدید آلات کے بارے میں سیکھتی ہوں۔ سائنسی اصطلاحات یا دیگر اسٹاک ایکسچینج، بینکنگ...... بہت سی چیزیں ہمارے دور میں نہ تھیں۔ اپنے دور کی باتیں میں انہیں سکھاتی ہوں اور ان کے دور کی باتیں ان سے سیکھتی ہوں اور سمجھتی ہوں۔ بہت سی چیزیں موجود بھی تھیں تو ہر گھر میں ہر چیز موجود نہیں ہوتی۔ سیکھنا پڑتا ہے، شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی آج کل کے بچے بڑوں کے استاد ہیں بلکہ استادوں کے استاد...... (جی ہاں)

پاکیزہ ❖ کن رویوں کو اور کس قسم کے لوگوں کو آپ یاد نہیں رکھتیں؟

سیما سراج ❖...... مجھے بھول جانے کی عادت ہے وہ تمام باتیں جو کسی لمحے میرے لیے دکھ کا سبب بنیں، وہ تمام لوگ جو مجھ سے حسد کریں۔ بحیثیت انسان محسوس کرتی ہوں، غصہ آتا ہے پھر بھول جاتی ہوں۔ شاید یہ قدرت کی مہربانی ہے اور اگر یاد بھی رہتا ہے تو صرف وہ خوبیاں جن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خامیاں نظرانداز کی جا سکتی ہیں۔ مجھے معاف کر دینے کی عادت ہے اور شاید یہی میری خوشی کی ضمانت ہے۔

پاکیزہ ❖ کیا آج کی عورت نے اپنا درست مقام پا لیا ہے؟



سیما سراج ❖...... نہیں...... آج کی عورت کو خود بھی نہیں پتا کہ اس کا درست مقام کیا ہے۔ جس دن وہ اپنے مقام کا تعین کر لے گی۔ وہ اپنے اصل مقام تک پہنچ جائے گی۔

پاکیزہ ❖ تحریکِ آزادیِ نسواں...... ہمارے ہاں کیا تصور ہے اور اس کا اصل تصور کیا ہے؟

سیما سراج ❖...... تحریکِ آزادیِ نسواں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم تمام مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور روایتی وخاندانی قواعد سے آزاد ہو جائیں۔ بلکہ آزادیِ نسواں کا مطلب ہے کہ عورت کو وہ تمام جائز حقوق وتحفظ حاصل ہوں جو اللہ ورسول ﷺ نے دیے ہیں۔ معاشرے میں باعزت و پُروقار مقام ہو۔ عورت کو تعظیم دی جائے اس کی عزت وحرمت، پسند ناپسند کو فوقیت دی جائے۔ اس سے وابستہ تمام رشتے قابلِ احترام سمجھے جائیں۔ (کاش کہ ایسا ہو)

پاکیزہ ❖ آج کل ڈائجسٹ کو تو چھوڑیں کتب بینی کا ہی رجحان کم ہوتا جا رہا ہے اس کی کیا وجہ ہے اور اس پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے؟

سیما سراج ❖...... گلوبل ویلیج، جدید ٹیکنالوجی، الیکٹرانک میڈیا اور موبائل اصل وجہ ہیں۔ ڈائجسٹ کی جگہ ڈراموں اور فلموں نے لے لی ہے۔ کتابوں کی جگہ موبائل نے، کتب بینی کی جگہ بھی چینلز اور فلموں نے لے لی ہے۔ شوق پیدا کرنا ہوگا۔ بچوں کو راغب کرنا ہوگا۔ معاشرہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اقدار بدل گئی ہیں۔ ہمیں اپنی اقدار بچانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ (مگر آج کی مائیں تو خود ہی اس کا شکار ہو چکی ہیں)

پاکیزہ ❖ اپنی اسٹوڈنٹس کو اکثر کیا نصیحت کرتی ہیں یا آٹوگراف بک میں کیا لکھتی ہیں؟

سیما سراج ❖...... زندگی کے سفر میں کبھی مایوس مت ہونا، زندگی کی خوب صورتی تمہیں آواز دے رہی ہے۔ ہمت ہار جانے والے زندگی ہار جاتے ہیں۔ پُروقار زندگی کے لیے ناامیدی کو شکست دینی پڑتی ہے۔ خدا کی ذات پر یقین اور حوصلہ کامیابی کی ضمانت ہیں۔ (بالکل)

پاکیزہ ❖ چلیں ہمارے پاکیزہ قارئین کو بھی اپنی پُراثر افکار سے نوازیں؟

سیما سراج ❖...... پاکیزہ کے لیے میں صرف اتنا کہوں گی کہ اللہ کرے اس کی پاکیزگی ہمیشہ برقرار رہے۔ اس کی دوشیزگی پر اتنا نکھار آئے کہ ہر پڑھنے والے اور دیکھنے والے کو پیار آ جائے۔ محبت وپیار کا یہ رشتہ پاکیزہ سے ہمیشہ برقرار رہے۔

پاکیزہ ❖ آج کی نوجوان نسل سے آپ کس حد تک پُرامید ہیں؟

سیما سراج ❖......

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

پاکیزہ ❖ اچھا اپنا تازہ ترین افسانہ کب دے رہی ہیں؟ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں؟

سیما سراج ❖...... کوشش کروں گی بہت جلد...... ایک کہانی شروع کی تو تسلسل سے کئی کہانیاں بنتی چلی جائیں گی۔

پاکیزہ: آپ کو اس بزم میں آنا کیسا لگا؟

سیما سراج ❖...... یہ وہ بزم ہے جس سے جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ جب سے شریک ہوئی ہوں کسی نہ کسی روپ میں موجود ہوں۔ انجم مجھے بھلاتی نہیں ہیں اور پاکیزہ کا پیار مجھے جانے نہیں دیتا۔ کہیں جاتی بھی ہوں تو لوٹ کر پھر واپس آجاتی ہوں۔

پاکیزہ ❖ اب اپنے پاکیزہ کے لیے اپنے قیمتی تاثرات و خیالات سے آگاہ کیجیے بلکہ اس کی مزید بہتری اور نکھار کے لیے کوئی تجویز، مشورہ ہو تو......؟

سیما سراج ❖......ناول، ناولٹ، افسانوں اور مختصر کہانیوں کا مطالعہ میں کرتی ہوں۔ افسانچوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا اضافہ مزید دلچسپی میں اضافے کا سبب ہوگا۔ پاکیزہ سے وابستہ تمام شخصیات اور قلم کار بہنیں زبردست لکھ رہی ہیں۔ انجم کا مزاج پسند ہے، منفرد انداز ہے۔ تفصیلی تبصرہ کروں گی تو کئی صفحات کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس کے لیے علیحدہ سے خط لکھوں گی۔ (جی ضرور)

پاکیزہ ❖ آخر میں اپنا خود کا پسندیدہ کلام بھی سنائیں؟

سیما سراج ❖...... مجھے اپنی یہ نظم پسند ہے جو کسی خاص لمحے میں لکھی تھی۔

وہ لمحے وہ ملاقاتیں

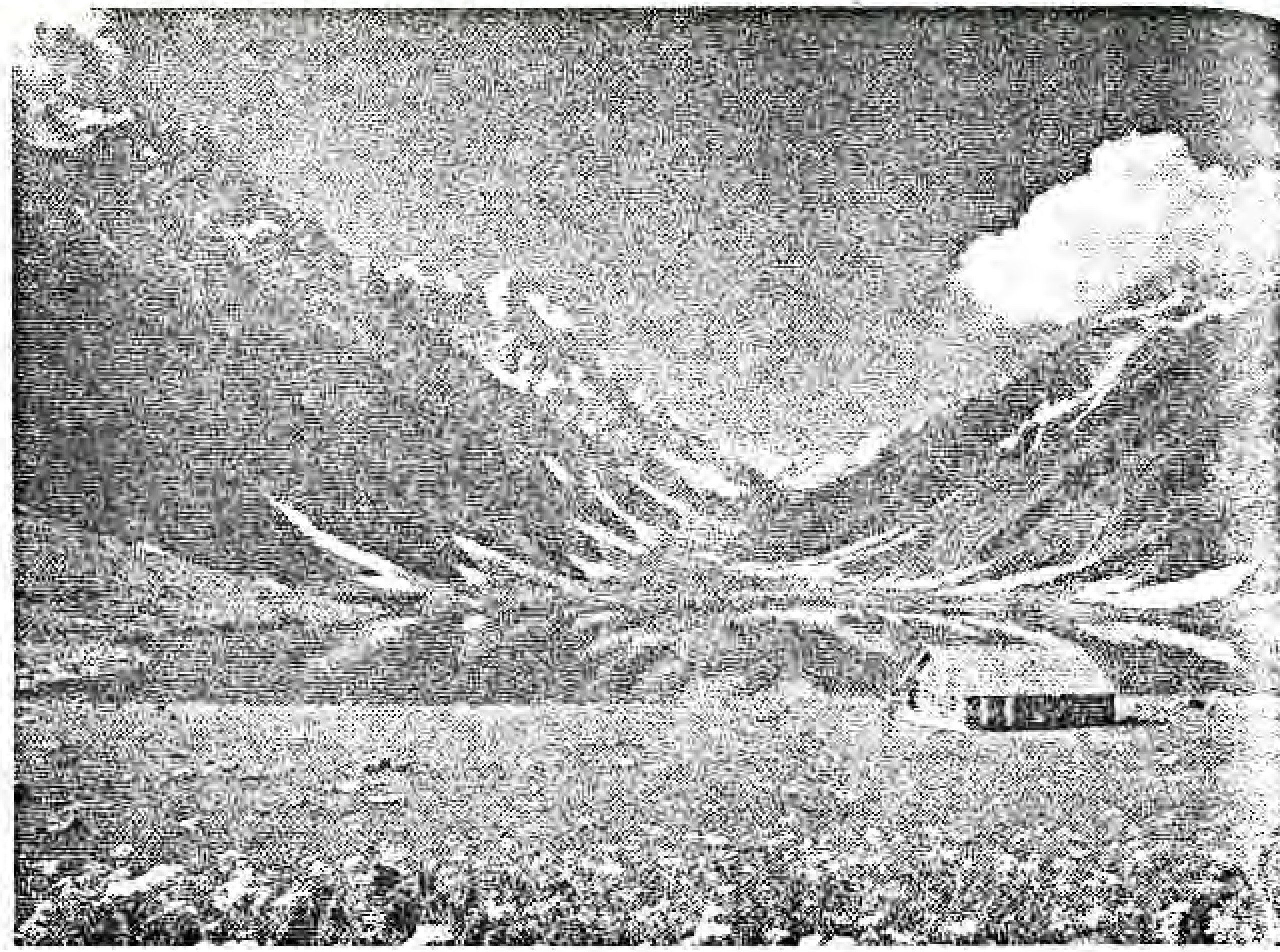
گئے لمحو! کبھی تو لوٹ آؤ
وہ دلکش ساعتیں بھی ساتھ لاؤ
جو میری عمر رفتہ کے
کسی پُرکیف گوشے میں
نشاطِ وصل کی رعنائیوں کو چھوڑ آئی ہیں
وہ بھی، بھی سی کچھ ان کہی باتیں
وہ راتیں وہ ملاقاتیں
وہ زیرِ لب تبسم
یا فقط ایک دوسرے کو تکتے رہنا
کبھی خاموشیوں کی رو میں بہنا
کبھی آنکھوں کا کچھ آنکھوں سے کہنا
وہ لمحے جسم و جاں کی سرخوشی کے
وہ لمحے اِک سہانی زندگی کے
رگوں میں دھیمی، دھیمی آنچ سے پگھلے ہوئے جذبے
حیا کی سرخیوں میں نو بہارِ حسن کے جلوے
سبھی پُرکیف لمحے اب تو ایک خوابِ پریشاں ہیں
وہ جلوے جتنے تھے نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہیں
کہاں وہ عہد و پیماں ہیں
کوئی شعلہ سا میری روح کو دہکا رہا ہے
بدن سلگا رہا ہے
یہ تنہائی کا غم کب تک سہوں میں؟
کسی سے کیا کہوں میں
گئے لمحو! کبھی تو لوٹ آؤ

☆☆☆

بہت خوب سیما سراج صاحبہ...... آپ سے بات چیت کر کے اور آپ کے قیمتی خیالات جان کر بہت لطف آیا اور یقیناً ہمارے باذوق قارئین بھی لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ آپ نے بہت سے پہلوؤں پر سیر حاصل باتیں کیں۔ بس آپ کی تحریر کا انتظار رہے گا۔ ہماری دعا ہے کہ آپ اپنے ہنر، قابلیت اور تجربے سے اسی طرح نسل در نسل علم کی شمعیں روشن کرتی رہیں اور یہ معاشرہ ایک تہذیب یافتہ اور تعلیم و تربیت یافتہ معاشرہ کہلانے کا حقدار ٹھہرے اسی کے ساتھ اجازت طلب کرتے ہیں...... انشاء اللہ آئندہ کسی اور پسندیدہ مہمان کے ساتھ اس بزم میں حاضر ہوں گے۔ بس قارئین ہماری یہ مختصر اور پُراثر بات یاد رکھیں کہ خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھیں زندگی سہل ہو جائے گی۔ اس نشست پر آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا...... اللہ ہم سب کا نگہبان ہو۔

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆



میں اور میرا شہر کاغان

حیا ترمذی

میں صوبہ خیبر پختونخواہ کے ضلع مانسہرہ کی خوبصورت وادی ''وادیِ کاغان'' کی باسی ہوں۔ پرائمری تعلیم ایبٹ آباد اور میٹرک کاغان ہائی اسکول سے کیا۔ میری تعلیم ایم اے اردو + بی ایڈ ہے۔ میں چھ سال سے شہر اور گاؤں کے مختلف پرائیویٹ اسکولز میں پڑھا رہی ہوں۔ نمازِ پنجگانہ کی پابند ہوں۔ تلاوتِ قرآن پاک میرے دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ کسی حد تک سوشل ورکر بھی سمجھ لیں۔ غربا اور مساکین کی مدد کرنا میرے لیے باعثِ طمانیت ہے۔ فطری طور پر شاعرہ ہوں سو وہ تمام چیزیں پسند ہیں جن سے ایک شاعر کو دلچسپی ہوتی ہے۔ جیسے کہ پھول، خوشبو، تتلیاں، جگنو، چاند، تارے، نیلگوں آسمان میں اڑتے روئی کے گالوں جیسے بادل، چہچہاتے پرندے، پہاڑوں پر غروب آفتاب کا منظر، دریا، سبزہ، جنگل، آبشار، جھیلیں، خاص طور پر جھیل سیف الملوک...... میرے مشاغل شاعری کرنا، موسیقی سننا، کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا، پاکیزہ پڑھنا، پسندیدہ لباس، لمبی فراک کے ساتھ جینز اور چوڑی دار، شلوار قمیص، کھانوں میں آلو، مٹر کے علاوہ سبھی کچھ پسند ہے۔ فیورٹ کلرز، خدا کے بنائے ہوئے سبھی رنگ پسند ہیں لیکن خاص طور پر وائٹ، پنک، اسکائی بلیو اور لیمن کلر...... پسندیدہ رائٹرز، پاکیزہ میں لکھنے والی تمام رائٹرز پسند ہیں خاص طور پر انجم باجی، ساجدہ حبیب، عنیزہ سید، نمرہ احمد اور عمیرہ احمد بہت پسند ہیں۔ پسندیدہ شعرا میں اقبال، پروین شاکر، احمد فراز، فتیل شفائی، فیض احمد فیض،

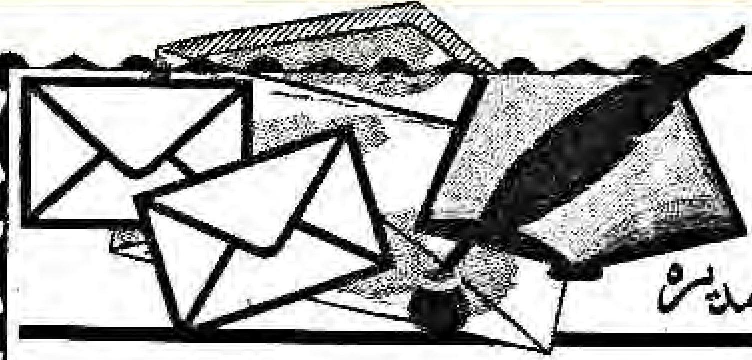
ناصر کاظمی، غالب، میرا جی اور وصی شاہ شامل ہیں۔ ذہین لوگوں سے بہت امپریس ہوتی ہوں۔ رہا دوستی کا سوال تو میری دوستی اور تعلق پاکیزہ سے ہے۔ جو بہت پرانا ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ پاکیزہ میں جو پہلی کہانی پڑھی تھی۔ اس کہانی اور کہانی میں ہیروئن کا نام بھی پاکیزہ تھا۔ پاکیزہ سے اس محبت نے میرے اندر اِک تحریک سی پیدا کردی کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ پاکیزہ پڑھتے، پڑھتے میرے اندر یہ خواہش پروان چڑھتی گئی کہ کاش میں بھی رائٹر بن جاؤں۔ میرا بھی پاکیزہ میں نام آئے۔ یوں تو اور بھی کئی کتابیں اور رسالے پڑھے مگر جو محبت پاکیزہ سے ہے وہ کسی اور رسالے سے نہ ہوسکی۔ پاکیزہ سے محبت جنون میں تب بدلی جب عمیرہ احمد کے ناول ''عکس'' کی پہلی قسط پڑھی۔ اب تو پاکیزہ سے عشق ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں پاکیزہ کی کیسے تعریف کروں۔ پاکیزہ کی پوری ٹیم، خاص کر لکھاری بہنوں اور خاص کر پیاری باجی انجم اور باجی عذرا کی تعریف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ میں ان دونوں پیاری ہستیوں سے بہت امپریس ہوں۔ خدا ان دونوں پیاری ہستیوں کی طرح ہر مسلمان عورت کو ایسے ہی پاکیزہ خیالات، پاکیزہ کردار کی دولت نصیب کرے (آمین)۔ پاکیزہ میں لکھی جانے والی ہر تحریر خیر کی نمائندہ ہے۔ انجم باجی کا اداریہ اور جلترنگ تو رسالے کی شان ہیں۔ پیارے قارئین! آج جو یہ قلم میرے ہاتھ میں ہے اور میں لکھ رہی ہوں اس کا سارا کریڈٹ انجم باجی کو جاتا ہے۔ جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔

اب آتی ہوں اپنی جنت نظیر وادی ''وادیِ کاغان'' کے تعارف کی طرف، پیارے قارئین! پیارے وطن پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں سیاحت کا مرکز وادیِ کاغان سطح سمندر سے تقریباً 7500 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے دل کی دھڑکن ہے جو اپنے دلفریب حسن، قدرتی مناظر، بدلتی ہوئی لحہ بہ لحہ آب و ہوا کے سنگ، دودھ کی طرح سفید فلک بوس کوہسار .....اور گلیشئرز.........دل کی امنگوں میں آبشاروں کے رس گھولتے ہوئے سُروں کے سنگ، سنگ اور وادی کی خوب صورت جھیلوں کے طلسماتی نیلگوں پُرکیف نظارے نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک سے آئے ہوئے سیاحوں کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ وادیِ ناران، وادیِ کاغان کا قلب ہے اور جھیل سیف الملوک اس وادی کے ماتھے پر اِک سنہری تاج ہے یوں تو سارا سال اس کے خوب صورت رنگ برف کی چادر اوڑھے بلند و بالا پہاڑ، خوب صورت پھولوں سے لبریز سرسبز میدان، آبشاروں سے گرتے ہوئے پانی، ہرے بھرے جنگلات، دل کی تانوں کو چھیڑتی ہوئی ندیوں کے نظارے، پرندوں کی میٹھی میٹھی بولیاں، نیلگوں جھیلیں اس وادی کی پہچان ہیں۔ اس پُراثر وادی کے رنگین نظارے ہر جاندار کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے کچے پکے راستے انسان کو محوِ حیرت بنائے ہوئے ہیں۔ اس وادی میں تقریباً تو چھوٹی بڑی خوبصورت جھیلیں ہیں۔ وادیِ کاغان بالاکوٹ کے بعد شروع ہوتی ہے۔ بالاکوٹ سے سڑک پختہ اور کشادہ ہے اس لیے سفر بھی آرام دہ ہوتا ہے۔ یہاں سوئی گیس کے علاوہ ہر طرح کی جدید سہولتیں میسر ہیں۔ تاریخی لحاظ سے یہ بہت اہم وادی ہے۔ اس کی خوب صورتی کے چرچے پوری دنیا میں ہیں۔ یہ وادی شہید مسلمان مجاہدین کی امانت ہے۔ یہاں پر ہر نسل کے لوگ آباد ہیں جن میں سادات، فضل کشمیری، سواتی، خان، اعوان، درانی، کثرت سے آباد ہیں۔ گرمیوں میں دوسرے علاقوں سے پٹھان، گوجر اور کوہستانی یہاں آکر رہائش پزیر ہوجاتے ہیں۔ یہاں کی مقامی زبان ہندکو ہے۔ جس کی تاثیر بہت میٹھی ہے۔ لوگ انگریزی، اردو، پنجابی، پشتو اور سرائیکی سے اچھی طرح آشنا ہیں یہاں کا پسندیدہ

کھیل کرکٹ اور والی بال ہے۔ اکثریت پڑھی لکھی ہے۔ یہاں کے لوگ بہت مہمان نواز اور وسیع القلب ہیں۔ یہاں گندم، مکئی، مٹر، آلو، لوبیا اور مختلف سبزیاں کاشت کی جاتی ہیں یہاں دنیا کے نایاب ترین جانور اور پرندے پائے جاتے ہیں۔ وادی میں ان کا شکار ممنوع ہے۔ سردیوں میں برف کے باعث راستے بند ہوجاتے ہیں لیکن گرمیوں میں یہ وادی خوشگوار موسم کے سبب جنتِ ارضی بن جاتی ہے۔ گرمیوں میں بھی راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ اکثر آسمان پر بادل چھائے رہتے ہیں۔ وادیِ کاغان کی لوک داستانیں بہت مشہور ہیں جن میں سیف الملوک کی رومانوی داستان وادی کی دھڑکن ہے۔ سیف الملوک اور پری بدیع الجمال کی داستان یہاں کا بچہ، بچہ جانتا ہے۔ ہر سال ملک اور بیرونِ ملک سے لوگ اس وادی کی سیاحت کے لیے آتے ہیں۔ اس سال سیاحت کے لیے آنے والوں کی تعداد 10 لاکھ تک ریکارڈ کی گئی ہے۔ 2005ء میں آنے والے زلزلے نے یہاں بہت تباہی مچائی۔ لیکن حکومتِ پاکستان نے یہاں پھر سے تمام سہولتیں بہم پہنچانے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اور اب پھر سے یہ وادی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ وادیِ کاغان بالاکوٹ سے لے کر بابوسر پاس تک تقریباً 800 مربع کلومیٹر کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ قصبۂ کاغان وادی کا ہم نام ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ وادی میں قصبۂ کاغان کی رونقیں چہل پہل اور سیاحوں کی آمد اس وادی کو پُرکشش اور پُررونق بنادیتی ہے۔ یہاں کا سادات قبیلہ زمینوں کا مالک ہے۔ یہاں سردیوں میں روزگار نہ ہونے کی وجہ سے لوگ زیادہ تر شہروں کا رخ اختیار کیے ہوئے ہیں، یہاں زیادہ تر لوگ لکڑیاں جلاتے ہیں۔ انگریزوں کے دور میں بھی اس علاقے کو خاصی اہمیت حاصل رہی۔ انگریز اس علاقے کا حسن و

جمال دیکھنے کے لیے گھوڑوں اور خچروں پر سوار ہوکے یہاں آتے تھے۔ یہاں بہنے والا دریائے کنہار وادیِ کاغان کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ یہ اپنی دلکشیوں اور خوب صورتی کے ساتھ پوری وادی میں سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا رواں دواں ہے۔ وادیِ ناران کے مقام پر جھیل سیف الملوک اور دریائے کنہار کا سنگم ایک لافانی شاہکار ہے۔ یہ وادی میں گھومتا، پتھروں کے سنگ گیت گاتا، وادی سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا کشمیر میں دریائے نیلم اور جہلم کے ساتھ آزاد پتن کے مقام پر مل جاتا ہے۔ اس میں دنیا کی سب سے خوب صورت اور ذائقے میں لذیذ مچھلی ”ٹراؤٹ“ پائی جاتی ہے۔ سفر کے دوران کبھی پہاڑ اوجھل تو کبھی دریا اوجھل رہتا ہے۔ سیاح ان کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ دریا کی نمی سے لبریز ہوا کے جھونکے، وادی میں پھولوں کی خوشبوئیں جوان دلوں میں ایک رومانوی کیفیت طاری کردیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ جب ملکہ نور جہاں اور اس کی کنیز جن کی آنکھیں دکھی ہوئی تھیں۔ جب کشمیر کی سیر کے لیے آئی تھیں، ان دونوں نے دریائے کنہار کے پانی سے اپنی آنکھیں دھوئیں تو ان کی آنکھوں کو آرام آگیا تھا۔ جس پر ملکہ نور جہاں نے دریائے کنہار کو نین سکھ کا نام دیا۔ دریائے کنہار دو الفاظ کوہ یعنی پہاڑ اور نہار یعنی نہروں کا مجموعہ ہے۔ یہاں کی خنک ہوائیں، دریا کے پانی سے اٹکھیلیاں کرتی انسان کے چہرے کو نمی اور تازگی دیتی ہیں۔ وادیِ کاغان کی خوب صورتی کا راز دریائے کنہار کی دلکش یخ بستہ خوشبوؤں سے رچی ہوئی لہروں میں چھپا ہے۔ جو سیاحوں کے دلوں کو موہ لیتی ہیں۔ اس کو دیکھنے سے آنکھوں کو مسلسل جو تازگی اور سکون ملتا ہے اس کو محسوس کرتے ہوئے ہر سیاح بے ساختہ اس کو نین سکھ کا نام دیتا ہے۔ اس کا پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ یہاں برف پوش چوٹیوں سے بہتا ہوا آبشاروں کا پانی پتھروں سے ٹکرا کر عجیب سا دلوں میں رس گھولتا ہوا میوزک پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ شام کے وقت وادی میں سفر کررہے ہوں تو آپ کو دریائے کنہار چاندی کی لکیر کی طرح وادی کو چیرتا ہوا نظر آئے گا اور یہ بڑا ہی پُرکیف نظارہ ہوتا ہے۔ وادی کے مشہور پھلوں میں اخروٹ، خوبانی، ناشپاتی، سیب اور آلو بخارا بہت مشہور پھل ہیں۔ یہاں کے مشہور صحت افزا مقامات میں شوگراں، سری پائے، تراں، صنوبر گلی، قصبۂ کاغان، وادیِ ناران، غار، میدان، شنگری، جھیل سیف الملوک، لالہ زار، جھیل لولو پت سر، جھیل دودی پت سر، درہ بابوسر پاس اور آنسو جھیل شامل ہیں۔ یہاں کے لوگ بہت سادہ لوح اور مہمان نواز ہیں۔ لیکن دو تین سالوں سے یہاں پر شہر سے آئے ہوئے کاروباریوں اور بیوپاریوں نے یہاں کے مقامی لوگوں سے ہوٹل وغیرہ ٹھیکے پر لے کر سیاحوں کو کافی مشکلات میں ڈالا ہوا ہے۔ ہر چیز کو مہنگے داموں بیچ کر ہوٹلز کے کرائے دُگنے چوگنے کرکے سیاحوں کے دلوں اور جذبات کو مقامی لوگوں کے خلاف کردیا ہے۔ اب جو بھی سیاح یہاں آتے ہیں وہ یہاں مہنگائی دیکھ کر واپسی میں یہاں کے رہنے والوں کو قسائیوں کا نام دے کر جاتے ہیں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں کی مہنگائی کے اصل ذمے دار وہ شہری کاروباری ہیں جو مختلف شہروں سے آکر یہاں اپنا کاروبار چمکا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پیارے قارئین میں نے صفحات کی تنگی کے باعث وادی کے مزید سیاحتی مقامات پر جو فطری صناعی کا نمونہ ہیں نہیں لکھا لیکن پاکیزہ کے صفحات میں آئندہ جگہ ملی تو آپ کو ان مقامات اور سیف الملوک اور پری جمال کی کہانی ضرور لکھ کر بھیجوں گی۔ آپ کو ”میں اور میرا شہر“ پڑھ کر کیسا لگا؟ اپنی قیمتی آرا سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ پاکیزہ اور پاکیزہ کی پوری ٹیم کے لیے دعائیں۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

٭ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

٭ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

٭ پیاری بہنو! مجھے اس وقت بے حد خوشی ہوتی ہے جب کوئی بہن مجھے فون کرکے یہ بتاتی ہے کہ میرے مشورے پر عمل کرکے اس کا فائدہ ہوا۔ یہ آپ کا مجھ پر بھروسا اور اعتماد ہے کہ میری ادنیٰ سی رائے کو اہمیت دیا کرتی ہیں اور تب میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ مجھ ناچیز اور گناہ گار کا مشورہ کسی کے کام آگیا۔ اب بات تو چھوٹی سی ہی ہے مگر اس سے بہت سی بہنوں کی رہنمائی ہوسکتی ہے۔ اس لیے میں یہ بات آپ سے شیئر کررہی ہوں۔ ایک دور دراز علاقے سے میرے پاس ایک بہن کا روتا سسکتا فون آیا۔ باجی مجھ جیسی بدنصیب لڑکی شاید ہی کوئی ہوگی۔ جس کی شادی کو تو پندرہ سال ہوگئے ہیں مگر ایک دن بھی میرا سکون کا نہیں گزرا۔ شوہر میری کوئی بات نہیں مانتے، وہ جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ تم اٹھ جاؤ، تم بیٹھ جاؤ جیسی ہدایتیں مجھ پر حاوی رہتی ہیں۔ جب میری زندگی میرے حساب سے نہ گزرے تو اس کا ایک ہی حل ہے کہ میں اپنے شوہر سے طلاق لے لوں۔ میں نے بھرپور خاموشی کے ساتھ اس لڑکی کو بولنے دیا اور وہ اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرتی رہی۔ جب اس کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے بچے ہیں؟ اس نے کہا ہاں بیٹے، بیٹیاں دونوں ہیں۔ میرا دوسرا سوال تھا کہ تمہارے میاں تمہیں پیسہ نہیں دیتے ہوں گے۔ تمہارا گزارہ مشکل سے ہوتا ہوگا۔ اس لیے تم گھٹی، گھٹی زندگی گزار رہی ہوگی۔ نہیں باجی ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اچھا تو وہ پھر تم کو مارتے ہوں گے...... میں نے پوچھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ کیا تمہیں ان سب باتوں کا احساس کسی اور شخص نے دلایا ہے؟ اس کا جواب اثبات میں تھا۔ کیا وہی تم سے یہ کہہ رہا ہے کہ تم اپنے شوہر سے طلاق لے لو؟ جی باجی...... مگر وہ سچ ہی تو کہہ رہا ہے۔ تب میں نے اس لڑکی کو سمجھاتے ہوئے کہا بیٹا۔ تمہارا اصل دشمن ہی وہی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ تمہارا گھر ٹوٹ جائے اور تمہارے بچے دربدر ہوجائیں۔ تمہارے شوہر کی خامیاں اس کی خوبیوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ تم اپنے شوہر کا خیال رکھو۔ اس سے محبت کرو اور اس شیطان صفت شخص کو ڈانٹ کر بھگا دو۔ تم دیکھو گی کہ تمہیں ہر خوشی اپنے گھر میں نصیب ہوگی۔ فون بند ہوگیا اور میں بھی اس واقعے کو بھول گئی۔ چھ ماہ کے بعد کل اس لڑکی کا سرشار سا فون آیا۔ میں تو پہچان بھی نہیں پائی۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ اس نے میرے مشورے پر عمل کرکے اپنی زندگی کا ہر سکھ پالیا ہے تو مجھے بھی وہی خوشی ہوئی جو اس کے لہجے میں تھی اور یہ بات بتانے کا مقصد میرا صرف یہی ہے کہ بے شک مکمل صفات صرف اللہ تعالیٰ میں ہیں۔ ہر انسان میں خوبیوں کے ساتھ، ساتھ خامیاں موجود ہوتی ہیں اور ہم جن سے محبت کرتے ہیں ان کی خامیوں کو نظر انداز کردیا کرتے ہیں۔ امید ہے آپ سب بہنیں بھی اپنی خانگی زندگی کو آسان بنانے کی ضرور سعی کریں گی۔

اور آیئے اب اپنی سرگرمیوں کی جانب مگر اس سے قبل صرف ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لاالٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت

یونسؑ کی مشہور دعا ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیتِ کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب اپنی بہنوں کی سرگرمیوں سے ذرا آگاہ تو ہو جائیں کہ کون کیا کچھ کر رہا ہے۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ معروف مصنفہ خالدہ نسیم، لندن اپنے عزیزوں کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے راول پنڈی آنے والی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ معروف شاعرہ یاسمین کنول، پسرور ضلع سیالکوٹ کے بیٹے حسن نوازش نے ایف ایس سی پری انجینئرنگ کا امتحان پاس کر کے ICT اسکالرشپ ایوارڈ حاصل کر لیا ہے۔ (ماشاء اللہ...... بے حد مبارکاں)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری سلمیٰ ناز، سندھ کی منگنی ہوگئی ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری آمنہ ریاض، کراچی کے ہاں شادی کے سولہ سال بعد فرزند پیدا ہوا ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ریحانہ بیگم کی بیٹی ستارہ کا نکاح ہوا ہے۔ (مبارک باد)

☆ معروف مصنفہ رفاقت جاوید نے اپنی بہترین دوست اور پسندیدہ شاعرہ پروین شاکر کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے پروین شاکر کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ہے پروین شاکر جیسا میں نے دیکھا۔ جس میں پروین کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو من و عن پیش کیا ہے۔ یہ کتاب عام قاری کو تو پسند آئے گی ہی مگر وہ لوگ جو پروین کی شاعری پر کام کر رہے ہیں ان کے لیے یہ ریسرچ میں بڑی معاون ثابت ہوگی۔ اس خوب صورت باتصویر کتاب کی قیمت صرف 460 روپے ہے اور کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں۔ پروین شاکر ٹرسٹ...... ہاؤس نمبر 6 گلی نمبر 76۔ G6/4 اسلام آباد۔ فون نمبر 051/9204070

☆ ہماری دو پیاری مصنفات افسر سلطانہ اور ثریا انجم ماشاءاللہ حج کی سعادت حاصل کر کے آگئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ معروف مصنفہ نگہت اعظمیٰ کا نیا افسانوں کا مجموعہ صندل کا درخت شائع ہوگیا ہے۔ جس کا انتساب ان کے والد کے نام ہے۔ یہ ضخیم مجموعہ بے حد خوب صورتی کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ جس کی قیمت صرف 250 روپے ہے۔ یہ کتاب علی میاں پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی ہے مگر اسے آپ ہر شہر کے اردو بازار سے حاصل کر سکتے ہیں۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ ہماری پیاری مصنفہ سیما مناف، کراچی ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں۔

☆ پاکیزہ کی نئی تبصرہ نگار سدرہ کلثوم، لکی مروت کے والد کو فالج کا شدید اٹیک ہوا ہے جس کی وجہ سے ان کا آدھا حصہ مفلوج ہوگیا ہے۔

☆ ہماری پیاری تبصرہ نگار ڈاکٹر شہلا عامر، کراچی کی ٹانگ میں فریکچر ہوگیا ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر، کراچی تا حال بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی ہنوز بسترِ علالت پر ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ثریا بیگم، کراچی کی طبیعت بہت خراب ہے۔

☆ معروف شاعرہ اور ناول نگار فریدہ جاوید فری، لاہور ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ممتاز خانم، کراچی ان دنوں علیل ہیں۔

انتقالِ پُر ملال

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار بشریٰ سہیل، ابوظہبی کا بھائی گزشتہ دنوں انتقال کر گیا۔

☆ معروف مصنفہ تبسم زیدی، حیدر آباد کے شوہر انتقال کر گئے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری کرن صوفی، کراچی کے بھائی چل بسے۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ یاسمین کنول، پسرور کے دیور راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

☜ نگہت اعظمیٰ، کراچی سے۔ ”میں سفرنامے کبھی رغبت سے نہیں پڑھا کرتی ہوں مگر جب یوں ہی سرسری سا پڑھنے کی نیت سے شروع کیا تو میں حیران رہ گئی کہ اتنا اچھا لکھا ہے...... پڑھ کر واقعی مزہ آگیا۔ پہلی قسط پڑھنے کے بعد مجھے راول پنڈی جانا پڑ گیا۔ مگر اس کی دوسری قسط پڑھنے کے لیے میں نے پنڈی سے پاکیزہ خریدا اور یوں ملائشیا کی سیر خوب لطف کے ساتھ کی۔ (شکریہ) انٹرویو میں مجھے قیصرہ حیات سے مل کر خوشی ہوئی۔ وہ جس انداز میں لکھتی ہیں ویسی ہی ان کی شخصیت بھی ہے (یہ تو ہے) شجاعت بے حد عمدگی کے ساتھ علم، معرفتِ الٰہی کے بارے میں لکھ رہی ہیں اور پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے (بے شک) ناولوں میں رفاقت جاوید کے ناول کی پہلی قسط بے حد پسند آئی۔ اس ناول میں جس موضوع کے بارے میں لکھا جا رہا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے اور یونیک بھی...... نگہت سیما تو میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کی ہر تحریر مجھے پہلے سے بڑھ کر اچھی لگتی ہے۔ دیگر افسانے بھی یقیناً اچھے ہوں گے...... مگر میں ان دنوں پھر سفر میں ہوں...... راول پنڈی پھر جانا ہے۔ جلترنگ پڑھ کر واقعی بہت ہی مزہ آتا ہے۔“ (تبصرے کا شکریہ، نگہت مجھے بھی تمہاری ہر تحریر پہلے سے بڑھ کر اچھی لگتی ہے۔ ہاں میری اتنی تعریف کر دی...... تو میرا سنا پا کہاں جائے گا...... یہ بھی سوچ لیا کرو)

☜ شائستہ زریں، کراچی سے۔ ”اداریہ بہت عمدہ ہے اللہ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ امانت کی آخری قسط بھرپور تھی۔ نایاب جیلانی بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں اور مجھے ایسی تحریریں بہت اچھی لگتی ہیں۔ غزالہ رشید کا موضوع بہت اچھا تھا مگر اختتام پر تشنگی کا احساس ہوا۔ دلہن نمبر کے حوالے سے شیریں حیدر کی تحریر سب سے زیادہ اچھی رہی ہے۔ دلشاد نسیم نے سماجی المیے پر سلیقے سے قلم اٹھایا ہے۔ عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ مختصر مگر جامع تھا اور ہر لحاظ سے بھرپور رہا۔ کمال کی برجستگی اور بے ساختگی تھی۔ تصنع سے پاک فکری انداز میں لکھے گئے سفرنامے نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ عظمیٰ کا کمال یہ ہے کہ جیسے وہ بولتی ہے ویسے ہی وہ لکھتی بھی ہے۔ ملائشیا یہ تو نے کیا، کیا پڑھتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے عظمیٰ مجھے سنا رہی ہے۔ شمیم فضل خالق سے ملاقات اچھی رہی۔ نزہت اچھے سوالات اٹھاتی ہیں۔ بشریٰ رحمٰن اور دلشاد نسیم کے انٹرویو بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ شادی مبارک پڑھ کر لطف آیا۔ جلترنگ پڑھ کر ابھی تک مزہ آ رہا ہے۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

☜ شہزادی کائنات یونس، کراچی سے۔ ”قول و فعل، ہالا احمد کی تحریر ایک اچھے پیرائے میں لکھی چھوٹی سی تحریر دل کو چھو گئی۔ واقعی کچھ لوگ یونہی ہوتے ہیں دوسروں کے لیے کچھ اپنے لیے کچھ...... شیریں حیدر کی تحریر کی بات کروں تو انہوں نے بالکل درست نام رکھا اپنے افسانے کا...... آج کے دور میں واقعی ساس کے من کو بھائی دلہن ہی کامیاب زندگی گزارتی ہے۔ دلشاد نسیم کا افسانہ بیسٹ لگا۔ ایک سوال ایک معاشرتی افسانہ تھا۔ ہمارا معاشرہ ایسے گندی سوچیں رکھنے والوں سے پٹا پڑا ہے۔ دلِ ناتواں دکھ کر رہ گیا ہاں جی وہ دلدل جو پڑھ لیا ایک ماں کے جذبات کس عمدگی سے رقم کیے ہیں۔ بس یونہی اور آئندہ نہیں ہوگا متاثر نہیں کر سکیں۔ وہ آئے بزم میں بہت اچھا سلسلہ ہے۔ ہمیں اپنی پسندیدہ رائٹر کے بارے میں جاننے کا موقع ملتا ہے۔ سروے کے جواب پڑھے اور پلو سے باندھ لیے۔ دلہن تو دلہن ہوتی ہے سادی بھی اچھی لگتی ہے ساری دلہنیں اچھی لگتی ہیں۔ جلترنگ ہمیشہ کی طرح سپرہٹ تھا۔ امانت کی آخری قسط اس لیے نہیں پڑھی کیونکہ ریگولر رسالہ نہیں لیتی۔ سو پڑھنے کا کیا جواز مگر نام رفعت خالہ کا ہو تو معیار یقیناً اعلیٰ ہی ہوگا۔“ (ہاں یہ تو ہے)

☜ سنبل ملک اعوان، لاہور شاہدرہ۔ پیاری بیٹی تمہارا طویل ترین خط پڑھا...... یقیناً تم ایک بے حد محبت بھرے دل کی مالک ہو جس کے دل میں دوسرے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ آپ نے اپنے طویل خط میں مجھ سے چند باتیں پوچھی ہیں۔ آپ کی پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے وقت، ہمت، توفیق اور کثیر سرمایہ دیا تو میں یقیناً غریب خواتین کی مدد کے لیے کوئی ادارہ ضرور بناؤں گی...... فی الوقت میں انتہائی محدود پیمانے پر کام کر رہی ہوں۔ جس

میں میری مدد میرے بچے، میری خلیا ساس ڈاکٹر شمیم فاطمہ صدیقی اور میری ایک بہن نزہت اشفاق کررہی ہیں۔ میں باہر سے کسی سے کوئی پیسہ اس وجہ سے بھی نہیں لیتی کہ میں باہر کے لوگوں کی کوئی مدد بھی نہیں کررہی ہوں۔ انشاء اللہ آپ جب کراچی آئیں گی تو میں آپ کے اعزاز میں ضرور کوئی تقریب کروں گی۔ جس میں عذرا رسول اور دیگر مصنفات تو ضرور شرکت کریں گی۔ (پکا وعدہ ہے آپ سے) تیسری بات کا جواب دیگر بہنوں کے حوالے سے بھی ہے کہ اگر کسی قاری بہن کو ان دفاتر کا ایڈریس اور فون نمبر معلوم ہو جو قرض دیتے ہوں جو لیپ ٹاپ قسطوں پر دیتے ہوں اور دیگر سامان بھی تو اس سے ضرور مجھے آگاہ کریں تاکہ میں اپنی بہنوں کو بتاسکوں۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ دکھ دینے والوں پر غصہ آتا ہے..... مگر اللہ کی رضا کے لیے ان کو معاف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے..... میں منافقت کے ساتھ کسی سے نہیں مل سکتی۔ آخر میں آپ نے یاحی یاقیوم برحمتک استغیث کا ترجمہ پوچھا ہے تو عرض ہے ترجمہ..... اے (ہمیشہ، ہمیشہ) زندہ رہنے والے (تمام مخلوق کو) قائم رکھنے (اور سنبھالنے) والے، تیری ہی رحمت کے وسیلے سے فریاد کرتا، کرتی ہوں۔ رسول اکرم ﷺ کو جب کوئی فکر لاحق ہوتی تو آپ ﷺ یہ دعا بکثرت پڑھتے تھے۔ (ترمذی)

عائشہ گل، لاہور سے۔ ''میرا نام عائشہ گل ہے اور میرا تعلق لاہور سے ہے۔ پاکیزہ میں یہ میرا دوسرا خط ہے۔ جب پہلا میرا خط شائع ہوا تو مجھے بالکل یقین نہیں آیا کہ میرا بھی خط شاملِ اشاعت ہوا ہے۔ میں نے آپ کو اپنی شاعری بھیجی تھی جو خط کے ساتھ لکھی ہونے کی وجہ سے شائع تو نہیں ہوئی پر میرا خط شامل کرکے آپ نے جو مجھے خوشی دی میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ آپی ہمارا ہاکر ہمیں پاکیزہ بہت دیر سے دے کر جاتا ہے۔ آج بھی 12 تاریخ ہوگئی ہے اور اس ماہ کا پاکیزہ ہمیں ابھی تک نہیں ملا اس لیے اس پر تبصرہ نہیں کرسکتی ہوں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اپنے گاؤں اور خاندان میں میں واحد ہوں جس کو رسالوں کا چسکا لگا ہے۔'' (آپ کا خط ہمیں کتنی ہی تاخیر سے ملے میں اس کو ضرور شائع کروں گی ویسے آپ سالانہ خریدار بن جائیں تو جلدی پرچہ مل جائے گا)

سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔ ''ڈاکٹر ممتاز ضیا کا سیر حاصل تبصرہ بہت پسند آیا۔ اسما قادری کا پلاٹ بہت پرانا تھا۔ شبانہ شوکت کی تحریر سچی کہانی یا آپ بیتی تھی..... سارہ ملک نے بھی اچھا لکھا۔ صائمہ اکرم کا طرزِ تحریر دلچسپ تھا۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ قیصرہ حیات کا سادہ سا انٹرویو پسند آیا۔ رفاقت جاوید کے ناول کی قسط اچھی ہے..... مگر مجھے ان سے یہی کہنا ہے کہ وہ اپنا اندازِ تحریر تبدیل نہ کریں۔ سمپل طرزِ تحریر میں بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ زاہدہ پروین اور نگہت سیما کی تحریریں بھی ٹھیک تھیں..... مجھے عظمیٰ آفاق سے یہ کہنا ہے کہ پاکیزہ کے لیے باقاعدگی سے لکھیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے رفاقت جاوید کے طرزِ تحریر میں پہلے کے مقابلے میں اب کافی تبدیلی آگئی ہے)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''دونوں نئے ناول کی اقساط اچھی لگیں۔ زاہدہ پروین بھی ٹھیک ہی لکھ رہی ہیں۔ سارہ ملک کی وہ ناداں ہے پسند آئی، دیگر تحریروں میں ام ایمان اور شمیم فضل خالق نے اچھا لکھا۔ قیصرہ حیات کا سمپل سا انٹرویو پسند آیا اور جس میں انہوں نے برملا اعتراف کیا ہے کہ انجم انصار نے ان کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ میرا پیارا بھائی، غزالہ فرخ نے لکھ کر رُلا دیا۔ تصویر دیکھ کر تو میں سمجھی تھی کہ شاید کسی شادی کا احوال ہے مگر پڑھ کر دل اداس ہوگیا۔ دیگر تمام مستقل سلسلے بہت عمدہ رہے مگر اب عظمیٰ آفاق کی تازہ ترین تحریر کا انتظار ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ۔ عظمیٰ ان دنوں کچھ لکھ رہی ہیں آپ جلد ہی پڑھیں گی)

عظمیٰ خورشید، لاہور سے۔ ''روحانی مشوروں کے صفحات سے میں ہمیشہ مستفید ہوتی ہوں۔ انجم اس کے لیے میں تمہیں صرف جزاک اللہ ہی کہہ سکتی ہوں۔ نئے ناولوں کے بارے میں بعد میں رائے دوں گی۔ عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ پڑھ کر بے حد انجوائے کیا..... اور بعض صفحات تو بار بار پڑھے۔ اسی طرح جنجوعہ ہاؤس پڑھ کر مزہ آیا۔ قیصرہ حیات یقیناً ایک سیدھی سادی سی لڑکی ہے جو اپنے انٹرویو کی ہر سطر میں نظر آرہی ہے۔ قیصرہ حیات تمہاری پُرخلوص اور سچی باتیں اچھی لگیں۔ میری ملاقات اور بات چیت بہت سی مصنفات سے ہوتی ہے مگر جو بات میں نے عمیرہ احمد میں دیکھی ہے وہ کسی میں بھی نہیں۔'' (جی ہاں عمیرہ احمد بے حد اچھے اخلاق کی لڑکی ہے جو تکبر اور بناوٹ سے کوسوں دور ہے)

ندرت نایاب، کوہاٹ سے۔ ''موسل شنید کا انٹرویو رضوانہ پرنس نے بہت اچھا کیا ہے۔ اب رضوانہ جی، مومنہ کا انٹرویو جلد از جلد کریں..... مومنہ میری کزن ہے اور میں اس کا انٹرویو بہت جلد دیکھنا چاہتی ہوں..... اگست اور ستمبر کے شماروں میں جو تحریر سپرہٹ رہی وہ عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ ہے۔ اس کے لیے میں آپ کو مبارک باد دوں گی کہ آپ نے عظمیٰ کا اتنا خوب صورت سفرنامہ شائع کیا۔ اب ہم عظمیٰ کا دلچسپ ناولٹ اور ناول پڑھنا چاہیں گے۔'' (ندرت سب سے پہلے خوش آمدید..... اس مبارک باد کی مستحق محترمہ عذرا رسول ہیں۔ جب وہ میری مزاج پرسی کو گھر آئی تھیں تو عظمیٰ نے ان سے کہا آنٹی میں نے اتنا اچھا سفرنامہ لکھا ہے اور امی اس کو لگا نہیں رہی ہیں اور پھر اس نے اپنے سفرنامے کی خاص، خاص باتیں بتائیں اور تب عذرا نے فوراً کہا..... عظمیٰ تم اپنا سفرنامہ فوراً دو۔ وہ ضرور لگے گا اور جب اس کی پہلی قسط شائع ہوئی تو سب سے پہلا فون عذرا رسول کا ہی آیا اور کہا کہ میں اس لیے تعریف نہیں کررہی ہوں کہ اسے انجم انصاری کی بیٹی نے لکھا ہے بلکہ اس لیے تعریف کررہی ہوں کہ عظمیٰ نے بہت ہی اچھا لکھا ہے اور بقول عظمیٰ یہ جملے سن کر ہی اس کا ویٹ بڑھ گیا)

بشریٰ اصغر، اسلام آباد سے۔ ''پاکیزہ پڑھتی ہوں یا ٹی وی پر ڈرامے کے حوالے سے انجم تمہارا نام دیکھتی ہوں تو مجھے وہ چھوٹی سی انجم انصار یاد آجاتی ہے جس کا بی ایڈ کرتے ہی اسلام آباد اسکول نمبر ایک میں بطور ٹیچر اپائنٹمنٹ ہوا تھا۔ یہ وہی اسکول تھا جہاں سے انجم نے میٹرک کیا تھا۔ انجم تمہارا بطور ٹیچر دورانیہ بہت کم رہا..... کہ تم شادی کے بعد کراچی چلی گئی تھیں مگر مجھے آج بھی تمہاری پُرخلوص باتیں یاد آتی ہیں۔'' (بشریٰ جی..... مجھے آپ، خالدہ خانم، مس غزالہ، مسز اشرف، مسز ملک سب یاد ہیں اور آپ سب سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ سنا ہے کہ خالدہ خانم اب کینیڈا میں ہیں اور ان کا پیارا سا بیٹا نیورو سرجن بن گیا ہے۔ آپ کی جب بھی اور جس، جس سے بھی بات ہو میرا اسلام کہیے گا اور ہاں پاکیزہ کے بارے میں اپنی رائے ضرور دیجیے گا)

بشریٰ سہیل، ابوظہبی سے۔ ''اس مرتبہ جلترنگ میں آپ نے لکھا کہ بہنوں کو بھائیوں سے کس قدر محبت ہوتی ہے پڑھ کر بے اختیار آنسو نکل آئے۔ آج کل تو ویسے بھی رونے کا بہانہ چاہیے۔ پاکیزہ میں امانت کی آخری قسط بھی متاثر نہیں کرسکی۔ بہت سے پہلو تشنہ ہی رہے۔ اس مرتبہ کوئی افسانہ خاص متاثر نہیں کرسکا۔ شیریں حیدر نے بھی پرانے موضوع پر روایتی تحریر لکھی۔ نایاب جیلانی کی ترکِ وفا اچھی جارہی ہے مگر بار بار ایک ہی طرح کی منظرنگاری سے طوالت بڑھ رہی ہے۔ اب ذی شاہ کی مون میں دلچسپی نیا موڑ لے آئی ہے نہیں کبھی نہیں سمجھ نہیں آیا کیا کہنا چاہ رہی ہیں کہ کبھی اس سے دعا نہیں مانگی الجھی ہوئی تحریر تھی۔ ایک سوال بھی پرانا موضوع ہی تھا۔ نگہت اعظمیٰ کی دلدل اچھی تھی ورکنگ لیڈی کی مشکلات اور احساسات کے بارے میں بالکل سچ لکھا۔ جنگل کا پھول بہت ہی معصوم سی کہانی ہے۔ آئندہ نہیں ہوگا۔ عنوان سے ہی اینڈ کا پتا چل رہا تھا۔ سب سے بہترین عظمیٰ کا سفرنامہ تھا۔ اتنی سچائی سے لکھنے کے لیے بہت حوصلہ چاہیے کہ ہر طرح کی بات انہوں نے ہم سب کے ساتھ شیئر کی۔ بہت ہی عمدہ اور مزیدار تھا اور ہر جملہ بہت، بہت انجوائے کیا ہم بھی ملائشیا جاچکے ہیں اس لیے ہر جگہ کے بارے میں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ خاص کر وہ جھولا جس میں لیٹ کر گھوما جاتا ہے۔ اس میں ہمارے میاں اور بچے ہی بیٹھے ہم تو ڈر کے مارے باہر سے ہی دیکھتے رہے اور آپ جن تاریخوں میں عمرہ کرنے گئیں۔ ہم بھی وہاں تھے۔ انٹرویو میں شمیم فضل خالق صاحبہ سے ملاقات اچھی رہی۔ رضوانہ کے انٹرویو میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ وہ بالکل روایتی انداز سے ہٹ کر بہت ہی مزیدار سا لکھتی ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ دیگر باتوں کے لیے آپ مجھے فون کرسکتی ہیں 021.36981952)

صابرہ سلطانہ، کیماڑی سے ''عرصہ دراز کے بعد اس محفل میں شامل ہورہی ہوں..... اور اس کی اصل وجہ عظمیٰ آفاق کا خوب صورت سفرنامہ ہے..... بے حد معلوماتی..... اور آنکھوں کے سامنے مہارت سے نقشہ کھینچنا جانتی ہیں اس لیے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ عظمیٰ تو آپ سے بھی آگے جائے گی..... مگر اس کو اب باقاعدگی سے لکھنا ہے اور ہم اس کے ناولٹ بھی پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد بہنوں کی محفل پڑھتی ہوں..... باجی جب آپ مزاحیہ انداز میں تفصیلی جوابات دیا کرتی ہیں تو ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ پلیز آپ مختصر جواب نہ دیا کریں۔'' (پیاری صابرہ..... اگر میں تفصیلی جوابات دینے لگوں گی تو خطوط کی تعداد تو کم ہوجائے گی ناں اور ظاہر ہے ایسا کوئی بہن بھی نہیں چاہے گی لیکن اگر سب بہنوں کو پسند ہے تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں)

تابندہ، کراچی سے۔ ''اتنے عرصے بعد آپ سے رابطہ کیا ہے مگر آپ تو ہمیں یاد ہی نہیں کرتیں۔ (گڑیا یاد انہیں کیا جاتا ہے جنہیں بھول جائیں۔ آپ تو ہمیں یاد ہیں، ہاں کہاں غائب تھیں اتنے عرصے سے؟) باجی ہمیں مشکل، مشکل تحریریں ہضم نہیں ہوتیں۔ ہمیں ہنستی مسکراتی تحریریں پسند ہیں جس سے ہم ڈپریشن کا شکار نہ ہوں۔ بتائیں کہ آپ اور عظمیٰ پاکیزہ کے لیے کب کوئی

ناولٹ یا ناول لکھیں گی؟‘‘ (انشاء اللہ بہت جلد)

فصیحہ آصف خان، ملتان سے ’’بے حد شکریہ کہ آپ نے بہت تفصیل سے نمایاں کر کے میری کتابوں کی خبر لگائی۔ جزاک اللہ..... سب سے پہلے تو یہ کہوں گی کہ فریدہ جاوید فری کی کتاب محبت یاد رکھوں گی پڑھی۔ بہت نفاست سے اشعار کو معانی کا پیراہن اوڑھایا ہے انہوں نے۔ نازک و کول جذبات کو دل کی کیفیات کو اشعار کے موتی میں پرو کر اسیرانِ ادب کی پیاس بجھائی ہے۔ ستمبر کے خوب صورت موسم میں پاکیزہ کا ساتھ دلکش معلوم ہوا۔ کیونکہ دلہن نمبر کا اپنا ہی الگ حسن ہوتا ہے اور سرورق کی دلہن نظروں کو بھا گئی۔ آپ کی باتیں مجھے بہت کارآمد اور اپنے اندر جھانکنے کا درس دیتی ہیں۔ اسلامیات کی کلاس کے بعد امانت کی آخری قسط پڑھی۔ انکشافات کی قسط تھی۔ بہر حال اختتام پزیر ہوئی۔ ہالہ احمد نے مختصر مگر جامع لکھا..... ترکِ وفا میں کچھ تیزی آئی۔ دیکھنا ہے کہ ذی شاہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہے اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہے کہ نہیں۔ غزالہ رشید نے عرصے بعد قدم رنجہ فرمائے۔ ساس اور بہو کی زندگی پر شیریں حیدر نے وضاحت سے لکھا اور خاص طور پر ہم لکھاریوں کی لاج رکھی۔ شکریہ شیریں جی، آخر پڑھی لکھی لڑکی کا انداز سامنے آیا۔ ایک سوال؟ واقعی جواب دینا مشکل مگر ضروری ہے۔ ہم کسی کی ذہنیت نہیں بدل سکتے اگر آپ کے دل میں چور نہیں تو مسئلہ حل..... دلدل بے حد دکھی کر دینے والی تحریر لگی۔ عورت بھی کیا کرے.....؟ کہاں سے انصاف مانگے..... جنگل کا پھول حریدار لگی۔ اگلے حصے کا انتظار ہے۔ خسارہ جو بویا وہی کاٹا کے مصداق تھی۔ ملائشیا کی کیا بات ہے، بہت انجوائے کیا پڑھ کر، سادہ سی لکھاری شمیم فضل خالق کی باتیں انہی کی طرح سادہ مگر ہمارے لیے سبق آموز ہیں۔ شادی کا سروے ہمیں کسی میرج ہال میں لے گیا۔ اسی طرح دلہنوں کے واقعات و مشاہدات بھی دلچسپی لیے ہوئے ہیں۔ جلترنگ، پاکیزہ میں مدھر موسیقی کی طرح لگتا ہے، باقی سلسلے بھی اپنی جگہ لاجواب تھے۔ امینہ عندلیب کے لیے خاص دعا کہ وہ مکمل صحت یاب ہوں۔ سعدیہ رابطہ کرنے کا شکریہ..... جی مجھے محترمہ عظمیٰ خورشید صاحبہ سے کہنا ہے کہ وہ غیر حاضر نہ ہوا کریں۔‘‘ (تبصرے کا شکریہ..... ہاں عظمیٰ خورشید اس ماہ حاضر ہیں)

اُمِ دعا، میر پور آزاد کشمیر سے۔ ’’اس دفعہ سنانے کو کچھ ایسا ہے کہ آپ حیران ہوں گی، پچھلے خط میں، میں نے آپ کو لکھا تھا کہ ہمارے گھر دو، تین لڑکیاں آتی ہیں۔ امی کا ہاتھ بٹانے بہت ہی محنتی..... واللہ ان میں سے ایک تو واقعی بہت محنتی نکلی۔ جی جناب ساری محنت اس نے ہاتھ کی صفائی پہ کی، عرصہ چار سال سے وہ ہمارے ہاں کام کر رہی تھی۔ ہمارے اور میری بڑی بہن کے گھر..... اس کی عمر تقریباً اب تیرہ سال تھی۔ چار سال سے وہ کیا کر رہی تھی؟ یہ نہیں اندازہ مگر پچھلے چھ ماہ سے جو اس نے کیا وہ قابلِ رقم ہے۔ محترمہ نے آپی کے گھر سے 56,000 ہزار روپے اور امی کے سیف سے امی کا زیور (لاکٹ، 2 کانٹوں کی جوڑیاں، 3 انگوٹھیاں) اور تقریباً 50,000 تک پیسے وقتاً فوقتاً چرائے۔ میرے بھی وہ 2000 لے گئی۔ پکڑائی کیسے.....؟ جب آپی نے اسے موبائل پر باتیں کرتے دیکھا، آخر میں ہمیں درخواست دینی پڑی تھانے میں۔ (وہ لوگ خانہ بدوش ہیں) اور یہ لڑکی ایسی ڈھیٹ کہ اقرار نہ کرے..... پھر جب تفتیش ہوئی تو پتا چلا کہ جناب اس کا لڑکے سے چکر ہے، لڑکے کو پکڑا اور جب اس کو لتر پڑے تو پتا لگا کہ محترمہ نے ملکہ برطانیہ بنتے ہوئے اس لڑکے کو موٹر سائیکل، لیپ ٹاپ لے کر دیا۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہوا تو اس نے 5000 دیے کہ جاؤ دوائی لاؤ۔ کبھی 5000 کبھی 2000 اور کبھی 3000 اور حد تو یہ کہ امی کا زیور اس محترمہ نے اس کے پاس امانتاً رکھوایا۔ اف.....! آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ ہم لوگوں کی کیا حالت تھی۔ ان لوگوں کی اپنی بولی ہے مگر چونکہ یہ لڑکی چار سال سے ہمارے گھر کام کر رہی تھی تو اس نے اردو بہت اچھی سیکھ لی اور لباس بھی آج کل کے فیشن کے مطابق..... جب تفتیش ہو رہی تھی تو پولیس والے کہتے ہیں کہ یہ کیا.....؟ یہ تو اردو سے نیچے بات ہی نہیں کرتی، اسکن ٹائٹس پہنے ہوئے ہے۔ آپ لوگوں نے اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے؟ اور حد تو یہ کہ وہ مانی ہی نہیں کہ یہ سب اس نے چرایا ہے۔ امی کا زیور، اصلی حالت میں اس لڑکے سے برآمد ہوا ہے اور یہ محترمہ کہتی ہے قسم ہے، قرآن کی قسم، اللہ کی قسم، میں نے کچھ نہیں کیا۔ اب آپ اندازہ لگالیں کہ کس طرح کی وہ لڑکی تھی۔ اس پر دھواں دھار کہانی بھی ہو سکتی تھی انسان جتنا قابلِ بھروسا ہوتا ہے اتنا ہی ناقابلِ بھروسا بھی ہوتا ہے۔ ہم انسان نامی شے سے کچھ بھی توقع کر سکتے ہیں۔ عظمیٰ کا سفرنامہ بہت اچھا ہے، جلترنگ، بہنوں کی محفل اور پھر ملائشیا کی سیر..... مزہ آ گیا۔‘‘ (تبصرے کا شکریہ۔ جب ہم اپنے کاموں کے لیے ملازموں کے محتاج ہو جائیں گے تو یہی سب ہوگا۔ میں اپنے گھر میں کام کرنے والیوں کو موبائل لانے کی اجازت نہیں دیتی)

نحل سعدی آرا ئیں، گولارچی سے۔ ’’آپ سوچ رہی ہوں گی کہ کہاں مر کھپ گئی یہ لڑکی..... نہ ہی شکریہ کہا اور نہ ہی

پیارے پاکیزہ میں انٹری دی۔ تو سب سے پہلے شکریے کا ٹرک قبول کیجیے۔ مارچ کے شمارے میں میری چھوٹی سی تحریر میرے ہوتے رہو شائع کرنے پر.....اور شکریے کا پورا ہیلی کاپٹر قبول فرمائیں، اتنے بڑے، بڑے ناموں میں مجھے جگہ دینے پر..... پاکیزہ میں کئی مہینوں سے شرکت کا ارادہ باندھ رہی تھی مگر کچھ کاروبارِ زیست اور کچھ جیب نے اجازت نہیں دی۔ ترکِ وفا بڑی زبردست جا رہی ہے، علی عیسیٰ، مالا کی جوڑی فرسٹ کلاس ہے مگر مالا کا دکھ اداس کر دیتا ہے، نایاب جی، جم کر لکھ رہی ہیں، ویلڈن رفعت سراج صاحبہ امانت اچھا رہا، عنیزہ سید جی پہلے لگتا تھا کہانی طویل ہو گئی ہے۔ اب جب ختم ہوئی تو محسوس ہو رہا ہے جیسے جلدی ختم ہو گئی، باقی افسانے کہانیاں بھی اچھی، اپنی جگہ اچھی ہیں، بہنوں کی محفل تو رسالے کی جان ہے، پڑھ کر بڑا اچھا لگتا ہے۔ آنٹی جان! اب میں نئے نام سے لکھوں گی۔ (اچھا جیسی مرضی) پاکیزہ کی شاعرہ ایشل شادیان سے پکی دوستی ہو گئی ہے۔‘‘ (آپ کو نئی دوستی مبارک ہو، ہاں آمنہ حماد کو فون کر کے اپنے نئے نام سے آگاہ کر دینا ورنہ وہ بےچاری بھول جائے گی)

فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ’’ملائشیا کی سیر کرتے کرتے ایک پیراگراف پر نگاہ ٹھہر گئی۔ جی ہاں صفحہ نمبر 245، 246 ہمارے ملک میں کیا نہیں ہے۔ بس نیتوں کا فتور ہے، حرام خوری ہے، بھتا مافیا ہے، لینڈ مافیا ہے۔ ان کا بس چلے تو پاکستان کے سارے سبز علاقوں، باغوں، کھیتوں کھلیانوں کو ملیا میٹ کر کے کنکریٹ کے بدنما پلازے، شاپنگ سینٹر، مال تعمیر کیے جائیں۔ جہاں صرف مال والے ہی خریداری کر سکیں۔ ساحلِ سمندر کے مینگروو آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں، ڈر ہے کہیں سمندر بھی ان کے ڈر سے سمٹ نہ جائے۔ (اللہ نہ کرے) ملک کے چپے چپے کو خوشنما بنانے کا شعور ہے نہ ذہن اتنے کھلے.....‘‘ (بس اللہ کوئی معجزہ کر دے کہ ملک کے حالات اور لوگ سب ایک محبت کی ڈوری میں بندھے ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے ہوں)

ایشل شادیان، گولارچی سے۔ ’’بڑی خوشی، خوشی پاکیزہ کھولا تو مت پوچھیں کیا حال ہوا، کمپوزنگ کی غلطی نے میری ساری محنت خاک میں ملا دی۔ میرا خط سارہ چوہدری کے نام سے لگا ہوا تھا۔ آنٹی اب کسی کو کیسے پتا چلے گا کہ ان کو ریکویسٹ کے لیے کہنے والی ایشل ہے۔‘‘ (ہمارے پاس آپ کا خط موجود ہے، جس پر سارہ چوہدری لکھا ہوا ہے، آپ بہنیں چونکہ بار بار اپنا قلمی نام تبدیل کیا کرتی ہیں تو میں نے سوچا کہ شاید تم نے بھی ایسا کیا ہوگا، چلو..... اب تم سارہ یا ماریہ لکھو گی بھی تو میں اسے نہیں لگانے والی)

صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ’’پچھلے شمارے میں آپ نے بہت اچھی بات کی کہ کسی کی ٹوہ لینا اور بچوں کو یہ بات سکھانا کہ جا کر دیکھو، وہاں کیا ہو رہا ہے؟ بہت غلط بات ہے۔ میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں غلط باتیں اگر بچپن سے پختہ ہو جائیں تو پکی ہو جاتی ہیں اور انسان کی زندگی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کو شعور دینا چاہیے خاص کر کے میڈیا اہم کردار ادا کرتا ہے کہ وہ بات کو اچھے انداز سے پیش کرے کہ لوگوں میں آگاہی ہو۔ شیریں حیدر کا دلہن وہی جو سا سوَ من بھائے۔ کافی پُراثر تحریر تھی۔ بہت زبردست موضوعِ سخن تھا۔ عظمیٰ آفاق سعید کا ملائشیا کا سفرنامہ اچھا ہے۔ ہم بھی ان کے ساتھ شریکِ سفر تھے۔ عظمیٰ نے کہیں اپنے بچوں اور اپنی تصاویر بھی لگائے کہ ہم دیکھ سکیں۔ صائمہ اکرم کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ ان کا ڈراما آن ائر آ گیا اور بہت اچھا جا رہا ہے۔ جب ان کا نام آتا ہے تو انجانی سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ جلترنگ میں میرا قصور مزہ دے گیا۔‘‘ (پیاری صائمہ یہ اس محفل کے طفیل آپ سب کی ایک دوسرے سے محبت ہی تو ہے کہ دوسرے کی خوشی بھی اپنی خوشی لگتی ہے اور زندگی کا یہ مثبت رویّہ بہت خوب صورت ہوتا ہے)

عاشی کبیر، کراچی سے۔ ’’میں پڑھنے کی بہت شوقین ہوں..... تقریباً سارے ہی رسائل، میگزین پڑھتی ہوں۔ پاکیزہ میرا پسندیدہ ہے اور اس میں انجم جی، جلترنگ سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ پہلے میں لکھتی بھی تھی اور میری کہانیاں اخبار، میگزین میں چھپتی بھی تھیں۔ بہت سالوں کے بعد لکھا ہے آپ کا معیار بہت بلند ہے۔‘‘ (اس محفل میں خوش آمدید..... آپ یقیناً لکھنا جانتی ہیں مگر یہ افسانہ بے حد غم زدہ سا ہے کہ پڑھنے والے کو بھی ڈپریشن میں مبتلا کر دے..... آپ کوئی دوسری تحریر بھیجیں)

اُمِ ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ سے۔ ’’کل 24 کو رسالہ ہاتھ میں آیا ہے اور آج 25 کو سوائے قسط وار ناولز کے سارا ختم بھی کر چکی ہوں۔ آتی ہوں تبصرے کی جانب، ٹائٹل اس بار کچھ خاص اچھا نہیں لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ کی مفید اور سبق آموز باتوں سے مستفید ہوتے ہوئے سب سے پہلے اپنی کہانی پڑھی۔ رائے تو آپ سب لوگ دیں گے۔ پھر بہنوں کی محفل تک جا پہنچی جہاں آپ سے اور قاری و مصنفین کی باتیں و تبصرے بہت مزہ دے گئے۔ سب سے پہلے نایاب جیلانی کی ترکِ وفا میں مالا کی

پریشانیوں کا کوئی سرا ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اگلی ایک دو قسطوں میں پوری بات کھل جائے گی۔ میری گڑیا، پڑھ کر دل دکھ کی اتھاہ گہرائی میں اتر گیا۔ ہر بار ایسی ہی کوئی کہانی، خبر یا بات دل کو دہلا دیتی ہے اور یہی دعا بے ساختہ نکلتی ہے اللہ پاک سب کی محبتوں کو اپنی امان میں رکھے اور ناپاک سوچوں والے گھناؤنے لوگوں کے مذموم ارادوں کو ناکام کردے (آمین) ام ثمامہ کا ہلکا پھلکا افسانہ مزہ دے گیا۔ درِ دیگراں، ایک اچھی تحریر تھی اگرچہ آج کل ایسی محبتیں ناپید ہوچکی ہیں اور خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں بھی اچھا لگا۔ جنگل کا پھول میں خاص مزہ نہیں آرہا۔ اہلِ صبر میں عورت کی بے بسی پر دکھ ہوا۔ جنجوعہ ہاؤس، صائمہ اکرم اس بار ایک ہنستا مسکراتا ناولٹ لے کر آئیں۔ اچھا لگا۔ اس بار مجھے جو تحریر سب سے زیادہ بھائی وہ سارہ ملک کی...... وہ ناداں ہے تھی ایک اہم موضوع کو بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا۔ قیصرہ حیات کو اگرچہ کم پڑھا ہے لیکن ان کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ باتاں دل کی اور سزا وار لوگوں اور رشتے داروں کی حریداری وارثی آپ کے جلترنگ میں پاکر آپ کے ذہن کی زرخیزی پر بے اختیار ماشاء اللہ نکلتی ہے۔" (تبصرے کا شکریہ اس کے ساتھ آپ کا ناولٹ بھی مل گیا ہے جو قابلِ اشاعت ہے)

✍ ہالہ احمد، کراچی سے۔ "بے حد خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ اکتوبر کا پاکیزہ بہت جلد مل گیا۔ افسانے تو جلدی، جلدی سارے ہی پڑھ ڈالے اور سچ پوچھیں تو اچھی، اپنی جگہ سبھی نے بہت اچھا لکھا ہے۔ سلسلے وار ناولوں کی اقساط ابھی پڑھ نہیں پائی ہوں۔ صائمہ اکرم کا ناولٹ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ پاکیزہ ڈائری اور جلترنگ ہمیشہ کی طرح لاجواب، پاکیزہ ڈائری کی تعریف تو میں پوری کروں گی کہ یہ رنگ، رنگ کے پھولوں سے سجا ایسا گلدستہ ہے جس کی مہکار دل کو شگفتہ و معطر کردیتی ہے۔ بہنوں کی محفل کی بات کروں تو ڈاکٹر ممتاز ضیا صاحب آپ نے میری تحریر کو پسند کیا اور نئی مصنفات کو میری مثال بھی دی۔ آپ یقین کریں آپ کے یہ الفاظ مجھے میری جگہ بہت معتبر کر گئے ہیں۔ آپ جیسی سینئر شخصیات مجھ جیسی نو وارد اور اناڑی رائٹر کے لیے چند الفاظ بھی کہہ دیں تو میرے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ (ہماری تبصرہ نگار ہمیشہ اچھی تحریروں کی تعریف دل کھول کر کیا کرتی ہیں) اور آمنہ پرواعالیہ آپ کا خط پڑھ کر تو میں حیران رہ گئی ہوں۔ میں نے جب سے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ افسانوں کے علاوہ صرف ایک بار میرا تبصرہ جولائی کے پاکیزہ میں شائع ہوا ہے۔ اس پورے تبصرے کی کون سی سطر میں آپ کو تلوار کی کاٹ یا کڑواہٹ محسوس ہوئی؟ پلیز مجھے ضرور بتایئے گا۔ (عالیہ ضرور وضاحت کریں گی) آنٹی میں نے اپنے گزشتہ خط میں بھی پھلبہری کے سفید نشانات کے لیے کوئی آزمودہ ٹوٹکا یا روحانی علاج دریافت کیا تھا۔ کسی بھی بہن کے پاس اس کا کوئی بھی علاج ہو تو پلیز ضرور بتائیں۔" (اگر کسی بہن کے پاس کوئی آزمودہ نسخہ موجود ہو تو ضرور ارسال کریں)

✍ سیدہ جیا عباس، تلہ گنگ سے۔ "ہم پاکیزہ والوں سے اتنے خفا تھے کہ سوچا تھا کہ اب خاموش قاری ہی رہیں گے مگر دلہن نمبر دیکھ کر پھر قلم اٹھانے پر مجبور ہوگئے۔ زبردست...... قول و فعل مختصر مگر معاشرتی رویوں کی عکاس تحریر تھی۔ خسارہ اچھی تحریر تھی۔ شادی مبارک اور سروے بہت پسند آیا۔ باقی مستقل سلسلے بھی اچھے ہیں۔ انجم اپیا اس بار پھر لیٹر پلیز ردی کی ٹوکری سے بچاکے پاکیزہ کے خوب صورت صفحات کی زینت بنا ہی دیں۔" (گڑیا آپ کے خطوط تاخیر سے ملے تھے مگر اس بات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دیر سے آنے والے خطوط ضائع کردیے جاتے ہیں)

✍ انجم گلزار، کراچی سے۔ "مجھ کو بہنوں کی محفل طویل ناول جیسا مزہ دیتی ہے۔ پہلے میں بہت سے ڈائجسٹ پڑھا کرتی تھی مگر اب میں صرف پاکیزہ اور سرگزشت کی قاری ہوں وجہ انجم انصار اور پاکیزہ جیسی اپنائیت کہیں اور کہاں...... مجھ کو تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ماں کی آغوش میں آگئی ہوں۔ سعدیہ رئیس میں حیران ہوں کہ آپ نانی بھی بن گئی بہنیں یقین کریں کہ میں ضیا کے ولیمے میں سعدیہ سے ملی تھی۔ موتیا کلر کے کپڑوں میں ایسی نوجوان نانی میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ امینہ عندلیب آپ سے میں کہوں گی کہ چشم ما روشن دلِ ماشاد، آپ مجھ کو فون کرلیا کریں۔ عذرا آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ضیا کے ولیمے میں کہ آپ اپنی تقریبات میں مجھ کو بلائیں گی۔ نزہت اللہ آپ کے قلم کو ترقی دے لیکن اکثر رائٹر ذاتی زندگی کے سوالات کو بہت خوب صورتی کے ساتھ گھما جاتی ہیں۔ قیصرہ حیات کی تمام کتابیں میرے بک ریک میں موجود ہیں۔ نمرہ احمد اپنی ہیروئن کی کوئی شناختی علامت ضرور رکھتی ہیں۔ کبھی بالوں کی پونی کبھی بالیاں اور کبھی ہیروئن کا موٹا موٹا کاجل...... رفاقت جاوید نے رنگِ خلش بہت گہرائی سے جمادیا ہے۔ امید ہے آخر تک یہ رنگ ایسے ہی جما رہے گا۔ نگہت سیما کے اعتبار وفا کا ابھی تو تعارف ہی ہو رہا ہے۔ امید ہے دھوپ بارش اور

سائے سے زیادہ وفا اور اعتبار ملے گا۔ نایاب جیلانی نے ترکِ وفا کے نویں حصے میں اس سسپنس کا ٹمپو توڑ دیا جو آٹھویں حصے میں چھوڑی تھی۔ منکشے ہی مون ہے جسے ذی شاہ نے بنا دیکھے ہی ٹھکرا دیا تھا اور اس بات کا بدلا مون نے مالا سے لیا۔ افریشم ہی انی ہے اور بچہ آفاق کا ہے جو کہ زندہ ہے اور کمپنی کا تیسرا ایم ڈی بھی وہی ہے لیکن شاید پاکستان میں ہے اور علی عیسیٰ ازالے کے لیے آفاق اور افریشم کا خیال بہت زیادہ رکھ رہا ہے۔ اب دیکھیں ترکِ وفا کون کرتا ہے۔ صائمہ اکرم ہم نے بند مٹھی میں سلگتی ریت، جنجوعہ ہاؤس کے باہر ہی گرا دی ہے اور بہت ہی فریش ہوگئے۔ آپ نے ہر ذائقہ ہی محسوس کرا دیا۔ طنز و مزاح سے بھرپور جلدی، جلدی آیا کریں۔ میری گڑیا، سعدیہ عزیز نے آج کل کے موذی الیمے کو گہرائی کے ساتھ مختصراً پیش کیا۔ اللہ پاک میری تمام بہن، بیٹیوں کو محفوظ رکھے۔ وہ ناداں ہے، سارہ ملک نے بہترین ڈائیٹ پلان بنا دیا۔ صبح، صبح چائے سے کلیجا جلانے سے بہتر ہے ڈرائی فروٹ کے ساتھ دودھ اور شہد سے دل و دماغ کو ٹھنڈک پہنچائی جائے جو جنت میں ملنے والی غذا بھی ہے۔ یہ ضروری تو نہیں...... بشریٰ گوندل کی تاریخ اپنے آپ کو دُہرائے مگر یہ بہت ضروری ہے کہ ہر ماں چاہے کسی بھی طبقے کی ہو اپنی آنکھیں کھلی رکھے...... اسما قادری بہت اچھا لکھنے والوں میں سے ہیں مگر درِ دیگراں موضوع بہت بار مختلف انداز میں چھپ چکا ہے۔ کبھی بہنوں میں اور کبھی بھائیوں میں حسد کا جذبہ اور ایک جانب سے قربانیوں کی انتہا...... شبانہ شوکت، اہلِ صبر کا نام کچھ اور ہونا چاہیے تھا مگر رومعہ کی مضبوطی کو داد دیتے ہیں کہ عورت کو تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہیے۔ نہ جانے کب کون سی مشکل آپڑے لیکن رائٹر کبھی دوسری عورت برداشت کرنے کا حوصلہ بھی دکھایا کریں مگر مثبت انداز میں کیونکہ جب اللہ نے مرد کو دوسری شادی سے نہیں روکا تو عورت کو بھی حوصلہ دینا چاہیے یہ حقیقت ہے کہ دل تو تا عمر ہی دکھتا رہتا ہے۔ سلسلے وفا کے ارسلا ارمین ایک فوجی کا کیا کہنا کہ ہر محبِ وطن کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ روشن راہیں وہی پرانا موضوع مرد کا اپنی برتری جتانے کا پرانا مرض...... مجھے تو اس میں رائٹر سے زیادہ ایڈیٹر کی محنت محسوس ہو رہی ہے۔ کچھ ہم بدل گئے بھی وقت پاس کیا...... اپنی پیاری بہنوں سے کہنا ہے کہ سلسلے وار ناول صبر سے پڑھا کریں اینڈ کرنے کی جلدی نہ مچایا کریں پھر ایسا لگتا ہے کہ رائٹر نے بہت کچھ جلدی میں لپیٹ دیا ہے۔ میں 24 سال سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں جتنا کچھ میں نے پاکیزہ سے سیکھا ہے اور اپنی زندگی میں شامل کرلیا ہے مثلاً میں نے سر کو مکمل ڈھانپنا عذرا رسول کا انٹرویو پڑھنے کے بعد شروع کیا اور شادی بیاہ کی محفل میں بھی اپنا سر نہیں کھولتی۔ توبہ اور شکرانے کے نفل ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا پڑھ کر روزانہ کی عبادت میں شامل کیے۔ قرآن پاک کی کتابت کی توفیق بھی میرے رب نے مجھ کو ذکیہ صاحبہ کو پڑھنے کے بعد دی اور انجم آنٹی کی باتوں سے دوسروں کو معاف کرنا سیکھا اور اپنے لیے مختلف سورے اور کلمہ درود پاک وغیرہ کا زادِ راہ اکٹھا کرتا...... انجم آنٹی کی تعریف میں کچھ بھی نہیں لکھ رہی کہ پھر مجھ پہ کہیں چاپلوسی کا لیبل نہ لگ جائے۔ آخر میں RJ کے F M,105 کے یاسر قاضی، شیرین اختر اور مریم رضوی، رضوان باسط کے انٹرویو کی فرمائش کرنی ہے۔" (طویل تبصرے کا شکریہ...... ہمارے لیے یہ دلی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے پاکیزہ سے اچھی باتیں سیکھیں...... اب آپ ان باتوں کو آگے بھی پہنچائیں...... کہ نیکی کا یہ سفر رکنا نہیں چاہیے...... فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے)

✍ اعزاز احمد آذر، لاہور سے۔ "تازہ پاکیزہ ستمبر 2014ء کے صفحہ 225 پر ایک نظم بعنوان تم ایسا کرنا شامل ہے۔ شاعرہ کا نام عنبرین اقبال ساتھ میں لکھا ہے۔ اس نظم کا آغاز جن الفاظ سے کیا گیا ہے وہ دراصل میری ایک بہت مقبول غزل کا مطلع ہے۔ تم ایسا کرنا کہ کوئی جگنو، کوئی ستارہ سنبھال رکھنا مرے اندھیروں کی فکر چھوڑو، بس اپنے گھر کا خیال رکھنا۔ شعر یا مصرعہ مستعار لیا جاسکتا ہے مگر اس کو واوین میں لکھ کر حوالہ درج کردیا جاتا ہے۔ یہاں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ جیسے یہ شعر عنبرین اقبال صاحبہ کے ذہنِ رسا کی تخلیق ہے جو ادبی سرقہ کی ذیل میں آتا ہے۔" (ہم معذرت خواہ ہیں مگر ہماری یہ شاعرہ آپ کا نام لکھنا بھول گئیں)

✍ پروین افضل شاہین، بہاولنگر سے۔ "امانت کی آخری قسط اور اعتبار وفا کی پہلی قسط جاندار تھی۔ ہماری دعا ہے کہ امینہ عندلیب، عذرا بی بی اور تمام بیمار خواتین و حضرات تندرست ہوجائیں اور خوش و خرم زندگی گزاریں، آمین۔ شمیم فضل خالق سے ملاقات اور عظمیٰ آفاق سعید کا سفرنامہ ملائشیا تو نے کیا کیا...... بہت ہی پسند آیا۔ ابھی تک تو میرے میاں جانی پرنس افضل شاہین پاکیزہ میں میرے انٹرویو کے خلاف ہیں۔ (مجھ سے جلتے جو ہیں) میں اپنے انٹرویو کے لیے اپنے میاں کو منالوں گی۔" (پہلے اپنے میاں جی کو راضی کرلیں پھر انٹرویو بھی بھیجیے گا۔

✍ رضوانہ آفتاب، کراچی سے۔ "میں آپ کا بے انتہا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں، آپ نے میرے افسانے کو اپنے

اکتوبر کے شمارے میں جگہ دی۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ مجھے آپ کے شمارے میں جگہ مل جائے گی کیونکہ شمارے میں ایک سے بڑھ کر ایک رائٹر موجود ہیں۔ جنہوں نے اپنے قلم کی روشنیوں سے ڈائجسٹ میں رونقیں بکھیر رکھی ہیں۔ ماشاء اللہ سے پاکیزہ بہت بہترین شمارہ ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اور ترقی کرے۔'' (پیاری رضوانہ اب آپ بھی ہماری ٹیم میں شامل ہو چکی ہیں اور ماشاء اللہ بہت اچھا لکھتی ہیں)

٭ انیس جبار خان، آزاد کشمیر سے۔ ''زندگی میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے آپ کا دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن پھر بھی دلوں کی ڈوران سے بندھی محسوس ہوتی ہے ان کے دکھ رُلاتے ہیں تو ان کی خوشیاں بے اختیار مسکرانے پر مجبور کرتی ہیں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ تو ذہن پر ان کا نام دستک دے کر اپنی یاد دلاتا ہے۔ آپ سے اور پاکیزہ سے وابستہ بہت سے لوگوں سے ایسا رشتہ جڑ گیا ہے۔ اکثر پڑھا اور سنا ہے کہ کسی کے منہ پر تعریف کرنا خوشامد میں شمار ہوتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی ہوگی لیکن میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ جب تک کسی کے لیے دل میں موجزن محبت، احساسات، جذبات اور خلوص کا اظہار نہیں کریں گے۔ وہ کیسے جان پائے گا کہ آپ کی زندگی میں وہ کیا مقام رکھتا ہے۔ میں اگر اپنے احساسات آپ تک نہیں پہنچاؤں تو آپ کیسے جان پائیں گی کہ اس دنیا میں انیس جبار خان بھی کوئی وجود رکھتی ہے۔ اور آپ سے اور پاکیزہ سے محبت کرتی ہے۔ ہمارے گھر میں پاکیزہ بڑے پروٹوکول اور نخرے کے ساتھ آتا ہے۔ ہر ماہ کے آخر میں بک شاپ تک وقتاً فوقتاً سب کی دوڑیں لگوائی رہتی ہوں اور ساتھ میں خالہ کو فون آپ کی طرف پاکیزہ آیا کہ نہیں...... اگر نہیں آیا تو تسلی ہو جاتی ہے اور اگر آ گیا ہو تو عبداللہ بھائی کی منت کرنی پڑتی ہے کہ کہیں سے لا دو۔ وہ کہے کہ نہیں ملا...... تو ماما اور ابو کی منت کرتی ہوں کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے آپ لا دیں۔ عبداللہ کو اکثر ہی 60 کے بجائے 120 دینے پڑ جاتے ہیں اور اب تو اس نے لانا ہی چھوڑ دیا ہے کہ انکل حیران ہوتے ہیں کہ یہ سب گھر والے پاگل ہیں کیا ایک کو منع کرتا ہوں کہ ابھی نہیں آیا تو تھوڑی دیر بعد دوسرا پوچھنے آ جاتا ہے۔ پھر ماما سے اچھی خاصی عزت ہوتی ہے۔ شرمندہ بھی ہوتی ہوں لیکن مہینے کے آخر پر سب بھول کر پھر سے منت کرنی پڑ جاتی ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے سے لے کر ہومیو کلینک تک سب سلسلے ہی زبردست جا رہے ہیں۔ کمی تو ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتی کیونکہ محبت کی آنکھ سب اچھا، اچھا ہی دیکھتی ہے۔'' (گڑیا محبت کبھی ایک طرفہ نہیں ہوا کرتی ہے اگر آپ ہم سے اور پاکیزہ سے محبت کرتی ہیں تو ہمیں بھی آپ سے محبت ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین)

٭ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ ''میری سب بہنوں سے اپیل ہے۔ کمی کہیں نہ کہیں رہ جاتی ہے۔ شمارے (پاکیزہ) کا معیار بہتر بنانے کے لیے اپنی تجاویز، رائے، تنقید ضرور کریں جو پاکیزہ کی کامیابی میں ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتی ہیں۔ پاکیزہ ڈائری میں محترمہ آنٹی ذکیہ بلگرامی کا کلام بہت خوب صورت تھا۔ تمام مستقل سلسلے اے ون رہے۔ عظمیٰ آفاق نے ملائشیا کا سفرنامہ بہت خوب صورت انداز میں لکھا۔ آسان دلچسپ لفظوں میں، عظمیٰ بہن میں نے سابقہ خط میں بے حد تعریف کی تھی۔ جگہ کی کمی کے باعث میری باجی انجم انصار نے وہ نہیں لگایا۔ آج تک سفرنامہ نہیں پڑھا تھا اور یہ بہت پسند آیا ہے۔'' (اب یہ سال بھی ختم ہونے کو ہے۔ نئے سال میں بہنیں کیا، کیا نئی چیزیں چاہتی ہیں ہم آپ سب کے مشوروں کی روشنی میں ضرور تبدیلیاں کریں گے)

٭ بشریٰ باجوہ، اوکاڑہ سے۔ ''کافی عرصے کے بعد پاکیزہ میں حاضری دے رہی ہوں۔ پتا نہیں میں آپ کو یاد بھی ہوں یا نہیں...... لیکن میں آپ کو اور پاکیزہ کو کبھی نہیں بھولی۔ بس کچھ مصروفیت رہی۔ بارہ اپریل کو میری شادی ہو گئی تھی۔ شادی کے بعد پڑھنے کا سلسلہ تو جاری رہا مگر لکھنے میں سستی آڑے آتی رہی۔ معراج انکل اب کیسے ہیں، آپی عذرا رسول کا کیا حال ہے؟'' (اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہیں گڑیا آپ بھی ہمیں یاد ہیں ہاں اپنے افسانے کی اشاعت کے بارے میں آپ جلد خوشخبری سن لیں گی)

٭ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ ''یوں تو میں خوش قسمت ہوں کہ آپ نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ نعت وحمد، شاعری اور اب دلہن نمبر میں فوقیت دی۔ جس کے لیے میں اللہ عزوجل کے بعد آپ کی نہایت مشکور ہوں۔ یوں تو رسالہ پرفیکٹ ہے کہیں کمی نہیں مگر بہنوں کی محفل میں آپ کا جواب لفظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہم آپ کے دو جملوں کے جواب کے لیے ترستے رہتے ہیں۔'' (اب آپ کو بھرپور جواب ملے گا۔ ہاں بتاؤ...... اپنے مراسلات کب بھیجو گی...... ہاں صفحات کی پشت پر مت لکھنا) عظمیٰ کا ملائشیا کا سفرنامہ ایک ذہین وفطین اور حساس شخصیت کی عکاسی کر رہا تھا اور عینی نے نگواروں کے نام لکھ کر مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اللہ جزا دے۔

یقین کیجیے میں پڑھنے لکھنے کی اتنی شوقین ہوں کہ مجھے کبھی کوئی تحریر بری نہیں لگتی سوائے فحش تحریروں کے۔ ڈاکٹر زاہدہ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ پاکیزہ نام کا وقار قائم رہنا چاہیے۔ محترمہ شمیم فضل خالق...... آپ مجھے بہت خوب صورت لگیں۔ غزالہ نگار کی طرح ہمارا لباس ایسا ہی ہونا چاہیے۔ گرمیوں میں گھر میں ہاف بازو پہنتی ہوں اور دوپٹا بھی نہیں لیتی مگر میں خود کو بہت گناہ گار سمجھتی ہوں۔ جوانی میں برقع تھا اور اب چادر، موٹاپا ہونے کی وجہ سے اب تو بے بی لگتی ہوں۔ بقول میری بیٹی آپ تو عورت نہیں آدمی لگتی ہیں۔ اوپر سے آواز دہشت والی۔ انجم میں نے یہ سب اس لیے لکھ دیا کہ ایک تو آپ کو تعارف کا شوق ہے دوسرا میری دلہن والی تصویر دیکھ کر بہنیں میرا تصور غلط نہ کر بیٹھیں۔'' (تمہاری تحریروں سے مجھے دبلی پتلی نازک سی لڑکی نظر آتی ہے۔ اگر موٹی بھی ہو گئی ہو تو کیا ہوا۔ میں بہنوں کی ساری تصاویر اپنے پاس سنبھال کر رکھتی ہوں کہ جب دل چاہا دیکھ لیا کروں)

٭ ڈاکٹر زاہدہ پروین، بہاول پور سے۔ ''شمارہ پڑھا اور تعریف کے لیے الفاظ کافی نہیں...... ماشاء اللہ ایک سے بڑھ کر ایک تحریر تھی۔ علم معرفتِ الٰہی حیران کن تھا۔ اگلے حصے کا انتظار ہے۔ امانت اُف۔ ف اتنا کچھ ہو گیا اور وہ بھی ایک قسط میں...... یہ زیادتی ہے بھئی جتنی سست روی سے ناول کا آغاز ہوا تھا ایسا ہی آرام سے اختتام ہونا چاہیے تھا۔ یہ کیا کہ تیز گام ہی چلا دی۔ بہر حال ناول زبردست تھا۔ کیا گورکھ دھندے ہمارے اردگرد بکھرے ہیں۔ سب کچھ اچھا، اچھا ہو گیا تو کائنات کی بھی کسی اچھے بندے سے شادی کروا دیتیں۔ بہر حال اس نے روما کا بہت ساتھ دیا۔ قول و فعل میں دو سبق تھے جو مجھے سمجھ میں آئے۔ 1۔ بچپن کی بری عادات بھی چھوڑی نہیں جا سکتیں۔ 2۔ دوسروں کو نصیحت کرتے ہوئے ہم اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ دوسرا سبق ٹھیک ہے، پہلے سے میں متفق نہیں...... دعا، کوشش اور مستقل مزاجی...... بہت سی خراب عادتوں کو ٹھیک کرنے کا نسخہ ہے۔ ترک وفا کی ہر قسط خاصی طویل ہوتی ہے مگر پڑھنے کے بعد سوچیں تو پتا چلتا ہے کہ کہانی کچھ انچ ہی آگے بڑھی ہے۔ اس کو پڑھنے کے لیے خاصا وقت نکالنا پڑتا ہے یا قسطوں میں پڑھتی ہوں۔ بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔ مالا کے بعد اب مالا کا بھائی بھی مون کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ نہیں کبھی نہیں زیادہ متاثر نہیں کر سکی۔ دلہن وہی جو ساسو من بھائے۔ سمجھ نہیں آتی کہ شیطان ساسوں کو ٹارگٹ کیوں کرتا ہے۔ شاید ان کے سامنے آسان ہدف بہو ہوتا ہے۔ شکر ہے اختتام اچھا ہوا۔ جو سچ پوچھیں تو اس کہانی اور ولدل نے ماضی کے بہت سے واقعات آنکھوں کے سامنے تازہ کر دیے۔ جاب کرنے والی بہو...... آہ...... یہ تو بچوں کو گھر میں پھینک کر چلی جاتی تھی ہم نے ہی بچوں کو سنبھالا۔ مگر عالیہ کو اتنا نرم نہیں ہونا چاہیے تھا کہ نوبت یہاں تک آتی۔ اسے احتجاج کرنا چاہیے تھا۔ آفس سے چھٹی لے لیتی۔ خود فیڈ کرواتی، ضروری تو نہیں کہ ہم دوسروں کی غیر ضروری باتیں بھی مانتے جائیں۔ کہیں تو ہمیں بتانا پڑتا ہے کہ ہم ہیں ورنہ دوسرے تو ہمیں روندتے چلے جائیں۔ آئندہ نہیں ہوگا۔ بہت دکھی کہانی تھی۔ مجموعی طور پر رسالے نے دکھی ہی کیا پلیز ذرا توازن رکھیں کچھ ہنستی مسکراتی کہانیاں بھی شامل کر لیا کریں۔ کسی حد تک ملائشیا کے سفرنامے نے ریلیکس کیا۔ بس یونہی بالکل پسند نہیں آئی۔ اللہ نے ہم عورتوں کو یہ اجازت نہیں دی کہ کسی بھی غیر مرد سے گپ شپ کریں۔ چاہے وہ عمر میں ہم سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ بھلا تیل اور آگ اکٹھے رہ سکتے ہیں؟ یہ تعلق تو فساد ہی لاتا ہے اور شیطان تو سرگرم عمل رہتا ہے۔ شاہ زیب بھی عادینہ سے محبت کر بیٹھا...... نہ کرتا تو حیرت ہوتی۔ میری سب بہنوں سے گزارش ہے کہ ابتدا میں ہی اپنے آپ کو روک لیں۔ بظاہر بے ضرر نظر آنے والا تعلق آگے بڑھ کر بہت پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرا پچھلا تم وغصے سے بھرا خط شائع کیا اور مزید شکریہ کہ فون پر وقت دیا۔''

٭ رحمت خاتون، ارم احمد، گاؤں لادہ سے۔ ''میں یہ خط آپ کو اپنی امی کی طرف سے لکھ رہی ہوں اور تھوڑا تھوڑا اپنی طرف سے بھی۔ سب سے پہلے تو امانت کے بارے میں امی جان کا کہنا ہے کہ انہیں پہلی پاکیزہ ڈائجسٹ میں کوئی کہانی اتنی ناپسند آئی ہے۔ کہاں تو کہانی چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھی اور کہاں ایک دم تیندوے کی طرح چھلانگ لگا کر پار...... اصیل خان جیسا عاجز بندہ نہ دیکھا نہ سنا...... تمبر کی فہرست میں صائمہ اکرم کا نام دیکھ کر دل باغ، باغ ہو گیا۔ مگر یہ کیا......؟ صرف ایک پل کی نیا پار لگی؟ نہیں بھئی ہمیں تو جنجوعہ ہاؤس کا اگلا حصہ چاہیے تھا۔ ٹاپ آف دی لسٹ شمیم فضل خالق صاحبہ کی سائبان ضرور ہوتی اگر آخر میں اتنا قلمی نہ ہوتا سب کچھ...... صحیح بتا رہی ہوں ان کا نام پڑھ کر امی جان اور میں دونوں ہی پُرجوش ہو گئے پہلے میں نے پڑھنی ہے...... نہیں پہلے میں پڑھوں گی۔ معذرت کے ساتھ مگر اچھی نہیں لگی کہ بیوی کے سابقہ شوہر کو اس قدر یاد رکھا جائے کہ نکاح کے بعد بھی اسی کی باتیں دُہرائی جائیں...... سارہ ملک آپ نے کیا خوب لکھا...... بہت اعلیٰ بھئی چھا گئیں آپ تو اتنی اہم بات اتنے سادہ الفاظ میں

اتنے اچھے انداز میں کہی آپ نے خوب دل کو لگی...... ترکِ وفا میں کتنا سسپنس باقی ہے؟ جرمنی اتنا خوب صورت ہے؟ دل چاہنے لگا ہے کہ جا کر دیکھوں...... اس قسط کے بعد تو لگتا ہے منکشے اصل میں مون ہی ہوگی۔ مالا کی طلاق کا قصہ بھی سلجھ جائے بس...... انا چاہنے والا شوہر اور ایک دم سے بدل گیا۔ یہ حقیقت کھلے تو دل کو چین آئے گا۔ اہلِ صبر ایک اچھی تحریر تھی مگر کیا یہ غلط نہیں کہ جب شریعت اور مذہب مرد کو اجازت دیتا ہو کہ وہ دو بیویوں سے یکساں سلوک کر سکے تو دو بیویاں رکھ لے۔ یہ کہانی لکھ کر اسلام کی دی گئی اجازت کے منافی بات نہیں کی گئی؟ انا کو آگے کیا گیا اور بیوی جو پہلی تھی اس کو خود مختار بنا دیا گیا۔ جدید ریسرچ میں ہے کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اسلام میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے۔ اللہ طلاق کو حلال قرار دیتے ہیں تو کیا انا اور خودی اللہ اور حدیث کے فیصلے کے آگے زیادہ اہم ہیں؟" (اس محفل میں آپ ماں، بیٹی کو خوش آمدید اور تبصرے کا شکریہ)

☜ فریدہ فری، لاہور سے۔ "اکتوبر کا شمارہ بے حد پیارے ٹائٹل کے ساتھ ملا آج کل پاکیزہ کی صحت اچھی ہوتی جا رہی ہے۔ تمام دوستوں اور رائٹرز کو سلام دعا...... دین کی باتیں پڑھ کر دلی سکون ملا۔ سائبان، شمیم فضل خالق نے بہت ہی اچھا لکھا آپ کو بے حد سلام دعا...... جنجوعہ ہاؤس، صائمہ اکرم کی بہت ہی اچھی کوشش ہے۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ جنگل کا پھول کی دوسری قسط پڑھ کر بے حد اچھا لگا۔ زاہدہ پروین نے کمال بلکہ دھما کا کر دیا۔ میری گڑیا اور وہ ناداں بھی اچھے افسانے تھے۔ جنتی بہنیں اور راحیلہ عندلیب جو بیمار ہیں سب کے لیے ہی میں نے بہت دعائیں کی ہیں ہر نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ ان کو صحتِ کاملہ عطا کرے آمین۔ میں بھی آج کل پھر بے حد بیمار ہوں۔" (تبصرے کا شکریہ۔ اللہ آپ کو صحت دے)

☜ ماریہ سندس، چکوال سے۔ "سوچتی تھی کہ پاکیزہ میں بھی خط لکھوں ہر بار سوچ کر رہ جاتی لیکن آج امانت کی آخری قسط کا پتا چلا۔ میں تو حیران ہی رہ گئی۔ جنوری سے ایک قسط بھی نہیں پڑھی اسی لیے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ کس رخ پر یہ ناول آگے بڑھا ہے لیکن جلد ہی پورا ناول پڑھ کر تبصرہ کروں گی۔ "اعتبارِ وفا" نگہت سیما بے شک اچھا لکھتی ہیں اور یہ ناول بھی ان کے باقی ناولز کی طرح بہت اچھا ہوگا۔ پاکیزہ میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ میں آپ کو اپنی کوئی تحریر بھیجوں شائع ہو جائے گی۔" (خوش آمدید...... آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی، ہاں آپ نے اپنا تعارف اپنے خط میں ہی لکھ دیا ہے وہ علیحدہ صفحے پر لکھ کر بھیجیں)

☜ یاسمین کنول، پسرور سے۔ "سرورق دلکش اور دلآویز تھا۔ نئے سلسلے وار ناولز، ناولٹ، منی ناول سرسری دیکھے...... افسانوں میں سائبان پسند آیا۔ مستقل سلسلوں میں، میں اکثر گنگناتی ہوں کے تمام اشعار اچھے لگے۔ جلترنگ نے خراب موڈ کو ٹھیک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ روحانی مشورے پسند آئے۔" (اللہ کا شکر آپ کا موڈ ٹھیک ہوا...... اب آئندہ بھرپور تبصرے کے ساتھ خط لکھیے گا)

☜ حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین سے۔ "پاکیزہ ملا ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک لگائے سفید دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اختر شجاعت کے قلم سے لکھی دین کی باتیں...... کا سلسلہ صحیح معنوں میں ہمیں معلومات فراہم کر رہا ہے۔ ان واقعات سے ہم بہت ہی اچھی باتوں پر عمل کر کے اپنی دنیا و آخرت سنوار سکتے ہیں۔ قیصرہ حیات کا انٹرویو پڑھا۔ سادہ و پُراثر تحریر کی پختگی سے ذہن میں یہی آتا تھا کہ کوئی بڑی عمر کی خاتون ہیں۔ ماشاء اللہ قیصرہ کا اندازِ تحریر بہت عمدہ ہے اور انوار اسماء النبیؐ لکھنے کا جو کارنامہ انہوں نے سرانجام دیا ہے اس کو پڑھ کر تو میں اسی سوچ میں پڑ جاتی ہوں کہ اتنی عظیم شخصیت کے بارے میں لکھنے والی کو اللہ نے کس قدر صلاحیت بخشی ہوگی۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ ان کی اس بات سے میں بھی صد فیصد متفق ہوں کہ ہر ماہ کسی نامور ادیب کی کہانی شامل کی جائے۔ یہ نئی لکھاری بہنوں کے لیے روشنی کی ایک لکیر ثابت ہوگی اور قارئین اپنے ادیبوں کی تحاریر بھی پڑھ سکیں گے۔ نگہت سیما میں یہ خوبی ہے کہ ان کی تحریر قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ شروعات تو اچھی ہے یقیناً آگے چل کر ناول مزید پسندیدگی کی سند حاصل کرلے گا۔ پاکیزہ میں جو آج کل ناول چل رہے ہیں سارے ہی ہمارے ضبط کو آزمانے پر تلے ہوئے ہیں۔ باقی آئندہ کے الفاظ پورے مہینے کے صبر آزما انتظار پر محیط ہوتے ہیں۔ بہنوں کی محفل میں آپ مجھے شریک کرتی ہیں بے حد شکریہ۔ پاکیزہ میں خط لکھنا اور اس کے مستقل سلسلوں میں حصہ لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم ایم اے اردو کا پیپر دے رہے ہوں جس میں شاعری بھی لکھنی ہے۔ نثر نگاری کو بھی جگہ دینی ہے اور ادیبوں کی تحریر کے بارے میں نوٹ لکھنے ہیں۔ پاکیزہ کے آتے ہی کاغذ قلم کر کس لیتے ہیں دیگر کتب و رسائل کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے جن چیزوں کو نشاندہی کر کے رکھا جاتا ہے پاکیزہ کے پیپر میں لکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور

جب اس پیپر میں لکھی ہوئی چیزیں پاکیزہ کے صفحات پر جگمگاتی ہیں تو یوں لگتا ہے کہ رزلٹ آ گیا۔" (گڑیا ہم آپ بہنوں کی تحریر کے پھولوں سے گلدستے ہی تو بنایا کرتے ہیں...... جتنے خوب صورت پھول آپ ہمیں بھیجیں گی گلدستہ اتنا ہی خوب صورت بنے گا)

☜ عروج اسد، لاہور سے۔ "پہلی بار حاضر ہوئی ہوں...... پاکیزہ پڑھا اچھا لگا۔ منفرد موضوعات پر کہانیاں دل کو چھو گئیں۔ مجھے خبر نہ تھی کہ اتنا تنوع ملے گا۔ اس ڈائجسٹ میں...... سرورق پر ماڈل کے ایکسپریشن سمجھ نہ سکی میں۔ مجھے البتہ ایک ہی جھلک میں دل کو بھا گئے۔ کاش پورے دکھائی دیتے زیادہ مزہ آتا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے خوب کہا۔ حج میں ہر عبادت کا جز ...اور روح زندہ و تابندہ ہے۔ علم کی فضیلت کے موضوع دین کی باتیں انتہائی دلچسپ جا رہی ہیں۔ اللہ اختر شجاعت کو بہترین جزا دے آمین۔ سائبان بھی اچھی رہی۔ آخری پیراگراف سے پہلے تک...... اختتام میں ایک جملہ ہی سہی تسکین اور سعد کی بطور میاں، بیوی زندگی سے متعلق ہونا چاہیے تھا۔ شہزادے کے تذکرے کے بغیر عزت بچانے کے مقصد کے علاوہ صرف ان کے تعلق کو لے کر کچھ لکھا ہوتا تو مجھے تو اچھا لگتا...... میری گڑیا کہانی نہیں لگی۔ حقیقت کا عکس لگی۔ اخبار کی کسی تکلیف دہ سرخی کے بعد کی داستان۔ وہ ناداں ہے کے پہلے دو صفحے مجھے اپنا خواب لگے پوری کہانی پڑھ کر میں نے اللہ سے یہ دو صفحے تعبیر میں نہیں مانگے۔ اللہ اس کہانی کا آخری صفحہ میری زندگی کی کتاب میں شامل کر دے، آمین۔ بہت اچھی کہانی...... بہت مزہ آیا۔ یہ ضروری تو نہیں...... وہی پرانی گھسی پٹی کہانی...... آخر میں پیغام اچھا دیا بشریٰ گوندل نے اور بہت اچھے الفاظ میں دیا۔ قیصرہ حیات کی تصانیف تو میں نے نہیں پڑھیں پر انٹرویو اچھا لگا۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

اس سے قبل کہ آپ کے ساتھ دعا مانگوں...... میں ایک انتہائی دکھ کی خبر آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ ہماری مایہ ناز مصنفہ فرحانہ ناز ملک جوڈی جی خان میں رہتی تھیں ایک ٹریفک حادثے میں چل بسیں۔ وہ اپنی والدہ، بھائی، بہن اور بیٹے کے ساتھ کسی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہی تھیں۔ سامنے سے آنے والی ایک گاڑی ٹکرانے کے باعث ایک ہی گھرانے کے یہ چاروں افراد جاں بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جبکہ ان کا بیٹا دانیال جو فرسٹ ائیر کا طالب علم ہے شدید زخمی ہے۔ اس کے لیے دعا کی اپیل ہے۔ ہماری یہ مصنفہ اپنی تحریر کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ آئندہ شمارہ فرحانہ ناز نمبر ہوگا اس حوالے سے پاکیزہ کا ایک گوشہ فرحانہ ناز ملک کے لیے مختص ہوگا۔ ہماری مصنفات مختصر انداز میں اپنی اس رائٹر کو خراجِ تحسین پیش کریں کہ یہ فرحانہ ناز کا ہم پر حق ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی فیملی خصوصاً ان کی بارہ سالہ بیٹی حفصہ اور آٹھ سالہ بیٹا عبداللہ و دیگر عزیز رشتے داروں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے (آمین) ادارہ پاکیزہ کے تمام اراکین آپ سب کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ادارہ پاکیزہ کے تحت ہونے والی عید ملن کی تقریب فرحانہ ناز کی رحلت کے باعث منسوخ کر دی گئی ہے اس لیے ہم تمام مدعوئین سے معذرت خواہ ہیں۔

اب آئیں درودِ ابراہیمیؐ پڑھ کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور ہر گناہ ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا اور میرے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا کہ تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ تیری ثنا سب سے بڑی ہے اور تیری پناہ عزت والی ہے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیب یا مجیب یا مجیب

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ، کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35895313 EXT 107,118 021-35804200

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفتاق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

اے ربِ کریم اے ربِ ذوالجلال
تیری ذات و صفات ہیں باکمال
بیاں ہو نہ سکے تعریف تیری
تو وحدہٗ لا شریک ، تو بے مثال
تو رگِ جاں سے میرے قریب تر
ذرا دور تجھ سے، شروع میرا زوال
تو نور ہی نور ارض و سما کا
بے مثل تیرا حسن و جمال
سکوں میرا تیرے نام میں پوشیدہ
مٹائے ذکر تیرا میرے رنج و ملال
تو رؤف ہے، رحمٰن ہے ،رحیم ہے
نہ تجھ سا کوئی نہ کوئی تیری مثال

از: فصیحہ آصف خان، ملتان

نعت رسول مقبول ﷺ

نبی ﷺ کے روضے سے ہو کے آرہی ہوں
اپنی قسمت پہ مسکرا رہی ہوں
سنہری جالیوں کو چوم کر
پڑھا صلِّ علیٰ یوں جھوم کر
سر تا پا روشنی میں نہا گئی
میں گناہ گار کیسے یہاں پر آگئی
گنبدِ خضریٰ جس لمحہ نظر پڑی
آنسوؤں کی لگ گئی اِک جھڑی
یارسول اللہ ﷺ جس دل میں بھی تڑپ ہے
بلالو اپنے روضے پہ، ورنہ جینا بے سبب ہے

شاعرہ: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین

دعا

مرے آقا مرے مالک مجھے پھر نور دکھلا دے
گزاروں کس طرح میں زندگی اِک بار بتلادے
گناہوں میں کٹی ہے زندگی تو جانتا ہے سب
گناہوں کو مٹادے اے خدا اپنا کرم کردے
یہ تنہائی، اکیلا پن مجھے ہر دم رُلاتا ہے
کٹھن ہے زندگی میری اسے آسان تو کردے
کوئی مشکل نہیں مشکل یہ سب تو آزمائش ہے
میں راضی ہوں الٰہی تجھ سے تو بھی معاف اب کردے
میں ننگے پاؤں چلتی جاؤں گی سوئے حرم لیکن
پڑے ہیں پاؤں میں چھالے کوئی مرہم عطا کردے
مدینے بھی تو جانا ہے وہیں سب کچھ لٹانا ہے
مدینے جاؤں گی لیکن مجھے رستہ تو بتلادے
ترے محبوب کی چوکھٹ پہ بیٹھوں پھر نہ اٹھ پاؤں
دعائیں تجھ سے مانگوں گی کرم کی انتہا کردے
میں تھک جاتی ہوں پر تھکتی نہیں کیسی عنایت ہے
ملی ہے زندگی جو بھی حیاتِ جاوداں کردے
میں بیمارِ مدینہ ہوں شفاعت کی بھی ہوں طالب
دعائیں کر میری پوری الٰہی تُو کرم کردے
بہت خوش ہوں بہت مسرور میں نے نور دیکھا ہے
عنایت تیری ہوجائے مجھے پھر نور دکھلا دے

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: عالیہ ضیا...... کراچی

مشکل وقت کی دعا

حضرت اسما بنت عمیسؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا۔ میں تمہیں ایسے کلمات نہ سکھاؤں، جنہیں تم دکھ اور پریشانی کے وقت پڑھا کرو پھر آپ ﷺ نے فرمایا۔

اللہ اللہ ربی لا اُشرِکُ بہ شَیْاً ط

ترجمہ: اللہ ،اللہ میرا پروردگار ہے، میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔

سنن ابوداؤد

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی نماز

جنگِ احد میں حضرت علی کرم اللہ وجہ کے ایک ایسا تیر لگا جس کی نوک ٹوٹ کر جسم کے اندر ہی رہ گئی۔ اس کو نکالنے میں سخت ایذا ہوتی تھی اس لیے جناب رسالت مآبؐ نے حکم دیا کہ جب علی نماز پڑھیں اس وقت اس کو نکالا جائے۔ نماز کا وقت آیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہ باوجود سخت تکلیف کے نماز کے لیے نیت باندھ کر کھڑے ہوگئے اور عبادتِ خداوندی میں ایسے محو ہوئے کہ آپ کو تن بدن کے متعلق خبر نہ رہی۔ اس وقت حضورؐ کے حکم سے لوگوں نے زخم سے بڑھا کر تیر کی نوک نکال دی مگر نماز کی محویت میں جنابِ امیر کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ زخم سے بڑے پیمانے پر خون نکلا...... مصلی تر بتر ہوگیا۔ نماز سے فراغت ہوئی اور حضرت علی کرم اللہ وجہ نے مصلے کا خون دیکھا تو لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ خون کہاں سے آیا۔ لوگوں نے حقیقتِ حال عرض کی تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

''بخدا مجھ کو خنجر سے ذرا بھی ایذا نہیں ہوئی نہ اس کی خبر ہوئی کہ تیر نکالا جارہا ہے۔''

مرسلہ: لاریب، چونیاں

پریشانی کا علاج

1 چھوٹی، چھوٹی باتوں پر لوگوں کا شکریہ ادا کریں۔
2۔ فوراً صدقہ دیں اور توبہ کے نفل پڑھیں۔
3۔ آنکھیں بند کرکے اپنے خوشگوار لمحات کو یاد کریں۔
4۔ بخل، چغل خوری اور حسد سے بچیں۔

از: فرحین اشفاق، گگو منڈی

ایک حکایت ایک سبق

کہتے ہیں بصرہ میں ایک رئیس تھا، وہ اپنے باغ میں گیا۔ وہاں اس کی نظر اپنے ملازم کی بیوی پر پڑی۔ ملازم کو کسی کام کے بہانے باہر بھیج دیا اور عورت سے کہا۔ ''دروازہ بند کرو۔''

عورت نے کہا۔ ''میں نے سب دروازے بند کردیے ہیں مگر ایک ہے جو بند نہیں ہوسکتا۔''

رئیس نے پوچھا۔ ''وہ کون سا ہے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''ہمارے اور خدا کے درمیان ہے۔''

رئیس بہت پشیمان ہوا اور سچے دل سے توبہ کی۔

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

مان جاؤ بیگم

گھر کا کام کرتے ہوئے اماں بیمار ہوگئی ہیں، آپا کی ڈانٹ پھٹکار کی وجہ سے گھر کی ملازمہ کام چھوڑ کر چلی گئی ہے......اب تم اپنی ناراضی ختم کرکے جلدی سے گھر آجاؤ...... میں تم کو بہت یاد کررہا ہوں۔ میں واقعی بہت مس کررہا ہوں۔ شوہر کی ایسی باتیں سن کر ہر بیوی کو یہ تو ضرور کہنا چاہیے۔ ٹھیک ہے میں آرہی ہوں مگر میں کوئی مشین نہیں ہوں...... ہاں!

از: ع، ب، پنجاب

دل کی باتیں

کوئی بھی دکھ پیارے نہیں ہوتے
سمجھوتوں پہ گزارے نہیں ہوتے
میں تم سے پوچھ بھی تو سکتا تھا
لبوں پر آئے سوال مگر سارے نہیں ہوتے

شاعرہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

فرض کرو

فرض کرو تم چھت پہ بیٹھی دھوپ میں بال سکھاتی ہو
فرض کرو کہ دھوپ کا اس دن کچھ، کچھ رنگ گلابی ہو
فرض کرو یوں بیٹھے، بیٹھے گہری سوچ میں کھو جاؤ
بال سکھانا بھول کے سر گھٹنوں پر رکھ کے سو جاؤ
فرض کرو اس نیند میں تم نے دیکھا ایسا سپنا ہو

بے کل ہو کے من یہ چاہے کاش یہ سپنا اپنا ہو
فرض کرو کمرے میں بیٹھی تم افسانہ لکھتی ہو
افسانے کے ہیرو کو شاعر، دیوانہ لکھتی ہو
افسانے کی ہیروئن بھی افسانے ہی لکھتی ہو
فرض کرو وہ دیکھنے میں بھی نرل، کومل لگتی ہو
فرض کرو تم خط لکھنے کی خواہش من میں پاتی ہو
لکھنے سے پہلے تم خط پر خوشبو خوب لگاتی ہو
فرض کرو القاب پہ آ کر ہاتھ تمہارا رک جائے
آنکھ تمہاری دھک دھک کرتے دل کی جانب جھک جائے
فرض کرو اِک نام لکھو تم لکھ کر کاٹو پھر لکھو
فرض کرو وہ نام تمہارے اپنے اس شاعر کا ہو

شاعر: اعزاز احمد آذر
مرسلہ: مسز شمع حسین، ٹورنٹو

شرطیہ علاج

ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا۔
"یار کیا کروں۔ میری بیوی نے میری زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ ہر بات پر غصہ...... بعض دفعہ تو لگتا ہے کہ وہ میرا شوہر ہے...... کہ ہر وقت غصے میں بھری بیٹھی رہتی ہے۔ سیدھی بات پر بھی چیخ کر آتی ہے۔"
ڈاکٹر دوست نے مسکرا کر کہا۔ "تم اس سے کہنا......کوئی بات نہیں...... بڑھاپے میں غصہ زیادہ آجاتا ہے...... میں نے تو اس علاج سے اپنے بیوی کے غصے پر قابو پالیا ہے۔"

از: نجمہ ناز اصغر، کراچی

وجہ خاص

کبھی تو پوچھو جاناں ہم سے
زیست کا پل پل، کیسے تم بن
وقت کی صورت ڈھلتا ہے
دن بھر کام کے دھندوں میں
کیسے خود کو رام کریں
شام ہو تو صبح کی خاطر
آنکھیں نہ آرام کریں

شاعرہ: ظلِ شاہین، رحیم یار خان

بھول

تیرے پیار کا پہلا موسم
وصل کا موسم
اِک مدت تک یاد رہا
باقی موسم بھول گئے

شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

تُکا

"کیا چاہیے تمہیں؟ جو بھی کہو گے، میری دکان پر وہ پاؤ گے۔" دکان دار بولا۔
"کتے کے کھانے کا کیک ہے؟" اس نے پوچھا۔
"یہاں پہ کھاؤ گے...... یا گھر لے جاؤ گے؟" دکان دار بولا۔

مرسلہ: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

مسکرانا تو ہوگا

☆ غفور قیصر جلدی میں کہیں جا رہے تھے۔ ان کی بیگم نے کہا۔
"پان تو کھالو۔"
غفور قیصر نے پان منہ میں ڈالا واپس پلٹے تو بیگم نے کہا۔ "ارے وہ جوتے......؟"
"مجھے دیر ہو رہی ہے واپس آ کر کھالوں گا۔" غفور قیصر نے کہا۔

قابلیت کی ویلیو

"جناب کیسی ہے یہ یونیورسٹی؟" ایک اسٹوڈنٹ نے ایم بی اے کا فارم فل کرتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا۔
"بہت ہی اچھی ہے، میں نے بھی یہاں سے ہی ایم بی اے کیا تھا۔" چوکیدار بولا۔

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

طے رکا ہوا سفر ہو جائے
پیار کا وعدہ امر ہو جائے
لوٹ آؤ کسی روز ایک پل کو
کہ میرا گھر بھی گھر ہو جائے
اس پل میں صدیاں گزار لوں
اس طرح سے پھر جیون بسر ہو جائے
جس، جس نے سوال اٹھایا ہے
اس ، اس کو خبر ہو جائے
آؤ کہ اداسیوں کی شام ڈھلے
آؤ کہ میری رات کی سحر ہو جائے

شاعرہ: کوثر اعجاز چوہدری، للیانی، ضلع قصور

خوشی

"دولت ہی دنیا میں سب کچھ نہیں ہوتی۔" ایک کروڑ پتی نے اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
"اگر ایک شخص کے پاس آٹھ کروڑ ہیں تو وہ بھی اتنا ہی خوش ہے جتنا جس کے پاس دس کروڑ مالیت کی رقم ہے۔"

از: نگینہ بنگش، کراچی

نظم

ڈھلتی عمر کی شام میں
پلٹ کر دیکھے تو
بہت سی خوش رنگ یادیں
گلاب لمحوں کی دلفریب باتیں
تمہارے ویران دل کو بہار کر دیں
تو ہر گزرے لمحے سے پیار کرے
اور خدائے لم یزل تیری عمر
دراز کرے، دراز کرے......

مسز اقصیٰ عمران، لاہور

معاف کیا

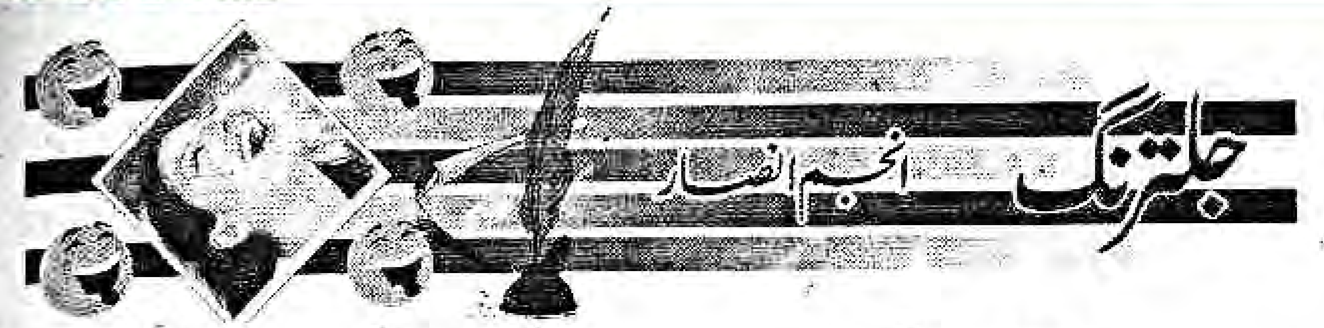
"آج میں نے تمہیں دیکھا کہ تم ایک گاہک سے لڑ رہے تھے اور تم جانتے نہیں ہو ایسے سیلز مین کو میں باہر نکال دیا کرتا ہوں کیونکہ دکانداری کا پہلا اصول یہ ہے کہ گاہک کی کسی بھی بات کی تردید نہیں کیا کرتے ہیں۔" ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے مالک نے اپنے سیلز مین کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔
"جی سر مجھے معلوم ہے مگر میں کیا کرتا؟" سیلز مین نے سر جھکا کر کہا۔
"تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور آج سے تمہاری چھٹی......" مالک نے کہا۔
"یس سر......!" سیلز مین نے سر جھکا کر کہا۔ "مگر......میں......"
"یہ تم کیا اگر مگر کر رہے ہو......آخر گاہک نے ایسا کیا کہہ دیا جو تم یوں پاگلوں کی طرح آگ بگولہ ہو گئے تھے۔"
"سر وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے مالک سے بڑا گدھا، پاجی اور پاگل انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا......تمہارے اسٹور کی ہر چیز دو نمبر کی ہے۔"
"اوہ...... چلو معاف کیا، تم کام کرو۔" مالک نے دانت پیس کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

از: صائمہ یاسر شاہ، کراچی

غزل

مجھ کو شکستِ غم کا مزہ یاد آگیا
تم کیوں اداس ہوگئے؟ تمہیں کیا یاد آگیا
کہنے کو زندگی تھی بہت مختصر مگر......
کچھ یوں بسر ہوئی کہ خدا یاد آگیا
برسے بغیر ہی جو گھٹا آگے نکل گئی
ایک بے وفا کا عہدِ وفا یاد آگیا
یوں چونک اٹھے وہ سن کر میرا شکوہ
جیسے انہیں بھی کوئی گلہ یاد آگیا
حیرت ہوئی تم کو دیکھ کے مسجد میں اے غالب
کیا بات ہوگئی جو خدا یاد آگیا

نگینہ ضیا بنگش، کراچی



میں......؟

گو کہ میں کبھی کسی کی باتوں میں نہیں آتی اور نہ ہی فضول گفتگو کرنے کی عادی ہوں۔ مجھے تو زیادہ بولنے والے لوگ بھی بہت برے لگتے ہیں۔

میرا مزاج تو ایسا ہے کہ قہقہہ لگانے کے بجائے زیرِ لب مسکرانے کو ترجیح دیتی ہوں۔ لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ دور بھاگتی ہوں۔

شادی ہو کر بڑی سی سسرال میں آئی تو کم گو کا لقب پایا، نہ کبھی کسی کی بات کسی سے کی اور نہ کسی کی بات رغبت سے سنی...... کہ شور شرابے اور جھگڑوں سے میں الرجک ہوں۔

”صابرہ جیسی بہو قسمت والوں کو ملتی ہے۔“

میری ساس، جہاں بھی جاتی ہیں میری تعریفوں کے پل باندھ دیتی ہیں...... مگر میں اپنی تعریفیں سن کر بھی خوشی سے نہیں پھولی کہ میں جانتی ہوں کہ میری ساس ان سمجھدار خواتین میں سے ہیں جو اپنی ہر بہو کی صرف تعریف ہی کرتی ہیں۔

مگر پتا نہیں کیا ہوا، مجھ کو نظر سی لگ گئی۔ (حالانکہ ان باتوں کو میں نہیں مانتی) ساری خوبیاں یک دم مجھ میں سمٹ گئیں۔

اس دن بڑی بھابی کی بھابی جو میری کالج فیلو بھی رہ چکی تھیں، کرید کرید کر نہ جانے کیا کچھ پوچھتی رہیں۔ میں ہوں، ہاں میں جواب دیتی رہی اور اگلے دن جب ساری جیٹھانیاں اپنی زبانوں پر دھاریں لگا کر میرے مدِ مقابل آئیں تو پتا چلا کہ مجھ سے وہ باتیں منسوب تھیں کہ لبوں سے تو میں نے انہیں کبھی آزاد نہیں کیا تھا۔

لوگ دوسروں کی ہوں اور ہاں کا مطلب ایسا گہرا بھی لے سکتے ہیں۔ میں واقعی ششدر سی تھی کہ گفتگو کے کیسے قرینے سیکھوں جو دلوں اور زبانوں کو موم کر سکیں۔

ہے کسی کے پاس کوئی ایسا ٹوٹکا!
جو میری مدد کو آئے......
میں جو اچھا بننا چاہتی ہوں، کس طرح بنوں......!

نجات

طبیعت تو بیلا کی اتنی خراب نہیں تھی جتنی کہ ان کی بیان بازی تھی۔

ایک ہی رٹ تھی ان کی کہ ”میں میٹرک کب پاس کروں گی، میں میٹرک کب پاس کروں گی۔“

”ارے بیٹا تم تو بی اے پاس ہو، یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟“ ساس نے پریشان ہو کر کہا۔

”پہلے آپ یہ بتائیں کہ جب میں میٹرک پاس کرلوں گی تو اسکول کی پڑھائی تو ختم ہو جائے گی ناں......؟“

”ہاں بیٹا، میٹرک پاس کرنے کے بعد اسکول سے کوئی تعلق نہیں رہتا، تم کالج میں چلی جاؤ گی۔“ ساس سمجھا رہی تھیں۔

”لگتا ہے کہ کوئی دماغی صدمہ ہے۔“ سسر تاسف سے اپنی بہو کو دیکھ رہے تھے۔

”شاید بچپن میں سر پر لگی کوئی چوٹ ہری ہوگئی ہے۔“ نند نے نیا نکتہ ڈھونڈا۔

اور سب کے جانے کے بعد بیلا اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔ ”میری شادی کو آٹھ سال ہوگئے ہیں میں آٹھویں میں ہوں، دس سال بعد میں میٹرک کرلوں گی تو اس بھری سسرال سے نکل جاؤں گی پھر اس اسکول سے میرا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ جہاں ہر شخص اپنے آپ کو معلم سمجھتا ہے اور میں علیحدہ اپنے گھر میں رہوں گی۔ اپنی زندگی اپنے حساب سے بسر کروں گی اور خوب عیش کروں گی۔“

”سنو...... ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم آٹھویں جماعت میں فیل ہو جاؤ...... یوں بھی آٹھویں جماعت سب سے مشکل ہوتی ہے۔“ میاں کو غصہ ہی آگیا تھا۔

تب بیلا ہنس کر بولی۔ ”میں تو نویں اور دسویں کا ایک ساتھ امتحان دینے کا سوچ رہی ہوں کہ جلد از جلد اس اسکول سے نجات حاصل کرسکوں۔“

رشک

برسات گرمی کی ہو یا سردی کی مجھے ہمیشہ اچھی لگتی ہے اور چھم چھم کرتے موسم میں، میں کھڑکی میں بیٹھی املی کی چٹنی کے ساتھ پکوڑے کھاتے ہوئے باہر کا نظارہ کرتی رہتی ہوں کہ بارش میں کوئی کہاں گرا، اِدھر یا اُدھر...... یا دھڑام سے...... یہ خوب صورت مناظر دیکھنے میں خاصا لطف آتا ہے۔ اسی سہانے موسم میں مجھے گھومنے کا مزاق بھی زیادہ رہتا ہے۔ برستی پھوار میں لوگ جب مہمانوں کے خوف سے بے نیاز ہوتے ہیں، تو میں ان کو جا کر سراسیمہ کر دیتی ہوں۔

شاہدہ میری فرسٹ کزن، اپنا چھوٹا سا گھر ہمیشہ صاف ستھرا رکھتی ہے مگر برسات میں گیلے کپڑے اس کے ٹی وی لاؤنج میں پھیلے نظر آتے ہیں۔ بچے کے کلوث جھنڈیوں کی شکل میں بیرونی دروازوں پر جھالروں کی طرح لٹک رہے ہوتے ہیں۔ باورچی خانے کی گرل سے تمام پھوار پورے باورچی خانے کو گیلا کیے رکھتی ہے اور وہ بدحواس سی پورے گھر میں گھومتی نظر آتی ہے اور مجھے دیکھ کر یوں زرد پڑ جاتی ہے کہ خیر مقدمی کے کلمات زبان سے ادا بھی نہیں ہو پاتے۔ چند لمحے کے لیے اسے واقعی سکتہ سا ہو جاتا ہے۔

نصرت باجی، میری کزن کا گھر بڑا ہے، جسے کئی نوکر صاف ستھرا رکھتے ہیں مگر وہ برسات میں اس قدر سونے کے عادی ہیں کہ ان کے چھوٹے بچے گھر میں تباہیاں مچا دیتے ہیں اور جب میں ان کے بڑے سے گھر میں کیچڑ، نمی اور غلاظت دیکھتی ہوں تو میرے چہرے کے تاثرات تمسخرانہ زیورات سے مزین ہو جاتے ہیں۔

سخت خلاف

”بڑی خالہ کی راشدہ کے رشتے کتنے آئے تھے؟“

”واقعی بوچھاڑ تھی۔ ایک سے ایک رشتے، ڈاکٹر، انجینئر، بینک آفیسر، بزنس مین اور نہ جانے کیا، کیا......“

”مگر خالہ نے سب کو ہی ٹال دیا۔ یوں بھی ان دنوں راشدہ نے صرف انٹر ہی کیا تھا۔“

”لڑکی بی اے کرلے پھر بیاہ کروں گی۔ بی اے کر کے کچھ عقل بوجھ تو آجائے گی ابھی تو وہ ننھی سی ہے۔ بھوک لگتی ہے تو رو کر کھانا مانگتی ہے۔ ابھی تو منی سی ہے، کسی کی بات تک سمجھ میں نہیں آتی ہے اسے۔“

اور پھر چار، پانچ سال میں راشدہ نے بی اے کا امتحان پاس کیا، انگریزی کے پیپر نے ان کے کتنے سال ضائع کیے تھے وہ خوب جانتی تھی، بہرحال عوامی ڈویژن میں وہ پاس ہوگئی۔ اب رشتوں کی بارش تو کیا، ایک آدھ بوند بھی نہیں تھی۔

اب بڑی خالہ لوگوں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔

''چچی، آپ اپنے کرائے داروں کو ہمارے گھر لے کر آیئے گا۔''

''پھوپی جان، آپ کی نند کا لڑکا تو بہت اچھا ہے۔ کبھی اپنی نند کو لے کر ہماری طرف کا چکر لگائیں۔''

''اچھا آپ الف بلاک میں ہیں، ہم بھی وہیں رہتے ہیں۔ پلیز آیئے ناں ہمارے گھر۔'' راہ چلتی خواتین سے بھی بات چیت ہوتی اور ان سے متاثر ہوجاتیں تو فوراً اپنے گھر کا بلاوا دے دیتیں مگر نہ جانے بی اے کی سند میں کیسا آسیب چھپا تھا کہ کوئی ڈھنگ کا رشتہ راشدہ کے لیے آ ہی نہیں پا رہا تھا۔

''میں نے بی اے ہی بلاوجہ کیا۔'' ایک دن راشدہ نے جل کر کہہ دیا۔

''ہاں، یہ ڈگری ہر ایک کو راس کہاں آتی ہے۔ اب دیکھ لو، بیچاری عابدہ حسین نے اس بڑھاپے میں بی اے کا امتحان پاس کیا اور اس کی وجہ سے الیکشن میں ہار گئیں۔ (وہ تو سفید موتی کا ننھا سا ہار پہنتی تھیں) ان کے ہارنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا مگر لگتا ہے کہ یہ بی اے کی سند ان کے آڑے آ گئی۔ نہ گریجویشن کی شرط ہوتی، نہ وہ امتحان دیتیں اور نہ ہی وہ ہارتیں۔''

میں خوب زوردار تقریر کر رہی تھی، خیر سے میٹرک فیل ہوں اور ایک اچھے سے شخص کی بیگم ہوں جو میرا مرید ہے۔ یہ خیر قطعی دوسری بات ہے کہ ہم مریدکے میں رہتے ہیں۔ ہاں، تعلیم خاص طور پر بی اے کے میں سخت خلاف ہوں، میرے میاں جو مڈل فیل ہیں وہ بھی بی اے کے سخت خلاف ہیں۔

دل میں

کاش میں شاعرہ ہوتی...... اپنے دل کی ساری حکایتیں چند شعروں میں کہہ دیتی۔ مترنم اور رسیلے سے لفظ ایسے تیور بیان کرتے کہ لوگ تیورا کر گر پڑتے۔

یا کاش میں نثر نگار ہی ہوتی...... اور اپنے حالِ دل کی رُوداد ریشمی لفظوں میں اس طرح بیان کرتی کہ لوگوں کے دل، ان لچھوں میں الجھ سے جاتے اور میں ڈوری کھینچ لیتی۔

مگر میں تو لکھنا ہی نہیں جانتی ہوں، کیسے .... بتاؤں، بعض لوگ نفرتوں کی سرزمین پر رہتے ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد بے حساب ہے۔

آج میں اعتراف کرتی ہوں کہ میرے شہرِ دل میں بھی نفرت کی ایک بستی بسی ہے۔ جس میں مختلف درجے کے لوگ رہتے ہیں کسی سے کم نفرت اور کسی سے زیادہ نفرت اور کسی سے معمولی نفرت...... مگر رضیہ کا شمار کسی کیٹیگری میں نہیں آتا کہ اس کا درجہ نفرت کے ایوانوں میں سب سے بلند ہے۔

دوستی میں ملنے جلنے کی رسموں نے مجھے اتنا بامروت بنا رکھا ہے کہ میں اس سے ملنے پر مجبور ہوں۔

جب وہ میرے گھر آتی ہے تو اسے رخصت کرتے ہوئے میں یہ بھی کہا کرتی ہوں کہ ''اب کب آؤ گی، جلدی جلدی آتی رہا کرو ناں۔'' اسے رخصت کرتے وقت میں اس کی پیشانی پُرالوداعی بوسہ بھی دیتی ہوں اور جب تک اس کی گاڑی چلی نہیں جاتی، میں باہر کھڑی رہتی ہوں اور اس کے جاتے ہی ناقابلِ بیان مغلظات میرے ہونٹوں سے بہہ، بہہ کر پورے علاقے کے ماحول کو آلودہ کر دیتی ہیں۔

رضیہ صرف مجھے ہی بری نہیں لگتی بلکہ بہت سارے لوگوں کو وہ بے حد بری لگتی ہے اور اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اس کا واحد مشغلہ لوگوں کے بخیے ادھیڑنا ہے۔ جب بھی کوئی اس کے ہاتھ لگا۔ وہ لوگوں کو کلسانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ سینا، پرونا سلیقہ مندی کے زمرے میں آتا ہے مگر ادھیڑنا برائی کے معنوں

میں۔

کتنے عجیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو ہمیشہ... بدخواہی میں آگے آگے چلتے ہیں اور خوب تیز بھی، مجال ہے کہ ٹھوکر کھا کر گر بھی جائیں۔ (ہاں دوسروں کو گرانا خوب جانتے ہیں)

کاش میں مصورہ ہوتی تو رضیہ کی تصویر ہی بناتی، اس کے لیے تو سیاہ رنگ کے علاوہ کسی دوسرے رنگ کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

ایزل پر صرف کالے رنگ کا پورا ڈبا، برش کے بغیر یونہی الٹ دیتی اور وہ گرتی پڑتی لکیریں رضیہ کی تصویر ہی بنا جاتیں۔ (کاش میں مصورہ ہوتی) یوں بھی فنِ مصوری سے مجھے بے حد لگاؤ ہے۔ میں جب کبھی تجریدی آرٹ کی نمائش دیکھنے جاتی ہوں تو بڑی رغبت سے دیکھتی ہوں۔ گھر واپس آ کر مصوروں کو بے حد خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں کہ وہ سب اپنی، اپنی رضیہ کی تصویریں کتنی مہارت سے بناتے ہیں، ان کی ذہنی اور دلی نفرت میں خود محسوس کر لیتی ہوں۔ شاید سب کے دل کے ایوانوں میں کوئی نہ کوئی رضیہ ضرور ہوتی ہے...... ہے ناں......!

نیا پیکج

سیما نے مجھے بتایا کہ شائستہ نے موبائل کے مختلف پیکجز کے ساتھ، ساتھ مترنم ہنسی کا بھی پیکج لے لیا ہے۔

''وہ کیسے......؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کسی وقت بھی بات کر لو، کسی بھی موضوع پر بات کر لو...... اس کی طبیعت سنجیدہ ہو یا رنجیدہ...... وہ ایک مدھری ہنسی سے بات کا آغاز کرتی ہے اور پھر اس کی ہنسی کی چھما چھم ایک ایسا جلترنگ بجاتی ہے کہ بات کرنے والا خود بخود مسکرانے لگتا ہے...... اور ایسی چاہت بھری ہنسی ہنسنا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے...... یقیناً یہ کوئی نیا پیکج آیا ہے۔''

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆حمیرانوشین......منڈی بہاؤالدین

اس دور کا معیارِ محبت بھی ہے دولت
ٹھکراؤ مگر کچھ میری قیمت ہی لگا دو
پتھر پہ لکیروں کی طرح دل میں تیرا نام
اور لوگ کہیں مجھ سے کہ اب اس کو بھلا دو

☆فائزہ شاہ......لاہور

کچھ لوگ بچھا کر کانٹوں کو گلشن کی توقع رکھتے ہیں
شعلوں کو ہوائیں دے دے کر ساون کی توقع رکھتے ہیں
ماحول کے تپتے صحرا سے حالات کی اجڑی شاخوں سے
ہم اہلِ جنوں پھولوں سے بھرے دامن کی توقع رکھتے ہیں

☆ارم احمد......لاوہ

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے
پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

☆حافظہ اقرارحمن......لاہور

اس کی اپنی بیٹی کی ہتھیلی خشک رہتی ہے
جو بوڑھا دھوپ میں دن بھر حنا تقسیم کرتا ہے

☆مسز فرح امجد......ٹاؤن شپ لاہور

سلسلہ ایسا چلا نفرت کا کہ رک نہ سکا
ہم نے تو محبتوں کی دیواروں کو بہت دراز کیا

☆سیدہ رفیعہ ابدالی......نارتھ کراچی

اپنی اپنی راحتوں سے جب بھی فرصت ملے
دوسروں کا درد بھی دل میں جگا کر دیکھیے

☆عرشیہ جنید......کراچی

وہ رات دن مرے دستِ طلب میں ہے لیکن
قبول ہوتی ہیں کب تک دعائیں دیکھتے ہیں

☆جبین نیاز......ملتان

فقط احساس آزادی سے آزادی عبارت ہے
وہی دیوار گھر کی ہے وہی دیوار زنداں کی

☆نگہت آصف......اسلام آباد

کچھ لوگ میری دنیا میں خوشبو کی طرح ہیں
محسوس تو ہوتے ہیں دکھائی نہیں دیتے

☆غزالہ طارق......سرگودھا

نہیں فرصت یقین مانو ہمیں کچھ اور کرنے کی
تیری یادیں تری باتیں بہت مصروف رکھتی ہیں

☆شازیہ محبوب......مقام نامعلوم

اچھی گزر رہی ہے میری عمر آپ کے
وعدوں کے درمیان، بہانوں کے درمیان

☆ارم کمال......فیصل آباد

ذرا دیکھو تو دروازے پہ دستک کون دیتا ہے
محبت ہو تو کہنا کہ یہاں اب ہم نہیں رہتے

☆عروبہ ناز......کوٹلی

مسلسل ذہن و دل پر ہے مسلط
یہ دنیا عارضی ہوتے ہوئے بھی

☆ارم مختار......راول پنڈی

یاد میں تیری جاگی رات بھر تنہا
اور آنسو تھے میرے ساتھ تنہا
چاند تکتا رہا میری بے بسی
چاند کی آغوش میں تھے ہم تنہا



گھریلو پراٹھا رول

اشیا: چکن کے پارچے، ایک کلو۔ کچری پاؤڈر، ایک کھانے کا چمچ۔ دہی، آدھا کپ۔ گرم مسالا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن، (چوپ کیا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ پاؤڈر، نمک، حسبِ ذائقہ۔ چلی پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ مایونیز، آدھا کپ۔ بٹر پیپر، حسبِ ضرورت۔ ٹماٹر، فلنگ کے لیے۔ (سلائس کاٹ لیں) سلاد کے پتے، فلنگ کے لیے۔ تیل، حسبِ ضرورت۔ پراٹھے کے لیے میدہ، دو کپ۔ آٹا، ایک کپ۔ انڈا، ایک عدد۔ (پھینٹ لیں) چینی، ایک چائے کا چمچ۔ بیکنگ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ دودھ، ایک کپ۔ نیم گرم پانی، حسبِ ضرورت۔ تیل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: ایک برتن میں پارچے، کچری پاؤڈر، دہی، گرم مسالا پاؤڈر، لہسن، سرخ مرچ پاؤڈر، چلی پیسٹ اور نمک ڈال کر مکس کر کے دو سے تین گھنٹے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ اب مسالا لگے پارچے سوس پین میں تیل گرم کر کے درمیانی آنچ پر پکائیں اور پانی خشک ہوجائے تو چولھے سے اتار لیں۔ اب پراٹھوں کا آٹا گوندھ کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر کڑاہی میں تیل گرم کر کے میدے کے پیڑے بنا کر بیل کر پراٹھے فرائی کرلیں۔ سنہری ہوجائیں تو پلیٹ میں نکال لیں۔ پراٹھوں میں پارچے، ٹماٹر، سلاد کے پتے اور مایونیز لگا کر رول بنا کے بٹر پیپر میں لپیٹ کر سرونگ ڈش میں رکھتے جائیں۔ کیچپ اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: بینا عباس، کراچی

فروٹ کاک ٹیل

موسم گرما کے مانند موسم سرما میں بھی قسم قسم کے پھلوں کی بہار ہوتی ہے۔ اپنے دسترخوان یا ضیافتوں کو رونق دیجیے انہی پھلوں سے۔

ایک برتن میں میٹھا دہی ایک کپ، فریش کریم، ایک کپ۔ نمک، چٹکی بھر۔ پسی ہوئی چینی، دو کھانے کے چمچ اچھی طرح مکس کرلیں اب اس میں چوکور کٹے ہوئے پائن ایپل، سیب، کیلے، انار کے دانے اور کچا ناریل کٹا ہوا شامل کرلیں اور اچھی طرح مکس کر کے پیش کریں۔ مزید مزیدار کرنے کے لیے کوئی سا لال شربت یا چاکلیٹ سیرپ ڈال سکتے ہیں۔ آئس کریم کے ساتھ بھی سرو کر سکتے ہیں۔

حلوا گاجر کا

اشیا: گاجر، ایک کلو۔ دودھ آدھا کلو۔ چینی، دو پیالی۔ کھویا، ایک پیالی۔ انڈے، تین عدد۔ سبز الائچی، چار عدد۔ میوہ، حسبِ ذائقہ۔ گھی، آدھی پیالی۔

ترکیب: گاجروں کو دھو کر چھیل کر کدوکش کرلیں۔ دودھ بڑی پتیلی میں ایک گلاس پانی ملا کر ابال لیں۔ ابال آنے پر الائچی ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر دس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر اس میں کش کی ہوئی گاجریں ڈال دیں جب دودھ خشک ہوجائے۔ گاجریں بھون کر چولھے سے اتار لیں۔ لکڑی کا چمچ استعمال کریں۔

کڑاہی میں گھی اور میوہ ڈال کر کڑکڑائیں اور گاجروں میں شامل کرلیں اب چینی بھی ڈالیں اور ہلکی آنچ پر بھونتی رہیں جب تک چینی کا پانی خشک نہ ہوجائے اور آمیزہ تیل نہ چھوڑ دے۔ جب بھننے کے قریب ہو تو کھویا اوپر سے بکھرا دیں اور ابلے ہوئے انڈے کاٹ کر سجادیں۔ مزیدار حلوا تیار ہے۔

مرسلہ: ثنا مرتضیٰ، کراچی

مزیدار دیگی حلیم

اشیا: چکن بون لیس، ایک کلو، گائے کا گوشت بھی استعمال بھی کرسکتے ہیں۔ گیہوں، 1/2 کلو۔ دال چنا، 200 گرام۔ دال ماش، 100 گرام۔ دال مونگ، 100 گرام۔ گھی، 500 گرام۔ ادرک پیسٹ، 2 کھانے کے چمچ۔ لہسن پیسٹ، دو کھانے کے چمچ۔ چاول، 100 گرام۔ سرخ مرچ پاؤڈر، ایک کھانے کا چمچ۔ پیاز، (باریک کاٹ لیں) تین عدد۔ گرم مسالا پاؤڈر، 50 گرام۔ ہلدی پاؤڈر، ایک کھانے کا چمچ۔ دھنیا پاؤڈر، تین کھانے کے چمچ۔ سفید زیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی) پانچ چھ عدد۔ ٹماٹر (کیوب کاٹ لیں) دو عدد بڑے۔ پودینہ (باریک کاٹ لیں) ایک گٹھی۔ نمک، حسب ضرورت۔

ترکیب: گیہوں، چاول اور دالیں رات بھر کے لیے الگ، الگ برتن میں بھگودیں۔ دیگچی میں گیہوں ڈالیں اور نمک ڈال کر تقریباً تین لیٹر پانی میں ابال لیں یہاں تک کہ گیہوں گل جائے اور اس کا پانی خشک ہوجائے اسے اتار کر گھونٹ لیں۔ باقی دالیں، چاول الگ پکالیں۔ گھونٹی ہوئی دالیں، چاول اور گیہوں ایک پتیلی میں ڈالیں اور تھوڑا سا پانی ملا کر گھونٹ لیں۔ ایک دوسری پتیلی میں پیاز ہلکی براؤن کرلیں۔ تلی ہوئی پیاز میں سے تھوڑی سی پیاز علیحدہ نکال لیں اور باقی پیاز میں گوشت ڈال کر بھون لیں پھر ادرک اور لہسن پیسٹ ڈال کر مزید بھونیں اور ٹماٹر بھی ڈال دیں۔ ٹماٹر گل جائے تو دھنیا پاؤڈر، سرخ مرچ پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، ہری مرچیں ڈال کر مزید بھونیں۔ گوشت کا مسالا اچھی طرح بھن جائے اور گھی چھوڑنے لگے تو حسب ضرورت پانی ڈال کر گوشت گلنے تک ڈھک کر پکائیں۔ گوشت کے گلنے کے بعد اتار لیں۔ اب گھونٹے ہوئے گیہوں اور دالیں گوشت میں ڈال کر یک جان کر کے ہلکی آنچ پر پکائیں اگر حلیم گاڑھا معلوم ہو تو اس میں گرم پانی مناسب مقدار میں ڈال کر اسے مزید تھوڑی دیر پکائیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر باریک ادرک، پودینہ اور ہری مرچ چھڑک دیں۔ تلی ہوئی پیاز بھی ڈال دیں اور حسب پسند گرم مسالا چھڑک کر اور اس پر لیموں نچوڑ کر کھائیں اور مزیدار چٹ پٹی حلیم کے منفرد ذائقے سے لطف اندوز ہوں۔

مرسلہ: نگہت آصف، اسلام آباد

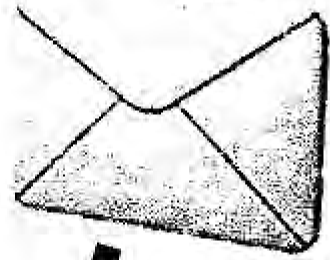
ریڈ چلی چکن ودھ رائس

اشیا: چکن بون لیس، آدھا کلو، چوکور کاٹ لیں۔ چاول، (ابال لیں) دو کپ۔ ٹماٹو پیسٹ، آدھا کپ۔ ریڈ چلی پیسٹ، تین کھانے کے چمچ۔ سیاہ مرچ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ پیپریکا پاؤڈر، آدھا کھانے کا چمچ۔ شملہ مرچ، ایک سے دو عدد (لمبائی میں کاٹ لیں) مسٹرڈ پیسٹ، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ضرورت۔ تیل، چار کھانے کے چمچ۔

ترکیب: کڑاہی میں تیل گرم کر کے چکن ڈال کر فرائی کریں، اسی تیل میں ٹماٹو پیسٹ ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے پانچ منٹ پکائیں، اب چکن اور شملہ مرچ ڈال کر مزید پانچ منٹ کے لیے پکائیں، خشک ہوجائے تو چولھے پر سے اتار لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ گرما گرم سرو کریں۔

مرسلہ: رابعہ شاہد، دبئی

سندیسے



پاکیزہ بہنیں

پیاری بہنوں کے نام

آپ سب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول ہمیشہ یاد رکھیں...... زندگی ایسے جیو کہ کوئی ہنسے تو تمہاری وجہ سے ہنسے، تم پر نہیں اور کوئی روئے تو تمہارے لیے روئے، تمہاری وجہ سے نہیں۔

از: صبا نور، لیہ

ایک راز کی بات

اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی اپنے شوہر کے ساتھ کوئی لڑائی طول نہ پکڑے فوراً ختم ہوجائے تو آپ کے شوہر غصے میں جب آپ کو باتیں سنائیں تو آپ ان کو بالکل جواب نہ دیں۔ دانت بھینچ کر بالکل خاموش رہیں...... آپ دیکھیں گی کہ کبھی اکیلے ہاتھ سے تالی بج ہی نہیں سکے گی...... ہمیشہ لڑائی اس وقت ہوا کرتی ہے جب دونوں فریقین ایک دوسرے کو ترکی بہ ترکی جواب دیا کرتے ہیں۔

از: امینہ عندلیب...... سلانوالی

اپنے منگیتر کے نام پیغام

جب کوئی بات بگڑ جائے\
جب کوئی مشکل پڑ جائے\
تم دینا ساتھ میرا\
او میرے ہم نوا

از: تمہاری اپنی تابندہ طلعت یعنی...... ٹی ٹی، کراچی

پیاری مینا

بے حد پیاری امینہ عندلیب...... ایک طویل عرصے سے تم شدید بیمار ہو...... میری دلی دعا ہے کہ تمہاری ساری بیماریاں اُڑن چھو ہوجائیں...... اور تم مکمل صحت مند ہو کر اپنے محبت کرنے والوں سے ملنے کراچی ضرور آؤ...... کہ یہاں سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

از: شگفتہ شفیق، کراچی

حد برداشت

سنیں میں آپ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہوں...... آپ اپنی جاب پر جاتے ہیں تو بہت زیادہ آپ کو مس کرتی ہوں اور اگر میں اپنا بیڈ روم بہت زیادہ پھیلا کر رکھتی ہوں تو آپ کم از کم مجھے پھوہڑ تو نہ کہا کریں...... اس سے آپ کی اماں بہت خوش ہوتی ہیں۔ اور یہ میں برداشت نہیں کرسکتی۔

از: سائرہ، سندھ

میرے شریک حیات

غم ہے یا خوشی ہے تو\
میری زندگی ہے تو

بس...... چھوٹی، چھوٹی باتوں کو درگزر کردیا کریں...... باقی تو الحمد للہ سب ٹھیک ہے۔ لائف آئیڈیل گزر رہی ہے۔

از: شہلا ناز، حیدرآباد

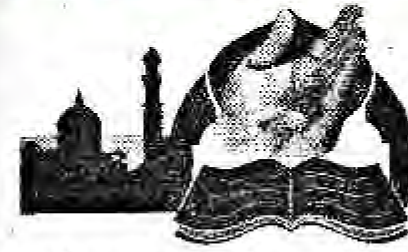
ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے

ایک عورت اس وقت تک غلط ہوتی ہے جب تک وہ روتی نہیں...... رونے کے بعد وہ ہمیشہ درست قرار دی جاتی ہے۔

از: ممتاز خانم...... کورنگی، کراچی

روحانی مشورے

ادارہ



حضرت ابراهیمؑ

خداوندِ قدوس کی بے شمار صفات ہیں۔ ہر صفت دوسری سے جدا ہے۔ ایک صفت اس کی یہ ہے کہ وہ سب سے اعلیٰ قدر دان ہے اور جس کی وہ قدر کرے، وہ دنیا میں عظیم ہو جاتا ہے اس کی قدر دانی کا ایک روپ بندے سے دوستی کا ہے اور حضرت ابراہیمؑ اللہ کے وہ جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ جنہیں اللہ نے اپنی دوستی سے نوازا اور آپ کو اپنا خلیل بنایا۔ اللہ تعالیٰ سے دوستی کا معیار یہی ہے کہ اس کی عظمت اور حاکیت کو تسلیم کیا جائے پھر جو وہ کہے اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہوش سنبھالتے ہی اللہ کی وحدانیت کو قبول کیا اور اللہ کو اپنا الہٰ مانا اور اسی کو اپنا رب سمجھا، آخر اسی تسلیم و رضا کے بعد اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت سے نوازا اور کہا اب جو لوگ مجھے نہیں مانتے انہیں دعوتِ حق دو۔ جونہی حضرت ابرہیمؑ نے اللہ کے منکرین کو دعوتِ حق دی تو حاکمانِ وقت آپ کے خلاف ہو گئے۔ آخر آپ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے پھر نہ صرف ظلم و ستم پر اکتفا کیا بلکہ نمرود، حضرت ابراہیمؑ کی جان لینے کے درپے ہوا۔ حتیٰ کہ اس نے ایک بہت بڑی آگ تیار کروائی اور آپ کو اس نے اس آگ میں ڈال دیا۔ اس وقت خدا کی خدائی بول اٹھی کہ ابراہیم! تمہیں میرا نام لینے پر آگ میں ڈالا گیا ہے مگر یہ آگ تمہارا ایک بال بھی نہیں جلا سکتی کیونکہ کائنات کا ذرہ، ذرہ میرے تابع ہے اور جا! تو میرا خلیل ہے اور جو لوگ تیرے مقابلے میں ہیں، میں انہیں نیست و نابود کر دوں گا لیکن جب لوگ تمہارا ایمان جانچیں آپ صبر و ضبط سے کام لیں۔ حتیٰ کہ اسی جانچ کے سلسلے میں حضرت ابراہیمؑ کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ پھر راہِ حق میں بے شمار مصائب برداشت کرنے پڑے۔ دور دراز کے سفر کرنے پڑے۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں... مگر جب دورِ آزمائش ختم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابرہیمؑ کو اپنی بے پناہ نعمتوں سے نواز دیا۔ بلکہ بڑھاپے میں اولاد سے سرفراز کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے زندگی کے کئی مواقع پر اللہ کے حضور دعائیں کیں، ان دعاؤں کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔

حضرت ابرہیم علیہ السلام کی دعائیں

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف اوقات میں اور جن حالات میں دعائیں مانگیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

قبول خدمت کی دعا

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

اے ہمارے رب! ہمارے (اس کام کو) قبول فرما...... درحقیقت تو ہی دعاؤں کا سننے والا ہے (اور دلوں کی نیتوں کو) جاننے والا ہے۔ (پ، ۲۔ سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۱۲۷) یہ دعا حضرت ابراہیمؑ نے اس وقت پڑھی جب آپ نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا اور جس خلوص اور نیک نیتی سے آپ نے خانۂ کعبہ بنایا تھا وہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا، لہٰذا تعمیر کے وقت آپ نے اللہ کے حضور التجا کی کہ یاالٰہی یہ گھر جو ہم نے تیرا بنایا ہے اسے قبول فرما۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کی سنت سمجھتے ہوئے ہر نیک کام کرتے ہوئے یا اس کی تکمیل پر مندرجہ بالا دعا پڑھنی چاہیے۔

اس دعا کے بارے میں صوفیا اور فقرا کا نظریہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص نیا مکان تعمیر کرے اور عمارت بنائے تو اس کی تکمیل پر اللہ کے حضور حسبِ توفیق نذر و نیاز پیش کرے اور مندرجہ بالا دعا کو کثرت سے پڑھے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس دعا کو دوست احباب مل کر سوا لاکھ مرتبہ پڑھیں تو انشاء اللہ نئے مکان کی تعمیر، بنانے والے کے لیے باعثِ برکت ہو گی اور خاص کر جب کوئی شخص مسجد بنوائے تو تعمیرِ مسجد کے دوران اور تکمیل پر اس آیت کا ورد کرے یا کروائے۔ انشاء اللہ تعمیر کی قبولیت کی اطلاع اسے خواب میں مل جائے گی۔

حصول خیر و برکت کی دعا

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

پروردگارا! ہم کو اپنا (بندہ) فرمانبردار بنا اور ہماری نسل میں ایک امت (پیدا کر) جو تیری حکم بردار ہو اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر۔ بے شک تو ہی بڑا درگزر کرنے والا مہربان ہے اور اے ہمارے پروردگار ان (مکہ والوں) میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیج جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب (آسمانی) اور عقل (کی باتیں) سکھائے اور ان (کے نفوس) کی اصلاح کرے بے شک تو ہی با اختیار (اور) صاحبِ تدبیر ہے (پ ۱، سورۂ بقرہ، آیت ۱۲۸، ۱۲۹)

حضرت ابراہیمؑ نے اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے استقامت، عبادت اور اپنی اولاد میں سے ایک رسول طلب کیا ہے اور اس دعا کے اثرات بہت ہیں جو شخص اللہ تعالیٰ سے اپنی نسل میں نیک انسان پیدا کرنے کی خواہش رکھتا ہو تو وہ اس دعا کو پڑھے۔ انشاء اللہ اس کی اولاد میں سے نیک اور صالح مرد پیدا ہوں گے۔

اس دعا کے پڑھنے سے انسان کے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ اس دعا کو نماز کے بعد ایک بار پڑھنا بہت بہتر ہے۔

اضافۂ رزق کی دعا

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

اے میرے پروردگار! اس (شہر مکہ) کو امن کا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائیں ان کو پھل پھلاری کھانے کو دے۔

(پ ۱، سورۂ بقرہ آیت ۱۲۵)

ہمارا روزانہ کا معمول

قارئین ہمارا روز کا معمول یہ ہونا چاہیے کہ صبح شام تین تسبیحات کا اہتمام کریں۔ جو شخص قبلہ رو بیٹھ کر اہتمام سے درمیان میں کسی سے بات کیے بغیر دھیان سے تین تسبیحات اہتمام سے کرتا ہے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے کی ایسی طاقت عطا فرما دیتے ہیں کہ اس کی نگاہ غلط جگہ اٹھتی ہی نہیں اور اگر غلطی سے اٹھ گئی تو دوبارہ حفاظت ہو جاتی ہے۔ تین تسبیحات یہ ہیں۔

1 تیسرا کلمہ سو مرتبہ صبح شام۔
2۔ درود شریف سو مرتبہ صبح شام
3۔ استغفار سو مرتبہ صبح شام
4۔ اگر ان تدابیر سے ... فائدہ نہ ہو تو ماہر علمائے کرام و تجربہ کار بزرگوں سے مشورہ کر لے کہ ان گناہوں سے بچنے کی کیا تدبیریں ہیں۔ جیسے جسم کی بیماریوں سے نجات کے لیے ..... اسپیشلسٹ کے ہاں جاتے ہیں بالکل اسی طرح ان بزرگوں کے پاس روحانی بیماری کے علاج کے لیے جائیں مگر پلیز بابوں کے پاس ہرگز نہیں جائیں۔

☆☆☆



شوابے ہومیو کلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجئے پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

معدے کا مسئلہ

محمد اشفاق۔ کوٹ ادّو

ڈاکٹر صاحب میں نے بہت پہلے آپ کو خط لکھا اور رپورٹ بھی بھیجی تھی۔ میرا جواب پاکیزہ (اگست) میں چھپا تھا لیکن آپ نے کہا آپ پوری تفصیل لکھیں۔ میں نے بہت سے ڈاکٹروں سے علاج کروایا تھا۔ میرے سینے میں معدے کی جگہ پر ہلکا ہلکا قابلِ برداشت درد رہتا ہے اور یہ درد بعض اوقات بہت بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ایک ڈاکٹر نے 2 ماہ تک متواتر علاج کیا لیکن درد ویسا ہی رہا۔ الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ کے مطابق معدے کا السر.... بتایا لیکن دوائیوں سے آرام نہیں آیا۔ پھر ڈاکٹر نے کہا کہ یہ ریاحی درد ہے اور آخرکار میں نے تنگ ہو کر علاج چھوڑ دیا ہے۔ اب آپ میرے لیے کوئی ہومیو پیتھک دوائی تجویز کریں۔ اب بھی معدے میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ آپ مجھے غذا کے بارے میں بھی بتائیں۔ میں میکینکل کا کام کرتا ہوں اور غیر شادی شدہ ہوں۔ یہ بیماری تقریباً 4 سال سے ہے۔

جواب: آپ اپنی ناف چیک کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Carboveg 30,Calc. Carb 30,Rhstox 30 کے 5،5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔ کھانے میں مرچ مسالے اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ سادہ، زود ہضم اور قوت بخش غذا لیں۔ بھاری وزن نہ اٹھایا کریں۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

دسمبر 2014

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

ذہنی پریشانی کے جسم پر اثرات

سمیرا۔ آزاد کشمیر

میں جب 7 سال کی تھی تب سے میرے سر میں بہت درد رہتا ہے۔ 13 سال کی عمر میں چیک کروایا تو ڈاکٹر نے کہا کہ دماغ کی کوئی وین کمزور ہے۔ 15 سال کی عمر میں مجھے عینک لگ گئی۔ R-1.00 اور L-2.00 ہوگیا ہے۔ سر میں اب بھی بہت درد ہوتا ہے۔ درد آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے پھر سر پھٹنے والا ہو جاتا ہے جب تک کوئی گولی نہ کھاؤں آرام نہیں آتا چاہے ہفتہ گزر جائے۔ مجھے 6 سال سے لیکوریا کا مسئلہ بھی ہے۔ کبھی کبھی بالکل آرام آجاتا ہے اور کبھی کبھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ کمر میں بہت زیادہ درد رہتا ہے۔ تھکاوٹ اور پیلا پن ہوگیا ہے۔ میں نے 3 سال پہلے خودکشی کی کوشش کی جس کی وجہ سے میرا معدہ بہت خراب ہوگیا ہے۔ کھانا ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتا ہر وقت گیس اور قبض رہتا ہے۔ معدے میں درد ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ معدہ کسی نے ابالتے پانی میں رکھ دیا ہے۔ ہمارے گھر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی ٹینشن رہتی ہے۔ جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، ذرا سکون نہیں ہوتا۔ زیادہ سوچنے کی وجہ سے اب اکثر سینے اور بائیں بازو میں درد رہنے لگا ہے۔ اکثر بازو بے جان ہو جاتا ہے۔ بی پی بہت لو رہتا ہے۔ پاؤں ہر وقت ٹھنڈے رہتے ہیں۔ گرم چیزیں کھانے سے گردے میں درد ہوتا ہے۔ پیریڈز میں بھی بلیڈنگ بہت ہوتی ہے۔ تھوڑا سا کام کر کے تھک جاتی ہوں۔ بہت سست ہو جاتی ہوں۔ ذرا سا سفر کر کے بھی تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ گھر میں ورزش کی کوئی جگہ نہیں باہر جا نہیں سکتی۔ صبح ناشتے میں دہی اور دن رات میں ایک ایک روٹی کھا لیتی ہوں۔ نماز پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں پر دھیان نہیں لگتا۔ چڑچڑا پن اور غصہ بہت زیادہ آتا ہے ذرا برداشت نہیں رہی۔ پڑھائی پوری کر کے اب 2 سال سے گھر پر ہوں جس کی وجہ سے پیٹ اور کولہے بہت بھاری ہو گئے ہیں حد سے زیادہ بڑے لگتے ہیں۔ آپ میرے لیے کوئی دوا تجویز کردیں تاکہ میں نارمل زندگی گزار سکوں۔ شکریہ۔



جواب: ذہنی تناؤ نہ صرف دماغ پر بلکہ جسم پر بھی برا اثر ڈالتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلی کوشش یہ



کریں کہ گھریلو ماحول بہتر ہو، یہ بات سب کو باور کرائیں۔ جس گھر میں آئے دن جھگڑے ہوتے ہیں اس گھر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہیں آتی۔ سب لوگ نماز اور قرآن کی تلاوت مع ترجمے کے صرف ایک رکوع یا صرف 3 آیات پڑھنے کی عادت بنالیں۔ درود شریف نماز والا کثرت سے پڑھا کریں۔ صبح فجر کی نماز کے بعد سورۂ یٰسین کی تلاوت کیا کریں۔ آہستہ آہستہ گھریلو تناؤ میں فرق آئے گا۔ چٹ پٹی نمکین چیزوں کا استعمال کم سے کم کریں۔ حالات سے تنگ آ کر مایوسی اور مایوسی کے بعد خودکشی کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اللہ کریم کی ذات پر یقین ہے ہی نہیں اسی لیے مایوسی کو کفر اور خودکشی کو حرام قرار دیا ہے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو سب سے پہلے اللہ سے مدد مانگیں نمازوں اور دعا کے ذریعے پھر مسئلے کے حل کے لیے اپنی سمجھ بوجھ کو استعمال کریں، اپنے بزرگوں سے مدد لیں۔ یاد رکھیں ہر مسئلے کا حل ہے بشرطیکہ ہم اس کو حل کرنا چاہیں۔ متوازن غذا کا استعمال کریں۔ کھانے کو اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ کھانے سے پہلے پانی پئیں۔ کھانے کے دوران اور بعد میں پانی کا استعمال بالکل نہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Kali. Phos-30 اور Ars.Alb-30 کے 5.5 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھے گلاس پانی میں لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

رحم کا مسئلہ

ثمینہ۔ پاک پتن

آپ کی لکھی ہوئی دوائیاں استعمال کیں، اللہ کے فضل و کرم سے پہلے سے کافی آرام ہے، کمر درد اور ٹانگوں کے درد میں۔ Periods بھی پہلے سے کچھ بہتر ہیں۔ اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ میرے رحم کے منہ پر ایک ...... لوتھڑا بن گیا ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ رحم کا منہ بند ہو گیا ہے۔ پچھلے سال DNC بھی کروائی تھی۔

جواب: آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات Bovista-30، Calc Flour-30 اور Pulsatilla-30، 2 ماہ استعمال کر کے الٹرا ساؤنڈ کرا کے اس کی رپورٹ بھیجیں اور کسی اچھی جگہ سے الٹرا ساؤنڈ کرائیں تا کہ رپورٹ ٹائپ ہو۔

بیٹوں کا مسئلہ

مسز احسان۔ لاہور

میں پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں۔ شوابے ہومیو کلینک بہت شوق سے پڑھتی ہوں جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں جو مسئلہ لکھ کر بھیج رہی ہوں وہ میرے بیٹوں کا ہے۔ بڑے بیٹے کی عمر 13 سال ہے۔ نویں کلاس کا اسٹوڈنٹ ہے مگر بہت کمزور ہے۔ قد اپنے ہم عمر بچوں سے کافی چھوٹا ہے یعنی عمر کے لحاظ سے وہ ابھی 8-9 سال کا

لگتا ہے۔ صحت بھی کمزور ہے۔ اس کی نظر بھی کمزور ہے۔ عینک لگے 3 سال ہو گئے ہیں۔ عینک کا نمبر 2 ہے۔ اب تو یاد کیا ہوا بھی بھولنے لگا ہے۔ چھوٹا بیٹا بھی کمزور ہے۔

جواب: دونوں بیٹوں کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔ Alfalfa-Ø کے 10-10 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 دفعہ کھانے کے بعد استعمال کرائیں۔ بڑے بیٹے کو Baryta Cab-30، Calc.Flour-30 اور Calc.Phos-30 کے 5-5 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھے گلاس پانی میں کسی بھی وقت استعمال کرا سکتی ہیں۔ 3 ماہ تک استعمال کر کے پھر حال بتائیں۔ دوسرے بیٹے کی سانس پھول جاتی ہے اس کی تفصیل لکھیں، کب سے ہے، کیا ہوا تھا کہ سانس پھولنے لگی۔ کوئی علاج کرایا یا نہیں؟

بریسٹ کا مسئلہ

زب۔ بہاولپور

میرے بریسٹ گروتھ نہیں کر رہے۔ پلیز ایسی میڈیسن تجویز کر دیں جس کا کوئی سائڈ افیکٹ نہ ہو۔

شازیہ، مقام نامعلوم

شادی کو 6 سال ہو گئے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ



میرے بریسٹ بالکل نہ ہونے کے برابر ہیں اکثر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے حالانکہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ اللہ کی دین یا کوئی جسمانی نقص ہے؟ مجھے اس بارے میں کافی پریشانی ہے۔ میں بہت ہمت کر کے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔

جواب: بی بی شازیہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک بیٹا اور بیٹی کی دولت سے نوازا ہے۔ اس پر تمام افراد کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ انسان کے اندر وقت کے ساتھ ساتھ کچھ بیماریاں یا مسائل جنم لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کا حل سوچنے کے بجائے ایک دوسرے کا مذاق اڑانے لگیں۔ آپ کا مسئلہ طبی نوعیت کا ہے جس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں غذائی کمی کا مسئلہ۔ غذا کے کچھ جزویات کا مسئلہ (آیوڈین کی کمی) ہارمون کی کمی کا مسئلہ) تھائی رائیڈ۔ پرولیکٹن) بریسٹ کی کوئی بیماری۔ ان سب کا ہومیو پیتھی میں شافی ادویاتی علاج ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مریضہ معالج سے رابطہ کرے تا کہ اگر کسی الٹرا ساؤنڈ یا میموگرام کی یا ہارمون کے ٹیسٹ کی ضرورت ہو تو سبب معلوم کرنے کے لیے ٹیسٹ کروایا جائے۔ یاد رکھیں بازار میں بکنے والی اشتہاری ادویات مثلاً گولیاں، قطرے، کریم، لوشن استعمال کرنے کے خاطر خواہ نتائج نہیں ملتے کیونکہ جب تک سبب کا تعین نہیں ہوگا یہ سب

چیزیں بیکار ثابت ہوتی ہیں اور مساج اور ورزش بھی کارآمد ثابت نہیں ہوتی۔

پھولا ہوا جسم

شمیم کنول۔ حافظ آباد

میں پہلی بار اپنا مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ میں اپنی بھتیجی کے بارے میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ میری بھتیجی کو تین چار سال پہلے فیٹ ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا سارا جسم پھول گیا ہے۔ اس کا پیٹ بھی کافی بڑھ گیا ہے اور مینسز بھی ہونے لگے ہیں۔ مینسز ہر ماہ نہیں ہوتے بلکہ دو تین ماہ بعد ہوتے ہیں اور پیٹ کے نچلے حصے میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔ اس کا بخار نہیں اترتا، دن کو اتر جاتا ہے اور رات میں بہت تیز ہو جاتا ہے۔ بہت سے ڈاکٹروں سے علاج کرایا لیکن افاقہ نہیں ہوا۔

جواب: بچی کو پانی زیادہ سے زیادہ پلائیں اور ہلکی سادہ غذا دیں۔ فروٹ زیادہ استعمال کرائیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد حالت بتائیں۔ Baptisia-30، Pulsatilla-30 اور Merc.Cor-30 کے 5-5 قطرے دن میں 3 مرتبہ استعمال کرائیں آدھے گلاس پانی میں ڈال کر۔

بدلتے موسم میں احتیاط کریں

گرمی اب ختم ہو رہی ہے اور سردیوں کی شروعات ہیں۔ ایسے موقع پر کھانے پینے، کپڑوں اور رہن سہن میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ موسم اور اس کی بیماریوں سے بچا جاسکے۔

ٹھنڈے پانی، مشروبات، کولڈ ڈرنکس، آئس کریم کا استعمال اب بند کردیں۔ موسم کے پھل اور سبزیوں کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں۔ قوت بخش غذاؤں کا استعمال بڑھائیں۔ سوپ پیا کریں۔

ٹھنڈے پانی کے بجائے نیم گرم پانی سے نہائیں۔

رات سوتے وقت پنکھے یا اے سی کے نیچے نہ لیٹیں اور چادر اوڑھ کر سوئیں۔ کمرا ٹھنڈا ہو جائے یا ٹھنڈ ہو جائے تو اسپلٹ/پنکھا بند کردیں۔

موسم کے درجۂ حرارت کے مطابق کپڑوں کا استعمال کریں۔

ان سب احتیاطوں سے آپ موسم کی بیماریوں نزلہ، کھانسی، دمہ، بخار، بدہضمی، دست، بلڈ پریشر وغیرہ سے کسی حد تک خود... کو محفوظ رکھ سکیں گے۔

☆☆☆

